۴

وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا

معارفِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

احادیثِ نبویہ کا آسان اور عام فہم ترجمہ وتشریح

شہیدِ اسلام

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی نوّر اللہ مرقدہ

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا

معارفِ نبوی ﷺ

احادیثِ نبویہ کا آسان اور عام فہم ترجمہ و تشریح

جلد چہارم

ترجمہ و تشریح

شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی نور اللہ مرقدہ

مکتبہ لدھیانوی

18- سلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن کراچی

021-34130020-0321-2115595-0321-2115502

فہرستِ مضامین

کتابُ الجہاد

کتابُ الشّھید

کتاب الغزوات

کتاب الفتن والملاحم

کتابُ المناقب

فضائل ومناقب کے بیان میں

کتابُ العلم

علم کی فضیلت واقسام

[حدیث:۱۱۶۷] "عَنْ أَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ مَرْفُوْعًا قَالَ: تَعَلَّمُوْا مَا شِئْتُمْ أَنْ تَعْلَمُوْا فَلَنْ یَنْفَعَکُمُ اللّٰہُ حَتّٰی تَعْمَلُوْا بِمَا تَعْلَمُوْنَ۔"

(حیاۃ الصحابہ ج:۳ ص:۲۴۷)

ترجمہ: "حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم جو سیکھنا چاہتے ہو سیکھ لو، لیکن اللہ تعالیٰ تمہیں نفع نہیں دیں گے تمہارے سیکھنے پر جب تک کہ تم اپنے سیکھے ہوئے پر عمل نہ کرلو۔"

تشریح: سیکھنے کی چیزیں تین قسم کی ہیں، جن کو آدمی سیکھتا ہے:

۱:......بعض چیزیں وہ ہیں جیسے ایران توران کی کہانیاں اور اِدھر اُدھر کے قصے، آدمی پڑھتا رہتا ہے، اس کو لایعنیہ کی مد میں شمار کرنا چاہئے، یہ سب بے فائدہ ہیں، جس آدمی نے اپنا وقت ضائع کرنا ہو وہ یہ کام کرے، افسانے اور دُوسرے قسم کے فیچر آدمی پڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے، مجھے بھی اس کی بڑی عادت رہی ہے، جو بھی چیز سامنے آگئی اس کو پڑھ لیا۔

۲:......دُوسری چیز وہ ہے جس کو آدمی پڑھتا ہے اور اس کو سمجھتا ہے کہ میرے لئے یہ مضر ہے، یہ میرے فائدے کی چیز نہیں ہے، فحش قسم کی باتیں، لایعنیہ باتیں، بے حیائی کی باتیں، ان میں تو آدمی کو مشغول ہونا ہی نہیں چاہئے۔

۳:......اب رہی تیسری چیز بظاہر مفید علم ہے، اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: تم جتنا چاہو سیکھ لو، لیکن صرف تمہارے سیکھنے پر اجر نہیں ملے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ تمہیں اجر عطا فرمائیں گے عمل کرنے پر، آدمی اچھی باتیں پڑھتا رہے، پڑھتا رہے لیکن عمل نہ کرے بے فائدہ ہے۔

[حدیث:۱۱۶۸] ”عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مَرْفُوْعًا: تَعَلَّمُوا مِنَ الْعِلْمِ مَا شِئْتُمْ فَوَاللّٰهِ! لَا تُوْجَرُوْا بِجَمِيْعِ الْعِلْمِ حَتّٰى تَعْمَلُوْا۔“

(حیاۃ الصحابہ ج:۳ ص:۲۴۸، بحوالہ جامع الصغیر)

ترجمہ: ”ابوالحسن بن اخرم المدینی نے اپنی امالی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم جتنا چاہو علم سیکھ لو، لیکن اللہ کی قسم! تمہیں تمام علم پر اجر نہیں ملے گا جب تک تم اس پر عمل نہ کرو۔“

[حدیث:۱۱۶۹] ”عَنْ مَكْحُوْلٍ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ ابْنِ غَنْمٍ قَالَ: حَدَّثَنِيْ عَشْرَةٌ مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا: كُنَّا نَتَدَارَسُ الْعِلْمَ فِيْ مَسْجِدِ قُبَاءَ إِذْ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: تَعَلَّمُوْا مِنَ الْعِلْمِ مَا شِئْتُمْ، فَوَاللّٰهِ! لَا تُوْجَرُوْا بِجَمِيْعِ الْعِلْمِ حَتّٰى تَعْمَلُوْا۔“

(حیاۃ الصحابہ ج:۳ ص:۲۴۸)

ترجمہ: ”حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے جامع بیان علم میں مکحول رحمۃ اللہ علیہ سے اور انہوں نے عبدالرحمٰن بن غنم رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے: ہم مسجد قباء میں دس آدمی تھے ایک دُوسرے سے سن رہے تھے، پڑھ پڑھا رہے تھے، اتنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: تم پڑھ لو جتنا چاہو، لیکن اگر تم عمل نہیں کروگے تو تمہیں اجر نہیں ملے گا۔“

دِین کی کسی بات کو سیکھنا اور اس کے لئے محنت کرنا یہ مستقل اجر و ثواب کا موجب ہے، اللہ تعالیٰ اس پر اجر عطا فرماتے ہیں، اس لئے کہ اگر سارے آدمی دُوسرے کام کرنے لگیں اور دِین کا علم کوئی نہ سیکھے تو پھر اُمّت کی تباہی ہے۔

اسی لئے علماء فرماتے ہیں: بستی میں کم از کم ایک عالم ایسا ہونا چاہئے جو لوگوں کو حلال و حرام بتاسکے، کسی کو پوچھنے کی ضرورت ہو تو بتاسکے، اور اگر کوئی بھی حلال و حرام بتانے والا نہیں ہے تو سارے کے سارے گناہ گار ہوں گے، اسی طرح شہر میں، محلے میں ایک عالم ایسا ہونا چاہئے جو لوگوں کو دِین کی ضروری باتیں بتاسکے کہ یہ ناجائز ہے، حرام ہے، حلال ہے، لوگ اس سے رُجوع کرسکیں، اس سے قطع نظر کہ لوگ اس سے رُجوع کرتے ہیں یا نہیں کرتے؟ لیکن عالم موجود ہونا چاہئے جو دِین کی باتیں بتاسکے اور لوگوں کی راہ نمائی کرسکے، اور اگر کوئی بھی عالم وہاں نہیں ہے تو سارے کے سارے شہر والے گناہگار ہوں گے۔

حصولِ علم فرض ہے

توعلم کا حاصل کرنا یہ ایک مستقل فرض ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کا اجر وثواب بھی ملے گا، لیکن علم سے مقصود عمل کرنا ہے۔ اگر آدمی سیکھتا جائے، پڑھتا جائے لیکن عمل نہ کرے تو گناہگار ہوگا، لیکن جب اللہ تعالیٰ کا علم پڑھنے لگے تو اللہ تعالیٰ عمل کی بھی توفیق عطا فرما دیتے ہیں۔

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ عمل تو ہم نے کرنا ہی نہیں، لہٰذا دین کی بات کیوں سیکھیں؟ جبکہ اس پر عمل نہیں کرنا۔ یہ غلط فہمی ہے اور شیطان کا مغالطہ ہے۔ میرے بھائی! علم حاصل کرلو، مسئلہ معلوم کرلو اور اپنے پاس محفوظ رکھو، مسئلہ معلوم کرلو عمل نہ کرو، لیکن ایک وقت آئے گا کہ تمہارا علم خود تمہیں عمل کرنے پر مجبور کرے گا۔

علم، عمل پر مجبور کرتا ہے

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرمایا کرتے تھے:

"تَعَلَّمْنَا الْعِلْمَ لِغَيْرِ اللهِ، وَيَأْبِى أَنْ يَكُوْنَ اِلَّا لِلّٰهِ۔"

ترجمہ: "ہم نے جو علم حاصل کیا تھا غیر اللہ کے لئے، بڑے بننے کے لئے، عزت کرانے کے لئے، وہ کرنے کے لئے، لیکن علم نے انکار کردیا کہ میں تو اللہ کے لئے ہوں گا اور کسی کے لئے نہیں ہوں گا۔"

اس لئے دین کی بات صحیح معلوم کرلو اور چاہے فیصلہ کرلو کہ ہمیں اس پر عمل نہیں کرنا، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمہیں توفیق عطا فرمائیں گے اور جو تمہارا علم محفوظ ہے اور جو تم نے سن رکھا ہے، وہ ان شاء اللہ کسی وقت عمل کی بھی توفیق عطا فرما دے گا اور اس وقت تمہیں افسوس ہوگا کہ اس وقت کیوں نہ اس پر عمل کیا؟ اس لئے شیطان اگر ورغلاتا ہے اور دھوکا دیتا ہے کہ علم پر عمل تو کرنا نہیں ہے، اس کو پڑھنے سے کیا فائدہ؟ سیکھنے سے کیا فائدہ؟ وعظ سننے سے کیا فائدہ؟ تو یہ شیطان کا دھوکا ہے، تم اللہ کے لئے، اللہ کی رضا کے لئے علم حاصل کرو، لوگوں کو دکھانے کے لئے نہیں، ان شاء اللہ! اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

[حدیث: ۱۱۷۰] "عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! مَا يَنْفِيْ عَنِّيْ حُجَّةَ الْجَهْلِ؟ قَالَ: اَلْعِلْمُ! قَالَ: فَمَا يَنْفِيْ عَنِّيْ حُجَّةَ الْعِلْمِ؟ قَالَ: اَلْعَمَلُ!"
(کنز العمال ج:۱۰ ص:۲۵۴ حدیث: ۲۹۳۶۱)

ترجمہ: "حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی نے کہا: یا رسول اللہ! میرے اندر جہل پایا جاتا ہے اور یہ گویا اللہ کی حجت ہے میرے اُوپر کہ تم نے کیوں

نہیں سیکھا تو میری اس حجت کو جو میرے ذمے لازم ہوگئی اس کو کون سی چیز ہٹا سکتی ہے؟
آپ ﷺ نے فرمایا: علم! ...... یعنی علم حاصل کرلو گے تو جہل کی حجت، کہ کیوں نہیں سیکھا، نہیں رہے گی...... اس شخص نے پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! علم تو میں نے سیکھ لیا، اب علم کی حجت کو کون مجھ سے ہٹا سکتا ہے؟ فرمایا: عمل!''

گویا دو مرحلے ہوگئے، ایک ہے دِین کا سیکھنا، اور دُوسرا ہے دِین کی بات پر عمل کرنا۔ اگر کسی نے دِین کی بات کو سیکھا ہی نہیں تو اس پر اس کا جہل، اس کے خلاف حجت ہے، قیامت کے دن اس سے پوچھا جائے گا کہ تو نے دِین کی بات کو کیوں نہیں سیکھا؟ کیا تجھے بتانے والے نہیں آئے تھے؟ کیا تو سیکھ نہیں سکتا تھا؟ قیامت کے دن آپ یہ حجت نہیں کرسکیں گے کہ یا اللہ! مجھے کوئی بتانے والا ہی نہیں تھا، بتانے والے تو اللہ تعالیٰ نے بہت پیدا کردیئے۔

اور جب علم حاصل کرلیا تو اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ اس علم پر کتنا عمل کیا؟ ایک مستقل حجت ہوگی، اللہ تعالیٰ ہمیں علم کی توفیق عطا فرمائے یعنی دِین کا مسئلہ صحیح سیکھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور جب دِین کا مسئلہ سیکھ لیا تو اللہ تعالیٰ اس پر عمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائیں گے۔

[حدیث: ۱۱۷۱] ''عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: تَعَلَّمُوْا کِتَابَ اللہِ تَعْرِفُوْا بِہٖ! وَاعْمَلُوْا بِہٖ تَکُوْنُوْا مِنْ أَھْلِہٖ۔'' (کنز العمال ج:۱۰ ص:۲۵۴ حدیث:۲۹۳۶۰)

ترجمہ: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ: اللہ تعالیٰ کی کتاب کو سیکھو! تم اس کے ذریعے سے پہچانے جاؤ گے، معلوم ہوجائے گا کہ فلاں عالم ہے، فلانے شخص کو کتاب آتی ہے، فلانا قاری صاحب ہے، لیکن صرف کتاب کے سیکھنے سے کام نہیں چلے گا، بلکہ اس پر عمل کرو تب تم اہلِ علم میں سے ہوگے، یعنی تب تم کہلاؤ گے کہ یہ صاحبِ علم و کتاب ہے، یعنی اگر تم اس علم پر عمل کروگے، تو صاحبِ علم کہلاؤ گے، اگر عمل نہ کیا اور صرف سیکھ لیا تو پڑھ کے پتھر ہوگئے۔''

[حدیث: ۱۱۷۲] ''عَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ تُعْرَفُوْا بِہٖ! وَاعْمَلُوْا بِہٖ تَکُوْنُوْا مِنْ أَھْلِہٖ، فَاِنَّہٗ سَیَأْتِیْ مِنْ بَعْدِکُمْ زَمَانٌ یُنْکَرُ فِیْہِ الْحَقُّ تِسْعَۃَ أَعْشَارِہٖ وَاِنَّہٗ لَا یَنْجُوْ فِیْہِ اِلَّا کُلُّ نَوْمَۃٍ مُنْبَتٍ اِنَّمَا اُولٰئِکَ أَئِمَّۃُ الْھُدٰی وَمَصَابِیْحُ الْعِلْمِ لَیْسُوْا بِالْعُجُلِ الْمَذَایِیْعِ الْبُذُرِ۔''

(کنز العمال ج:۱۰ ص:۲۵۶ حدیث:۲۹۳۶۵)

سیّدنا علی کرّم اللہ وجہہ سے روایت ہے وہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ علم سیکھو، تم اس کے ذریعے

پہچانے جاؤ گے، عالم میں اور غیر عالم میں کیا فرق ہے؟ ایک آدمی نے علم سیکھ لیا ہے اور وہ علم کو اچھی طرح سمجھتا ہے، اور دُوسرے نے علم نہیں سیکھا دونوں کے درمیان امتیاز کیا ہے؟ پھر فرماتے ہیں کہ علم حاصل کرنے کے بعد اس پر عمل بھی کرو، علم پر عمل کرو گے تو تم اس کے اہل میں سے ہو گے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے تھے: اب تو ماشاء اللہ سیکھنے والے بھی موجود ہیں، سکھانے والے بھی موجود ہیں، لوگوں میں دِین کا علم سیکھنے کا سکھانے کا، قرآنِ کریم پڑھنے کا، حدیث شریف پڑھنے کا چرچا ہے، کہتے ہیں تین درس گاہیں تھیں، ایک مکہ مکرمہ میں اور ایک مدینہ طیبہ میں اور ایک کوفہ میں۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کوفہ چلے گئے تھے تو فرمایا کہ: آج تو تم پڑھ سکتے ہو، لیکن ایک وقت آئے گا جس میں حق کا انکار کردیا جائے گا، دِین کے دس حصوں میں سے ایک حصہ باقی رہے گا، نو حصے ختم کردیئے جائیں گے۔ ذرا اندازہ فرمایئے! اپنے محلے کی، اپنے شہر کی مردم شماری کرکے دیکھئے! کتنے آدمی یہاں رہتے ہیں، اور ان میں سے جو دِین کی شدبد رکھتے ہیں وہ کتنے ہیں؟ اور ان میں سے جو دِین کو پورے طور پر سمجھنے والے ہیں، وہ کتنے ہیں؟ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ فرماتے ہیں ایک وقت آئے گا کہ دِین کے نو حصوں کا انکار کردیا جائے گا، صرف ایک حصہ باقی رہے گا، اب مجموعی حالات کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے، یہ چند آدمی جو مسجد میں بیٹھے ہیں ان سے دھوکا نہ کھاؤ، یا تبلیغ میں چند آدمی چلے جاتے ہیں اس سے دھوکا نہ کھاؤ، مسجد کا اور بازار کا مقابلہ کرو اور دِین داروں کا بے دِینوں کے ساتھ مقابلہ کرو، تو پھر معلوم ہوگا کہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے صحیح فرمایا تھا کہ ایک حصہ باقی رہے گا، نو حصوں کا انکار کردیا جائے گا، اور انکار بھی پوری طرح کا انکار۔ علمائے کرام، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، لوگ ان کو کیا کیا کہتے ہیں؟ مجھے معلوم ہے، ہم لوگ تو منبر پر بیٹھ کر یا جو بھی دِین کا مسئلہ صحیح بتائے، تم اس کے دُشمن ہوجاتے ہو، تم اس کو مُلاَّ کہتے ہو، اور اس کیفیت کو مُلاَّئیت کہتے ہو، نعوذ باللہ! استغفر اللہ! تو حضرت علی کرّم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے کہ دِین کا ایک حصہ چھوڑ کر باقی نو حصوں کا انکار کردیا جائے گا اور اس میں صرف وہی شخص نجات پائے گا جو بے چارہ گم نام ہو اور الگ تھلگ رہتا ہو، اور لوگوں کی باتیں ہی نہ سنے، فرمایا: یہ لوگ ائمہ ہدیٰ ہیں، مصابیح علم ہیں، ہدایت کے اِمام ہیں، ہدایت کے چراغ ہیں، اور علم کے چراغ ہیں اور جلد بازی کرنے والے نہیں بلکہ دِین کو سمجھ کے اس پر عمل کرنے والے ہیں۔

مبارک ہیں وہ لوگ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دِین کو صحیح سمجھیں اور حتی الامکان جہاں تک ممکن ہو، لوگوں کو پہنچانے کی کوشش کریں، بہت سے لوگ اپنی خواہشات کے لئے دِین کو بگاڑ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ان میں سے نہ بنائے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے، وہ مدارس میں ...... جہاں حدیث کے درس ہوتے تھے...... جاتے تھے، یہ اللہ والے اور بزرگ تھے اور مدارس میں جاکر کہا کرتے تھے: میاں! اپنے علم

کی زکوٰۃ ادا کیا کرو! یعنی سو میں سے ایک بات پر عمل کرلیا کرو۔ لیکن اب تو لوگ اس کا مذاق اُڑاتے ہیں ......لا اِلٰہ اِلَّا اللہ!

رسول اللہ ﷺ جنگِ اُحد میں تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: کون ہے جو ان کافروں کو ہٹائے؟ چند صحابہ آگے بڑھے، ان کا مقابلہ کرتے رہے اور ان کو رسول اللہ ﷺ تک نہیں آنے دیا، یہاں تک کہ وہ شہید ہوگئے، پھر اور بڑھے یہاں تک کہ وہ بھی شہید ہوگئے، ان کی سعادت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے شہید ہوگئے، اور آنحضرت ﷺ کو آنچ نہیں آنے دی۔

میں دوستوں کو کہا کرتا ہوں کہ تم مُلّاؤں کو جو کچھ کہتے ہو، بہت بڑی خوشی کی بات ہے، واللہ! یہ مُلّا تمہارے سامنے حضور ﷺ کے لئے ڈھال بن گیا ہے، جس کی وجہ سے تم حضور ﷺ کو کچھ نہیں کہہ سکتے، اور مُلّاؤں کو کہتے ہو کہ وہ ایسا کرتے ہیں، وہ ایسا کرتے ہیں، حالانکہ تم رسول اللہ ﷺ کو کہنا چاہتے ہو، لیکن بات نکلتی ہے مُلّا کے خلاف، میرے اللہ کا شکر ہے کہ تم مُلّا کو کچھ کہتے ہو، اور حضور ﷺ کو کچھ نہیں کہتے، الحمدللہ! مجھے اس پر بہت خوشی ہے کہ ہم کل قیامت کے دن آنحضرت ﷺ کی جنابِ عالی میں عرض کریں گے: آپ کی خاطر ہمیں یہ، یہ کہا گیا تھا، جس طرح ان صحابہ رضی اللہ عنہم کو حضور ﷺ کی خاطر شہید کیا گیا، آج تم مسلمان کہلانے والے بھی مُلّاؤں پر اپنا غصہ نکال رہے ہو، حالانکہ مُلّاؤں کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ دِین کا صحیح مسئلہ بتاتے ہیں۔

[حدیث: ۱۱۷۳] "عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: يَا حَمَلَةَ الْعِلْمِ! اِعْمَلُوْا بِهٖ! فَاِنَّمَا الْعَالِمُ مَنْ عَلِمَ ثُمَّ عَمِلَ وَوَافَقَ عِلْمُهٗ عَمَلَهٗ، وَسَيَكُوْنُ أَقْوَامٌ يَحْمِلُوْنَ الْعِلْمَ لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ، يُخَالِفُ سَرِيْرَتُهُمْ عَلَانِيَتَهُمْ وَيُخَالِفُ عَمَلُهُمْ عِلْمَهُمْ، يَجْلِسُوْنَ حِلَقًا فَيُبَاهِيْ بَعْضُهُمْ بَعْضًا حَتّٰى اِنَّ أَحَدَهُمْ لَيَغْضَبُ عَلٰى جَلِيْسِهٖ حِيْنَ يَجْلِسُ اِلٰى غَيْرِهٖ وَيَدَعُهٗ أُولٰٓئِكَ لَا تَصْعَدُ أَعْمَالُهُمْ فِيْ مَجَالِسِهِمْ تِلْكَ اِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ۔" (کنز العمال ج:۱۰ ص:۲۷۲ حدیث:۲۹۴۱۹)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے: اے حاملینِ علم! اپنے علم پر عمل کرو، اس لئے کہ عالم تو وہی ہوتا ہے جو سیکھے اور پھر عمل کرے، اور پھر اس کا عمل، علم کے موافق ہو۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ آخر زمانے میں کچھ لوگ ایسے آئیں گے...... حضرت کے زمانے میں تو نہیں تھے بعد میں آئیں گے...... علم ان کی ہنسلی سے نیچے نہیں اُترے گا، ان کا ظاہر کچھ اور ہوگا، باطن کچھ اور ہوگا، ظاہر میں تو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوں گے، اور باطن میں اللہ کا خوف نہیں ہوگا، ظاہر اور باطن کے درمیان اختلاف ہوگا، اور ان کا عمل ان کے علم کے خلاف ہوگا، حلقے بناکر بیٹھیں گے، فخر کریں گے کہ آج ہم نے یہ تیر مارا ہے، آج ہم نے وہ کام کیا ہے، اور اگر ان کے

حلقے کا آدمی دُوسری جگہ چلا جائے گا تو ان سے ناراض ہوجائیں گے کہ یہ ہمیں چھوڑ کر فلاں جگہ چلا گیا ہے۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ فرماتے تھے کہ: یہ وہ لوگ ہوں گے کہ ان کے اعمال ان کی مجلسوں میں سے اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچ پاتے۔

تین چیزیں

علم حاصل کرو، لیکن علم کے ساتھ بھائی! عمل بھی کرو۔

یہاں تین چیزیں ہیں: ۱: علم ہے، ۲: عمل ہے، ۳: اِخلاص ہے۔

علم یہ پہلی سیڑھی اور پہلا زینہ ہے، اگر ہم نے علم ہی حاصل نہیں کیا، عمل کاہے پر کریں گے؟ اللہ کا شکر کرو کہ ہمارے پاس علم حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں وقت اور فرصت بھی عطا فرمائی ہے، جبکہ ایک وقت آنے والا ہے کہ جب ہماری روانگی ہوجائے گی اور اس وقت کہیں گے:

﴿رَبِّ لَوْلَآ أَخَّرْتَنِيْٓ إِلٰٓى أَجَلٍ قَرِيْبٍ، فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾

ترجمہ: ''یا اللہ! تھوڑی سی مہلت مجھے اور دے دیتے، میں تصدیق کرتا اور نیک لوگوں میں سے ہوجاتا۔''

وہ وقت مجھ پر بھی آنے والا ہے، آپ پر بھی آنے والا ہے، اور سفید بالوں کے بعد تو اب اسی کا انتظار ہے، کالے بال تو اب آنے سے رہے، اب تو اس کا انتظار ہے، لہٰذا مرنے سے پہلے علم حاصل کرلو۔

علم حاصل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس پر عمل کرنے کی توفیق مانگو، کبھی تو عمل کرلو گے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں یوں کہہ سکو گے: یا اللہ! تیری یہ بات سنی تھی تیرے محبوب ﷺ کی یہ بات سنی تھی اور میں نے اس پر عمل کرلیا تھا۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ اِخلاص ہو، خالص اللہ کی رضا کے لئے عمل کرو، اخلاص کے یہ معنی ہیں کہ مخلوق کو دِکھانے کے لئے نہیں، ذرا سوچو کہ مخلوق کو دِکھا کے کریں گے تو ہمیں کیا ملے گا؟ تم سارے مل جاؤ تو مجھے کیا دے دوگے؟ کچھ بھی نہیں ملے گا مجھے! تمہیں دِکھانے سے کچھ بھی نہیں ملے گا، اور اللہ کو دِکھانے سے سب کچھ مل جائے گا۔ اس لئے علم، عمل، اور تیسرے اِخلاص، خالص اللہ کے لئے کام کروگے تو پھر ان شاء اللہ تعالیٰ! کام چل جائے گا، چاہے علم میں کھوٹ تھا، یا عمل میں کھوٹ تھا یا اِخلاص نہیں تھا، اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ ہم سب لوگوں کو اِخلاص نصیب فرمائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے:

''يَآ أَيُّهَا النَّاسُ! تَعَلَّمُوْا فَمَنْ عَلِمَ فَلْيَعْمَلْ''

(مجمع الزوائد ج:۱ ص:۱۶۴)

ترجمہ: ''لوگو! علم حاصل کرو، اور جس شخص نے ایک بات کا علم حاصل کرلیا وہ اس پر عمل کرے۔''

[حدیث:۱۱۷۴] ''عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُکَیْمٍ قَالَ: سَمِعْتُ اِبْنَ مَسْعُوْدٍ فِیْ ھٰذَا الْمَسْجِدِ یَبْدَأُ بِالْیَمِیْنِ قَبْلَ الْکَلَامِ فَقَالَ: مَا مِنْکُمْ مِنْ أَحَدٍ اِلَّا أَنَّ رَبَّہٗ تَعَالٰی سَیَخْلُوْ بِہٖ کَمَا یَخْلُوْ اَحَدُکُمْ بِالْقَمَرِ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ، فَیَقُوْلُ: یَا ابْنَ اٰدَمَ! مَا غَرَّکَ بِیْ؟ اِبْنَ اٰدَمَ! مَاذَا أَجَبْتَ الْمُرْسَلِیْنَ؟ اِبْنَ اٰدَمَ! مَاذَا عَمِلْتَ فِیْمَا عَلِمْتَ۔''

(حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۱۳۱)

ترجمہ: ''عبداللہ بن عکیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کوفہ کی اس مسجد میں سنا، اور وہ بات کرنے سے پہلے قسم کھاتے تھے، یعنی قسم کھا کر بات کرتے تھے تاکہ تم لوگ اس پر یقین رکھ سکو، بعضے لوگ تو قسم کے بغیر اللہ کی بات پر بھی اعتبار نہیں کرتے اور فرماتے تھے کہ تم میں سے ایک ایک آدمی اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں پیش ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تنہائی میں بات کرے گا، جس طرح کہ چودھویں رات کے چاند کو ہر آدمی الگ الگ دیکھتا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے آدم کے بیٹے! تجھ کو کس چیز نے میرے بارے میں دھوکے میں ڈالا؟ اے ابن آدم! تو نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا؟ اے ابن آدم! تو نے جو سیکھا تھا، کیا اس پر عمل کیا تھا؟''

تفسیر نسفی میں نقل کیا ہے کہ ایک بزرگ کے پاس ایک دیہاتی قسم کے آدمی آئے اور آکر کہنے لگے: مجھے بھی قرآن مجید کا کچھ علم سکھاؤ! انہوں نے ایک آیت سکھادی، کہنے لگے: بس بہت کافی ہوگیا۔ دیہاتی بڑے سادے ہوتے ہیں، علم عمل کے لئے کرنا ہے نا تو بس یہی آیت کافی ہے، ایک سال کے بعد پھر آئے، اور پھر فرمانے لگے کہ: وہ جو میں نے ایک سال پہلے ایک آیت سیکھی تھی اس پر عمل کرلیا ہے، اب مجھے اگلا سبق سنائیے! اگلا سبق تھا:

﴿فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ اِنَّہٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ أَنَّکُمْ تَنْطِقُوْنَ﴾

ترجمہ: ''قسم ہے آسمان اور زمین کے ربّ کی! کہ یہ بات برحق ہے جو کہہ رہے ہیں ہم، جیسے کہ تم آپس میں ایک دُوسرے سے باتیں کرتے ہو۔''

کم از کم اتنی بات کا تو یقین کرلو! چنانچہ جب وہ بزرگ یہ پڑھا رہے تھے تو دیہاتی کہنے لگا کہ: یہ اللہ کا کلام ہے؟ کہنے لگے: ہاں اللہ کا کلام ہے! تو کہنے لگا: ایسا کون آدمی تھا جس کو میرے ربّ کی بات پر

اعتماد نہیں ہوا؟ یقین نہیں آیا اور میرے رَبّ کو قسم کھا کر بات کہنی پڑی؟ ''فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ'' کہنا پڑا، یہ بات کہی اور نعرہ مار کر مر گیا، کیونکہ اس کے دِل پر علم نے اثر کیا تھا۔ اور یہودی اور منافق کہا کرتے کہ ہمارے دِل پردوں میں ہیں، آپ کا کلام اثر نہیں کرتا۔

ہمارے دِل بھی پردوں میں ہیں اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کی باتیں سن لیتے ہیں لیکن اس طرح جھاڑ کر چلے جاتے ہیں جس طرح کہ کوئی اجنبی چیز لگ جاتی ہے۔ جیسے اس کو آدمی جھٹک دیتا ہے اور وہ صاف ہوجاتی ہے، ہمارے دِل پر رسول اللہ ﷺ کی کوئی بات اثر نہیں کرتی، دِل میں رچتی بستی نہیں، لا اِلٰہ اِلَّا اللہ!

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی عادت شریفہ تھی کہ جو وعظ فرماتے تھے وہ قسم کھاتے تھے تاکہ لوگوں کو ان کی بات کا یقین آجائے اور قسم کھا کر فرماتے تھے: تم میں سے ایک ایک آدمی اللہ رَبُّ العزّت کی بارگاہ میں پیش ہوگا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تنہائی میں بات کرے گا، جس طرح کہ چودھویں رات کے چاند کو ہر آدمی الگ الگ دیکھتا ہے، کوئی اس کے درمیان اور چاند کے درمیان حائل نہیں ہوتا، تم میں سے ہر ایک آدمی بھی ایسے ہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوگا اور ہر ایک آدمی اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوگا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی مجھ سے ہم کلام ہو تو تمہارے ساتھ ہم کلام ہونے سے مانع نہیں، تم سے بھی ہم کلام ہو، فلانے سے بھی ہم کلام ہو، فلانے سے بھی ہم کلام ہو، تمام اہلِ محشر سے بیک وقت ہم کلام ہوں، ان کو کوئی فرق نہیں پڑے گا، ہم تو ایسے ہیں کہ اگر ایک بات کرنے لگے، کہیں گے ٹھہر جاؤ بھئی دُوسرے آدمی کو بات کرنے دو، مگر وہاں ایسا نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ بیک وقت ساری دُنیا کے انسانوں سے بات کریں گے اور ایک کا کلام دُوسرے کے کلام سے مانع نہیں ہوگا، بات خلط ملط نہیں ہوگی، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کی مثال یوں دی کہ جیسے چودھویں کا چاند چمک رہا ہو، ہر ایک آدمی اس کو دیکھتا ہے۔

ہمارے ایک بزرگ حضرت قاری رحیم بخش رحمۃ اللہ علیہ تھے، میں نے ان کو دیکھا ہے، ان کی خدمت میں بیٹھا ہوں، ان کے پاس طالبِ علم پڑھا کرتے تھے، پورا کمرہ بھرا ہوا ہوتا تھا، اور طالب علم ایک دُوسرے کے پیچھے بیٹھتے تھے، جگہ تنگ ہوتی تھی، پڑھنے والے زیادہ ہوتے تھے اور وہ اپنا اپنا پڑھ رہے ہوتے، حضرت قاری صاحب ایک آدمی کا نام لے کر کہتے کہ تو نہیں پڑھ رہا، حالانکہ دس آدمی آپ کے اِردگرد لائن بنا کر سنانے کے لئے بیٹھے ہوتے تھے، اسی طرح دُوسرے طالب علم بھی پڑھ رہے ہوتے تھے، جو دس آدمی سنانے کے لئے حاضر ہوتے تھے ان میں سے ہر ایک آدمی کی غلطی پر آپ ٹوکتے تھے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے بندوں کا حال ہے، اللہ تعالیٰ کی کیا بات ہے؟ یہ بات ہمارے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی، ہم اپنے ذہن سے اُوپر سوچ ہی نہیں سکتے۔

رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمایا کرتے تھے: اندھیری رات میں اگر چھوٹی سی چیونٹی چلتی ہے، تو اس

کے چلنے کی آواز بھی اللہ تعالیٰ سنتے ہیں۔اور یہ تو اللہ تعالیٰ کے سننے کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کے پالنے کی بات یہ ہے کہ ایک پتھر لے لو اس کو توڑ لو، سات ٹکڑے اس کے ہوئے ہیں، سات تہیں اور ساتویں تہہ کے اندر ایک کیڑا نکلا جس کے منہ میں ہرا پتا ہے، "فَتَبَارَكَ اللهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ" بابرکت ہے وہ ذات جو بہترین پیدا کرنے والی ہے۔اور جو سب سے عمدہ رزق دینے والا ہے، وہ ان کو بھی نہیں بھولتے۔

تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ: ایک وقت آئے گا کہ تم میں سے ایک ایک آدمی اللہ تعالیٰ سے اس طرح ہم کلام ہوگا اور اس کو اس طرح دیکھے گا جس طرح کہ ایک کا دیکھنا دُوسرے کے دیکھنے سے مانع نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے آدم کے بیٹے! تجھ کو کس چیز نے میرے بارے میں دھوکے میں ڈالا؟ قرآنِ کریم میں ہے:

﴿يَأَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ﴾ (الانفطار:٦)

ترجمہ: "اے انسان! تیرے کریم رَبّ کے معاملے میں تجھے کس چیز نے دھوکے میں ڈالا؟"

ایک بزرگ اس آیت کو پڑھا کرتے تھے تو کہا کرتے تھے: "یا رَبّ غرنی حلمک وکرمک!" آپ کے حلم نے اور آپ کے کرم نے ہمیں دھوکے میں ڈالا۔

اے ابنِ آدم! تو نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا؟ اے ابنِ آدم! تو نے جو سیکھا تھا اس پر کتنا عمل کیا تھا؟

آج ایک فہرست بنالو ایک دن کی کہ ہم نے آج کے دن کتنی چیزیں سیکھیں اور کتنی سیکھی ہوئی چیزوں پر ہم نے عمل کیا؟ باقی عمر کا اندازہ بعد میں ہوجائے گا، ایک دن کے علم کا اور عمل کا موازنہ کرنا اور اس کے بعد پھر دُوسری زندگی کو قیاس کرلو، یہ کمپیوٹر کا دور آگیا ہے، اب تو یہ چھوٹا سا کمپیوٹر ہوتا ہے دُنیا کی سب چیزیں بھردی جاتی ہیں، عقل حیران ہے کہ ساری چیزیں اس میں کیسے سما جاتی ہیں؟ اور بٹن دباؤ تو ساری چیزوں کی تفصیل بتادے گا، ہمارے چھوٹے سے دِماغ نے اس کمپیوٹر کو بنایا ہے، تو جس اللہ نے اس دِماغ کو بنایا ہے، اس کی قوت وقدرت کا کیا حال ہوگا؟ تو جس اللہ تعالیٰ نے اس کمپیوٹر کو بنایا ہے، ساری دُنیا کی معلومات اس کے پاس محفوظ ہیں، بس بٹن دبانے کی ضرورت ہے، سب کچھ سامنے آجائے گا۔ میرے بھائی! یہ دیکھیں کہ ہمارے کمپیوٹر میں کتنی معلومات ہیں؟ اور ہم نے ان معلومات میں سے کتنی باتوں پر عمل کیا ہے؟

جدید تعلیم اور اس کے نتائج

[حدیث:۱۱۷۵] ''عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللہُ عَنْهُ قَالَ: كُونُوا أَوْعِيَةَ الْكِتَابِ يَنَابِيعَ الْعِلْمِ وَسَلُوا اللہَ رِزْقَ يَوْمٍ بِيَوْمٍ۔'' (حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۵۱)

ترجمہ: ''ابونعیم نے حلیہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: کتاب اللہ کے برتن بنو اور علم کے چشمے بنو، اور اللہ تعالیٰ سے رزق مانگو ایک ایک دن کا۔''

[حدیث:۱۱۷۶] ''وَأَخْرَجَ أَيْضًا عَنْهُ قَالَ: جَالِسُوا التَّوَّابِينَ فَإِنَّهُ أَرَقُّ شَيْءٍ أَفْئِدَةً۔'' (حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۵۱)

ترجمہ: ''اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے: توبہ کرنے والوں کے پاس بیٹھا کرو، اس لئے کہ وہ لوگ سب سے زیادہ نرم دِل ہوتے ہیں۔''

[حدیث:۱۱۷۷] ''عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللہُ عَنْهُ قَالَ: مَنْ خَافَ اللہَ لَمْ يُشْفَ غَيْظُهُ وَمَنْ يَتَّقِ اللہَ لَمْ يَصْنَعْ مَا يُرِيدُ وَلَوْ لَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَكَانَ غَيْرُ مَا تَرَوْنَ۔''

(کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۳۷۵)

ترجمہ: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو، وہ اپنے غصّے کو ٹھنڈا نہیں کرتا، اور جو اللہ سے خوف رکھتا ہو وہ اپنے غصّے کو ٹھنڈا نہیں کرتا، اور جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو وہ جو کچھ چاہتا ہے وہ نہیں کرتا، اور اگر قیامت کا دن نہ ہوتا تو جو کچھ تم دیکھ رہے ہو اس کے سوا کچھ اور دیکھتے۔''

تشریح: یہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مواعظ ہیں۔ پہلی روایت میں دو چیزوں کی نصیحت فرمائی ہے:

۱: ایک یہ کہ کتاب اللہ کے برتن اور علم کے چشمے بنو۔ جس طرح کسی برتن میں کوئی چیز محفوظ ہوتی ہے، ایسے ہی تمہارے قلب میں اللہ تعالیٰ کی کتاب محفوظ ہو، کتاب اللہ کو اپنے قلب میں محفوظ کرو، اور علم کے چشمے بنو، جس طرح چشمے سے پانی پھوٹتا ہے اسی طرح تمہارے دِل سے جب بھی کچھ پھوٹے تو علم کی بات ہی پھوٹے، تمہاری زبان سے علم کی بات ہی نکلے۔

علم دو قسم کے ہوتے ہیں:

۱: ایک دُنیا کا علم ہوتا ہے، ۲: ایک آخرت کا علم ہوتا ہے۔

دُنیا کے کاموں کی طرف راہ نمائی کرنے والا علم، دُنیا کا علم کہلاتا ہے، اس علم کے ذریعے ہم اپنے

کھانے کمانے کے طریقے معلوم کرتے ہیں، مثلاً: تجارت کا علم ہے، صنعت کا علم ہے، دُکان داری کا علم ہے، یعنی زراعت، حرفت، صنعت اور تجارت کا علم، گویا دُنیا کی معیشت کے یہ چار ذرائع بیان کئے گئے ہیں۔

الف:...... سب سے پہلا ذریعہ زراعت ہے، زراعت یعنی زمین سے پیداوار اُگانا۔

ب:...... دُوسرا ذریعہ حرفت ہے، یعنی دست کاری، اپنے ہاتھوں سے محنت کر کے چیزیں ایجاد کرنا۔

ج:...... تیسرا ذریعہ صنعت ہے، بڑی بڑی چیزیں جو ایجاد کی جاتی ہیں اور جن چیزوں کے بنانے کے لئے آلات اور مشینوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس کو صنعت کہتے ہیں۔

د:...... چوتھا ذریعہ تجارت ہے، اور تجارت کا مطلب ہے چیزوں کا تبادلہ کرنا۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے دُنیا کی ساری چیزیں ایک آدمی کو نہیں دیں، کسی کو کوئی چیز دی ہے، کسی کو کوئی چیز دی ہے، کسی علاقے میں کوئی ایک چیز ہوتی ہے، دُوسری چیز وہاں نہیں ہوتی تو اس کی ضرورت اس علاقے والوں کو پیش آتی ہے، دُوسرے علاقے میں دُوسری چیز فراوانی سے ہوتی ہے تو پہلی چیز وہاں نہیں ہوتی، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو تجارت کا اِلہام فرمایا، یعنی جن جن ملکوں میں یا جن جن علاقوں میں جن جن چیزوں کی ضرورت ہے وہاں ان چیزوں کو لے جایا کریں، اور وہاں سے ایسی چیزیں منگوائیں جن کی ان علاقوں کو ضرورت ہے، اور اس کے لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے بر و بحر کے سفر کی بھی ہدایت فرمادی، تجارتی سفر ہوتے ہیں خشکی کے راستوں سے بھی اور دریا کے راستے سے بھی، اور یہ اَسفار قدیم زمانے سے چلے آرہے ہیں، جیسے جیسے زمانے میں ترقی ہو رہی ہے ویسے ہی ان ذرائع مواصلات میں بھی ترقی ہو رہی ہے، پہلے لوگ بیلوں پر، اُونٹوں پر اور گھوڑوں پر سفر کرتے تھے، اب لوگ ہوائی جہازوں پر سفر کرنے لگے۔

بہرکیف! تجارت معیشت کا ایک بنیادی پتھر ہے، اور معیشت کا ایک ذریعہ ملازمت بھی ہے، یہ پانچواں ذریعہ ہے، لیکن اِس کو مستقل طور پر ذریعہ نہیں سمجھا جاتا، یہ تو ایسے وقتی سی چیز ہے، پیداوار اور معیشت کے ذرائع یہ چار ہیں۔

زراعت: یہ ہے کہ کسان زمین کے جگر کو چیر کر اور اس پر اپنی محنت کی پونجی لگا کر اس کو اُگانے کے قابل بناتا ہے، گویا ایک چیز جو موجود نہیں تھی اس کو وجود میں لاتا ہے، اور یہ زراعت سب سے بنیادی چیز ہے، اس لئے کہ زمین اگر اپنی پیداوار ہی پیدا نہ کرے تو تم کہاں سے کھاؤ گے اور پیو گے؟ کیا تمہاری حرفتیں، تمہاری صنعتیں اور تمہاری تجارتیں سب ٹھپ نہیں ہوجائیں گی؟

یہ زراعت کا پیشہ ہمارے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام کو دیا گیا تھا، جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اُتارا گیا تو ان کو زراعت کا طریقہ سکھایا گیا، یعنی اس طرح وہ کاشت کریں، اس طرح بیج ڈالیں، کیونکہ زراعت کا طریقہ تو وہ جانتے نہیں تھے کہ کیسے کریں؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے ان کو طریقہ سکھایا، پھر حق

تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے ان کو اِلقا ہوتے رہے، اِلہام ہوتے رہے کہ یہ یہ طریقہ اختیار کریں، ظاہر بات ہے کہ نقل وحمل کے لئے بھی ضرورت پیش آتی ہوگی، اور وہ اکیلا آدمی کیا کرسکتا تھا، اس کو بھی کتنا کھانا تھا، بعد میں ان کی اولاد بڑھتی گئی، تو یہ زراعت کا پیشہ بھی ترقی کرتا گیا۔

غرضیکہ زراعت کا پیشہ انسان کی معیشت میں سب سے پہلا اور بنیادی پتھر ہے، اور یہ جو کسان ہیں، محنت کرنے والے لوگ ہیں، جو زمین جوتتے ہیں، بیج ڈالتے ہیں، زمین پر محنت کرتے ہیں، یہ سب حضرت آدم علیہ السلام کے خلیفہ ہیں، ان کے جانشین ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زراعت اور شجرکاری کی بہت ہی فضیلتیں بیان فرمائی ہیں، یوں فرمایا ہے:

> ''کوئی شخص کھیتی کرے یا درخت لگادے، تو جب تک وہ کھیتی یا درخت قائم رہے اس سے کوئی پرندہ، کوئی جنگل کا جانور یا کوئی انسان کھائے گا، اس کسان کے لئے صدقہ لکھا جائے گا۔''

کھیتی اور پھلوں کو چڑیاں کھاتی ہیں، یا اُڑنے والے جانور کھاتے ہیں، کبھی جنگل کے جانور آ کر کھا جاتے ہیں، کبھی کوئی انسان بھی کھالیتا ہے، اس غلے یا پیداوار کے گھر آنے سے پہلے پہلے جتنے حیوان یا انسان کھائیں گے وہ سارے کا سارا اس کے حق میں صدقہ لکھا جاتا ہے، یہ بہت بڑی فضیلت ہے۔

اسی طرح دست کاری یعنی حرفت لوگ اس کو عار سمجھتے ہیں، گویا ہاتھ سے محنت کرنا بابو پن کے خلاف سمجھا جاتا ہے، اور اس کو عیب وعار سمجھا جاتا ہے کہ اتنا بڑا آدمی ہاتھ سے محنت کرتا ہے، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

> ''مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ وَإِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوٗدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ۔'' (مشکوٰۃ ص:۲۴۱، بحوالہ بخاری)
>
> ترجمہ: ''سب سے پاکیزہ کھانا جو آدمی کھائے وہ اپنی ہاتھ کی کمائی کا ہے، اور اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں کی کمائی سے کھاتے تھے۔''

حضرت داؤد علیہ السلام تخت پر بیٹھے ہیں، سلطنت حاصل ہے لیکن سرکاری خزانے کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے، اپنی روٹی اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ بادشاہ کا بھی یہی معمول تھا، مغلیہ خاندان کا تخت ہے اور ماشاء اللہ ہمیشہ جہاد میں رہتے تھے، لیکن اس کے باوجود اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے، ٹوپیاں بنتے تھے اور قرآنِ کریم کی کتابت فرماتے تھے، عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک سے لکھے ہوئے مصاحف، قرآنِ کریم کے نسخے اب بھی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اور جب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو وصیت فرمائی کہ فلاں پوٹلی کے اندر کچھ

رقم پڑی ہے اس سے میرا کفن دفن کیا جائے، اور فلاں پوٹلی میں ایک رقم پڑی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں صدقہ کردی جائے، وہ رقم میرے کفن دفن میں استعمال نہ کی جائے اس لئے کہ وہ قرآنِ کریم کی کتابت کی اُجرت ہے۔ دراصل بعض اہلِ علم اس کو جائز نہیں سمجھتے تھے کہ قرآنِ کریم کی کتابت کے پیسے لے کر استعمال کئے جائیں، چونکہ ایسی رقم کے استعمال میں علماء کا اختلاف تھا، کوئی اس کو جائز کہتا اور کوئی اس کو ناجائز کہتا، تو فرمایا کہ: میرا کفن دفن اس سے نہ کیا جائے۔

خلاصہ یہ کہ ہاتھ سے کما کر کھانا تو عار نہیں ہے، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا اِلَّا رَعَى الْغَنَمَ، فَقَالَ أَصْحَابُهُ: وَأَنْتَ؟ فَقَالَ: نَعَمْ! كُنْتَ أَرْعٰى عَلٰى قَرَارِيطِ لِأَهْلِ مَكَّةَ۔" (مشکوٰۃ ص:۲۵۸، بحوالہ بخاری)

ترجمہ: "اللہ نے کوئی نبی ایسا مبعوث نہیں کیا جس نے بکریاں نہ چَرائی ہوں، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے بھی بکریاں چَرائی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں! میں نے بھی بکریاں چَرائی ہیں، میں چند قیراط پر قریش کی بکریاں چَرایا کرتا تھا۔"

قیراط بہت معمولی سکہ کہلاتا تھا، جیسے پرانے زمانے میں دمڑی مشہور تھی، یعنی چند دمڑیوں کے عوض قریش کی میں بکریاں چرایا کرتا تھا۔ اللہ کے نبیوں سے اللہ تعالیٰ نے بکریاں چروائی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بکریاں چرانا تو قرآنِ کریم میں مذکور ہے، آپ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چراتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس سال بکریاں چرائی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ: کوئی نبی ایسا نہیں ہوا کہ جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں، بکریاں چرانا نبیوں کی سنّت ہے، کوئی عار کی بات نہیں، اور سر پر ٹوکری اُٹھانا، محنت و مزدوری کرنا یہ بھی کوئی عار کی بات نہیں ہے، تم بہترین قسم کے لباس پہن کر سوٹ وغیرہ پہن کر کرسیوں پر بیٹھ کر لوگوں سے جو ناجائز ٹیکس وصول کرتے ہو، یہ حرام کی کمائی ہے، غصب ہے، اور اگر تم لوگ ٹوکری اُٹھاؤ، اپنے ہاتھ سے محنت کرو، تو یہ حلال کی کمائی ہے، اس حرام کی کمائی کو عزت سمجھتے ہو اور حلال کی کمائی کو ذِلت سمجھتے ہو۔

حضرت حکیم الاُمت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے تھے کہ: پتا نہیں مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے؟ انہوں نے کسبِ حلال کو عار سمجھنا شروع کردیا ہے، سینکڑوں ہزاروں نوجوان بے کار پھر رہے ہیں، میاں! تم جاکر کوئی کام کرو۔ کہتے ہیں کہ جی ہم نے تو ایف ایس سی کیا ہے، بی اے کی تعلیم حاصل کی ہے، ایم اے کی تعلیم حاصل کی ہے، فلاں فلاں تعلیم حاصل کی ہے، اب کیسے ٹوکری اُٹھائیں؟ میں کہتا ہوں: تمہارا جاہل رہنا بہتر تھا۔

اگر تمہاری تعلیم قوم میں اخلاق پیدا کردیتی تو میں مانتا کہ یہ تعلیم بہت اچھی چیز ہے، واقعی بڑی اچھی

چیز ہے، لیکن جتنی تعلیم بڑھتی ہے اتنا اخلاق بگڑتا ہے، اگر میں غلط کہتا ہوں تو آپ لوگ مجھے ٹوک سکتے ہیں کہ تم غلط کہتے ہو، میں دیکھتا ہوں عام اُجڈ قسم کے لوگوں کے اخلاق ان لکھے پڑھے لوگوں کے اخلاق سے اچھے ہیں، وہ کم از کم کسی کی تو مان ہی لیتے ہیں، اور تمہارے پڑھے لکھے ہونے کے باوجود تمہارے اندر بداخلاقیاں پیدا ہوگئی ہیں، غرور ہے، تکبر ہے، حسد ہے، مار دھاڑ ہے، دوسرے کو نیچا دِکھانا اور اپنے آپ کو اُوپر دِکھانا، یہ سارے گندے اخلاق تمہیں اس تعلیم نے دیئے ہیں، اُستادوں کی پگڑیاں اُچھالنا، لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنا، اور شریف خاندان کی لڑکیوں سے عشق لڑانا، اس کے سوا تم کیا سکھاتے ہو؟ مجھے بتاؤ یہ تمہارے کالج اور یونیورسٹیاں اس کے سوا کیا سکھاتی ہیں؟ اگر تمہارا یہ علم لوگوں کو اخلاق سکھاتا، تہذیب سکھاتا، تو میں مانتا کہ واقعی تم نے علم سیکھا ہے، اخلاق اور تہذیب کے معنی چبا چبا کر باتیں کرنے کے نہیں ہیں، جس کو تم نے تہذیب سمجھ لیا ہے، اخلاق اور تہذیب یہ ہے کہ جس کا جو حق ہے وہ اسے دیا جائے۔ چھوٹوں کے ساتھ چھوٹوں کا سا معاملہ کیا جائے، بڑوں کے ساتھ بڑوں کا معاملہ کیا جائے، ماں باپ کے ساتھ ماں باپ جیسا حسنِ سلوک کیا جائے، ادب ہے، احترام ہے، یہ چیز اخلاق کہلاتی ہے، تہذیب کہلاتی ہے۔ کسی دیہاتی سے کسی نے پوچھا تھا کہ تمہارا لڑکا پڑھتا ہے کتنا لکھ پڑھ گیا ہے؟ اب وہ بے چارہ کیا جانے کہ کتنا پڑھ گیا ہے کتنا نہیں؟ دیہاتی جاہل کہتا ہے: جی وہ کافی پڑھ گیا ہے، کھڑے ہو کے پیشاب تو کرنے لگا ہے۔ بس تم کھڑے ہو کر پیشاب کرنا سکھاتے ہو، پینٹ پہنو، کھڑے ہو کر پیشاب کرو!

تو میں نے کہا کہ اس قسم کی تعلیم ایک جہالت ہے جو عام ہوگئی ہے، ہماری قوم بڑی جاہل ہے، یہ اُوپر کی سطح پر جتنے فساد مچا رہے ہیں یہ سب جاہل ہیں، میں تو کہتا ہوں کہ اس سے جاہل اچھے ہوتے ہیں، یہ اپنے آپ کو پڑھا لکھا کہلانے والے سیاسی بحران پیدا کر رہے ہیں، قوم کو بے چینی میں مبتلا کر کے رکھتے ہیں، یہ سب کے سب جاہل ہیں، یہ پڑھے لکھے نہیں ہیں، یہ تو آکسفورڈ تک ہو کر آئے ہیں، معلوم ہوا کہ اس سے زیادہ بڑی کوئی جہالت نہیں۔ دُنیاوی تعلیم کا عام کرنا گویا قوم کو تلقین کرنا ہے کہ بے کار بنو، کیونکہ اپنے تئیں جو پڑھ لکھ جاتے ہیں وہ بے چارے دست کاری کے قابل نہیں رہتے، میں کہتا ہوں کہ سڑک پر بیٹھ کر جوتی گانٹھ لو یہ حلال کی روزی ہوگی، لیکن تمہیں تو تمہاری تعلیم سوائے مار دھاڑ کے اور سوائے نوکری اور ملازمت کے کچھ نہیں سکھاتی۔ اللہ کے نبی دست کاری کرتے ہیں، ان کو اس سے عار نہیں، بکریاں چرانے سے بھی عار نہیں ہے، اپنے ہاتھ سے کام کرنے سے عار نہیں ہے۔

کوئی دست کاری کی چھوٹی موٹی صنعتیں لگالو، لیکن کوئی مجتہد قسم کا دِماغ ہو جو ان چیزوں کو ایجاد کرے اور قوم کے نوجوانوں کو اس راستے پر لگائے۔

تمہیں تو ایک ہی اِجتہاد سوجھتا ہے کہ مولوی دِین کو بدلیں، شریعت کو بدلیں، اِجتہاد کریں، یہ لوگ

ہمیں تلقین کیا کرتے ہیں کہ اِجتہاد کرو، تم بھی کوئی اِجتہاد کرو نا!

تم میں سے کچھ نوجوان اُٹھیں اور اُٹھ کر ایسی چھوٹی موٹی صنعتیں لگائیں، جس سے اپنے گھر کی کفالت ہو سکے، ملک کو فائدہ ہو، نفع ہو، نوجوان کام پر لگیں، اب تو دہشت گردی کی وجہ سے کراچی میں سناٹا چھا گیا ہے، ورنہ میں دیکھتا تھا کہ نوجوانوں نے سڑکیں بند کی ہوئی ہیں، کرکٹ کھیل رہے ہیں، بس نوجوان اس کام کے لئے رہ گئے ہیں، بلے اُٹھائے پھرتے ہیں، سڑکیں بند کی ہوئی ہیں، کوئی گاڑی نہیں جاسکتی اور یا پھر کلاشنکوف اُٹھالی، میرے بھائی! کوئی ایسا کام کرو جو تمہارے لئے مفید ہو چاہے چھوٹا سا کام ہو، قوم کو بھی پیداوار ملے اور تمہیں بھی اپنے ہاتھ کی محنت ملے۔

اسی طرح یہ جو کہا جاتا ہے کہ لڑکیوں کو پڑھاؤ اور ان کو مردوں کے شانہ بشانہ ملازمت دِلواؤ، میں پوچھتا ہوں: کیا تم نے لڑکوں کے لئے ملازمتیں پوری کر دیں کہ اب ان سے بچ رہی ہیں جو تم لڑکیون کو دو گے؟ لڑکیوں کو تو گھر کا کام ذمے کیا گیا ہے، اب یہ کتنی بڑی حماقت کی بات ہے کہ جس شخص کے ذمے گھر کی ذمہ داری ہے اس کو تو بے کار کر دو اور جس کا نان ونفقہ مرد کے ذمے ڈالا گیا تھا، اس کو ملازمت دِلواؤ! نوجوان بے کار اور ہماری بچیاں برسرِ روزگار، اب تم ہی بتاؤ وہ اپنے شوہر کے پاس کیوں رہیں گی؟ اپنا گھر کیوں آباد کریں گی؟ جب لڑکی خود کفیل ہوگی اور اپنا بوجھ خود اُٹھا سکے گی تو وہ شوہر کے گھر میں پابند ہو کر رہنا کیوں گوارا کرے گی؟ ہاں! اس کے ساتھ عشق ومحبت کا افسانہ دو چار دن چلے گا بعد میں رنگ ڈھل جاتا ہے، میں جانتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت کا اور عورت کو مرد کا محتاج بنایا ہے اور اسی احتیاج کی سریش کے ساتھ چپکا دیا ہے، یہ احتیاج کی سریش ہے جو مرد اور عورت دونوں کو چپکائے رکھتی ہے۔

مرد جانتا ہے کہ عورت کے بغیر گھر کی گاڑی نہیں چل سکتی، خانہ داری ہے، بچوں کی حفاظت ہے، بچوں کی پرورِش ہے، یہ عورت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اور عورت جانتی ہے کہ جب تک سر پر سائیں کا سایہ نہیں ہوگا میری زندگی بے سایہ گزرے گی۔ دونوں ایک دُوسرے کے محتاج ہیں، قدرت نے ان دونوں کو محتاج بنایا ہے، اس کا شوہر بے روزگار اور لڑکی برسرِ روزگار، مجھے بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے اِلہام کیا ہے، لوگوں کے دِل میں ڈالا ہے کہ اس طرح نظام بناؤ؟ ہماری حکومتیں تو منصوبہ بندیاں کرتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہاں فطری منصوبہ بندی کی ہوئی ہے، ان کی منصوبہ بندی پر معاملہ نہیں ہے، جس چیز کی احتیاج ہوتی ہے اللہ تعالیٰ لوگوں کے دِل میں اُس کا حل ڈال دیتے ہیں کہ یہاں یہ چیز پیدا کرو، مہیا کر دو یا باہر سے لاؤ، تاجر لے آتے ہیں۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ: بادشاہ اگر تجارت کرنے لگے تو رعایا کو بگاڑ ڈالے گا۔

آج ہماری ہر چیز اُلٹی ہوگئی ہے، آج تجارت ساری کی ساری گورنمنٹ کے قبضے میں ہے، اور جو تاجر بے چارے اپنی تجارت کر رہے ہیں وہ بھی گورنمنٹ کے دست نگر ہیں، گورنمنٹ سے اجازت ملنی چاہئے

اور درآمد و برآمد بینک کے ذریعے سے تبادلہ ہونا چاہئے، بہت سے شعبے تو گورنمنٹ نے اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں کہ گورنمنٹ ہی ان کی درآمد کر سکتی ہے دُوسرا کوئی نہیں کر سکتا، اور گورنمنٹ کا جو حال ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی نافرمانی کی وجہ سے قوموں کا جو حال ہے وہ آپ کے سامنے ہے، حکومت کا کام تو نظم و نسق بحال رکھنا ہے، نظم و نسق کا بحال رکھنا اور ظالم کو مظلوم سے انصاف دِلانا، کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے، لوگوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا، معیشت کے سلسلے میں جہاں کسی چیز کی ضرورت ہو وہاں ان کی امداد کرنا، سرکاری وسائل کے ذریعے لوگوں کی معاونت کرنا، یہ مملکت کا کام ہے۔

لیکن دورِ جدید میں حکومت کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ دُنیا کی ہر دولت اس فرعون کے ہاتھ میں ہو، کوئی آدمی بغیر لائسنس کے تجارت نہ کر سکے، کوئی دُکان داری نہ کر سکے، کوئی حیوانات کی پرورش کرنا چاہے بغیر لائسنس کے وہ یہ کام نہ کر سکے، ہر چیز میں حکومت کا لائسنس اور اجازت نامہ لازمی ہے، گویا کنٹرول حکومت کا ہے، یہ سب اس کے نوکر ہیں، اور پھر حکومت جتنا چاہے ان کو حصہ دے اور جتنا چاہے اپنے پاس رکھے، اس ٹیکس کے معنی سوائے حصہ داری کے اور کیا ہیں؟ کماؤ تم اور عیش و عشرت اُڑانے کے لئے حکومت اپنا ٹیکس وصول کرے۔

ابنِ خلدون لکھتے ہیں: کسی مملکت کے زوال کا باعث یہ بنتا ہے کہ عوام پستی میں چلی جاتی ہے، مہنگائی بڑھتی ہے اور مہنگائی کی وجہ سے مطالبات زیادہ بڑھتے ہیں، اور مطالبات کی وجہ سے ٹیکس زیادہ لگائے جاتے ہیں، جتنے زیادہ ٹیکس لگائے جاتے ہیں اتنی ہی مہنگائی زیادہ بڑھتی ہے، جتنی مہنگائی زیادہ بڑھتی ہے اتنی ہی زیادہ تنخواہیں بڑھتی ہیں، جتنی زیادہ تنخواہیں بڑھتی ہیں اتنا ہی زیادہ ٹیکس بڑھتا ہے، یہ ایک چکر چلتا ہے۔ اور وہ لکھتے ہیں: کسی مملکت کی کسی حکومت کی سعادت مندی یہ ہے کہ اس میں کم سے کم ٹیکس ہوں اور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ آسانیاں ہوں۔

آج یہ جتنے ماہرِ معاشیات ہیں اور حکومت کے دُوسرے شعبوں میں کام کرنے والے لوگ ہیں، آپ نے کبھی ان کی زبان مبارک سے رسول اللہ ﷺ کا، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا، اور بادشاہانِ عدل کا تذکرہ اور حوالہ نہیں سنا ہوگا، یہ جب بھی حوالہ دیں گے جرمنی، فرانس، برطانیہ اور امریکا کے مدبرین کا حوالہ دیں گے، ان کے ذہن پر مغرب اتنا سوار ہے کہ کبھی بھول کر بھی کسی معاملے میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا حوالہ نہیں دیا، انہوں نے سوچا ہی نہیں، ان کا ذہن یہ بن گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو بس ثواب و عذاب بیان کرنے کے لئے آئے تھے۔ زندگی کا کون سا شعبہ ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے اصلاحات نہیں فرمائیں؟ مگر تمہاری آنکھیں پھوٹ گئی ہوں تو میں اس کا کیا علاج کروں؟ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں آقا نے راہ نمائی نہ فرمائی ہو، اور اس کے اُصولِ موضوعہ ترغیب اور ترہیب کے ساتھ بیان نہ فرما دیئے ہوں، لیکن تمہارے لئے یہ چیزیں بالکل بے کار ہیں، اور میں جانتا ہوں کہ جتنی

لفاظی تم کرتے ہو اس کا نتیجہ خاک ہے...!

صحابہ کرام اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان کے بعد بھی دُوسرے عادل سلاطین انہوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں، مگر کبھی تم نے ان اکابر کی تاریخ کو اُٹھا کے دیکھا ہی نہیں، اگر دیکھا بھی ہے تو اس سے سبق نہیں لیا، اس سے راہ نمائی نہیں لی، تمہاری راہ نمائی کے لئے یہی مغرب والے رہ گئے ہیں، اس لئے کہ تمہارا ذہن بھی غیر مسلم تھا، تمہارا دِل بھی غیر مسلم ہے، تم زبان سے ''لا إلٰہ إلّا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھتے ہو، مگر ذہن و دِل جب تک مسلمان نہ ہو تو کلمہ پڑھنے سے کیا فائدہ؟

علمِ معاش محدود ہے

خیر! یہ تو ضمناً بات آگئی تھی، میں گفتگو اس میں کر رہا تھا کہ علم دو ہیں، ایک علمِ معاش اور ایک علمِ معاد۔

علمِ معاش وہ ہے جو مرنے سے پہلے تک کی زندگی میں رہنے سہنے کے طریقے سکھاتا ہے کہ یہ زندگی کیسے گزاریں؟ کیا کھائیں؟ کس طرح کھائیں؟

علمِ معاد کی حد نہیں

اور ایک علمِ معاد ہے، اور وہ ہے موت کے وقت سے لے کر ابدالآباد کی زندگی تک راہ نمائی کرنے والا علم، اس علمِ معاش کی حد ہے، لیکن علمِ معاد کی حد نہیں، تمہارے اسکولوں اور کالجوں پر بھی لکھا ہوا ہوتا ہے:

''طلب العلم فریضة علٰی کل مسلم'' (مشکوٰۃ ص:۳۴)

ترجمہ: ''علم کا حاصل کرنا ہر مسلم پر فرض ہے۔''

جھوٹ کہتے ہو! یہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمت لگاتے ہو، تمہارے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے یہ علمِ معاد نہیں ہے۔ تمہارے یہاں صرف علمِ معاش پڑھایا جاتا ہے، جبکہ آپ کا مقصد علمِ معاد ہے اصلاً۔

''چین جاکر علم حاصل کرو'' غلط ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک اور تہمت گھڑی ہے کہ: ''أطلبوا العلم ولو کان بالصین'' علم کو تلاش کیا کرو چاہے تمہیں چین جانا پڑے۔ یہ بالکل جھوٹ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا، چین تو ابھی پچاس سال پہلے تک جاہلیت میں ڈُوبا ہوا تھا، یورپ بھی بے چارہ اپنی جہالت سے انگڑائی لے کر اُٹھا تھا، یہ مچھلیوں کے مچھیرے انگریز تمہاری بے وقوفی کی وجہ سے تم پر ڈیڑھ سو سال حکومت کرکے گئے ہیں، یہ مچھلیوں کے

مچھیرے تھے، یہ ڈاکو، بحری قزاق ہیں، سن ۱۹۸۲ء بلکہ اس سے پہلے میں پہلی دفعہ یورپ گیا مولانا محمد یوسف متالا صاحب نے بلایا تھا، تو میں نے ان سے کہا کہ: حضرت! مجھے یہ بتایئے کہ یہ روشنی کا زمانہ، بجلی اور گیس اور جدید وسائل، رسل ورسائل، مواصلات ان تمام چیزوں کی عمر تو بہت تھوڑی ہے، اس سے پہلے اس ملک میں کون رہتا تھا اور کس طرح رہتا تھا؟ انگلینڈ کا ملک بھی کوئی رہنے کے قابل ہے؟ آج دُنیا سے یہ بجلی کے چکر ختم ہوجائیں تو وہاں کوئی رہ سکتا ہے؟ مولانا نے مسکرا کر فرمایا کہ: یہاں دو طرح کے لوگ رہتے تھے، ایک مچھیرے، مچھلیاں پکڑنے والے اور دُوسرے بحری قزاق، جو کوئی جہاز جاتا تھا اس کو لوٹ لیتے تھے، نہ وہاں زراعت ہے اور نہ کوئی اور چیز ہوسکتی ہے، سیب لگاتے ہیں، پھل آتا ہے بہت ہی اچھا، لیکن کوئی ذائقہ نہیں، جب پھلوں کو سورج کی روشنی ہی نہ پڑے تو ان میں مٹھاس کہاں سے آئے؟ میں نے کہا کہ: یہ مغربی دُنیا کے لوگ تو نہایت غیر مہذّب قوم تھی، اور اس امریکا غریب کا تو ڈھائی سو سال پہلے کوئی وجود ہی نہیں تھا، دُنیا کو معلوم ہی نہیں تھا کہ امریکا بھی کوئی ملک ہے، یہ مغرب بھی انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا، لیکن چین والے ابھی تک افیونی تھے، سو رہے تھے، یہ سب سے بعد میں بیدار ہوئے ہیں، ان کے بارے میں کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علم حاصل کیا کرو چین جاکر، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمت ہے!

تم تو علم اسی کو سمجھتے ہو، حالانکہ یہ علم ہے ہی نہیں، محض کھانے پینے کا دھندا ہے، چاہے تمہارے سائنسی علوم ہوں یا تمہارے آج کے ترقی یافتہ علوم ہوں، یہ سب کے سب پیٹ کا چکر ہے، اور کچھ بھی نہیں۔ گھسیارا بے چارہ گھاس کھود کر کے روٹی کھاتا ہے، تم بڑے بڑے ادارے بنا کر روٹی کھاتے ہو، چکر سارا صرف روٹی کا ہے اور کچھ نہیں...!

مجھے معاف رکھیں گے، تمہاری سائنس نے آدمی کو نفع سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے، تم کہو گے کہ یہ مولوی بہت تعصب برتتا ہے، میں مانتا ہوں کہ سائنس نے بہت نفع بھی پہنچایا، لیکن جتنا انسان اس زمانے میں تلملا رہا ہے اور جس قدر اس کی رُوح آج بے چین ہے، کبھی انسانی زندگی میں بے چین نہیں ہوئی ہوگی، اور آج کا انسان جتنا مظلوم ہے اتنا کبھی نہیں رہا ہوگا، آج کا انسان مسائل سے جس قدر دوچار ہے اس سے پہلے کبھی نہیں رہا ہوگا، اور یہ سب برکتیں ہیں تمہاری سائنس کی، تمہارے ترقی یافتہ علوم کی، تم نے نعرہ لگایا کہ ہم نے فلاں بیماری پر فتح پالی، فلاں بیماری پر فتح پالی، فلاں بیماری کا نشان ختم کردیا، چیچک کا نشان ختم کردیا، یا فلاں چیزیں ختم کردیں، قدرت نے کہا کہ: تم نہیں کرسکتے، ایسی ایسی بیماریاں ایجاد کریں گے کہ تمہارے باپ کو بھی ان کا پتا نہ چلے، نئی نئی بیماریاں آتی ہیں، ان پر بے چارے تحقیقات شروع کرتے ہیں، اور جب وہ قابو میں آنے کے قریب ہوتی ہے تو ایک نئی بیماری سر اُٹھا لیتی ہے۔ یہ کینسر اب تو بہت پُرانی چیز بن گئی ہے، لیکن ہمارے یہاں کبھی نہیں جانی گئی تھی، حالانکہ ہماری طب کی کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے، یونانی طب میں

سرطان کے نام سے یہ بیماری ہوتی تھی اور اس کا علاج بھی کیا جاتا تھا، لیکن اب جس کثرت سے یہ بیماری ہونے لگی ہے، اور اس نے دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا، اب تو ہر دسویں آدمی پر شبہ ہوتا ہے کہ وہ کینسر، شوگر یا خدانخواستہ کسی موذی مرض میں مبتلا ہے۔

اصل علم آخرت کا علم ہے

تو اصل علم یہ ہے جو آخرت کی راہ نمائی کرے، قرآنِ کریم نے ایک جگہ اپنے بلیغ انداز میں فرمایا:

﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾

(الروم:۶)

ترجمہ: ''یہ لوگ دُنیا کے صرف ظاہر کو جانتے ہیں، حقیقت اس کی بھی معلوم نہیں، اور آخرت سے بالکل ہی غافل ہیں، بے خبر ہیں۔''

دُنیا کا ایک ظاہر ہے اور ایک اندر، یعنی اس کا چھپا ہوا حصہ ہے، تم دُنیا کے ظاہر ہی ظاہر کو جانتے ہو، اس کے اندر کا تمہیں بھی معلوم نہیں، اور دعویٰ کرتے ہو خدا اور نبی کے مقابلے میں علم کا، تو مسلمان ایسا ہونا چاہئے کہ وہ کتاب اللہ کا برتن ہو کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اس کے سینے میں محفوظ ہو، اس کے الفاظ بھی، اس کے معانی بھی اور اس کے انوار و برکات بھی اس کے سینے میں محفوظ ہوں، اس کے دِل سے اللہ تعالیٰ کی کتاب کی شعائیں پھوٹیں ''ینابیع العلم'' اور علم کے چشمے ہوں، جب بھی تمہاری زبان سے کچھ نکلے تو علم کی بات نکلے۔

علم پر عمل اس کی مقبولیت کی علامت

[حدیث:۱۱۷۸] ''عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: إِنَّ النَّاسَ كُلَّهُمْ قَدْ أَحْسَنُوا الْقَوْلَ، فَمَنْ وَافَقَ قَوْلُهُ فِعْلَهُ فَذَالِكَ الَّذِيْ حَظَّهُ، وَمَنْ خَالَفَ قَوْلُهُ فِعْلَهُ فَإِنَّمَا يُوَبِّخُ نَفْسَهُ۔'' (کنز العمال ج:۱۰ حدیث:۲۹۵۴۰)

[حدیث:۱۱۷۹] ''عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: مَا اسْتَغْنٰى أَحَدٌ بِاللهِ إِلَّا احْتَاجَ إِلَيْهِ النَّاسُ، وَمَا عَلِمَ أَحَدٌ بِمَا عَلَّمَهُ اللهُ إِلَّا احْتَاجَ النَّاسُ إِلٰى مَا عِنْدَهُ۔'' (حیاۃ الصحابۃ ج:۳ ص:۲۴۹)

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: بے شک سب لوگ باتیں تو اچھی کرتے ہیں، پس جس کا قول اس کے فعل کے موافق ہو، یہ وہ ہے جس کو اس کا حصہ مل گیا، اور جس کا عمل اس کے قول کے خلاف ہو تو گویا وہ اپنے آپ کو ڈانٹتا ہے۔''

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص (مخلوق کو چھوڑ کر)

صرف اللہ کا محتاج بنا، سب لوگ اس کے محتاج ہوتے ہیں، اور جس شخص نے وہ علم سیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اس کو سکھایا تو سارے لوگ اس کے اس علم کے محتاج ہوں گے جو اس کے پاس ہے۔''

تشریح: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: لوگ باتیں تو سب اچھی کرتے ہیں، باتیں کرنے کے بعد مرحلہ آتا ہے عمل کا، جس کا فعل اس کے قول کے موافق ہو، یعنی جس طرح باتیں اچھی کرتا ہے، اگر کام بھی اچھا کرتا ہو تو اس کو اپنا حصہ مل گیا، اور جس شخص کا قول اس کے فعل کے موافق نہ ہو، بلکہ خلاف ہو، یعنی باتیں تو بہت اچھی کرتا ہے لیکن کام اس کے خلاف کرتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کا قول وفعل ایک دوسرے کے مخالف ہیں، تو یوں کہو کہ گویا وہ شخص اچھی باتیں کر کے اپنے آپ کو ڈانٹتا ہے، یعنی اپنے نفس کی مخالفت کرتا ہے اور قیامت کے دن اس سے محاسبہ ہوگا۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے دوسرے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ: جو شخص اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے لوگوں سے مستغنی ہو جائے (ایک اللہ مل گیا تو اس کو کسی دوسرے کی ضرورت ہی نہیں رہی) تو اس کے نتیجے میں سارے لوگ اس کے محتاج ہو جاتے ہیں، اور جو شخص کہ اس علم پر عمل کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرما دیا ہے تو تمام لوگ اس کے علم کے محتاج ہو جائیں گے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے ان ارشادات میں بڑے پتے کی باتیں ارشاد فرمائی ہیں، کیونکہ آدمی جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے:

''لَا یَزَالُ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ مُقْبِلًا عَلَی الْعَبْدِ وَھُوَ فِیْ صَلَاتِہٖ مَا لَمْ یَلْتَفِتْ ... الخ۔'' (مشکوٰۃ ص:۹۱)

یعنی نماز میں آدمی اِدھر اُدھر نہ دیکھے، اس لئے کہ اس کی طرف اس کا رب متوجہ ہوتا ہے (اور اللہ تعالیٰ اس سے ہم کلام ہوتے ہیں)۔

اگر آدمی نماز کی نیت باندھے اور اس کا دھیان بازار چلا جائے، تو اس نے نماز کی نیت تو یہاں باندھی ہوئی ہے مگر وہ پھر رہا ہے بازار میں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو کہا جاتا ہے کہ بندے! میں تیری طرف متوجہ ہوں، تو کہاں پھر رہا ہے؟ تو تو یہاں میرے ساتھ باتیں کرنے کے لئے آیا تھا، مگر مجھے چھوڑ کر لوگوں کے ساتھ باتیں کرنے لگا، اگر بندہ واپس آجائے یعنی اپنی نماز کی طرف متوجہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنے لگے تو ٹھیک ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔

جیسے ایک صاحبِ کشفی بزرگ تھے، ان کو کشف ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ فضل فرمائے اور ہم پر رحم فرمائے، کسی کو کشف بھی نہیں ہونا چاہئے، یہاں آپ کی حالت مجھے معلوم نہیں کہ آپ کے اندر کیا ہے، اور میری خبر آپ

کو نہیں کہ میرے اندر کیا ہے؟ یوں اللہ تعالیٰ نے سب کا پردہ رکھا ہوا ہے، ہمیں ایک دوسرے کی خبر نہیں۔
لیکن قرآن مجید میں آتا ہے کہ قیامت کے دن سب بھید کھل جائیں گے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ. فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ﴾ (الطارق:۸،۹)

ترجمہ:...... ''جس دن کہ دلوں کے بھید کھول دیئے جائیں گے۔ تو بندے کو کوئی طاقت بھی نہیں ہوگی اور اس کا کوئی مددگار بھی نہیں ہوگا۔''

یہاں تو اللہ تعالیٰ نے سب سے پردہ رکھا ہوا ہے، میرا حال آپ کو معلوم نہیں، آپ کا حال مجھے معلوم نہیں، لیکن قیامت کے دن پردے کھول دیئے جائیں گے، بندہ چھپانے لگے گا مگر چھپ نہیں سکے گا، یہ ایسے ہی ہے جس طرح ہمارے حکیم الاُمت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے نقل کیا ہے:

ایک عورت کسی کے گھر میں ملازمہ تھی، اس کی چوری کرنے کی عادت تھی، گھر کی صفائی کرتے کرتے گھر کا ہی صفایا کر جایا کرتی تھی۔ ایک دن اس نے ایک ٹائم پیس گھڑی اٹھا کر اپنے لباس میں کہیں چھپا دی، صفائی کرتی رہی، گھڑی کا الارم لگا ہوا تھا وہ وقت پر بول پڑا، اب اس کو دباتی ہے، لیکن اس کے دبانے سے تو وہ بند نہیں ہوتا۔ تو ایسے ہی یہاں دنیا میں تو ہم لوگ اپنے اپنے عیبوں کو چھپائے ہوئے ہیں، آپ کو معلوم نہیں کہ میں گھر میں کیا کر رہا ہوں؟ مسجد میں نماز پڑھانے کے لئے آ گیا اور آپ کے بارے میں مجھے معلوم نہیں کہ آپ وہاں کیا کر رہے ہیں؟ لیکن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام بھید کھول دیں گے، بندے کے پاس نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ کوئی مددگار ہوگا، بہت دبائے گا مگر دبے گا نہیں۔ یہاں ایک یہ کیفیت ہے اور ایک یہ ہے جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ:

''اِنَّ اللّٰہَ یُدْنِی الْمُؤْمِنَ فَیَضَعُ عَلَیْہِ کَنَفَہٗ وَیَسْتُرُہٗ... الخ۔''

(مشکوٰۃ ص:۴۸۵)

یعنی اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کے سامنے ایک بندے کو بلائیں گے، اب وہاں کوئی پردے کرنے والی چیز ہے نہیں، کوئی اوٹ ہو اور کوئی پردہ ہو جہاں چھپ جائیں، لیکن حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ: اللہ تعالیٰ اپنا پردہ اس پر ڈال دیں گے، لوگوں کی نظر میں نہیں آئیں گے، اس کے ساتھ کیا سوال و جواب ہو رہا ہے؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔

عدالتِ الٰہی میں کوئی وکیل و ترجمان نہیں ہوگا، دنیا کے وکیل اور ترجمان یہاں رہ جائیں گے اور بارگاہِ الٰہی میں کوئی کچھ نہ چھپا سکے گا، جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ:

''مَا مِنْکُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا سَیُکَلِّمُہٗ رَبُّہٗ لَیْسَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَہٗ تُرْجُمَانٌ۔''

(مشکوٰۃ ص:۴۸۵)

ترجمہ:...... ’’تم میں سے ہر ایک آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے آئے گا جبکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی ترجمانی کرنے والا نہیں ہوگا۔‘‘

یہ عدالتوں کے وکیل نہیں رہ جائیں گے، جو جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بناتے ہیں، جو مجرم کو چھڑوانا جانتے ہیں اور بے گناہ کو پھنسانا جانتے ہیں۔

انگریز کی تعلیم ہی ایسی ہے بدقسمتی سے، اور انگریز کے دور سے آج تک یہی تعلیم چل رہی ہے، وہی عدالتیں ہیں، وہی وکیل ہیں، وہی لباس ہے، حتیٰ کہ یہ بھی نہیں کر سکے کہ ان کا لباس ہی بدل دیں، عدالت میں جب وکیل جائے گا تو سیاہ کوٹ پہن کر جائے گا، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جیسے اس کے اوپر کا لباس سیاہ ہے، ویسے ہی اس کا دل بھی کالا ہے، سوسو جھوٹ خود بولتے ہیں اور اپنے مؤکلوں سے بلواتے ہیں، پہلے سے پڑھا کر جاتے ہیں کہ تم نے ایسے کہنا ہے، ویسے کہنا ہے، تم سے کوئی بات پوچھے تو ایسے کہہ دینا، ورنہ چپ رہنا، اور وکیل اس کی طرف سے لڑتا رہتا ہے، وہاں آخرت میں یہ نہیں ہوگا۔ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان میں کوئی ترجمانی کرنے والا نہیں ہوگا، ہر آدمی خود اپنی جوابدہی کرے گا۔

حد نظر یعنی جہاں تک نظر پہنچے گی دائیں بھی، بائیں بھی اور سامنے بھی اس کے نامہ عمل کے دفاتر پھیلے ہوئے ہوں گے، قرآن کریم میں ہے کہ بندہ کہے گا:

﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ﴾ (الکہف:۴۹)

ترجمہ: ’’اس کتاب کو کیا ہوا کہ اس نے کوئی چھوٹی اور بڑی بات کو چھوڑا نہیں جس کو گھیر نہ لیا ہو، شمار نہ کرلیا ہو۔‘‘

میرے بھائیو! اول سے آخر تک کے تمام عمل لکھے ہوئے ہمارے سامنے ہوں گے، اور ہر ایک آدمی خود جوابدہی کرنے والا ہوگا، کوئی اس کا معاون و مددگار نہیں ہوگا، اور وہاں کوئی جھوٹ بھی نہیں بول سکے گا، ہاں! جھوٹ بولنے کی کوشش کریں گے اور لوگ جھوٹ بولیں گے بھی، مگر ان کی زبانیں بند کردی جائیں گی، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے کہ:

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (یٰس:۶۴)

ترجمہ: ’’ہم ان کے منہ پر مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ وہ کیا کرتے تھے؟‘‘

جب زبان بند ہوجائے گی اور دوسرے اعضا ان کے خلاف گواہی دیں گے تو وہ اپنے ان اعضا کو

کوستے ہوئے کہیں گے:

﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (حٰمۤ السجدۃ:۲۱)

ترجمہ:...... ''وہ اپنی کھالوں اور چمڑوں کو کہیں گے کہ تم ہمارے خلاف گواہی کیوں دے رہے ہو؟ وہ کہیں گے کہ آج ہمیں اس ذات نے ناطق بنایا ہے جس نے ہر چیز کو ناطق بنایا ہے (ہم اپنے اختیار میں نہیں ہیں)۔''

آدمی سب سے بڑی ہوشیاری یہ کرے گا کہ پہلے مکر جائے گا، لیکن مکرنے کہاں دیتے ہیں؟ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ آدمی کے مستقل ریکارڈ الگ الگ محفوظ ہو رہے ہیں، سب سے پہلا ریکارڈ تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، جو کبھی خطا نہیں ہوتا، ''لَا يَشْغَلُهٗ حَالٌ عَنْ حَالٍ!'' اس کو ایک حالت دوسری حالت سے مشغول نہیں کرتی، ایک سے بات کر رہے ہیں، یہ نہیں کہ دوسرے آدمی سے غافل ہو جائیں، ایک وقت میں ساری دنیا سے بات کر رہے ہوں گے، پھر لوحِ محفوظ میں ہماری مکمل ہسٹری اور ہمارا ریکارڈ جمع ہے، پھر زمین کے وہ ٹکڑے جن پر ہم چلے پھرے، اٹھے بیٹھے، لیٹے، اچھا عمل کیا، یا برا عمل کیا وہ سب کے سب قیامت کے دن گواہ ہوں گے، دیواریں بھی بولیں گی، زمین کے ٹکڑے بھی بولیں گے۔ جیسا کہ سورۂ زلزال میں فرمایا ہے: ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ؕ﴾ یعنی اس دن زمین اپنی خبریں دے گی، کہ اس بندے نے میری پشت اور میرے اوپر یہ یہ کام کیا تھا، فلاں وقت میں فلاں کام کیا تھا، یہ اس لئے ہوگا کہ تیرے رب نے اس کو حکم دے دیا ہے۔ تو اس دن ہمارے سامنے ہمارے سارے ریکارڈ ہوں گے، ہم چھپنا بھی چاہیں گے تو چھپ نہیں سکیں گے، اللہ تعالیٰ ہی ہمیں معاف فرما دیں تو دوسری بات ہے، ورنہ نہ تو کسی کی سفارش کام آئے گی اور نہ کسی شخص کا عذر و معذرت کام آئے گی، یہاں تو ہم عذر و معذرت کر لیتے ہیں کہ جی اصل میں یہ ہو گیا تھا، وہ ہو گیا تھا، وہاں اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز نہیں چھپ سکے گی اور نہ کوئی عذر کیا جا سکے گا۔

میں نے کہا تھا کہ ایک بندے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے لایا جائے گا، اس بندے کے دائیں بائیں اور سامنے سب جگہ نامہ اعمال پھیلے ہوئے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اپنا پردہ اس پر ڈال دیں گے، کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا کہ کس کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے؟ حالانکہ کوئی پردہ نہیں ہوگا، کوئی اوٹ نہیں ہوگی، قرآن کریم میں ہے: ﴿لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمْتًا﴾ (طٰهٰ:۱۰۷) تو اس میں کوئی اوٹ نہیں دیکھو گے، کوئی ٹیلا نہیں دیکھو گے، بالکل صاف چٹیل میدان، بندہ اپنے رب کے سامنے پیش ہوگا، فرشتے اس کے نامہ عمل کو پڑھنا شروع کر دیں گے، خدا جانے کتنا وقت اس میں لگے گا؟ اللہ تعالیٰ ہی معاف فرمائے، حق تعالیٰ شانہ سنتے رہیں

گے، جب فرشتے نامہ عمل پڑھ کر فارغ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے فرمائیں گے کہ: تو کچھ کہنا چاہتا ہے؟ اس بیچارے کا سر نیچا ہوگا، بولنے کی طاقت اس میں کہاں ہوگی؟ خود ہی اپنے آپ میں شرمندہ ہوگا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: کیا میرے فرشتوں نے تیرے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے؟ وہ کہے گا کہ: نہیں! اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے فرمائیں گے: کوئی نیکی تو نے کی ہو اور وہ فرشتوں نے نہ لکھی ہو، یا کوئی گناہ تو نے نہ کیا ہو اور وہ فرشتوں نے لکھ دیا ہو؟ بندہ کہے گا: نہیں! بندے کے پاس کوئی بھی عذر نہیں ہوگا، کچھ عذر تو آدمی کرے، بندہ بالکل چپ، آخر میں اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ: میں نے دنیا میں تیرا پردہ رکھا تھا، آج تجھے معاف کرتا ہوں! یہ تو اللہ تعالیٰ کے فضل کا معاملہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا کہ:

"لَیْسَ اَحَدًا مِنْکُمْ یُنْجِیْهِ عَمَلُهٗ! قَالُوْا: وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللهِ؟ قَالَ: وَلَا اَنَا! اِلَّا اَنْ یَتَغَمَّدَنِیَ اللهُ مِنْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّرَحْمَةٍ۔" (صحیح مسلم ج:۲ ص:۳۷۷)

ترجمہ: "تم میں سے کسی آدمی کو اس کا عمل نجات نہیں دلائے گا، (مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ!) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی نے کہا کہ: یا رسول اللہ! آپ کی بھی بخشش نہیں ہوگی بغیر اللہ کی رحمت کے؟ (سر جھکا لیا اور سر کے اوپر ہاتھ رکھ لیا) اور فرمایا: میری بھی بخشش نہیں ہوگی اِلَّا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مغفرت و رحمت کے ساتھ مجھے ڈھانک دے!"

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ کبڈی کھیلتے ہوئے جنت میں چلے جائیں گے، نہیں بھائی! یہ بات نہیں ہے، وہ دن آنے والا ہے: ﴿یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا﴾ (المزمل) جو بچوں کو بوڑھا کردے گا، اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت فرمائے، کم از کم آدمی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا تو رہے، ہم تو ڈرتے بھی نہیں ہیں، ہمارے دل میں کبھی خوف بھی پیدا نہیں ہوتا اور بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہونے کا کبھی تصور بھی نہیں آتا، قرآن مجید میں ہے کہ قیامت کے دن کافر کہیں گے: ﴿اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ﴾ (الجاثیہ) (ہم تو معمولی سا خیال کرتے تھے، ہمیں یقین نہیں تھا)۔ وہی کیفیت ہماری ہوگئی ہے، قیامت کے حق ہونے کا خیال کچھ ہمیں بھی آتا ہے کہ مریں گے، قبروں میں جائیں گے، محشر میں اُٹھیں گے، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی، لیکن یقین کے درجے میں نہیں، اللہ سبحانہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے اور ہمارے اس خیال کو یقین میں بدل دے، ہنسی مذاق کی تو ہمیں سوجھی، لیکن آخرت ہمیں یاد نہیں رہی، اب اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیشی کو بھی ہم مذاق ہی سمجھتے ہیں، نعوذ باللہ!

ایک روایت میں ہے:

”کَانَ اَبُو الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللہُ عَنْهُ یَقُوْلُ: اِنَّمَا اَخْشٰی مِنْ رَبِّیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اَنْ یَدْعُوْنِیْ عَلٰی رُؤُوْسِ الْخَلَائِقِ فَیَقُوْلُ: یَا عُوَیْمِرُ! فَاَقُوْلُ: لَبَّیْکَ رَبِّ! فَیَقُوْلُ: مَا عَمِلْتَ فِیْمَا عَلِمْتَ؟“ (الترغیب والترہیب ج:۱ص:۹۰)

یعنی حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے کسی چیز کا ڈر نہیں ہے، صرف ایک بات سے ڈر لگتا ہے، (حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکیم الاُمت کا لقب دیا تھا، سب سے پہلا شخص اس اُمت میں حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ ہیں جن کو حکیم الاُمت کا خطاب ملا تھا) کہ: اللہ تعالیٰ مجھے تمام دنیا کے سامنے، جہاں چھوٹے بڑے سب موجود ہوں گے، مجھے بلائیں گے اور بلا کر کہیں گے کہ: عویمر! (عویمر نام ہے ان کا)، میں کہوں گا کہ: اے رب میں حاضر ہوں! کیا فرماتے ہیں؟ مجھ سے کہا جائے گا کہ تجھے علم دیا تھا اس پر کتنا عمل کیا؟ بس اس بات پر بڑا ڈر لگتا ہے، کیونکہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ سب دنیا کے سامنے فرمائیں گے کہ: عویمر! تجھے جو علم دیا تھا اس پر کتنا عمل کیا؟ اور دوسری روایت میں یہی مضمون ذرا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ: اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کے سامنے مجھے بلائیں گے اور سوال کریں گے۔ ایک تو تمام خلائق کے سامنے کھڑا کیا جانا بڑی سخت رسوائی ہے، پھر یہ سوال کہ تجھے جو علم دیا تھا اس پر کتنا عمل کیا؟ ایک تو میں نے ابھی حدیث نقل کی ہے ناں کہ بندے پر اللہ تعالیٰ اپنا پردہ ڈال دیں گے، کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے، وہ تو الگ معاملہ ہے، لیکن ایک یہ کہ ساری مخلوق کو اس کی ندا ہو، خبر ہو، تو اس پر آدمی اتنا شرمندہ ہوگا کہ کہہ اٹھے گا: اے کاش! میں آج سے پہلے مرگیا ہوتا، تو میرے کرتوت مخلوق کے سامنے نہ آتے۔ تو حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کے سامنے مجھے بلائیں گے اور بلا کر کہیں گے: ”عُوَیْمِرُ! اَعَلِمْتَ اَمْ جَهِلْتَ؟“ تجھے علم ہے یا تو جاہل تھا؟ یعنی یہ وہ سوال ہے جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ یہ حضرت حکیم الاُمت فرماتے ہیں، یعنی اس اُمت کے سب سے پہلے حکیم۔

آخر میں فرماتے تھے کہ: میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں اس علم سے جو نفع نہ دے، اور اس نفس سے جس کا پیٹ نہ بھرے۔

ہمارے ساتھ نفس لگا ہوا ہے، ساری دنیا کے خزانے اس کو مل جائیں تو یہ نہیں بھرتا، حدیث میں فرمایا گیا ہے:

”لَوْ کَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِیًا مِنْ مَالٍ لَابْتَغٰی اِلَیْهِ ثَانِیًا، وَلَوْ کَانَ لَهٗ وَادِیَانِ لَابْتَغٰی

لَهُمَا ثَالِثًا، وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ!"

(کنز العمال ج:۳ حدیث:۷۴۳۲)

ترجمہ: "اگر ابن آدم کو سونے کی ایک وادی مل جائے تو اس کی خواہش ہوگی کہ ایک دوسری بھی مل جائے، اور اگر دو وادیاں مل جائیں تو اس کی چاہت ہوگی کہ ایک تیسری بھی مل جائے، اور ابن آدم کے پیٹ کو تو مٹی ہی بھر سکے گی۔"

یعنی اگر بندے کو ایک وادی سونے کی مل جائے تو چاہے گا کہ دو وادیاں مل جائیں، اگر دو وادیاں مل جائیں تو تیسری تلاش کرے گا کہ ایک اور ہونی چاہئے، انسان نے کارخانے بنائے، فیکٹریاں بنائیں، دیکھو نواز شریف نے کئی فیکٹریاں بنالی تھیں، لیکن ابھی بس نہیں ہوئی، کہا کہ دو کافی نہیں، تیسری ہونی چاہئے، تیسری مل جائے تو چوتھی ہونی چاہئے، آدمی کے پیٹ کو قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے، قبر میں جب جسم کو کیڑے کھا جائیں گے اور یہ خود مٹی ہو جائے گا، تب کہے گا کہ: ہاں! اب کافی ہو گیا۔ تو حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ: میں ایسے علم سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے، آپ حضرات نے سن لیا حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کیا فرماتے ہیں؟ یا اس کان سے سنا اور اس کان سے نکال دیا؟ چلو جیسے آئے تھے ویسے چلے گئے!

بھائی! بات یہ ہے کہ سنا تو ہم نے بہت، لیکن ہماری عقل میں نہیں آیا، حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرمارہے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں اس علم سے جو نفع نہ دے، اور اس نفس سے جو نہ بھرے۔

اور ایک تیسری چیز ہے: "وَمِنْ دُعَاءٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا۔" اور میں پناہ چاہتا ہوں ایسی دعا سے جو سنی نہ جائے۔ بندہ، اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ سنتے ہی نہیں۔

میں نے آپ حضرات کو سنایا تھا، یاد ہوگا کہ شیخ تاج الدین بن عطاء اللہ اسکندری کی کتاب ہے، اس میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ ایک بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کرتا ہے یا اللہ! یا اللہ! یا اللہ! بندہ، اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ اس کی چیز کو پورا نہ کرنا، اس کو ایسے ہی مانگنے دو، تو بندہ مانگتا ہے یا اللہ! مجھے یہ چیز دے، یا اللہ! مجھے یہ چیز دے، مانگتا ہی رہتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ: اس کو دینا نہیں، اس لئے کہ اس کا مانگنا مجھے اچھا لگتا ہے! سبحان اللہ! کیا بات ہے، ایک وہ بندہ ہے کہ جس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہتے ہیں کہ اس کی ضرورت پوری نہیں کرنا، تم نے ضرورت پوری کردی تو اس نے مانگنا ہی چھوڑ دینا ہے، اور مجھے اس کا مانگنا بہت اچھا لگتا ہے، کیا ہی مبارک ہے وہ بندہ کہ یہ مانگے اور اللہ تعالیٰ کو اس کا مانگنا اچھا لگے۔

اور ایک دوسرا بندہ ہے اس کو کوئی ضرورت پیش آجاتی ہے، وہ مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ فرشتوں سے

فرماتے ہیں کہ فوراً اس بندہ کی ضرورت پوری کردو، اس لئے کہ اس کا ہاتھ اٹھانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔

ہم یوں سمجھتے ہیں کہ جس کی حاجت جلدی پوری ہو جائے، جس کی ضرورت جلدی پوری ہو جائے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچا ہوا ہے، اِدھر مانگتا ہے اُدھر منظور ہو جاتی ہے، لیکن یہاں معاملہ کچھ اور نکلا، دعا مانگتا ہے لیکن دعا قبول نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ کو اس کا مانگنا اچھا لگتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ جب آدمی کو حاجت ہو جب بھی مانگے اور جب حاجت نہ ہو (اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، تمام چیزیں میسر ہیں، الحمدللہ!) تب بھی مانگے، کیونکہ اللہ سے مانگنا اللہ تعالیٰ کو بہت اچھا لگتا ہے، اور ایک وہ آدمی ہے کہ جب ضرورت ہوتی ہے تو مانگتا ہے، جب ضرورت نہیں ہوتی تو نہیں مانگتا، حالانکہ اسے یہ بھی پتہ نہیں کہ یہ موقع بھی مانگنے کا تھا، ایسا آدمی اللہ تعالیٰ کو اچھا نہیں لگتا، تو حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ: میں پناہ لیتا ہوں اللہ تعالیٰ کی اس علم سے جو کہ نفع نہ دے اور اس نفس سے جو کہ بھرے نہیں، اور اس دعا سے جو کہ سنی نہ جائے۔

ایک اور روایت میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

”لَا يَكُوْنُ تَقِيًّا حَتّٰى يَكُوْنَ عَالِمًا، وَلَنْ يَكُوْنَ بِالْعِلْمِ جَمِيلًا حَتّٰى يَكُوْنَ بِهٖ عَامِلًا۔“ (حلیۃ الاولیاء ج:۱ص:۲۱۳)

ترجمہ: ”آدمی متقی نہیں بن سکتا جب تک کہ عالم نہ ہو، اور سچا عالم نہیں بن سکتا جب تک کہ عمل نہ ہو۔“

یوں کہتے ہیں کہ علم اور عمل یہ دونوں بھائی ہیں، علم آتا ہے تو اپنے ساتھ عمل کو بھی بلاتا ہے کہ تم بھی آجاؤ، اگر علم کے ساتھ عمل بھی آجائے تو ٹھیک ہے، ورنہ علم بھی چلا جاتا ہے۔

ایک بزرگ غالباً حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تھے، فرمایا کرتے تھے: ”تَعَلَّمْنَا الْعِلْمَ لِغَيْرِ اللّٰهِ، فَاَبٰى اَنْ يَّكُوْنَ اِلَّا لِلّٰهِ!“ ہم نے علم سیکھا تھا تو اللہ تعالیٰ کی رضا سامنے نہیں تھی، ایسے ہی سیکھتے رہے، غیر اللہ کے لئے سیکھتے رہے، اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں سیکھا تھا، مگر علم نے انکار کردیا کہ میں تو اللہ تعالیٰ کے لئے ہوں گا کسی اور کے لئے نہیں ہوں گا، چنانچہ علم آیا تو ساتھ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یاد بھی آئی، اگر علم آئے اور ساتھ کے ساتھ اللہ کی یاد بھی آئے تو سمجھو کہ یہ علم مقبول ہے، اور اگر علم آتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی یاد نہیں آتی تو جان لو کہ یہ علم مقبول نہیں ہے، مردود ہے۔ تو حکیم الاُمّت حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ: بندہ متقی نہیں ہو سکتا جب تک کہ عالم نہ ہو، اور سچا عالم نہیں بن سکتا جب تک کہ عمل نہ ہو، یعنی علم پر عمل نہ کرے۔

ایک روایت میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ:

"اِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ مَنْزِلَةً یَوْمَ الْقِیَامَةِ عَالِمًا لَا یَنْتَفِعُ بِعِلْمِهٖ۔"

(حلیۃ الاولیاء ج:۱ص:۲۲۳)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیامت کے دن سب سے بدترین مرتبے کا آدمی وہ ہوگا جو عالم ہواور اپنے علم سے نفع نہ اٹھائے۔"

اللہ تعالیٰ نے علم تو دیا ہے لیکن عالم صاحب گپ شپ میں مشغول ہیں، فضولیات اور لغویات میں مشغول ہے، اس سے نفع نہیں اٹھاسکا، یہ عالم اللہ کے نزدیک قیامت کے دن سب سے بدترین مرتبے کا آدمی ہوگا، نعوذ باللہ من ذالک! اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے علم پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت ابی برزۃ الاسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ترمذی ج:۲ ص:۶۷ پر ہے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو حسن صحیح کہا ہے کہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: قیامت کے دن بندے کے دونوں قدم اپنی جگہ سے ہلنے نہیں پائیں گے (کھڑا رہے گا)۔ فرمایا جائے گا کہ: چار سوالوں کا جواب دے دو اور چلے جاؤ!

پہلا سوال یہ ہے کہ اپنا جسم کس چیز میں بوسیدہ کیا؟ چھوٹا بچہ تھا، بڑا ہوگیا، بال سفید ہوگئے، اب چل بھی نہیں سکتا، کس چیز میں اس جسم کو بوسیدہ کیا ہے؟ پہلے اس سوال کا جواب دو۔

دوسرا سوال یہ کہ عمر کس چیز میں ضائع کی؟ کن کن مشغلوں میں ضائع کی؟ اللہ تعالیٰ نے عمر دی تھی، کسی کو تھوڑی دی تھی، کسی کو زیادہ دی تھی، یہ عمر کن کاموں میں خرچ کی؟ یہ ایک مستقل سوال ہے جس کا ہم میں سے ہر ایک نے جواب دینا ہے، ہمیں اس کا احساس ہی نہیں، ہم نے یہ عمر ضائع کی اور خوب ضائع کی، بے پروائی سے ضائع کی، گویا اپنے باپ دادا کی میراث سمجھ بیٹھے ہیں، حالانکہ یہ عمر تو اللہ تعالیٰ کا عطیہ تھا، اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔

تیسرا سوال، اس سوال کی دو شقیں ہیں، مال کہاں سے لیا اور کہاں خرچ کیا، چھوٹا سا سوال ہے، پوری زندگی کا نقشہ ہمارے سامنے آجائے گا، مال کہاں کہاں سے کمایا اور کہاں کہاں خرچ کیا؟ باقی تمام چیزوں کے بارے میں صرف ایک سوال لیکن مال کے بارے میں دو سوال، مال کو آدمی بڑی کوشش سے حاصل کرتا ہے اور خرچ بھی کرتا ہے بڑی محبت کے ساتھ۔

چوتھا سوال یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جتنا علم دیا تھا، ان میں سے کس بات پر عمل کیا؟ بس چار سوال، چار سوالات کا جواب دے دو اور جاؤ، امتحانی سوال بتادیتے ہیں حالانکہ ممتحن بتایا نہیں کرتے، لیکن یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیا کہ یہ چار سوال ہوں گے اور ان میں سے ایک سوال دو سوال کی جگہ ہے، گویا پانچ سوال ہوگئے، ان پانچ سوالوں کا جواب دے دو اور جاؤ، تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ:

''اِعْلَمُوْا مَاشِئْتُمْ اَنْ تَعَلَّمُوْا! فَلَنْ يَّأْجُرَ كُمُ اللهُ بِعِلْمِهٖ حَتّٰى تَعْمَلُوْا۔''

(حیاۃ الصحابۃ ج:۳ص:۲۵۰)

ترجمہ: ''جان لو! جتنا چاہو علم سیکھ لو! مگر یاد رکھو اللہ تعالیٰ تمہیں علم پر اس وقت تک اجر نہیں دیں گے جب تک کہ تم اس پر عمل نہ کرو گے!''

یعنی تم کتابیں اور رسالے پڑھ کر جتنا چاہو اپنی معلومات کا ذخیرہ جمع کرلو، بڑے زبردست علاّمہ بن جاؤ لیکن اللہ تعالیٰ تمہیں اس پر اجر نہیں دے گا، جب تک کہ اس پر عمل نہیں کرو گے۔ صرف کتابوں کے پڑھنے سے تمہیں اجر نہیں ملے گا، بلکہ اجر ملے گا علم پر عمل کرنے سے۔ اور اسی مضمون کی ایک روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، وہ فرمایا کرتے تھے:

''تَعَلَّمُوْا مَاشِئْتُمْ اَنْ تَعَلَّمُوْا! فَاِنَّ اللهَ لَا يَأْجُرُ كُمْ عَلَى الْعِلْمِ حَتّٰى تَعْمَلُوْا بِهٖ، اِنَّ الْعُلَمَاءَ هِمَّتُهُمُ الْوِعَايَةُ، وَاَنَّ السُّفَهَاءَ هِمَّتُهُمُ الرِّوَايَةُ۔''

(حیاۃ الصحابۃ ج:۳ص:۲۵۰)

ترجمہ: ''جتنا چاہو علم سیکھ لو تمہاری خوشی ہے، لیکن تمہیں اللہ تعالیٰ علم پر اجر نہیں دیں گے، بلکہ عمل پر اجر دیں گے، کہ اپنے علم میں سے کتنی چیزوں پر عمل کیا؟ اور فرماتے تھے کہ علماءُ کا کام بات کو ذہن میں رکھ کر اس پر عمل کرنا ہے، اور احمق لوگوں کا کام روایتیں کرتے رہنا ہے۔''

یعنی جیسے لوگ کہتے ہیں کہ ایک روایت یہ ہے، ایک روایت یہ ہے، ایک روایت یہ ہے، عالم صاحب روایتوں پر لگے ہوئے ہیں، یہ بھی اچھی بات ہے، بہت اچھی بات ہے، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ ان روایتوں میں سے عمل کتنی روایتوں پر کیا؟

حضرت سہل بن عبداللہ طستری رحمۃ اللہ علیہ کبھی کبھی مدرسے میں طالب علموں کے پاس چلے جایا کرتے تھے، یہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں ہیں، حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ ابھی چھوٹے اور نابالغ تھے تو حضرت سہل بن عبداللہ طستری رحمۃ اللہ علیہ کی بہن اپنے اس بچے کو بھی اپنے بھائی کے پاس چھوڑ گئی، ان کی بہن اپنے بھائی سے کہنے لگی: ان کو بھی کچھ اللہ اللہ سکھا دو، ایک دن حضرت سہل بن عبداللہ کی بہن مدرسہ میں آئیں، اتفاق سے حضرت سہل بن عبداللہ کھانا کھا رہے تھے، حضرت سہل بن عبداللہ طستری رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے اچھا کھانا تھا اور بھانجے یعنی حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایسا ہی معمولی سا کھانا تھا، ان کی بہن کہنے لگی: بھائی جی! بھانجے کے سامنے آپ نے کھانا ایسا ہی رکھا ہوا ہے، اور آپ مرغ اُڑا رہے ہیں؟ حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جب اپنی بہن کی یہ بات سنی تو وہ ہڈیاں جو جمع تھیں ان کو اِکٹھا کیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: ''قُمْ بِاِذْنِ

اللہ!" اللہ تعالیٰ کے حکم سے کھڑی ہو جاؤ! وہ مرغ بن کر اذان دینے لگا، حضرت سہل بن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ بہن سے کہنے لگے کہ: جب آپ کا بیٹا اس مرتبے کو پہنچے گا تو یہ بھی مرغ کھالیا کرے گا، ابھی تو اس کو یہی دال ہی کھانے دو! حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر سات سال تھی، اپنے ماموں کے ساتھ تہجد پڑھتے تھے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ حضرت سہل بن عبد اللہ طستری رحمۃ اللہ علیہ کبھی کبھی مدرسوں میں چلے جاتے تھے اور ان پڑھنے والوں سے فرمایا کرتے تھے: "یا اھل العلم! ادوا زکوٰۃ العلم!" (مولوی صاحبان! اپنے علم کی زکوٰۃ دیا کرو!) وہ طالب علم کہتے کہ: حضرت! علم کی زکوٰۃ کیا ہے؟ فرماتے: ایک سو حدیثوں میں سے ایک حدیث پر عمل کرلو! اب ہمارا مدرسہ شروع ہوگا، صحاح ستہ اور صرف بخاری شریف کے گیارہ بارہ سو صفحات ہیں، مسلم شریف، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور دوسری کتابیں علمائے کرام دھڑا دھڑ پڑھا رہے ہیں، کچھ طلبہ سمجھ لیں گے اور کچھ نہیں سمجھیں گے، لیکن ان طلبہ سے پوچھ لیجئے کہ اس پر کس نے عمل کیا ہے؟

حضرت سہل بن عبد اللہ طستری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: اے اہل علم! اپنے علم کی زکوٰۃ ادا کیا کرو۔ لوگ عرض کرتے کہ: حضرت! علم کی زکوٰۃ کیا ہے؟ فرمایا: ایک سو میں سے ایک حدیث پر عمل کرلو! چلو ایک سو میں سے نہیں ایک ہزار میں سے ایک پر عمل کرلو۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: علماء کا اہم مقصد علم کو محفوظ کرنا ہے، اور محفوظ کر کے اس پر عمل کرنا ہے، اور کچھ لوگوں کا مقصد روایت کر دینا ہے، ایک بات سنی اور آگے روایت کر دینا ہے اور بس!

فضیلتِ طلبِ علم

[حدیث: ۱۱۸۰] "عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ......، وَمَنْ سَلَکَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ بِهِ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ۔"

(صحیح مسلم ج: ۱۳، ص: ۲۱۲، حدیث نمبر: ۴۸۶۷، بَاب فَضْلِ الِاجْتِمَاعِ عَلَى تِلَاوَةِ الْقُرْآنِ وَعَلَى الذِّكْرِ)

ترجمہ: "حضرت ابو ذر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی راستے پر چلا علمِ دین سیکھنے کے لئے، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے اس کے لئے جنّت کا راستہ آسان فرما دیتے ہیں۔"

تشریح: اس حدیث میں فرمایا: جس شخص نے کوئی راستہ اختیار کیا طلبِ علم کے لئے، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے جنّت کا راستہ اس کے لئے آسان کر دیتے ہیں۔

یہاں علم سے علمِ دین مراد ہے، جس سے انسان کی عاقبت سنورے، اور یہ دین کے طالب علموں کے لئے بشارت ہے کہ وہ جتنا سفر کریں گے طلبِ علم کے لئے، اللہ تعالیٰ ان کے لئے اتنا ہی جنّت کا راستہ

آسان فرمادیں گے۔ صحیح بخاری میں قصہ لکھا ہے کہ ایک صحابی مدینہ سے چلے شام پہنچے، اُونٹ پر سوار تھے، ایک صحابیؓ کے گھر پہنچے اُونٹ پر بیٹھے بیٹھے ان کے دروازے پر دستک دی، انہوں نے پوچھا: کون ہے؟ تو فرمایا: میں مدینہ سے آیا ہوں، میں نے سنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث تمہیں یاد ہے، میں آپ کی زبان سے براہِ راست سننا چاہتا ہوں، انہوں نے یہ حدیث پڑھ دی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

''جو شخص علم حاصل کرنے کے لئے کسی راستے پر چلے، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے جنّت کا راستہ اس کے لئے آسان کردیتے ہیں۔''

بس یہ سنا اور واپس چلے، انہوں نے کہا بھی کہ سواری سے اُتریئے! اندر آیئے، دروازہ کھولتا ہوں، آرام فرمائیں۔ فرمایا: صرف اس مقصد کے لئے آیا تھا اور کوئی کام نہیں۔ وہیں سے واپس لوٹ گئے۔ آپ حضرات جو یہاں تشریف لائے ہیں حدیث سننے کے لئے، یہ بھی طلبِ علم میں شامل ہے۔

علم کی مثال بارش کی طرح ہے

[حدیث: ۱۱۸۱] ''عَنْ أَبِي مُوسَى......، إِنَّ مَثَلَ مَا بَعَثَنِيَ اللهُ بِهٖ عَزَّ وَجَلَّ مِنَ الْهُدَى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَصَابَ أَرْضًا فَكَانَتْ مِنْهَا طَائِفَةٌ طَيِّبَةٌ قَبِلَتِ الْمَاءَ فَأَنْبَتَتِ الْكَلَأَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيرَ، وَكَانَ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَكَتِ الْمَاءَ فَنَفَعَ اللهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوا مِنْهَا وَسَقَوْا وَرَعَوْا، وَأَصَابَ طَائِفَةً مِنْهَا أُخْرَى إِنَّمَا هِيَ قِيعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلَأً، فَذَلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِي دِينِ اللهِ وَنَفَعَهُ بِمَا بَعَثَنِيَ اللهُ بِهٖ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ، وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذَلِكَ رَأْسًا وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللهِ الَّذِي أُرْسِلْتُ بِهٖ۔''

(صحیح مسلم ج:۱۱، ص:۳۹۵، حدیث نمبر:۴۲۳۲، باب بَيَانِ مَثَلِ مَا بُعِثَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ...)

ترجمہ: ''حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: مثال اس علم اور ہدایت کی جس کے ساتھ اللہ نے مجھے بھیجا ہے اس بارش کی سی ہے جو پہنچی ایک زمین کو، پس اس کا ایک حصہ بہت عمدہ تھا جس نے پانی کو جذب کرلیا اور اس نے گھاس اور بہت سی سبزیاں اُگائیں، اور ان میں سے ایک حصہ سخت زمین کا تھا جس سے پانی کو روک لیا، پس اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے لوگوں کو نفع پہنچایا انہوں نے اس میں سے پیا، مویشیوں کو بھی سیراب کیا اور زمین کو بھی سیراب کیا، اور یہی بارش

ایک اور حصے کو پہنچی جو چٹیل میدان تھا، نہ وہ پانی روکے اور نہ وہ سبزہ اُگائے، سو یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے اللہ کے دِین میں تفقہ حاصل کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اس چیز کے ذریعے سے جس کے ساتھ مجھے بھیجا ہے نفع پہنچایا، اس نے خود بھی علم حاصل کیا اور دُوسروں کو بھی تعلیم دی، اور مثال اس شخص کی جس نے اس کی طرف سر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا، اور اس نے اللہ کی اس ہدایت کو قبول نہیں کیا جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں۔''

تشریح: اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے، علماء فرماتے ہیں کہ مثال کے ساتھ مشکل مضامین کو سمجھانا یہ حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے سچے جانشینوں کا کام ہے، مشکل سے مشکل مضمون کو وہ مثال کے ساتھ سمجھا دیتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے مختلف مواقع پر مختلف مثالیں بیان فرمائی ہیں مختلف مضامین کے لئے، پہلی حدیث میں آنحضرت ﷺ نے اس علم اور ہدایت کی مثال بیان فرمائی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا اور بھیجا تھا۔

فرمایا: یوں سمجھو کہ آسمان سے بارش نازل ہوئی اور زمین پر بارش برسی، اب زمین کی تین قسمیں ہوگئیں، ایک حصہ تو بہت ہی عمدہ اور زرخیز قسم کی زمین کا تھا، اس پر جو پانی برسا اس نے پانی کو جذب کرلیا اور اس پانی کی برکت سے اس زمین کی خفیہ صلاحیت بیدار ہوگئی، وہ زمین لہلہانے لگی اور اس نے سبزہ گھاس، پھل پھول، غلہ اور چارے بے شمار اُگل دیئے۔ اور زمین کا ایک ٹکڑا وہ تھا جو پکی زمین تھی لیکن تھی نشیب میں، یعنی گہرائی میں، بارش جو برسی تو پانی چاروں طرف سے سمٹ کر وہاں جمع ہوگیا اور ایک اچھا خاصا تالاب اور جزیرہ سا بن گیا، اس جمع شدہ پانی سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو بے حد نفع پہنچا، پینے کے بھی کام آیا، مویشیوں کو بھی سیراب کیا اور اس کے ذریعے آبپاشی بھی کی، زمینوں کو سیراب کیا اور کاشتکاری کی، بند بنائے۔ اور تیسری قسم اس زمین کی تھی جو چٹیل میدان تھا، سخت پتھریلی زمین اور بالکل میدان، پانی برسا اور بہہ گیا نہ زمین نے اس کو جذب کیا اور نہ جمع کر کے سمیٹ کر رکھا۔

سو حق تعالیٰ شانہٗ نے میرے ذریعے سے جو ہدایت بھیجی اور علم نازل فرمایا یہ گویا آسمانی بارش تھی، ہدایت کی بارش، اب ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے دِین کا فہم عطا فرمایا، تفقہ فی الدین نصیب فرمایا، وہ اس علم و ہدایت کے ساتھ خود منتفع ہوا، خود علم سیکھا اور دُوسروں کو بھی سکھایا۔ اور ایک شخص وہ تھا جس نے سر اُٹھا کے بھی نہیں دیکھا کون کیا کہتا ہے؟ اور اس ہدایت اور علم سے اس نے کوئی نفع نہیں اُٹھایا، اس حدیث شریف پر مشہور طالب علمانہ اِشکال ہوا کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو مثال بیان فرمائی تھی اس میں تو زمین کی تین قسمیں بیان کی تھیں، یعنی ایک وہ قسم جس نے پانی کو جذب کرلیا تھا اور اس کی وجہ سے وہ کھیتی کے ساتھ لہلہانے لگی تھی، غلے بھی اُگائے، پھل بھی پیدا ہوئے، پھول بھی پیدا ہوئے، گھاس اور چارہ بھی پیدا ہوا۔ دُوسری قسم ان

تالابوں اور جوہڑوں کی تھی جنہوں نے بارش کا پانی جمع کر لیا اور ایک عرصے تک اللہ کی مخلوق ان سے نفع اُٹھاتی رہی۔ اور تیسری قسم اس زمین کی تھی جو میدانی تھی لیکن پتھریلی، جو پانی کو جذب نہیں کر سکتی تھی، تو نہ اس نے پانی کو جذب کیا، نہ اس سے سبزہ اُگایا، یہ تین قسمیں ذکر کی تھیں، اور جس کے لئے مثال بیان کی اس میں صرف دو ہی قسمیں بیان فرمائی ہیں، ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے دِین میں تفقہ عطا فرمایا ہے اور اس نے اس ہدایت اور علم سے جس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا گیا تھا نفع اُٹھایا، خود بھی علم حاصل کیا اور لوگوں کو بھی تعلیم دی، اور دُوسری قسم اس شخص کی جس نے سر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ تو تیسری قسم کدھر چلی گئی؟ مثال اور ممثل لہٗ کے درمیان مطابقت نہیں ہوئی۔

جواب اس کا یہ ہے کہ وہاں بھی تقسیم دو حصوں میں ہوئی تھی، ایک وہ زمین جس نے آسمان سے نازل شدہ پانی سے فائدہ اُٹھایا، اور دُوسری وہ زمین جس پر اس پانی نے کوئی اثر نہیں کیا، اور اس نے اس پانی سے کوئی نفع نہیں اُٹھایا، پھر پہلی قسم کی دو قسمیں ہوگئی تھیں ایک منتفع اور دُوسری نافع، ایک تو وہ تھی جس نے خود بھی نفع اُٹھایا اور دُوسروں کو نفع پہنچایا، اور دُوسری قسم وہ تھی جس نے خود تو نفع نہیں اُٹھایا لیکن دُوسروں کو نفع پہنچایا، تو جس نے زمین پر پانی جذب کر لیا اور اس جذب کرنے کی وجہ سے اس کی صلاحیتیں بیدار ہوئیں اور اس نے سبزے اُگائے اس نے خود بھی نفع اُٹھایا اور اللہ کی مخلوق کو بھی نفع پہنچایا، اور ایک تالاب اور جوہڑ تھے اور بہت سارا پانی ایک جگہ جمع ہو گیا، لوگ اس کو اِستعمال کریں گے، اس سے آب پاشی کا کام لیں گے، مویشیوں کو سیراب کریں گے اور خود اپنے پینے کا پانی بھی وہاں سے مہیا کریں گے، لیکن اس تالاب کو کیا فائدہ پہنچا؟ خود ویسے کا ویسے ہی رہا۔

تو خلاصہ یہ نکلا کہ اس ہدایت کو قبول کرنے والے بھی دو قسم کے لوگ ہیں، یا یوں کہیں کہ اس ہدایت کو قبول کرنے کے اعتبار سے دو قسم کے لوگ ہیں، ایک وہ جنہوں نے ہدایت کو قبول کیا اور دُوسرے وہ جنہوں نے ہدایت کو قبول ہی نہیں کیا، یہ تو سرے سے محروم رہے، اور ہدایت کو قبول کرنے والے پھر دو قسم پر ہیں، ایک وہ جنہوں نے اس ہدایت اور علم کے مطابق خود بھی اپنے آپ کو ڈھالا اور دُوسروں کو بھی اس راستے پر لائے، خود بھی منتفع ہوئے، فائدہ اُٹھایا اور لوگوں کو بھی فیض پہنچایا، یہ مثال ہوگئی عالم باعمل کی کہ اپنے علم سے خود بھی فائدہ اُٹھاتا ہے اور اللہ کی دُوسری مخلوق بھی اس کے عمل سے فائدہ اُٹھاتی ہے، اور دُوسرا وہ شخص جس نے علم کو جمع تو کر لیا اور علم کا تالاب بن گیا اور لوگ اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں لیکن خود بے چارہ محروم ہے فائدہ نہیں اُٹھاتا، یہ ہوا عالم بے عمل، اس کے پاس علم تو ہے لیکن اس سے اس کی ذات کو فائدہ نہیں پہنچتا، ہاں! دُوسرے لوگ اس سے نفع اُٹھاتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے جو علم اور ہدایت نازل فرمائی اس سے منتفع

ہونے کی توفیق عطا فرمائے، ہم اپنی زندگیوں کو اس ہدایت کے مطابق ڈھالیں، اور اس بات کی بھی حرص رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق کو یہ فیض پہنچے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو 'رحمۃ للعالمین' بنا کر بھیجا گیا ہے اور آپ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے یہ رحمت نازل فرمائی ہے بارش بھی رحمت ہوتی ہے اور علم بھی رحمت۔

ہر ذی علم سے بڑھ کر بھی ایک عالم ہے

[حدیث:۱۱۸۲] "... أُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ ...، إِنَّ مُوسَى قَامَ خَطِيبًا فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ فَسُئِلَ أَيُّ النَّاسِ أَعْلَمُ فَقَالَ أَنَا، فَعَتَبَ اللهُ عَلَيْهِ إِذْ لَمْ يَرُدَّ الْعِلْمَ إِلَيْهِ، فَأَوْحَى اللهُ إِلَيْهِ إِنَّ لِي عَبْدًا بِمَجْمَعِ الْبَحْرَيْنِ هُوَ أَعْلَمُ مِنْكَ، قَالَ مُوسَى: يَا رَبِّ فَكَيْفَ لِي بِهِ؟ قَالَ تَأْخُذُ مَعَكَ حُوتًا فَتَجْعَلُهُ فِي مِكْتَلٍ فَحَيْثُمَا فَقَدْتَ الْحُوتَ فَهُوَ ثَمَّ، فَأَخَذَ حُوتًا فَجَعَلَهُ فِي مِكْتَلٍ ثُمَّ انْطَلَقَ وَانْطَلَقَ مَعَهُ بِفَتَاهُ يُوشَعَ بْنِ نُونٍ حَتَّى إِذَا أَتَيَا الصَّخْرَةَ وَضَعَا رُءُوسَهُمَا فَنَامَا وَاضْطَرَبَ الْحُوتُ فِي الْمِكْتَلِ فَخَرَجَ مِنْهُ فَسَقَطَ فِي الْبَحْرِ {فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا} وَأَمْسَكَ اللهُ عَنِ الْحُوتِ جِرْيَةَ الْمَاءِ فَصَارَ عَلَيْهِ مِثْلَ الطَّاقِ فَلَمَّا اسْتَيْقَظَ نَسِيَ صَاحِبُهُ أَنْ يُخْبِرَهُ بِالْحُوتِ فَانْطَلَقَا بَقِيَّةَ يَوْمِهِمَا وَلَيْلَتَهُمَا حَتَّى إِذَا كَانَ مِنَ الْغَدِ قَالَ مُوسَى {لِفَتَاهُ آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا} قَالَ وَلَمْ يَجِدْ مُوسَى النَّصَبَ حَتَّى جَاوَزَا الْمَكَانَ الَّذِي أَمَرَ اللهُ بِهِ فَقَالَ لَهُ فَتَاهُ {أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسَانِيهِ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا} قَالَ فَكَانَ لِلْحُوتِ سَرَبًا وَلِمُوسَى وَلِفَتَاهُ عَجَبًا، فَقَالَ مُوسَى: {ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِي فَارْتَدَّا عَلَى آثَارِهِمَا قَصَصًا} قَالَ رَجَعَا يَقُصَّانِ آثَارَهُمَا حَتَّى انْتَهَيَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِذَا رَجُلٌ مُسَجًّى ثَوْبًا فَسَلَّمَ عَلَيْهِ مُوسَى فَقَالَ الْخَضِرُ: وَأَنَّى بِأَرْضِكَ السَّلَامُ؟ قَالَ: أَنَا مُوسَى، قَالَ مُوسَى بَنِي إِسْرَائِيلَ؟ قَالَ: نَعَمْ، أَتَيْتُكَ لِتُعَلِّمَنِي مِمَّا عُلِّمْتَ رَشَدًا قَالَ {إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا} يَا مُوسَى! إِنِّي عَلَى عِلْمٍ مِنْ عِلْمِ اللهِ عَلَّمَنِيهِ لَا تَعْلَمُهُ أَنْتَ وَأَنْتَ عَلَى عِلْمٍ مِنْ عِلْمِ اللهِ عَلَّمَكَهُ اللهُ لَا أَعْلَمُهُ فَقَالَ مُوسَى {سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا} فَقَالَ لَهُ الْخَضِرُ {فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّى أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا} فَانْطَلَقَا يَمْشِيَانِ

عَلٰى سَاحِلِ الْبَحْرِ فَمَرَّتْ سَفِينَةٌ فَكَلَّمُوهُمْ أَنْ يَحْمِلُوهُمْ فَعَرَفُوا الْخَضِرَ فَحَمَلُوهُمْ بِغَيْرِ نَوْلٍ فَلَمَّا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ لَمْ يَفْجَأْ إِلَّا وَالْخَضِرُ قَدْ قَلَعَ لَوْحًا مِنْ أَلْوَاحِ السَّفِينَةِ بِالْقَدُومِ فَقَالَ لَهُ مُوسٰى قَوْمٌ قَدْ حَمَلُونَا بِغَيْرِ نَوْلٍ عَمَدْتَ إِلٰى سَفِينَتِهِمْ فَخَرَقْتَهَا {لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا قَالَ أَلَمْ أَقُلْ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا} قَالَ: وَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتِ الْأُولٰى مِنْ مُوسٰى نِسْيَانًا، قَالَ وَجَاءَ عُصْفُورٌ فَوَقَعَ عَلٰى حَرْفِ السَّفِينَةِ فَنَقَرَ فِي الْبَحْرِ نَقْرَةً فَقَالَ لَهُ الْخَضِرُ مَا عِلْمِي وَعِلْمُكَ مِنْ عِلْمِ اللّٰهِ إِلَّا مِثْلُ مَا نَقَصَ هٰذَا الْعُصْفُورُ مِنْ هٰذَا الْبَحْرِ ثُمَّ خَرَجَا مِنَ السَّفِينَةِ فَبَيْنَا هُمَا يَمْشِيَانِ عَلَى السَّاحِلِ إِذْ أَبْصَرَ الْخَضِرُ غُلَامًا يَلْعَبُ مَعَ الْغِلْمَانِ فَأَخَذَ الْخَضِرُ رَأْسَهُ بِيَدِهِ فَاقْتَلَعَهُ بِيَدِهِ فَقَتَلَهُ فَقَالَ لَهُ مُوسٰى {أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَاكِيَةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا} قَالَ وَهٰذِهِ أَشَدُّ مِنَ الْأُولٰى {قَالَ إِنْ سَأَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِي قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَدُنِّي عُذْرًا فَانْطَلَقَا حَتّٰى إِذَا أَتَيَا أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَنْ يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ} قَالَ مَائِلٌ فَقَامَ الْخَضِرُ فَأَقَامَهُ بِيَدِهِ فَقَالَ مُوسٰى قَوْمٌ أَتَيْنَاهُمْ فَلَمْ يُطْعِمُونَا وَلَمْ يُضَيِّفُونَا {لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ إِلٰى قَوْلِهِ ذٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا} فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَدِدْنَا أَنَّ مُوسٰى كَانَ صَبَرَ حَتّٰى يَقُصَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا مِنْ خَبَرِهِمَا۔"

(صحیح بخاری ج:۱۴، ص:۳۴۷، حدیث نمبر:۴۳۵۶، باب {وَإِذْ قَالَ مُوسٰى لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتّٰى أَبْلُغَ...)

تشریح: اس حدیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا ہے، سورۂ کہف میں پندرھویں پارے کے آخر اور سولہویں پارے کے شروع میں یہ قصہ اللہ تعالیٰ نے مفصل ذکر فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قصے کو ذکر فرما کر اس میں کچھ افادات فرمائے ہیں۔

فرمایا: قصہ یہ ہوا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دفعہ بنی اسرائیل میں خطبہ دینے کے لئے، وعظ فرمانے کے لئے کھڑے ہوئے، کسی نے پوچھا کہ: اے موسیٰ! اس وقت سب سے بڑا عالم کون ہے؟ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں ان سے بڑا عالم کون ہوسکتا تھا؟ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "أنا!" میں سب سے بڑا عالم ہوں، اور بالکل بجا فرمایا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہیں اس علم کو اللہ کے سپرد کرنا چاہئے

تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ کون بڑا عالم ہے، یہ نہیں کہنا چاہئے تھا کہ کہ میں بڑا عالم ہوں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ میرا ایک بندہ ہے ''مجمع البحرین'' میں جہاں دو پانی ملتے ہیں، وہ تجھ سے بڑا عالم ہے۔ یہاں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات ناپسند ہے، اپنی طرف آدمی بڑائی کی نسبت کرے، یہ اچھا نہیں لگتا جیسا کہ میں نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ربّ کے اولوالعزم رسول تھے، اور اس وقت کے تمام لوگ ان کے تابع تھے، تو بلاشبہ اس وقت وہ شریعت کے سب سے بڑے عالم تھے، لیکن ان کا یہ فرمانا کہ ''میں بڑا عالم ہوں'' اللہ تعالیٰ کو ناپسند تھا۔

موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: یا اللہ! میں ان صاحب تک کیسے پہنچ سکتا ہوں؟ فرمایا: ایسا کرو کہ ایک مچھلی تل کرلے جاؤ جہاں وہ صاحب ہوں گے وہاں وہ مچھلی زندہ ہوجائے گی، تلی ہوئی مچھلی دوبارہ زندہ ہوجائے گی تو جہاں تم اس مچھلی کو گم پاؤ، وہ نہ ملے تو سمجھ لو کہ وہ صاحب اس جگہ ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مچھلی لی اور اس کو تل کر اپنے توشہ دان میں رکھ لیا، چل پڑے اور ان کے ساتھ ان کے خادم حضرت یوشع بن نون بھی تھے، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ان کے خادم تھے اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوّت عطا فرمائی، ان کے معاون اور وزیر حضرت ہارون علیہ السلام تھے، لیکن ان کا انتقال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ہوگیا تھا، چنانچہ ان کے بعد حضرت یوشع بن نون حضرت موسیٰ کے خادم تھے۔ بہرکیف! حضرت موسیٰ علیہ السلام چل پڑے اور اپنے ساتھ اپنے خادم حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو بھی ساتھ لے لیا، ظاہر ہے کہ وہ مچھلی اور توشہ دان بھی خادم ہی کے پاس ہوگا۔

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ آدمی خواہ کتنا بڑا عالم ہی کیوں نہ ہو، اس کو طلبِ علم سے عار نہ کرنا چاہئے، جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ: ہمارا ایک بندہ ہے جو تم سے بڑا عالم ہے۔ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ ان کا علم اور تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم اور تھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اس شوق میں کہ ایک صاحب سے بھی بڑے عالم موجود ہیں، ان سے استفادہ کرنا چاہئے، چل پڑے، جب مجمع البحرین میں پہنچے جہاں اللہ تعالیٰ نے پتا بتایا تھا، ذرا آرام کرنے لگے، خادم جاگ رہے تھے، اس توشہ دان کے اندر سے مچھلی کودی اور دریا میں چلی گئی اور دریا میں اس کے جانے سے راستہ سا بن گیا، جب ایک چٹان پر پہنچے وہاں کسی چٹان کے ساتھ سر لگا کر دونوں سو گئے، مچھلی میں حرکت ہوئی اور وہ توشہ دان سے نکل کر دریا میں چلی گئی، اور اس نے سرنگ کی شکل میں اپنا راستہ بنالیا اور اللہ تعالیٰ نے مچھلی سے پانی گزرنے کو روک لیا اور ایک سرنگ سی بن گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے تو آگے چلنے کے لئے کہا، خادم کو یہ بات بتانا یاد نہیں رہی کہ وہ مچھلی تو پانی میں چلی گئی ہے، چنانچہ چلتے رہے تھے باقی دن اور رات یہاں تک کے اگلا دن ہوگیا، تو موسیٰ علیہ السلام نے خادم سے فرمایا: ﴿اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۡ لَقَدۡ لَقِیۡنَا مِنۡ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾﴾ (الکھف) کچھ کھانا لاؤ، آج کے سفر سے

تو بہت ہی تعجب ہوا ہے، بہت تھکن ہوگئی۔ اب تک جو چلتے رہے تھے کبھی تھکن نہیں ہوئی اور اب چونکہ منزل سے آگے چلنا شروع کر دیا تو تھکن ہوگئی۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تھکن کا احساس نہیں ہوا یہاں تک کہ اس جگہ سے تجاوز فرما گئے جس جگہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم فرمایا تھا، چونکہ اپنی منزل سے آگے نکل گئے اس لئے تھکن کا احساس ہوا۔ تو جب موسیٰ علیہ السلام نے توشہ دان منگوایا تو خادم نے کہا کہ: وہ جو ہم نے چٹان کے پاس آرام کیا تھا وہاں مچھلی زندہ ہو کر پانی میں چلی گئی تھی، لیکن اس کا بتانا مجھے یاد نہیں رہا، اور شیطان نے اس کا تذکرہ بھلا دیا، اور اس نے تو عجیب طریقے سے راستہ بنالیا۔ فرمایا: ﴿قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ﴾ (الکہف: ٦٤) یہی تو ہم تلاش کر رہے تھے۔

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: مچھلی کے لئے دریا میں سرنگ جیسا راستہ بن گیا اور اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم کو تعجب ہوا، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہی تو ہم تلاش کرنے آئے تھے، بندۂ خدا وہاں بتایا ہوتا۔ پچھلے پاؤں لوٹے اپنے نشانِ قدم کو دیکھتے ہوئے، جب واپس پہنچ گئے اس چٹان کے پاس تو دیکھا کہ ایک آدمی ہے اس نے کپڑا اوڑھا ہوا ہے، لپٹا ہوا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو سلام کیا: **السلام علیکم**، حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: اس سرزمین میں سلام کہنے والا کون آ گیا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں موسیٰ بن عمران ہوں، کہا: کون سے موسیٰ؟ وہ موسیٰ جو بنی اسرائیل کے نبی ہیں وہ؟ فرمایا: جی ہاں! اور میں آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ ہدایت کی جو باتیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو تعلیم فرمائی ہیں آپ مجھے سکھائیں، حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ: ﴿اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا﴾ (الکہف) آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے، آپ سے میرے ساتھ نہیں چلا جائے گا، اور فرمایا کہ: آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایک علم عطا فرمایا ہے جو مجھے نہیں دیا اور مجھے ایک علم عطا فرمایا ہے جو آپ کے بس کا نہیں، میں جب وہ کام کروں گا تو آپ اپنی شریعت کا ڈنڈا اُٹھالیں گے اور مجھے ٹوکیں گے، تو ہماری نبھے گی نہیں۔

یہاں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ عالم اور طالبِ علم کے درمیان مناسبت کا ہونا ضروری ہے، اس مناسبت کے بغیر استفادہ نہیں ہوسکتا، بات یہ ہے کہ بعض باتیں طالبِ علم کی سطح سے نیچے کی ہوں گی وہ اس کو نہیں سمجھ میں آئیں گی، اس وقت اگر طالبِ علم اُستاذ پر نکیر کرے گا تو اس کی طبیعت متاثر ہوگی اور استفادہ بند ہو جائے گا، اور اگر ساتھ چلتا رہے کہ کچھ باتیں سمجھ میں نہیں آئی تھیں آئندہ آ جائیں گی، تو اُستاذ پر نکیر نہ کرے تو حق تعالیٰ شانہٗ علوم کا فیضان فرما دیتے ہیں۔

بعض اکابر فرماتے ہیں کہ علم صرف اُستاذ سے نہیں آتا، اُستاذ تو بیچ میں واسطہ ہیں، علوم براہِ راست حق تعالیٰ شانہٗ کی جانب سے القاء ہوتے ہیں لیکن واسطہ درمیان میں شرط ہے اور اگر واسطہ کو آدمی گدلا کر دے تو گدلا ہو کر علم آئے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ پائپ سے پانی آ رہا ہے، جہاں سے پائپ شروع

ہو رہا ہے وہاں مٹی پڑی ہو تو پانی گدلا ہو کر آئے گا۔ تو یہاں سے ایک ادب یہ معلوم ہوا کہ اُستاذ پر نکیر نہ کی جائے اور اس کی بیعت مکدّر نہ کی جائے، ہاں! سمجھنے کے لئے سوال کر سکتا ہے بلکہ یوں کہتے ہیں: ''شاگرد یکہ چرا نکند، و مرید یکے چرا کند ہر دو را در چراگاہ بافرستاذ'' جو طالبِ علم کہ اپنے اُستاذ کے سامنے چون و چرا نہ کرے، بات کو سمجھے نہیں، جو کچھ سن لیا بزاُ خفش کی طرح سر ہلا دیا کہ ٹھیک ہے، اور جو شخص کہ شیخ کی تجویز پر چون و چرا کرے کہ یہ کیوں؟ فرمایا: ان دونوں کو چراگاہ میں بھیجو کہ یہ انسان نہیں چراگاہ میں جا کے چریں۔

حضرت حکیم الاُمت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس کی مثال ایسی ہے ایک حکیم محمود خاں ہوتے تھے، دِلّی میں ان کے ایک شخص علاج کے لئے گیا، انہوں نے نسخہ تجویز کیا، فلاں چیز اتنے وزن، فلاں چیز اتنا وزن، وہ کہنے لگا: حضور! یہ چیز اتنے وزن کی کیوں لکھی؟ تو وہ کہنے لگے کہ: میاں! تم طب پڑھنے کے لئے نہیں آئے ہو، اپنا علاج کروانے کے لئے آئے ہو، اور اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ اتنے وزن کی کیوں لکھی ہے تو مطب میں میرے ساتھ آ کر بیٹھو، شاگردی اختیار کرو پھر بتاؤں گا کہ کیوں لکھی؟

تو شیخ فرمایا کرتے تھے کہ مرید تو شیخ کے پاس اصلاح کے لئے جاتا ہے کہ وہ جو نسخہ تجویز کرے اس پر عمل کرے، اس کا کام نہیں ہے مطب پوچھنا، ہاں! کوئی پڑھنے کے لئے آئے تو وہ ضرور سوال پوچھے، حضرت شیخ فرماتے تھے: ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا: آپ کے معمولات کیا ہیں؟ مجھے بڑا غصہ آیا، یہ بھی خلافِ ادب ہے کہ شیخ سے پوچھا جائے کہ آپ کے معمولات کیا ہیں؟ اس کے تو کوئی بھی معمولات نہیں ہیں۔ تو غرضیکہ طلبِ علم کے آداب میں سے یہ ہے کہ اُستاذ پر بے جا نکیر نہ کی جائے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں صبر کروں گا۔ جب حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا تھا: آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے، اس لئے کہ میں ایک علم پر ہوں جو اللہ نے مجھے سکھایا ہے آپ اس کو نہیں جانتے، اور آپ اللہ کی جانب سے ایک علم پر ہیں جو اللہ نے آپ کو سکھایا ہے وہ میں نہیں جانتا، یہ دونوں علم الگ الگ ہیں۔ وہ علم جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ہے وہ حضرت خضر علیہ السلام کے پاس نہیں، اور جو علم حضرت خضر علیہ السلام کے پاس ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس نہیں، اس علم کے لئے حضرت خضر کو موسیٰ کے پاس جانا پڑے گا، وہ اس علم میں حضرت موسیٰ کے محتاج ہیں۔ اور دُوسرے علم کی حضرت موسیٰ کو ضرورت ہو تو حضرت خضر سے ملنا پڑے گا۔ یہ دونوں الگ الگ علم تھے، ایک علم ہے شریعت کا جس کو ''علم تشریع'' کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کن باتوں سے راضی ہوتے ہیں اور کن باتوں سے ناراض ہوتے ہیں؟ یہ علم انبیاء علیہم السلام کے واسطے سے دیا جاتا ہے۔ اور ایک علم ہے تکوین کا کہ اللہ تعالیٰ دُنیا میں کیا کر رہے ہیں، اس کے اسرار کیا ہیں؟ یہ وہ علم ہے جس کو ''تکوینیات کا علم'' کہتے ہیں اور اسی کو ''علمِ مکاشفہ اور اسرار'' بھی کہتے ہیں، اس علم کو قربِ خداوندی میں کوئی دخل نہیں، اس کی وجہ سے بندے کو قرب حاصل نہیں ہوتا، حضراتِ اولیاء پر بعض اُمور کو منکشف کر دیا جاتا ہے اور ان حضرات کے کچھ مکاشفات

ہیں، لیکن اس کا قرب سے کوئی تعلق نہیں۔ قربِ خداوندی ان علوم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جو حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کے ذریعے سے حاصل ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ حضرات فرماتے ہیں کہ اولیاء دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جنہوں نے شیخ کی صحبت میں رہ کر سلوک طے کیا ہو، ان کی نگرانی میں، ان کا فیض اور سلسلہ حق تعالیٰ شانہٗ آگے چلاتے ہیں، اور ایک وہ جو کسی شیخ کی خدمت میں نہیں گئے، مست الست ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان پر اسرار کھول دیئے ہیں، ان کا سلسلہ آگے نہیں چلتا، جیسے کہ درخت جو بیجا جاتا ہے اس کے بیج کا سلسلہ تو آگے چلتا ہے، لیکن یہ جو خودرو پودے ہوتے ہیں ان کا سلسلہ آگے نہیں چلتا۔

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے علوم اشرف ہیں، اور اعلیٰ وارفع ہیں، بہ نسبت ان مکاشفات اور تکوینی علوم کے، یا یوں کہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم افضل ہے بہ نسبت حضرت خضر علیہ السلام کے علم کے۔

خیر! موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: آپ انکار نہ فرمائیں مجھے ساتھ رکھنے سے، میں آپ سے کچھ سیکھنا چاہتا ہوں۔ فرمایا: ٹھیک ہے، اگر آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے تو ایک شرط ہے کہ جو کام میں کروں آپ اس کے بارے میں پوچھیں گے نہیں جب تک کہ میں خود نہ بتاؤں۔ فرمایا: ٹھیک! اب دریا کے کنارے کنارے چلے ایک کشتی گزری حضرت خضر علیہ السلام نے ان سے بات کی کہ دریا سے پار ہونا چاہتے ہیں ہمیں بھی سوار کرلیں، یہ لوگ حضرت خضر کو جانتے تھے انہوں نے بہت ہی تعظیم کی اور ان حضرات کو سوار کرلیا اور ان سے اُجرت بھی نہیں لی کہ آپ سے کیا پیسے لینے۔ جب کشتی میں سوار ہوگئے اور کشتی چل پڑی تو حضرت خضر اُٹھے اور کلہاڑا لے کر کشتی کا تختہ اُکھاڑ دیا، حضرت موسیٰ نے فرمایا: آپ نے ان کو عجیب بدلہ دیا، ان بے چاروں نے ہمیں اُجرت کے بغیر سوار کرلیا تھا اور آپ نے ان کی کشتی توڑ ڈالی، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کشتی میں پانی بھر جائے گا سارے لوگ ڈوب جائیں گے، آپ نے کشتی کو توڑ دیا تاکہ آپ کشتی والوں کو ڈبو دیں، آپ نے تو بہت ہی سخت کام کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ آگیا، اس پر حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ نہیں چل سکتے، آپ ہر جگہ اپنی شریعت کا فتویٰ لائیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت موسیٰ کا یہ کہنا بھول کی وجہ سے تھا، وہ بھول گئے تھے۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا: میں بھول گیا تھا۔ فرمایا: بہت اچھا! دریا سے پار ہوگئے، آگے ایک بستی میں پہنچے وہاں کچھ بچے کھیل رہے تھے، ایک بچہ بہت ہی خوبصورت، بہت ہی پیارا، حضرت خضر نے اس کو پکڑا اور گردن مروڑ کر سر جدا کردیا، حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ: ایک معصوم جان کو بغیر کسی قصور کے آپ نے قتل کردیا، آپ نے بہت منکر، گندا اور بُرا کام کیا۔ پہلے ''اِمْرًا'' کہا تھا اب ''نُكْرًا'' کہا۔

رسولِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جب حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کشتی میں سوار تھے تو ایک چڑیا

آئی اور کشتی کے کنارے بیٹھ گئی، اس نے ایک چونچ پانی میں ڈالی اور پانی پیا، تو اس پر حضرت خضر نے فرمایا کہ: اے موسیٰ! میرا اور آپ کا علم اللہ تعالیٰ کے عِلم کے مقابلے میں اتنا سا ہی ہے جتنا کہ چڑیا نے جو پانی چونچ میں لیا ہے دریا کے پانی کے مقابلے میں، میرا اور آپ کا علم، وہ تشریعیات کے عالم اور اِمام اعظم ہیں اور یہ تکوینیات کے، لیکن دونوں کے بارے میں فرمایا کہ: میرا اور آپ کا علم اللہ کے مقابلے میں اتنا سا ہے جتنا اس دریا سے اس چڑیا کی چونچ میں آنے والا پانی۔ اورا کابر فرماتے ہیں کہ یہ بھی بطورِ تمثیل کے فرمایا، ورنہ یہ بھی حقیقت نہیں، اس لئے پانی کا جو قطرہ چڑیا کی چونچ سے لگا اس کا کچھ نہ کچھ مقابلہ تو دریا سے ہوسکتا ہے، جبکہ مخلوق کے علم کا اللہ کے علم سے کوئی مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور یہ اس لئے بتادیا تھا کہ حضرت موسیٰ ''أنا أعلم'' ''میں زیادہ علم والا'' نہ کہیں۔ دریا کے کنارے بیٹھ کر اگر چڑیا تھوڑا سا پانی پی لے تو اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ یہ کہے کہ سب سے بڑا دریا میرے پاس ہے۔

بہرحال! بچے کو قتل کیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نکیر فرمائی، تو حضرت خضر نے فرمایا: بھائی! میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ تم میرے ساتھ نہیں چل سکتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت موسیٰ کا جملہ پہلے سے زیادہ سخت تھا۔ پہلے فرمایا تھا: ''آپ نے بہت سخت کام کیا'' اس بار فرمایا کہ: ''بہت منکر، بُرا کام کیا'' حضرت موسیٰ بھی سمجھ گئے کہ میں ان کے ساتھ نہیں چل سکتا، فرمانے لگے: بس ایک موقع اور دے دیجئے، آئندہ اگر پھر نہ چل سکے تو پھر معذور ہوں گے، اس کے بعد میں اگر سوال کروں تو پھر مجھے اپنے ساتھ نہ رکھئے، میری جانب سے آپ عذر کو پہنچ گئے۔

چنانچہ پھر آگے چل پڑے، آگے ایک بستی میں گئے، وہ کونسی بستی تھی؟ اس میں حضراتِ مفسرین نے کافی بحث کی ہے، وہ ''انطاکیہ'' بستی تھی، ان لوگوں سے کہا: ہم مسافر ہیں، مہمان ہیں، کچھ کھانا کھلاؤ، کل تین آدمی وہ بھی جو اس وقت رُوئے زمین کے سب سے برگزیدہ انسان ہیں، لیکن بستی والے ایسے نیک بخت نکلے کہ مانگنے پر بھی روٹی نہیں دی، خیر کیا کہتے؟ بستی سے باہر نکلے تو ایک دیوار گرنے والی تھی، حضرت خضر علیہ السلام نے ہاتھ کا ایسے اشارہ کیا اور دیوار سیدھی کردی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پھر رہا نہ گیا، فرمایا: احسان اور مروّت کا برتاؤ انسان کو کرنا چاہئے مگر ایسے کمینوں کے ساتھ جنھوں نے پانی کا گھونٹ دینا بھی پسند نہ کیا، آپ ان کے ساتھ احسان کرتے ہیں، اگر آپ چاہتے تو اسی کی مزدوری لے لیتے کہ تمہاری دیوار بنائی ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: ﴿هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ﴾ (الکھف:۷۸) یہ میری اور آپ کی جدائی کا وقت آگیا۔ آپؑ نے پھر اعتراض کردیا، اب میں آپ کو تمام چیزوں کے اسرار اور بھید بتاتا ہوں جن پر آپ صبر نہیں کرسکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے قصہ ذکر نہیں فرمایا، بس اتنا فرمایا کہ اے کاش! کہ موسیٰ کچھ دن اور صبر کرلیتے تو ہمیں کچھ اور باتیں معلوم ہوجاتیں۔

زبان سیکھنے کا حکم

[حدیث:۱۱۸۳] "...قَالَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ ...، إِنِّي وَاللهِ مَا آمَنُ يَهُودَ عَلٰى كِتَابِي... قاله لما أمَرَهُ أنْ يَتَعَلَّمَ كِتَابَ الْيَهُودِ۔"

(سنن اَبی داؤد ج:۱۰،ص:۵۳، حدیث نمبر:۳۱۶۰، بَاب رِوَايَةِ حَدِيثِ أَهْلِ الْكِتَابِ)

(سنن بخاری ج:۲۲،ص:۱۳۳، بَاب تَرْجَمَةِ الْحُكَّامِ وَهَلْ يَجُوزُ تَرْجُمَانٌ وَاحِدٌ)

ترجمہ: "حضرت زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: البتہ مجھ کو اللہ کی قسم! اپنے خط لکھانے پڑھانے میں یہود پر اعتماد نہیں، یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے اس وقت ارشاد فرمائی تھی جبکہ ان کو حکم دیا تھا کہ یہودیوں کی زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھ لو۔"

تشریح: اس حدیث میں بھی ایک قصہ ہے، وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مختلف قسم کے خطوط آتے تھے، ان میں سے بعض خطوط یہودیوں کی عبرانی یا سریانی زبانوں میں لکھے ہوتے تھے، اور چونکہ مسلمانوں کی اپنی جماعت میں کوئی اس زبان کو جانتا نہیں تھا، ناچار اس کے لئے کسی یہودی کو بلوانا پڑتا تھا کہ اس کا ترجمہ کرو۔ ایک دن حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاتبِ وحی تھے اور نوجوان تھے، ان سے فرمایا: میں یہودیوں کو بلواتا ہوں خطوط پڑھنے کے لئے، لیکن مجھے اطمینان نہیں ہوتا، خدا جانے کیا گڑبڑ کرتے ہوں گے، تو تم ان کی زبان کیوں نہیں سیکھ لیتے تا کہ آئندہ لکھنے پڑھنے میں دِقت نہ ہو اور ہمیں ان کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ کہا: بہت اچھا! چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہودیوں کی جو اپنی زبان تھی جس میں توریت لکھی ہوئی تھی اور جس میں وہ خط و کتابت کرتے تھے، وہ چھ مہینے میں کامل مکمل طور پر سیکھ لی، یعنی اس کو پڑھنا لکھنا بولنا سیکھ لیا، اس زبان میں خط بھی تحریر فرما لیتے تھے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توجہاتِ عالیہ کا گویا کہ معجزہ تھا اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی کرامت تھی کہ چھ ماہ میں کسی زبان پر اتنا عبور حاصل کر لے کہ تمام کتابوں کو پڑھ بھی سکے، تحریر بھی کر سکے۔

کتابُ الإعتصام بالکتاب والسُّنَّة

سنّت اور بدعت کا بیان

[حدیث:۱۱۸۴] "عَنْ عَلِيٍّ اِنَّ عَوَازِمَ الْاُمُوْرِ اَفْضَلُهَا، وَاِنَّ مُحْدَثَاتِهَا شِرَارُهَا، وَ کُلُّ مُحْدَثٍ بِدْعَةٌ، وَ کُلُّ مُحْدِثٍ مُبْتَدِعٌ، وَمَنِ ابْتَدَعَ فَقَدْ ضَيَّعَ، وَمَا اَحْدَثَ مُحْدِثٌ بِدْعَةً اِلَّا تَرَکَ بِهَا سُنَّةً، اَلْمَغْبُوْنُ مَنْ غَبِنَ دِيْنَهُ وَ الْمَغْبُوْنَ مَنْ خَسِرَ نَفْسَهُ" (البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۳۰۸)

ترجمہ: "حضرت علی رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں: جو امور کہ پختہ ہوں وہ سب سے افضل ہیں، اور بے شک جو کام نئے نئے ایجاد کئے جائیں وہ سب سے بدتر ہیں، ہر نئی ایجاد کی ہوئی چیز بدعت ہے، اور ہر نئی چیز ایجاد کرنے والا مبتدع اور بدعتی ہے، اور جس نے کوئی نئی چیز ایجاد کی اس نے اپنے دین کو ضائع کر دیا، اور جس شخص نے کوئی بدعت ایجاد کی اس کی نحوست سے اس نے سنّت کو ترک کر دیا، خسارہ میں وہ شخص ہے جس نے اپنے دین کو ہار دیا ہو، اور خسارہ میں وہ شخص ہے جس نے اپنے نفس سے خسارہ پایا ہو۔"

تشریح: یہ امیر المؤمنین حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے خطبہ کے چند فقرے ہیں:

ارشاد فرماتے ہیں: "اِنَّ عَوَازِمَ الْاُمُوْرِ اَفْضَلُهَا" سب سے پختہ اعمال وہ ہیں جو کہ پابندی اور پختگی کے ساتھ کئے جائیں، اور سب سے بدتر کام وہ ہیں جو "محدثاتھا" نئے ایجاد کئے جائیں۔

کیا دین ناقص تھا؟

کچھ لوگوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو نامکمل سمجھ کر اپنی طرف سے اس میں اضافہ شروع کر دیا، عبادت کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے ہیں، یہ ختم شریف اور گیارہویں شریف تو چلتے ہی

تھے، اب جلوس بھی شروع ہو گئے ہیں، عرس شریف، جلوس شریف، میلہ شریف، نامعلوم کیا کیا شریف؟ اور کچھ لوگوں نے حرمین شریفین کے علاوہ نجف شریف، کربلاء شریف، بغداد شریف، وغیرہ لگانے شروع کئے ہیں، غالباً یہ نئی نئی بدعتیں ایجاد کرنے والے سمجھتے ہیں کہ حضور ﷺ کا دین مکمل نہیں تھا، اب یہ اس کی تکمیل کرنے چلے ہیں۔ نعوذ باللہ!

بدعت کی نحوست:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص بدعت کی ایجاد کرے، اس کی سب سے پہلی نحوست یہ ہے کہ اس سے سنّت چھوٹ جاتی ہے، جب یہ لوگ کوئی نئی بات گھڑتے ہیں تو الٹا کہتے ہیں کہ جی اس میں کیا حرج ہے؟

اہلِ بدعت کی اُپچ:

آج ہی ایک خاتون کا ٹیلی فون آیا (برسی کر رہے تھے، گھر کے لوگ برسی کرتے ہیں، اور اس کا کوئی دستور ہوگا، انہوں نے مقرر کیا ہوگا، تمام چیزیں رکھ دی جاتی ہیں، گھر کے تمام افراد جمع ہو جاتے ہیں، مرد، عورتیں، بچے سب جمع ہو جاتے ہیں۔ اور مولوی صاحب آ کر ختم شریف پڑھتے ہیں)، اس نے مجھے بتلایا اور کہنے لگی کہ: میں تمام چیزیں تیار کر کے رکھ دیتی ہوں، مگر اس مجلس میں شریک نہیں ہوتی اپنے کمرے میں بیٹھ کر ایصالِ ثواب کرتی رہتی ہوں، تو مجھ سے گھر والے کہتے ہیں کہ تم خاندان میں توڑ پیدا کرتی ہو، اور مجھ سے کہتے ہیں کہ کس قرآن میں لکھا ہے کہ برسی منانا منع ہے؟ اور یہ چیزیں منع ہیں؟ (سبحان اللہ!) کیا بدعت ہے۔

برسی کرنا کس قرآن میں ہے؟

میں نے کہا کہ مناظرہ کرنا ہے تو ان سے پوچھا کرو کہ کس قرآن میں لکھا ہے کہ برسی کیا کرو؟ تم اپنے رسم و رواج کرتے ہو، میں نہیں کہتا کہ اچھا کرتے ہو یا برا کرتے ہو، لیکن ان غلط رسوم کے لئے قرآن پاک کا حوالہ دیتے ہو؟ اور اگر کوئی اللہ کا بندہ اس سے رکنا چاہے تو تم اس کی جان کو آجاتے ہو۔ کوئی نماز نہ پڑھے تو تمہارے خاندان میں توڑ پیدا نہیں ہوتا، روزہ نہ رکھے، تمہارا کچھ نہیں بگڑتا، دنیا بھر کی برائیاں اور قباحتیں اس میں پائی جاتی ہیں تو کوئی حرج نہیں، اور اگر تمہاری ان ایجاد کردہ بدعتوں سے کوئی بچنا چاہے تو تم اس کو بچنے کی بھی اجازت نہیں دیتے! کچھ تو خدا کا خوف کرو! شیطان نے ایک ہی سوال تمہارے کان میں ڈال دیا ہے کہ اس میں کیا حرج ہے؟ اور کچھ نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کو: **"شر الامور محدثاتھا"** فرمایا ہے۔ شیطان نیکی کے نام سے یہ برائیاں کرواتا ہے، تاکہ کوئی مولوی، مُلّا اس کے خلاف بول بھی نہ سکے۔

قوالی ''شریف''

میں چھوٹی منی بسوں میں، میں سفر کیا کرتا تھا، اللہ مجھے معاف فرمائے کہ مجھے گانوں سے اتنی نفرت ہے کہ شاید دوسرے بڑے گناہوں سے اتنی نفرت نہ ہو، میں برداشت نہیں کرسکتا، مجھ سے برداشت نہیں ہوتا، تو میں منی بس میں سوار ہوا، اس میں اس نے اپنا راگ رنگ لگایا ہوا تھا، میں نے کہا کہ بھائی! ذرا اس کو بند کردو! تو مجھے کہنے لگا کہ مولوی جی! قوالی ہے قوالی! اس کو کیسے بند کردیں؟ قوالی ہوتی ہے جو نعت گانوں کے انداز میں گائی جاتی ہے، وہ نعت بھی الٹی سیدھی ہوتی ہیں، اس کے ساتھ الٹے سیدھے الفاظ ملائے جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ: بھائی! اللہ اور نبی پاک کا نام تو بہت بابرکت ہے، مگر تم ہی بتلاؤ کہ بہت ہی نفیس کھانا کسی گندی پلیٹ میں ڈال کر پیش کیا جائے تو اس کو قبول کیا جائے گا یا یہ اس کھانے کی توہین ہوگی؟ یہ گانے، باجے، ساز اور ان آلات کے بارے میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ: ''**انما بعثت لمحق المعازف**'' مجھ کو گانے اور بجانے کے آلات توڑنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ جس گندگی کو دور کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تھے، آپ اس رسول پاک کا نام اسی میں لپیٹ کر سنتے سناتے ہو، اور دلیل پیش کرتے ہو کہ یہ قوالی ہے، تو غلط کام عبادتوں کے نام پر شیطان نے ایجاد کردیئے ہیں، اور اس کے ساتھ ''شریف'' کا لفظ بھی لگادیا ہے۔

کعبہ اور روضۂ اطہر کی شبیہ

اب ربیع الاول کے موقع پر میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے ہاں روضہ شریف بنتا ہے، کعبہ شریف بنتا ہے، تمہارے کراچی میں (نعوذ باللہ! استغفر اللہ!) جب کراچی میں بھی روضہ شریف اور کعبہ شریف بننے لگے تو بتلاؤ دین داری کہاں رہی اور یہ نقل ہے شیعوں کی، چونکہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مقبرہ بناتے ہیں، جس کو تعزیہ کہتے ہیں، تم شیعوں کی مخالفت بھی کرتے ہو، ان کو برا بھلا بھی کہتے ہو، لیکن ان کے نقش قدم کو اپناتے ہو۔ اور روضہ شریف پر لوگ دعائیں کرتے ہیں، جیسے سلام پیش کیا جاتا ہے، اور کعبہ شریف کے دروازہ پر پرچیاں لٹکواتے ہیں، یہ تمہارے کراچی میں بدعات ہو رہی ہیں، اور بڑے بڑے ثقہ مولوی جلوس نکالتے ہیں۔

بدعتی دین کو ناقص سمجھتا ہے:

یہ بدعتی جو ہوتا ہے، یہ اللہ اور رسول کے دین کو ناقص سمجھتا ہے کہ یہ دین نامکمل تھا، میں اب اس کی تکمیل کرنے جارہا ہوں کہ کہیں فلاں شریف ہو رہا ہے، کہیں کیا ہو رہا ہے۔ تمہیں شیطان نے ان چیزوں میں الجھادیا، مسجدیں تمہاری ویران ہوگئیں، قرآن کریم کبھی تم نے کھول کے نہیں دیکھا۔

مسلمانوں کا ماضی اور حال:

ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کا بچہ بچہ مسجد میں حاضری دیتا تھا اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنے والا ہوتا تھا، ہر چھوٹا، بڑا قرآن کریم کی تلاوت کرنے والا تھا، ہر چھوٹا اور بڑا ذکر واذکار کا پابند تھا، صبح کی دعائیں، شام کی دعائیں، نماز کے بعد کی دعائیں، مسجد میں داخل ہونے کی دعا، نکلنے کی دعا، گھر میں دسترخوان پر بیٹھنے کی دعائیں نوک زبان پر ہوتی تھیں، اور اب تمہیں تو ''لا الٰہ الا اللہ'' بھی نہیں آتا، تمہارے پاس صرف یہ تعزیہ شریف رہ گیا ہے، اور تم کہتے ہو: کیا حرج ہے؟

بدعات نے دین کو غرق کر دیا ہے:

حرج صرف اتنا ہے کہ ان بدعات نے تمہارا دین غرق کر دیا، تم نے اس کو دین سمجھ لیا، اور جو دین تھا وہ تم سے چھوٹ گیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی بدعت میں مبتلا ہو جاتا ہے، اللہ پاک اس سے سنتیں چھین لیتے ہیں، محروم ہو جاتا ہے، آج یہ اُمت سنّت نبوی سے محروم، بدعات وخرافات میں مبتلا ہے، اس پر مجھے ایک حدیث یاد آئی۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے:

''مَا اَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً اِلَّا رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ۔'' (مشکوٰۃ ص:۳۱)

ترجمہ: ''جس قوم نے کوئی بدعت ایجاد کی اس سے اس کی مثل ایک سنّت اٹھالی جائے گی۔''

میرے رسالہ ''عصر حاضر حدیثِ نبوی کے آئینہ میں'' کے اندر یہ حدیث موجود ہے: ایک وقت آئے گا کہ لوگ بدعتوں کو سنّت بنالیں گے، اور اگر کوئی اللہ کا بندہ کوشش کرے گا کہ اس بدعت کو ہٹادیا جائے اور مٹادیا جائے، تو لوگ کہیں گے کہ: ''ترکِ السُّنَّۃ'' سنّت چھوڑ دی گئی۔ یہ ہم سے سنّت چھڑوا رہا ہے، تم نے بدعتوں کو سنّت بنالیا، بدعت کی شکل میں، سنتیں تم سے غائب ہوگئیں۔

سنّت کے مطابق تھوڑا عمل بہتر ہے

بدعت کی شکل میں زیادہ عمل کرنا، اس سے بہتر ہے کہ سنّت کے مطابق تھوڑا عمل کرے، کیونکہ سنّت کے مطابق جو عمل کروگے وہ انشاء اللہ مقبول ہوگا، اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہوگا اور بدعت کی شکل میں جو کام کروگے وہ مردود ہوگا، فرماتے ہیں کہ: ''مغبون'' یعنی خسارہ میں اور ہارنے والا وہ شخص ہے جس نے اپنے نفس کو ہار دیا ہو، اور خسارہ اٹھانے والا وہ ہے جس نے اپنے دین کا خسارہ اٹھالیا ہو، نفس کو ہار دیا، یہ جواری جو ہوتے ہیں، بعض مرتبہ بیوی بچوں کو ہار دیتے ہیں، اور تم نے دنیا کا جوا کھیلا اور اس میں اپنے آپ کو

ہار دیا، اور سب سے زیادہ بدقسمت اور خسارہ اٹھانے والا وہ ہے جو اپنے دین کو ہار دے، اور اس کے دین کا خسارہ ہوجائے۔

بدعات پر نکیر

[حدیث:۱۱۸۵] "عَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: عَلَیْکُمْ بِالسَّبِیْلِ وَ السُّنَّۃِ! فَاِنَّہٗ مَا عَلَی الْاَرْضِ عَبْدٌ عَلَی السَّبِیْلِ وَ السُّنَّۃِ ذَکَرَ الرَّحْمٰنَ فَفَاضَتْ عَیْنَاہُ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ فَیُعَذِّبَہٗ، وَ مَا عَلَی الْاَرْضِ عَبْدٌ عَلَی السَّبِیْلِ وَ السُّنَّۃِ ذَکَرَ اللّٰہَ فِیْ نَفْسِہٖ فَاقْشَعَرَّ جِلْدُہٗ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ اِلَّا کَانَ مَثَلُہٗ کَمَثَلِ شَجَرَۃٍ یَبِسَ وَرَقُھَا فَھِیَ کَذٰلِکَ اِذَا اَصَابَھَا رِیْحٌ شَدِیْدٌ فَتَحَاتَّ عَنْھَا وَرَقُھَا اِلَّا حَطَّ اللّٰہُ عَنْہُ خَطَایَاہُ کَمَا تُحَاطُ عَنْ تِلْکَ الشَّجَرَۃِ وَرَقُھَا وَ اِنَّ اقْتِصَادًا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ سُنَّۃٍ خَیْرٌ مِنِ اجْتِھَادٍ فِیْ خِلَافِ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ سُنَّۃٍ، فَانْظُرُوْا اَنْ یَکُوْنَ عَمَلُکُمْ اِنْ کَانَ اِجْتِھَادًا اَوْ اِقْتِصَادًا اَنْ یَکُوْنَ ذَالِکَ عَلٰی مِنْھَاجِ الْاَنْبِیَاءِ وَ سُنَّتِھِمْ۔"

(حلیۃ الاولیأ ج:۱ ص:۲۵۳)

ترجمہ: ''حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ واضح راستے اور سنّت کو لازم پکڑلو، جو بندہ واضح راستہ اور سنّت پر ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرے، اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ جائیں، اللہ تعالیٰ اس کو کبھی عذاب نہیں دے گا، جو بندہ کہ صحیح راستہ پر ہو اور سنّت کے طریقے پر عمل کرنے والا ہو، اگر اس کو اللہ تعالیٰ کا خیال آجائے، اللہ تعالیٰ کا خوف اس کے دل پر غالب آجائے اور اس کی وجہ سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں، تو اس کی مثال ایسی ہے کہ پت جھڑ کے موسم میں کسی درخت کے پتے خشک ہوجائیں اور وہ جھڑنے کے قریب ہوں، اس کے بعد تیز ہوا چلے تو کثرت کے ساتھ پتے جھڑتے ہیں، اس طرح اس آدمی کے گناہ جھڑ جاتے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپ جائے۔ اور ارشاد فرمایا کہ صحیح راستے پر ہوتے ہوئے اور سنّت پر عمل کرتے ہوئے تھوڑا عمل کرلینا، یہ زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ آدمی غلط راستے پر چلے اور کثرت سے عبادت کرتا ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول نہیں، جس شخص کا عمل صحیح راستے پر چلتے ہوئے سنّت کے مطابق ہو تو وہ شخص انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے طریقے اور سنّت پر ہے اور یہ شخص بڑا مبارک ہے۔''

تشریح: آدمی کو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ صرف ایک ذریعے سے ملتا ہے، یعنی حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ سے، زیادہ ٹکریں مارنے سے اللہ تعالیٰ کا راستہ نہیں ملتا، پیشانی گھسا دیں، اس سے اللہ تعالیٰ کا راستہ نہیں ملتا، اللہ تعالیٰ اس سے خوش نہیں ہوتے، داڑھی منڈوا لیتے ہیں اور بیت اللہ شریف کا غلاف پکڑ کر روتے ہیں، میں نے لوگوں کو اس طرح کرتے دیکھا ہے، بے تحاشا روتے ہیں، بھائی! ایسی عبادت منہ پر مار دی جاتی ہے۔ جو سنّت کے خلاف کام کرے اور پھر یہ چاہے کہ مجھے سنّت کا راستہ مل جائے گا، اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں گے کلّا ورب الکعبۃ! رب کعبہ کی قسم ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا! صحیح طریقے پر آدمی ہو اور سنّت پر ہو، رسول اللہ ﷺ کی سنّت کو زندہ کرے چاہے تھوڑا تھوڑا عمل کرے ان شاء اللہ! بہت ہو جائے گا۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی اتباعِ سنّت:

سائیں توکّل شاہ رحمۃ اللہ علیہ انبالہ میں تھے، اللہ تعالیٰ کے نیک اور مقبول بندے تھے، انہوں نے ایک دفعہ خواب دیکھا کہ رسول اقدس ﷺ کا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا قافلہ جا رہا ہے، یہ ذرا پیچھے ہیں، تو یہ دوڑ پڑے تاکہ رسول اللہ ﷺ سے جا کر مل جائیں، آگے دیکھا ایک آدمی ہے، وہ ایسے جیسے کوئی کسی چیز کو تلاش کرتا ہے، تلاش کرتے ہوئے جا رہا ہے تو سائیں صاحب کہتے ہیں: میاں! جلدی سے آ جاؤ! پنجابی زبان میں ''شوق نال بجھے بجھے آ''، یعنی شوق کے ساتھ بھاگو رسول اللہ ﷺ کا قافلہ جا رہا ہے، وہ صاحب کہنے لگے: میں رسول اللہ ﷺ کے قدم کے نشانات دیکھ رہا ہوں اور آپ کے نشانِ قدم پر قدم رکھتے ہوئے چلنا چاہتا ہوں اور پھر فرمایا کہ: اس صورت میں میں دیر سے پہنچوں گا لیکن اسی راستے سے پہنچنا چاہتا ہوں۔ سائیں صاحب خواب ہی میں کہتے ہیں کہ: تمہارا کیا نام ہے؟ کہنے لگے: مجھے محمد قاسم نانوتوی کہتے ہیں! سائیں صاحب نے تو ان کو چھوڑ دیا اور خود دوڑ پڑے، آنحضرت ﷺ کے قافلے کے ساتھ جا ملے، آگے دیکھتے کیا ہیں کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ آگے موجود ہیں۔ انبالے کا اور دیوبند کا زیادہ فاصلہ نہیں تھا، یعنی آدمی انبالے سے دیوبند جا سکتا تھا لیکن کبھی زیارت کا اتفاق نہیں ہوا تھا، جب یہ خواب سے بیدار ہوئے تو مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا، ان دنوں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بیمار تھے، سردی کا موسم تھا اور کوئی پھٹی پرانی سی رضائی (لحاف) اوپر لی ہوئی تھی، سائیں توکّل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کمرے میں داخل ہوئے تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ پر نظر پڑی تو ارشاد فرمایا: میں نے اس آدمی کو ہی دیکھا تھا، یعنی آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا پھر اس کے بعد تو بہت ہی زیادہ تعلق ہو گیا۔ تو اصل قصہ یہ ہے کہ آدمی رسول اللہ ﷺ کی سنّت کے مطابق عمل کرے۔

غیر مقلدین کا اتباعِ سنّت کا دعویٰ

یہاں پر ایک بات اور کہہ دوں ہمارے غیر مقلد بھائی، لوگوں کو گمراہ کر دیتے ہیں کہ دیکھو سنّت تو یہ

ہے کہ رفع یدین اور یہاں ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ باندھنا، اور جب امام "ولا الضالین" کہے تو اونچی آواز سے کہے کہ آمین، میں نے تو آہستہ کہا ہے، وہ ذرہ ترنم کے ساتھ کہتے ہیں، بس دین یہی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی ہزار مسئلے مرتب کئے اور بیان فرمائے تھے، ان کے نزدیک کوئی چیز بھی کام کی نہیں ہے، صرف یہ کہ نماز میں دو چار مسئلے رٹ لئے بس! اور کچھ نہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھنے والوں کا عمل معتبر ہے:

میں اپنے ان دوستوں سے ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ اس پر تمام لوگ متفق ہیں حتیٰ کہ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دوسری کتابوں میں لکھا ہے کہ ائمہ اربعہ، چار امام ہیں، ان اماموں میں صرف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تابعی ہیں اور تابعی وہ کہلاتا ہے جس نے صحابی کو دیکھا ہو، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تابعی نہیں ہیں، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ تو بہت بعد کے لوگ ہیں۔ جس دن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا اسی دن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ہوئی، اتنے بعد کے ہیں، تو میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ جنہوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ اس طرح نماز پڑھی جاتی ہے، اس کو تو نماز پڑھنی نہیں آتی، مگر تم نے خیر سے کتابوں سے دیکھ کر نماز سیکھ لی؟

صحیح بخاری سے پوری نماز دکھا دو!

مجھے صحیح بخاری کھول کر پوری نماز "اللہ اکبر" سے لے کر "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" تک پڑھ کے دکھا دو! تم نے دو چار مسئلے صحیح بخاری سے دیکھ لئے، تمہیں معلوم نہیں کہ یہ حدیث ناسخ ہے اور یہ حدیث منسوخ، حالانکہ یہ تمام احادیث بخاری میں لکھی ہیں۔

تو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، ایک واسطہ ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان، ان کو نماز نہیں پڑھنی آئی تمہیں نماز پڑھنی آ گئی چودہ سو سال کے بعد، بہر حال سنّت کے مطابق عمل کرنا اس کی بہت بڑی فضیلت ہے اور اپنی رائے اور بدعت پر عمل کرنا یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مذموم ہے، ہدایت کا راستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔

منزل پر پہنچنے کے لئے اتباعِ سنّت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے اور راستے کے خلاف کوئی شخص بھی راستہ اختیار کرے گا، کبھی منزل پر نہیں پہنچے گا، منزل پر پہنچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلو۔

اتباعِ نبوی سے سرتابی تمام انبیاء کی مخالفت کے مترادف ہے

آنحضرت ﷺ کا راستہ حقیقت میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا راستہ ہے، رسول اللہ ﷺ کو وہ دین عطا فرمایا گیا جو تمام انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے دین کا خلاصہ ہے، اس لئے جو شخص آنحضرت ﷺ کی مخالفت کرتا ہے یا آپ کے راستے کے خلاف چلتا ہے حقیقت میں وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے خلاف چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے رسول اللہ ﷺ کے راستے پر چلنا چاہئے۔

اتباعِ سنّت میں تنگی نہیں:

یہ خیال کرنا کہ ہمیں تنگی لاحق ہو جائے گی، نہیں! رسول اللہ ﷺ کے راستے پر چلتے ہوئے کبھی کسی کو تنگی لاحق نہیں ہوگی، تنگی جب لاحق ہوتی ہے جب ہم رسول اللہ ﷺ کے راستے کو چھوڑ کر کسی دوسرے راستے کو اپناتے ہیں، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کا راستہ ایسا سمجھئے کہ جرنیلی سڑک ہے، جس میں کوئی گڑھا نہیں ہے، کوئی کھڈہ نہیں ہے، کوئی اونچ نیچ نہیں ہے، آنکھیں بند کر کے چلتے رہو اور جب ادھر یمیناً وشمالاً جاؤ گے تو پھر کسی گڑھے میں گرو گے۔

اتباعِ سنّت سے انحراف میں ہی ہلاکت ہے:

حافظ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے جامع میں حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے (سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ سیّد التابعین ہیں، تمام تابعین سے افضل ہیں، حالانکہ تابعین تو بے شمار ہیں اور آدمی کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون آدمی افضل تھا کون نہیں تھا؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں تو ہم بڑی آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ تمام صحابہ میں سے بالترتیب حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم اور اس کے بعد عشرۂ مبشرہ افضل ہیں، وہاں تو فیصلہ ہو سکتا ہے لیکن تابعین کے بارے میں فیصلہ نہیں ہو سکتا، بڑی مشکل ہے، مگر علماً فرماتے ہیں کہ سید التابعین حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ ہیں، تمام تابعین کے سردار ہیں۔ اور یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے داماد ہیں تو حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں) کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حج سے واپس تشریف لائے، غالباً یہ آخری بیان تھا آپ کا، مسجد میں تشریف لے گئے، منبر پر بیٹھے اور فرمایا:

"...... اَیُّهَا النَّاسُ! قَدْ سَنَنْتُ لَكُمُ السُّنَنَ وَفَرَضْتُ لَكُمُ الْفَرَائِضَ وَتُرِكْتُمْ عَلَى الْوَاضِحَةِ اِلَّا اَنْ تَضِلُّوْا بِالنَّاسِ یمیناً و شمالاً ......"

(مؤطا امام مالک کتاب الحدود: ۱۴ باب: ۱ حدیث: ۱۰ ص: ۸۲۴ دار الاحیاء التراث)

یعنی تحقیق تمہارے لئے سنتیں جاری ہوچکی ہیں اور فرائض تم پر مقرر ہوچکے ہیں اور تم صاف سیدھے راستے پر ڈال دیئے گئے ہو، رسول اللہ ﷺ تمہیں اندھیرے میں نہیں چھوڑ کر گئے، بلکہ صاف راستے پر چھوڑ کر گئے ہیں، سنتیں تمہارے لئے مقرر ہوچکی ہیں، فرائض تمہارے لئے مقرر ہوچکے ہیں اور زندگی کا پورا نقشہ اور پورا طریقہ رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر تمہارے لئے بیان فرمادیا ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ دائیں بائیں راستے پر چل کر نہ بھٹکو۔ آپ نے سنا ہے کہ حضور ﷺ کو جو حوض کوثر دیا جائے گا مدینہ شریف سے لے کر یمن تک ہوگا۔

صراطِ مستقیم کی کشادگی:

میں ایک مثال دیتا ہوں آنحضرت ﷺ کو جو راستہ دیا گیا ہے الحمد للہ! اتنا کشادہ ہے کہ پوری اُمّت اس پر چل سکتی ہے اور کسی کے بھٹکنے کی گنجائش نہیں، لیکن اگر کوئی شخص اُمت سے الگ رہتا ہے، ”مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ“ جو شخص اُمت سے الگ ہوگا وہ جہنّم میں داخل کیا جائے گا۔

افضل الکلام:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جمعرات کو وعظ فرمایا کرتے تھے تو ارشاد فرمایا: ہمارے لئے دو چیزیں ہیں: ایک چلنے کا طریقہ، اور ایک بات کرنا۔ جہاں تک بات کرنے کا تعلق ہے افضل الکلام یا اصدق الکلام فرمایا، تمام باتوں میں سب سے زیادہ سچی اور سب سے زیادہ افضل کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، قرآن مجید ہے، اس کو اختیار کرو، قرآن مجید پڑھا کرو۔

ہمارے ایک مولانا صاحب، جو حافظ تھے، فرماتے تھے کہ قرآن کریم ہم پڑھتے ہیں، مگر آگے پیچھے تو ہمیں فرصت نہیں ملتی البتہ رمضان میں پڑھتے ہیں۔

اخبار بینی کا فتنہ:

سچی بات یہ ہے کہ ہمارے بھائیوں کو قرآن کریم پڑھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی، اگر اس پوری جماعت میں پوچھا جائے کہ کتنے آدمی ایسے ہیں جو ہر ماہ ایک قرآن کریم ختم کیا کرتے ہیں، شاید سوال کا جواب مشکل ہوگا، جس کو اللہ تعالیٰ نے پڑھنے کا ذوق عطا فرمایا ہے، اخبار تو بہت پڑھتے ہیں، میرے بعض بھائی ایسے ہیں کہ اول سے لے کر آخر تک ”میر خلیل الرحمٰن“ کے نام سے لے کر آخر تک پورا اخبار پڑھتے ہیں اور ساتھ ساتھ اشتہار بھی پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فضل فرمائے، اب اخبار اتنے موٹے موٹے ہوگئے ہیں کہ آدمی اگر پڑھنے لگے تو سارے دن میں ختم نہیں ہوسکتا، کوئی سرخی وغیرہ دیکھ لی، کوئی خاص خبر ہوئی دیکھ لی وہ تو

خیر الگ بات ہے، باقی جو دوسرے قصے کہانیاں، جتنے اخبارات میں لکھے ہوئے ہیں اگر کوئی پڑھنے لگے تو میرا خیال ہے کہ نہیں پڑھ سکتا اور یہ اخبارات شیطان کی ایک ایسی ایجاد ہے جس نے اُمّت مسلمہ کو اور اس کے اوقات کو گمراہ کرنے اور ضائع کرنے کا طریقہ ایجاد کر دیا ہے۔

میرے گھر میں دو اخبار آتے ہیں، کل بھی میں نے نہیں پڑھا، اخبار میں کیا تھا کیا نہیں تھا؟ کچھ نہیں معلوم، بچے اخبار کو اِدھر اُدھر غائب کر دیتے ہیں، میں تلاش بھی نہیں کرتا اور آج بھی نہیں پڑھا، کبھی کوئی اخبار سامنے آجاتا ہے تو ایک آدھ سرخی دیکھ لیتا ہوں۔

تلاوتِ قرآن کا ثواب:

حضرت فرماتے تھے: ایک ہے زندگی کا طریقہ اور ایک ہے کلام، تو کلاموں میں سے سب بہترین کلام، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ سبحان اللہ! ایسا کلام، ایسا کلام کہ ایک حرف پڑھنے پر دس نیکیاں ملیں، قرآن کریم کے علاوہ کوئی ایسا کلام ہے جس کے ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں ملیں؟ یہ تو اس صورت میں ہے جبکہ میں قرآن کریم سامنے کھول کر پڑھتا ہوں تو ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور اگر قرآن کریم بند کر کے پڑھوں، زبانی تو ایک حرف پر پچاس نیکیاں ملتی ہیں اور اگر نماز میں پڑھوں تو ایک حرف پر سو نیکیاں ملتی ہیں، مجھے دنیا کی کوئی کتاب ایسی بتاؤ کہ جس کے پڑھنے پر ہر حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہوں یا پچاس نیکیاں ملتی ہوں یا سو نیکیاں ملتی ہوں؟

اخبار بینی وقت کا ضیاع ہے:

جب تم اس کا مقابلہ کرو گے تو پھر تمہیں خود محسوس ہوگا کہ ہم اخبار پڑھ پڑھ کر وقت ضائع کر رہے ہیں، میرے پاس اور آپ کے پاس فالتو وقت نہیں ہے، چند لمحات ہیں، چند سانس ہیں جو ہمیں اللہ تعالیٰ نے گن کر دے دیئے ہیں، یہاں سے شروع ہوگا اور یہاں ختم ہو جائے گا بس۔ قبر میں تمہیں اخبار بھیج دیا کریں گے، بڑا فرصت کا وقت ہوگا، وہاں اخبار پڑھتے رہا کرنا، اگر میرے قبضۂ قدرت میں ہوتا اور حکومت میرے پاس ہوتی تو میں سب سے پہلا کام یہ کرتا کہ یہ اخبار کی فضولیات اور واہیات بند کر دیتا، معمولی اخبار چار صفحے کا بس یہ کافی ہے، خبریں معلوم ہو جائیں گی۔

تو سیّدنا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دو چیزیں ہیں ایک ''ہدیٰ'' یعنی طریقہ اور دوسرے ''کلام'' تو جہاں تک کلام کا تعلق ہے سب سے افضل ترین کلام، سب سے اعلیٰ ترین کلام اور سب سے سچا کلام وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

اور میں نے بتا ہی دیا ہے کہ قرآن کریم کا کوئی کتاب بھی مقابلہ نہیں کر سکتی حتیٰ کہ حدیث شریف وہ

بھی اللہ تعالیٰ کے کلام کا مقابلہ نہیں کر سکتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی فضیلت رسول اللہ ﷺ کے کلام پر ایسی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کی فضیلت رسول اللہ ﷺ پر ہے، اللہ تعالیٰ کی فضیلت رسول اللہ ﷺ پر جیسی ہے ویسے ہی اللہ تعالیٰ کے کلام کی فضیلت رسول اللہ ﷺ کے کلام پر ہے، باقی یہ ضرور ہے بھائی! کہ قرآن کریم کی ایک ایک چیز سمجھنے کے لئے حدیث شریف کی ضرورت پیش آتی ہے، وہ آگے میں ذکر کروں گا۔ تو ایک بات تو ہے اللہ تعالیٰ کا کلام سب سے افضل ترین کلام ہے، سب سے اعلیٰ ترین کلام ہے، سب سے سچا کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

بہترین راستہ:

دوسری چیز تھی طریقہ، راستہ ''وَاَحْسَنُ الْهَدْيِ هَدْىُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ'' سب سے بہترین طریقہ، سب سے بہترین راستہ حضرت محمد ﷺ کا راستہ ہے اور قرآن کریم اور حدیث شریف کے خلاف جو چلے گا اس کے بارے میں فرمایا گیا:

''شَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا، اَلَا كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَ كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَ كُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ۔'' (مسند احمد ج:۳ص:۳۱۹، مجمع الزوائد ج:۱ص:۱۷۱)

ترجمہ: ''بدترین کام وہ ہیں جو نئے ایجاد کردہ ہوں، ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔''

یعنی ہر نئی ایجاد بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے، رسول اللہ ﷺ کی پوری کی پوری سیرت پڑھو تمہیں کہیں نہیں ملے گا کہ سڑکوں پر، سواریوں پر بیٹھ کر رسول اللہ ﷺ جلوس نکالا کرتے تھے، اب یہ بتاؤ! کہ یہ بدعت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ جو کام حضور ﷺ نے نہیں کیے، وہ تم نے کر لئے نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! تمہیں عقل زیادہ آ گئی حضور ﷺ سے؟ ہر بدعت گمراہی ہے جو کام رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا، تم نے کر کے دکھایا اور ہر بدعت فی النار ہے یعنی دوزخ میں ہے۔

آرزوؤں کا وبال:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''اَلَا لَا يَتَطَاوَلَنَّ عَلَيْكُمُ الْاَمْرُ فَتَقْسُوَ قُلُوْبُكُمْ''

(حیاۃ الصحابہ ج:۶ص:۳۶۱)

دیکھو! میں ایک مثال دیتا ہوں، ہم کپڑا نیا پہن کر آتے ہیں، اس کا رنگ وروغن اور ہوتا ہے، لیکن وہ دھلتے دھلتے بالکل نکھر ہی جاتا ہے، فرمایا کہ زمانہ تم پر طویل نہ ہو جائے، ورنہ تمہارے دل سخت ہو جائیں

گے اور پھر حضور اقدس ﷺ کی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی باتیں تمہارے دل پر اثر نہیں کریں گی، دل کو اللہ تعالیٰ نے اخاذ بنایا ہے یعنی اخذ کرنے والا اور دل ہوگیا ہے سخت، کوئی چیز اس پر اثر ہی نہیں کرتی اور فرمایا کہ یہ دنیا کی آرزوئیں تمہیں غافل نہ کردیں، آدمی یہ کہتا ہے کہ یہ کام بھی ابھی کرنا ہے، یہ کام بھی کرنا ہے اس پریشانی میں لگا رہتا ہے یہاں تک کہ موت کا فرشتہ آجاتا ہے، کہتا ہے کہ چلئے! بندہ کہتا ہے: کہاں چلیں؟ کہنے لگا: حکم آگیا ہے چلنے کا!

خواہشات اور موت کا چوکٹا:

رسول اللہ ﷺ نے نقشہ بنا کر دکھایا، ایک چوکٹا بنایا اور اس چوکٹے کے درمیان میں ایک لکیر کھینچی اور لکیر کھینچنے کے بعد اس کے اردگرد لکیریں کھینچیں، فرمایا میں نے کیا بنایا ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: اللہ ورسولہٗ اعلم! اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں اور اس کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: یہ جو میں نے چوکٹا بنایا ہے، چارخانہ یہ تو انسان کی اجل ہے جو اس کے چاروں طرف سے محیط ہے اور یہ درمیان میں بندہ ہے، چل رہا ہے اور یہ جو اردگرد میں نے نشانات لگائے ہیں، یہ آدمی کے لئے رکاوٹیں ہیں، کوئی اِدھر سے کھینچ رہا ہے، کوئی اُدھر سے کھینچ رہا ہے اور آدمی کی خواہش اس دائرے سے باہر ہے، آدمی اس خواہش کو پورا کرنا چاہتا ہے یہاں تک کہ موت آجاتی ہے۔

خواہشات کو دل سے نکال دو:

خواہش کرو ہی کیوں؟ نکال دو خواہش کو، میرے اللہ نے روزی دینی ہے، روز کی روز دینی ہے، تین دن کے بعد اگر چوتھا دن ہوجائے تو آدمی کے لئے مردار حلال ہوجاتا ہے، میرے خیال میں ہم میں سے پوری جماعت میں ایک آدمی کو بھی یہ قصہ پیش نہیں آیا ہوگا کہ تین دن ہم پر گزر گئے ہوں اور چوتھا دن آگیا تو ہم پر مردار حلال ہوگیا۔ وہ روز کے روز لئے کھڑا ہے، تم کس لئے فکرمند ہوتے ہو؟ تمہارے سوچنے سے اور کرنے سے ہوگا کچھ نہیں اور ان کے کرنے سے سب کچھ ہوجائے گا، تو جس کے کرنے سے سب کچھ ہوجاتا ہے تم اسی کو کیوں نہیں پکڑ لیتے؟

گیا وقت نہیں آتا:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہے اور جو چیز آنے والی نہیں وہ بہت دور ہے، وہ لمحہ جس لمحہ میں میں نے بات شروع کی تھی وہ لمحہ دوبارہ واپس نہیں آسکتا، رسّے ڈال کر کھینچ لیں تب بھی واپس نہیں آسکتا اور جو وقت آنے والا ہے آئندہ اور انہی میں ہماری موت بھی ہے وہ

بہت قریب ہے، ہم چاہے اس کو دور سمجھیں، وہ دور نہیں ہے بہت نزدیک ہے۔

اتباع سے وصول، بدعت سے دُوری ہوتی ہے

[حدیث:۱۱۸۶] ”عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: اَلْاِقْتِصَادُ فِي السُّنَّةِ اَحْسَنُ مِنَ الْاِجْتِهَادِ فِي الْبِدْعَةِ۔“ (مستدرک حاکم ج:۱ ص:۱۰۳)

ترجمہ: ”حضرت امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ سنّت میں پیروی کرنا، میانہ روی کرنا یعنی آہستہ چال چلنا، ذرا ٹھہر کے چلنا، جلد بازی نہ کرنا یہ زیادہ بہتر ہے بہ نسبت بدعت کے کام میں محنت کرنے سے۔“

اتباعِ سنّت کے کام میں تو آدمی آہستہ چلے، چلتا رہے گا، چلتا رہے گا انشاء اللہ! منزل پر پہنچ جائے گا۔ اور خلافِ سنّت کام میں آدمی اگر محنت بھی کرے جتنا محنت کرے گا اتنا ہی اللہ تعالیٰ سے دور جائے گا، اس لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کے مطابق عمل کرو اور ہم نے جو چیز اپنے ماحول میں دیکھی، اردگرد دیکھی اس کا اعتبار نہیں ہے بھائی۔

پیچھے چلنے سے پہنچ جاؤ گے

[حدیث:۱۱۸۷] ”عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: نَزَلَ الْقُرْآنُ وَسَنَّ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السُّنَنَ۔ ثُمَّ قَالَ: اِتَّبِعُوْنَا فَوَاللهِ! اِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا تَضِلُّوْا۔“ (مسند احمد ج:۴ ص:۴۴۵)

ترجمہ: ”حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما (میں نے بتایا تھا کہ یہ باپ اور بیٹا دونوں صحابی ہیں، اللہ تعالیٰ ان دونوں سے راضی ہو) وہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم نازل ہوا اور قرآن کریم کی آیات تمہارے سامنے آگئیں اور رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے لئے سنتیں جاری کردیں۔ اور پھر ارشاد فرمایا کہ ہمارے پیچھے پیچھے چلو! (حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہمارے پیچھے پیچھے چلو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چلنے والے تھے اور ہم ان کے پیچھے چلیں) تو تم منزل پر پہنچ جاؤ گے اور اگر تم ہمارے پیچھے نہیں چلے، اپنا الگ راستہ اختیار کرلیا تو گمراہ ہوجاؤ گے۔“

سب کچھ قرآن میں نہیں ہے

[حدیث:۱۱۸۸] ”عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اَنَّهُ قَالَ لِرَجُلٍ:

اِنَّکَ اِمْرَؤٌ اَحْمَقُ! اَتَجِدُ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ الظُّھْرَ اَرْبَعًا لَا تَجْھَرُ فِیْھَا بِالْقِرَاءَۃِ؟ ثُمَّ عَدَّدَ عَلَیْہِ الصَّلَاۃَ وَالزَّکَاۃَ وَنَحْوَ ھٰذَا، ثُمَّ قَالَ: اَتَجِدُ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ مُفَسَّرًا؟ اِنَّ کِتَابَ اللّٰہِ اَبْھَمَ ھٰذَا وَاِنَّ السُّنَّۃَ تُفَسِّرُ ذَالِکَ۔" (حیاۃ الصحابہ ج:۵ ص:۳۶۲)

ترجمہ: ''ایک شخص نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے یہ کہا کہ فلاں چیز مجھے قرآن کریم میں نہیں ملی انہوں نے فرمایا: تم احمق آدمی ہو! تم یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں یہ چیز ملتی ہے کہ ظہر کی چار رکعتیں ہیں اور ان میں قرأت جہر سے نہیں کی جاتی؟ یہ چیز تمہیں قرآن میں ملتی ہے؟ کہنے لگا کہ: نہیں! کہنے لگے کہ: یہ چیز تو رسول اللہ ﷺ نے تمہیں بتائی ہے اور رسول اللہ ﷺ قرآن کو سمجھ رہے تھے اور اس کو بیان فرمار ہے تھے، آپ ﷺ پر قرآن کریم نازل ہوا، آپ ﷺ نے بتایا کہ فجر کی دو رکعتیں ہیں۔''

کہیں دو رکعتیں فجر کی لکھی ہوئی ہیں قرآن کریم میں؟ ظہر کی چار رکعتیں فرض ہیں، عصر کی چار رکعتیں فرض ہیں، مغرب کی تین رکعتیں فرض ہیں اور عشاء کی چار رکعتیں فرض ہیں، فجر، مغرب اور عشاء میں قراءت اونچی آواز سے کی جاتی ہے، ظہر اور عصر میں اونچی نہیں کی جاتی، یہ کہیں لکھا ہوا ہے قرآن کریم میں؟ کہا: نہیں! کہنے لگے: احمق آدمی! یہ باتیں تم نے رسول اللہ ﷺ سے لی ہیں اور اگر تم اس سے منکر ہو جاؤ گے تو کافر ہو جاؤ گے۔

منکرینِ حدیث کا مغالطہ:

منکرین حدیث کو سب سے بڑا مغالطہ یہی ہوا کہ یہ چیز قرآن کریم میں نہیں ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا تھا اور بالکل صحیح فرمایا تھا کہ تم دو رکعتیں قرآن کریم سے پڑھ کر سنا دو اور زیادہ نہیں کہتا، اس سے بحث نہیں کہ تم کون سی رکعت پڑھو، رات کی پڑھو، دن کی پڑھو، دو رکعتیں پڑھ کے قرآن کریم سامنے رکھ کر ہمیں پڑھ کر سنا دو۔ کوئی افلاطون کا بیٹا بھی نہیں کر سکتا اور آنحضرت ﷺ نے تیئیس سال نماز پڑھ کر دکھائی ہے، وہ تمہارے نزدیک حجت نہیں، نعوذ باللہ! استغفر اللہ! جن پر یہ قرآن کریم نازل ہوا اور انہوں نے اس قرآن کریم پر عمل کر کے یہ نمازیں پڑھائیں، نماز فرض بھی پڑھائی، نماز نفل بھی پڑھائی، سنتیں بھی پڑھائیں اور وتر بھی پڑھائے اور پڑھے بھی، تم ان کو کہتے ہو کہ ایسی چیز ہے۔

نہیں بھائی! رسول اللہ ﷺ نے جس طریقہ سے جو کام کیا ہے اس کو پورا کرو، بس! قرآن کریم کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ سمجھنے والا کوئی نہیں تھا، قرآن کریم کو آنحضرت ﷺ نے سمجھا اور ہمیں سمجھایا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سمجھایا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سمجھایا، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم کو سمجھایا

اور چلتے چلتے یہ ہم تک پہنچا، الحمد للہ! آنحضرت ﷺ کا علم بھی اور آنحضرت ﷺ کا عمل بھی متواتر ہم تک پہنچے ہیں۔

اتباعِ صحابہ کی ترغیب

ایک چھوٹی سی حدیث اور سنا دیتا ہوں:

[حدیث: ۱۱۸۹] ”عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: مَنْ كَانَ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْ مَاتَ، فَاِنَّ الْحَيَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ، اُولٰئِكَ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوْا اَفْضَلَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَبَرَّهَا قُلُوْبًا، وَاَعْمَقَهَا عِلْمًا، وَاَقَلَّهَا تَكَلُّفًا، اِخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ وَلِاِقَامَةِ دِيْنِهٖ، فَاعْرِفُوْا لَهُمْ فَضْلَهُمْ، وَاتَّبِعُوْهُمْ عَلٰى اٰثَرِهِمْ، وَتَمَسَّكُوْا بِمَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ اَخْلَاقِهِمْ وَسِيَرِهِمْ فَاِنَّهُمْ كَانُوْا عَلَى الْهُدَى الْمُسْتَقِيْمِ۔“ (مشکوٰۃ ص: ۳۲)

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: جس شخص کو اقتداء کرنی ہو وہ رسول اللہ ﷺ کے ان صحابہ کی اقتداء کرے، جو کہ دنیا سے تشریف لے جاچکے ہیں، کیونکہ جو زندہ آدمی ہے اس کے بارے میں کیا معلوم کہ خدانخواستہ فتنے میں مبتلا ہوجائے اور یہ حضور اقدس ﷺ کے صحابہ تھے، ان کے دل اُمّت میں سب سے زیادہ پاکیزہ تھے، اور ان کا علم سب سے زیادہ گہرا تھا، ان میں سب سے زیادہ کم تکلف تھا، ان کا طریقہ سب سے زیادہ سیدھا تھا اور ان کی حالت سب سے زیادہ اچھی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کریم ﷺ کی صحبت کے لئے اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لئے چنا۔“

وہ کتنے خوش قسمت ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت اختیار کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو چنا تھا، ہم بھی تو پہلے آسکتے تھے، لیکن ہمیں اپنے وقت پر آنا ہوا۔

میں تو اللہ تعالیٰ کا شکر کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس وقت پہنچایا، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور اپنے نبی پاک ﷺ کے دین کی ہدایت عطا فرمادی، اگر ہم آنحضرت ﷺ کے زمانے میں آتے اور حضور ﷺ کی باتیں ہمیں سمجھ میں نہ آتیں، خدا جانے ابوجہل کے ساتھ ہوتے؟ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہماری حفاظت فرمائی۔

فرمایا حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی فضیلت کا اعتراف کرو اور ان کے نشانِ قدم پر

چلو! اس لئے کہ وہ سیدھی ہدایت پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے طریقے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ہر بدعت گمراہی ہے

[حدیث:۱۱۹۰] "عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ.........، أَمَّا بَعْدُ! فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَ خَيْرُ الْهُدٰى هُدٰى مُحَمَّدٍ وَ شَرُّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَ كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ......"

(صحیح مسلم ج:۴، ص:۳۵۹، حدیث نمبر:۱۴۳۵، بَاب تَخْفِيفِ الصَّلَاةِ وَالْخُطْبَةِ)

ترجمہ: "حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حمد وصلاۃ کے بعد فرمایا بے شک سب سے بہتر کلام اللہ کی کتاب ہے اور سب سے بہتر طریقہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اور سب سے بدتر کام وہ ہیں جو نئے نئے ایجاد کئے جائیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

تشریح: اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا اور اس خطبے کے ابتدائی چار فقرے یہاں نقل کئے گئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کے بعد ارشاد فرمایا فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللّٰهِ یاد رکھو کہ سب سے بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے، قرآن کریم اس سے بہتر کلام نہ ہوا نہ ہوسکتا ہے، شاید میں نے پہلے بتایا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی کبھی صحابہ کا امتحان لیا کرتے تھے، ایک دفعہ حکم دیا کہ صحابہ کرام میں جو شاعر تھے ان کو جمع کرو چنانچہ وہ حضرات جمع ہوگئے اور آپ ہر ایک سے دریافت فرماتے کہ آج کل کون سا قصیدہ بنایا ہے وغیرہ وغیرہ، جو شخص یہ بتاتا کہ یہ قصیدہ میں نے بنایا ہے اس کا اتنا وظیفہ کم کردیتے، صحابہ تو جھوٹ نہیں بولتے تھے سچ سچ بتاتے تھے، ایک صحابی (حضرت لبید رضی اللہ عنہ) کو کہا کہ تم بہت نامی گرامی شاعر تھے تم نے کون سا قصیدہ بنایا ہے وہ کہنے لگے کہ امیر المومنین! قرآن کریم کے بعد پھر مجھے کسی قصیدے کی ضرورت نہیں رہی اور اب کسی قسم کا کوئی قصیدہ یا شعر کہتے ہوئے شرم آتی ہے، اللہ کے کلام کے سامنے کوئی اور قصیدہ کیا معنی؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی یہ بات بہت پسند آئی اور فرمایا کہ ان کا اتنا وظیفہ بڑھا دیا جائے، بہت سے صحابہ کرام نے نزول قرآن کے بعد شعر گوئی چھوڑ دی تھی، اب قرآن مجید سے بہتر کون سا کلام ہوسکتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللّٰهِ سب سے بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے۔

اور دوسرا فقرہ ہے وَ خَيْرُ الْهُدٰى هُدٰى مُحَمَّدٍ سب سے بہترین طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے سونا جاگنا اُٹھنا بیٹھنا غرضیکہ زندگی کے تمام معمولات ان کے سلسلے میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طریقہ اختیار کیا وہ

بہترین طریقہ ہے اور وجہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے تمام کائنات میں سے چن کر رسول اللہ ﷺ کو منتخب کیا حتی کہ انبیاء کرام سے بھی منتخب کر کے آنحضرت ﷺ کو چنا اور آپ کو عادت اطوار طور طریقہ وہ عطا فرمایا جو سب سے بہترین طریقہ تھا، خود فرماتے ہیں أَدَّبَنِي رَبِّي فَأَحْسَنَ تَأْدِيبِي میرے رب نے مجھے ادب سکھایا ہے اور بہت اچھا ادب سکھایا ہے، اس لئے حضرت محمد ﷺ کے طریقے سے بہتر اور عمدہ طریقہ ہو ہی نہیں سکتا۔

تیسرا فقرہ حدیث کا یہ ہے کہ وَشَرُّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا تمام کاموں میں بدترین کام وہ ہے جو نیا ایجاد کیا جائے، رسول اللہ ﷺ خلفائے راشدین اور حضرات صحابہ کرام ان کو ایک بات نہیں سوجھی اور ان صاحب کو ایک بات سوجھی ہے یہ عید میلاد النبی منوایا جاتا ہے، میں نے پہلے بھی بتایا تھا نا معلوم کتنی کتنی خرافات ہوتی ہیں؟ ساتویں صدی ہجری میں یہ میلاد شروع ہوا گویا چھ صدیاں جو ان مسلمانوں کی بہترین صدیاں تھیں وہ ان سے خالی تھیں، نہ کوئی عرس ہوتا تھا نہ کوئی میلاد ہوتا تھا نہ کوئی ایسی چیز تھی لیکن اب لوگ کہتے ہیں کہ اہل سنّت وہ ہیں جو ان خرافات کے کرنے والے ہیں اور جو اِن خرافات سے پرہیز کرتے ہیں وہ وہابی ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ وَشَرُّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وہ نئی چیزیں جو ایجاد کی جائیں وہ سب سے بدترین چیزیں ہیں۔

اور چوتھا فقرہ حدیث کا ہے وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ ہر بدعت گمراہی ہے، ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے جی بدعت کی دو قسمیں ہیں: ایک بدعت حسنہ، ایک بدعت سیئہ، بدعت سیئہ بُری بدعت اور بدعت حسنہ اچھی بدعت، امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اور میں نے ان کا یہ فقرہ حوالے کے ساتھ اپنی کتاب 'اختلاف اُمت اور صراط مستقیم' میں نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس فقیر کو کسی بدعت میں نور نظر نہیں آتا، مجدد الف ثانی فرماتے ہیں اور پھر شکوہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں آج کس کو مجال ہے کہ بدعت کی خلاف ورزی کرے، اس لئے کہ ایک دنیا کی دنیا بدعات کے سیلاب میں غرق ہے اور علماء کرام جن کا کام رسول اللہ ﷺ کے دین کی حفاظت اور صیانت تھا انہوں نے بدعت حسنہ کی پنکچر لگا کر بدعات کو رواج دینا شروع کیا ہے، اس لئے کسی بھی بدعت سے فیض حاصل نہیں ہوتا، نور نہیں ہے شور اور شر تو ضرور ہے لیکن نور نہیں ہے دل منور نہیں ہوتا، قمقمے لگادیں گے مسجد کے اردگرد اور بڑی روشنی ہوجائے گی لیکن جگمگاتے ہیں درو دیوار دل بے نور ہے، درو دیوار تو جگمگائیں گے لیکن دل میں نور نہیں آئے گا لیکن جب تک دل میں نور نہ آئے درو دیوار کے جگمگانے سے کیا فائدہ؟

آنحضرت ﷺ کی اتباع دین و دنیا میں

[حدیث: ۱۱۹۱] "عَنْ مُوسَى بْنِ طَلْحَةَ عَنْ أَبِيهِ...... وَلٰكِنْ إِذَا حَدَّثْتُكُمْ

عَنِ اللّٰہِ شَیْئًا فَخُذُوْا بِہٖ فَاِنِّیْ لَنْ أَکْذِبَ عَلَی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ۔''

(صحیح مسلم ج:۱۲، ص:۵۲، حدیث نمبر:۴۳۵۶، بَابُ وُجُوْبِ امْتِثَالِ مَا قَالَہٗ شَرْعًا دُوْنَ مَا ذَکَرَہٗ مِنْ.....)

ترجمہ: ''حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب میں تم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بات بتاؤں تو اس کو پکڑ لیا کرو کیونکہ میں کبھی بھی اللہ پر جھوٹ نہیں باندھتا غلط بات کہہ کر۔''

تشریح: اس حدیث کا قصہ یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آ کر دیکھا کہ وہ کھجور کے نر پودے کا بُور مادہ پودے پر بکھیرتے ہیں، اس کو تأبیر کہا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ کہا کہ اِسْتَقَی الْجُمْعَۃَ فرمایا نہ کرو تو نہیں کیا، اس سال پھل نہیں آیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعے پر ارشاد فرمایا أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ دنیا کے کام تم اچھی طرح جانتے ہو اور یہ بات ارشاد فرمائی کہ جب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کا حکم کروں تمہیں یا میں تمہیں کوئی بات بتاؤں تو اس کو پکڑ لیا کرو اس پر عمل کیا کرو، اس لئے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف غلط بات منسوب نہیں کرتا گویا کہ میں شرعی مسئلہ بیان کرتا ہوں وہ یہ کہتا ہوں کہ اللہ کا حکم ہے تو وہی بات کہتا ہوں جو اللہ نے فرمائی ہوتی ہے۔

اس سے یہ بات معلوم ہوگئی اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو بغیر مشورے کے کوئی بات فرمائی ہو جو شرعی مسئلہ نہ ہو تو اس کا قبول کرنا ضروری نہیں جیسا کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا قصہ پہلے گزر چکا ہے کہ جب وہ آزاد ہوگئیں تھیں تو ان کو اختیار تھا کہ وہ اپنا نکاح برقرار رکھیں یا نہ رکھیں، انہوں نے نکاح کو ختم کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفارش فرمائی کہ تمہارا شوہر بہت بدحال ہو رہا ہے تم اگر اس کو قبول کرتی تو کیا حرج تھا؟ کہنے لگی کہ یارسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ ہے؟ فرمایا حکم تو نہیں ہے مشورہ دیتا ہوں، کہا کہ پھر میں اس کو قبول نہیں کرتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے اس کی دانائی اور عقل پر۔

تو دنیا کے کام کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر کوئی مشورہ دیں تو اہل محبت تو یہی کہیں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے پر عمل کرنا چاہئے تاہم اگر کوئی اس پر عمل نہ کرے تو ایسا نہیں کہ گناہگار ہوگا، چنانچہ یہ کھجوروں پر بور ڈالنا یہ دنیا کے معاملات میں ایک مشورہ تھا اس لئے فرمایا بھائی تم دنیا کے امور کو زیادہ جانو اپنے دنیا کے کاموں کو لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی شخص کو کسی خاص معاملے میں حکم فرمادیں کہ ایسا کرو تو چاہے وہ معاملہ دنیا ہی کا ہو قابل تعمیل ہے اس کی تعمیل واجب ہے، مشورہ کے طور پر نہیں بلکہ حکم کے طور پر ارشاد فرمایا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش کا عقد زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کرنا چاہا اپنے آزاد کردہ غلام سے تو حضرت زینب چونکہ قریش کے قابل قدر اور اعلیٰ ترین خاندان سے تھیں آپ کے دادے کی نواسی تھیں اور زید رضی اللہ عنہ اپنی اصل کے اعتبار سے تو آزاد تھے لیکن غلامی کا داغ لگ چکا تھا، آزادہ

شدہ غلام کہلاتے تھے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے جب یہ حکم فرمایا کہ زینب کا نکاح زید سے کیا جائے تو حضرت زینب کو بھی طبعی طور پر ناگوار ہوا، اور ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن جحش کو بھی، تو قریش کے اعلیٰ ترین خاندان کی لڑکی ایک ایسے شخص کو دے دی جائے، اس پر قرآن کریم کی بائیسویں پارے کی آیت نازل ہوئی: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ (الاحزاب:٣٦) اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کسی چیز کا فیصلہ کر دیں ان کو اپنے معاملے میں کوئی اختیار داخل ہو جائے ﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ اور جو اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ صریح طور پر گمراہ ہو گیا ہے بہک گیا ہے۔

اب غور فرمائیے کہ ایک لڑکی کا رشتہ فلاں جگہ کیا جائے یہ خالص ذاتی اور نجی معاملہ ہے لڑکی کی بات سنی جائے اور لڑکی کے وارثوں کی، اولیاء کی رائے لی جائے ان کی صوابدید پر ہے لیکن خالص ذاتی اور نجی معاملے میں رسول اللہ ﷺ یہ فرما دیں کہ لڑکی کا نکاح فلاں جگہ کیا جائے تو کسی شخص کو انحراف کا حق حاصل نہیں اور جو نافرمانی کرے گا ﴿فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾۔

قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت زینب نے بھی اور آپ کے خاندان والوں نے بھی کہا سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا ہم سب اطاعت بجالاتے ہیں، چنانچہ ان کا نکاح کر دیا گیا حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ لیکن مزاج کی موافقت نہ ہونا ایک طبعی چیز تھی اور نہ ہوئی، بالآخر حضرت زید نے طلاق دے دی اور جب عدت گذر گئی تو انہی کے ساتھ یعنی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کا نکاح کروادیا بغیر گواہوں کے اور بغیر مہر کے، آسمان پر نکاح ہوا اور آنحضرت ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے جیسے آدمی اپنے گھر میں جاتا ہے ﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا﴾ (الاحزاب:٣٧) جب زید کا اس سے دل بھر گیا اور اس نے طلاق دے دی اور اس کی عدت ختم ہو گئی تو ہم نے آپ کا نکاح ان کے ساتھ کر دیا، بڑی گالیاں دیں لوگوں نے کہ بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا، حضرت زید کو لوگ آنحضرت ﷺ کا بیٹا سمجھتے تھے، بیٹے کی جورو سے نکاح کر لیا نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ۔ ﴿لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَاۗىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ۭ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۝﴾ جو بات اللہ نے فرض کر دی اس میں نبی کے لئے کسی قسم کا کوئی حرج اور تنگی نہیں، یہ اللہ کا دستور چلا آرہا ہے ان لوگوں کے بارے میں جو آپ سے پہلے ہو چکے ہیں، اللہ کے کام کا پہلے سے فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے۔

﴿الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ﴾ یہ وہ انبیاء علیہم السلام ہیں جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں

﴿وَيَخْشَوْنَهٗ﴾ اور اس سے ڈرتے ہیں ﴿وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ﴾ (الاحزاب:۳۹) اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، کوئی کچھ بھی کہتا رہے حکم الٰہی کے سامنے کسی سے نہیں ڈرتے، تو یہ شان ہے انبیاء علیہم السلام کی، اس لئے آپ کو بھی نہیں ڈرنا چاہئے پرواہ نہ کریں کسی کی، خیر میں کہنا چاہتا ہوں کہ جب آنحضرت ﷺ کوئی حکم بھیجیں یا فیصلہ فرمادیں چاہے دنیوی معاملے میں ہو اور کسی کی شخصی اور ذاتی معاملے میں ہو کسی کے لئے انحراف کی گنجائش نہیں ہے۔

مجمع الزوائد میں روایت ہے کہ ایک شخص آیا کہا یارسول اللہ! غریب آدمی ہوں شادی نہیں ہو رہی، فرمایا: انصار کے فلاں گھر میں چلے جاؤ ان کے خاندان کے لوگ تھے اور کہو کہ رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے اور یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ تم اپنی بیٹی کا عقد مجھ سے کر دو، وہ بیچارہ پتہ نہیں کون گمنام آدمی تھا چلا گیا پیغام پہنچا دیا جا کے، تو لڑکی کے والدین ذرا سوچ میں پڑ گئے کہ کیا کیا جائے؟ لڑکی کو معلوم ہوا تو کہنے لگی اس کو نہ دیکھو اس کے بھیجنے والے کو دیکھو وہ اطاعت بجالائے اور لڑکی کا نکاح کر کے اس کے ساتھ بھیج دیا، یہ بھی نہیں پوچھا کہاں کا ہے کیا کماتا ہے کیا کھاتا ہے کیا پہنتا ہے؟

اب جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دین کے معاملے میں بھی آنحضرت ﷺ کی بات حجت نہیں یعنی آنحضرت ﷺ کی حدیث حجت نہیں، آپ خود ہی غور فرمائیے کہ ان کے ایمان کا کیا عالم ہوگا اور ان کے اندر ایمان کیا ہوگا، لوگوں نے دین کو سیکھا نہیں کسی دین والے کے پاس بیٹھ کر، کتابیں سستی ہیں اخبار رسالے جو ہاتھ لگ جاتا ہے لوگوں کو کہتے ہیں جی سب کچھ پڑھو یعنی سب کتے بلیاں مردار اپنے گھر میں ڈھیر کرو تمہارا دماغ بھی ایک خانہ ہے، ہر مردار کو کتے کو مرے ہوئے کو بلی کو چوہے کو مرغی کو سب کو جمع کرلو نہیں بھائی! اچھی بات پڑھو غلط بات نہ پڑھو، اس سے دین کی استعداد بگڑتی ہے۔

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ جب میں اللہ کی طرف سے کوئی بات کہوں تو اس کو پکڑ لو اور اس پر خوب مضبوطی سے عمل کرو، اس لئے کہ میں ایسا نہیں ہوں کہ اللہ کا نام لے کر جھوٹ بولوں، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے جو بات بھی ارشاد فرمائی اُمت کی اصلاح کے لئے تمام علماء کرام متفق ہیں کہ وہ قرآن کریم کی تفسیر ہے اور حجت شرعیہ ہے، اس لئے کہ نبی کو غلطی پر قائم نہیں رہنے دیا جاتا، وحی کا پہرہ ہوتا ہے اس پر وہ اس پر پہرہ دیتی ہے اور وحی اس کی محافظ ہوتی ہے، امام ابوحنیفہ غلطی کر دیں امام احمد بن حنبل غلطی کر دیں اور کوئی دوسرا تیسرا اس نے تو اپنی طرف سے اجتہاد کیا لیکن غلطی ہو سکتی ہے مگر اس کی غلطی کی اصلاح بھی ممکن نہیں کیونکہ اس کے پاس وحی نہیں آتی، خدانخواستہ خدانخواستہ آنحضرت ﷺ ایک بات سوچ کر فرمائیں اور اس میں کوئی بھول چوک کوئی خطا ہو جائے، فوراً وحی الٰہی متنبہ کرتی ہے، نبی کو خطا پر ٹکنے نہیں دیا جاتا، اسی لئے اُمت کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زبان مبارک سے جو بات بھی نکلے وہ حق ہے، سب کہو برحق ہے دل

میں بٹھالیں اس بات کو۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نوجوان صحابی تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظات اور ارشادات لکھ لیا کرتے تھے، قریش کے بڑے بوڑھوں نے کہا تم بھی عجیب آدمی ہو ہر بات لکھتے ہو، کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہی مزاح فرماتے ہیں، کبھی غصے میں بات کرتے ہیں، ہر بات نہیں لکھنی چاہئے، کوئی کام کی بات لکھا کرو، انہوں نے کہا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے پوچھوں گا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوکر یہ بات عرض کی کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات قلمبند کرلیا کرتا تھا لیکن قریش کے بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم خوشی کی حالت میں ہوتے ہیں کبھی غمی کی حالت میں کبھی ناراضگی کی حالت میں ہوتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر ارشاد فرمایا اُکْتُبْ لکھا کر اور زبان مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا اللہ کی قسم! اس سے سوائے حق کے کچھ نہیں نکلتا، کیا شان ہے اس ہستی کی جس کے غصے کی بات بھی حق، جس کے مزاح کی بات بھی حق، غمی کی بات بھی حق، حق کے سوا اور کچھ نکلتا ہی نہیں، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور ہمیں یہ آج کل کے احمق دوست بتاتے ہیں کہ نبی کی بات کا اعتبار نہیں۔ لاحول ولا قوة إلّا باللہ۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا: ﴿قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ إِيْمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (البقرة: ۹۳) اے نبی! آپ ان سے کہہ دیجئے بہت ہی بُری چیز ہے جس کا تمہارا ایمان تمہیں حکم کرتا ہے، اگر تمہارا ایمان اس چیز کا نام ہے تو تف لعنت ہے ایسے ایمان پر۔

بدعت مردود ہے

[حدیث: ۱۱۹۲] ”عَنْ عَائِشَةَ...... مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ فِيهِ فَهُوَ رَدٌّ“

(صحیح بخاری ج: ۹، ص: ۲۰۱، حدیث نمبر: ۲۴۹۹، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود)

ترجمہ: ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص نئی بات نکالے ہمارے اس دین اور شریعت میں جو اس میں سے نہیں، پس وہ مردود ہے۔“

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ فِيهِ فَهُوَ رَدٌّ جس شخص نے ہمارے دین میں ایک ایسی چیز ایجاد کی جو اس میں سے نہیں ہے، وہ مردود ہے، وہ چیز مردود ہے، اللہ کی بارگاہ میں مقبول نہیں۔ اور اس کام کے کرنے والا بھی اللہ کی بارگاہ میں مردود ہے۔ یہ حدیث ان تمام چیزوں کی جڑ کاٹ دیتی ہے جو دین کے نام پر بعد میں ایجاد کی گئی۔

یہاں چند مسئلے سمجھ لینا چاہئیں، یہ دین کے چار اصول ہیں:

[۱] اللہ کی کتاب قرآنِ کریم۔

[۲] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ طیبہ۔

[۳] اُمت کا اِجماع۔

[۴] اور حضرات اَئمۂ مجتہدین رحمہم اللہ کا قیاس اور اِجتہاد۔

جو مسئلہ ان چار میں سے کسی ایک سے ثابت ہو وہ دِین کا مسئلہ ہے، اور جو چیز ان چاروں میں سے ثابت نہ ہو، وہ بدعت ہے۔

دُوسرا مسئلہ یہ کسی نئی چیز کا اِیجاد کرنا بطورِ دِین کے ہو تو وہ بدعت ہے، اگر وسائل کی حیثیت رکھتا ہے تو بدعت نہیں۔ مثال کے طور پر حج کے کئے جانا، اس کا حکم:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ (آل عمران:۹۷)

ترجمہ: ''اور اللہ کی رضا کے لئے لوگوں کے ذمے حج کرنا فرض ہے ہر شخص پر جو راستے کی طاقت رکھتا ہو۔''

یعنی بیت اللہ شریف تک پہنچ سکتا ہو، تو اَب وہ پیدل چلا جائے یہ بھی ایک ذریعہ ہے، موٹر کے ذریعے چلا جائے، کشتی کے ذریعے چلا جائے، پانی کے جہاز کے ذریعے چلا جائے، ہوائی جہاز کے ذریعے چلا جائے، یہ سارے ذرائع اور وسائل ہیں، خود مقصد نہیں۔ دِین میں جو وسیلہ بھی کسی کو میسر آسکتا ہے اس وسیلے کو اِختیار کر کے اگر بیت اللہ شریف تک پہنچ سکتا ہے تو اس پر حج فرض ہے، نہیں پہنچ سکتا تو مجبوری ہے، اس پر حج فرض نہیں۔ تو جہاز پر بیٹھنا، ریل یا موٹر پر بیٹھنا، اُونٹ، گھوڑے پر بیٹھنا، یا پیدل چلنا مقاصد نہیں، مقصود اس سے سفر کا قطع کرنا ہے اور بیت اللہ تک پہنچنا ہے۔

بہت سے بے وقوف یہ کٹ حجتی کیا کرتے ہیں کہ: ''اگر ہر نئی چیز بدعت ہے تو پھر تم جہاز پر کیوں بیٹھتے ہو؟ ریل اور موٹر پر کیوں بیٹھتے ہو؟'' کیا کبھی کسی عالم کے منہ سے سنا ہے کہ جہاز پر بیٹھنا عبادت ہے یا دِین کی بات ہے، یا ریل میں بیٹھنا عبادت ہے؟ بلکہ وسیلۂ سفر اور ذریعۂ سفر ہے، کسی بھی طریقے سے پہنچ سکتے ہوں اصل پہنچنا مقصود ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں پہنچانے کے اسباب مہیا کر دیئے ہوں اور پھر بھی آپ کہیں کہ: ''ہم تو پیدل جائیں گے'' تو بہت اچھی بات ہے، بہت سے اکابر بیت اللہ شریف پاپیادہ جاتے تھے، لیکن شریعت نے یہ پابندی نہیں لگائی کہ فلاں ذریعہ اختیار کرو اور فلاں ذریعہ اختیار نہ کرو۔

اسی طرح قرآنِ کریم کا سیکھنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا سیکھنا یعنی علمِ دِین کا سیکھنا۔ اب آپ جانتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بخاری تو نہیں تھی اور قرآن بھی باقاعدہ چھپے ہوئے نہیں تھے، پھر کیا یہ بھی بدعت ہے؟ مدرسے بھی نہیں تھے، پھر تو مدرسوں کا بنانا بھی بدعت ہوا! ہر وہ چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا

صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں نہیں تھی، اگر وہ بدعت ہے لہٰذا پھر تو ساری چیزیں بدعت ہیں۔ یہاں یہی مغالطہ ہوا کہ یہ چیزیں خود مقصود نہیں، مقصود ہے دِین کی تعلیم و تبلیغ، دِین کا سکھانا ہے، تعلیم و تعلّم ہے، یعنی دِین کا سیکھنا اور سکھانا ہے۔ اب اس کے ذرائع ایجاد ہوگئے، حضرات نے کتابیں لکھ دیں، کتابیں پڑھ کر سنادیں، ان کو باقاعدہ پڑھیں پڑھائیں، سمجھیں سمجھائیں تاکہ دِین سمجھ میں آئے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کتابوں کی ضرورت نہیں تھی اس لئے کہ انہوں نے ایک ہی کتاب پڑھی تھی، کتابِ رسالت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ان کے لئے چلتی پھرتی کتاب تھی جو ہر جگہ کھلی ہوئی تھی، وہ اس کتاب کو پڑھ پڑھ کر، دیکھ دیکھ کر اپنی زندگی کے ناک نقشے مرتب و دُرست کرتے تھے، اپنے اخلاق، اپنے اعمال، اپنے عقائد، اپنی معاشرت اور تمام چیزوں کو مرتب کرتے تھے۔ تابعین کو بھی ضرورت پیش نہیں آئی، اس لئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھتے تھے، اور صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چلتی پھرتی تصویریں ان کے سامنے تھیں۔ اور جب وہ رنگ بدل گیا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عقائد کیا تھا؟ اس کو الگ مرتب کرلیا جائے۔

اور پھر کچھ ایسے مسئلے ہیں جو قرآن اور حدیث میں نہیں آئے، نئے نئے حالات پیدا ہورہے ہیں، سوچ کر ان کا حل نکالو اور اس کے اُصول وقواعد مرتب کردو، کیونکہ ان کے بعد کے لوگ یہ کام نہیں کرسکیں گے، تو حضرات محدثین رحمۃ اللہ علیہم نے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، ملکوں ملکوں کا سفر کیا، نہ معلوم کہاں کہاں کی خاک چھانی انہوں نے صرف رسول اللہ کی صلی اللہ علیہ وسلم احادیث کو تلاش کرنے کے لئے، اور ایک ایک راوی پر گفتگو کی کہ یہ کیسا ہے؟ کیسا نہیں؟ لاکھوں انسانوں کی سوانح عمریاں مرتب ہوگئیں، جس کو ''علم اسماء الرجال'' کہا جاتا ہے، اور سو سے زائد علوم مرتب کئے گئے۔

حدیث کو پرکھنے اور جانچنے کے لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کیا ضرورت تھی اس کی؟ ہمارے حکیم الاُمت قدس سرہٗ نے ایک عجیب مثال بیان فرمائی، فرمایا: ایک آدمی طبیب کے پاس گیا، نبض دِکھائی، تشخیص کرائی، اس نے نسخہ لکھ دیا، خمیرہ گاؤزبان عنبری جواہر والا اور جوشاندہ، خمیرہ بنفشہ اور کئی چیزیں لکھ کر دے دیں کہ دُکان سے جاکر خریدلو، لیکن اگر کوئی شہر ایسا ہو کہ وہاں خمیرہ نہیں ملتا تو پھر کیا کروگے؟ پہلے نسخے کے الگ الگ اجزاء لوگے، پھر چولہا بھی اس کے لئے تیار کروگے، پھر اس کے لئے لکڑیاں بھی ڈھونڈوگے، سارے پاپڑ بیلوگے، مقصود صرف خمیرہ تیار کرنا ہے، لکڑیاں، چولہا مقصود نہیں، تو اس مسئلے کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے، اس میں بہت لوگ گھپلا کرتے ہیں بے عقلی کی وجہ سے، ناسمجھی کی وجہ سے، جو چیزیں کہ دِین کے مقاصد ہیں اِن میں کوئی ترمیم نہیں ہوسکتی، ہاں! ان مقاصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ کوئی تلاش کرو، اور یہی حال ہے صوفیہ کے اذکار کا۔

رسول اللہ ﷺ کی صحبتِ کیمیا اثر کی یہ شان ہے کہ جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اگر بیٹھا ایمان کی حالت میں، اس کی نظر رسول اللہ ﷺ پر پڑگئی، یا رسول اللہ ﷺ کی نظر اس پر پڑگئی، اس کا بیڑا پار ہوگیا، ایک آن میں اس کو نسبت معلی حاصل ہوگئی، اور اَب! اب بھی کوئی ایسا بندہ ہے کہ جو کوئی اس کے پاس بیٹھے تو ساری دُنیا ختم ہوگئی، نہیں! اس کے لئے محنت مجاہدے کی ضرورت ہوگی، قلب پر ضربیں لگانے کی ضرورت ہوگی تاکہ قلب متاثر ہوجائے۔ صوفیہ کے اَوراد و اَشغال کی ضرورت ہوگی، صوفیوں بیچاروں کو تو لوگوں نے عضوِ معطل سمجھ رکھا ہے کہ یہ لوگوں کو بے کار بناتے ہیں، نعوذ باللہ! اَستغفر اللہ! تو خوب سمجھ لیجئے کہ جو چیزیں کہ دِین کے مقاصد ہیں، ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے جو اشیاء ذریعے اور وسیلے کے طور پر استعمال ہوتی ہیں تجربے کے طور پر ان کے لئے دلیل شرعی ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب تمہیں ذکر بتایا کہ ''لا اِلٰہ'' کو یہاں سے کھینچو اور ادھر لے جاؤ اور ادھر پھینکو اور پھر ضرب لگاؤ۔ اور آپ کہیں کہ: ''جی قرآن کی کس آیت میں آیا ہے؟ یہ کس حدیث میں آیا ہے؟'' کیا جواب دیں گے اس کا؟ اب لوگ اسی حماقت میں مبتلا ہیں، پوچھتے ہیں ہم سے: ''یہ جی کس حدیث میں آیا ہے؟'' میں کہتا ہوں: حدیثِ جبریل میں آیا ہے۔ جب پوچھا حضرت جبریل نے: ''مَا الْإِحْسَانُ'' احسان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا:

أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنَّكَ إِنْ لَا تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ۔ (صحیح مسلم ۱/۸۸، ۱۰)

ترجمہ: ''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تم دیکھ رہا ہے۔''

یہ اِستحضار رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کو آنحضرت ﷺ کی ذاتِ عالی کے دیدار سے حاصل ہوجاتا تھا، اور ہمیں ضربیں لگانے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ ہمارے دِل پتھر ہوچکے ہیں۔

تو وہی خمیرہ تیار کرنے والی بات ہوئی کہ لکڑیاں بھی ڈھونڈو، چولہا بناؤ، دیگچا تلاش کرو، پانی ڈالو، دوائیاں ڈالو، پکاؤ، گھوٹو، تب جاکر خمیرہ تیار ہوگا۔ اگر تمہیں بنا بنایا ملتا ہے تو پھر اس حماقت کی کیا ضرورت ہے؟ تو یہ تمام اَوراد و اَشغال جو حضراتِ اکابر بتاتے ہیں، یا مراقبات بتاتے ہیں، خاص خاص تدبیریں بتاتے ہیں معالجات کی، یہ خود مقصود نہیں بلکہ ذریعہ اور وسیلہ ہیں، کوئی شخص وسائل پر بھی دلائل مانگا کرتا ہے؟

مجھ سے ایک صاحب کہنے لگے کہ ذکر بالجہر کا کیا حکم ہے؟ یہ جو اُونچی اُونچی ضربیں لگاتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟ میں نے کہا: حرام ہے فرض ہے۔ ایک ہی لفظ میں دو حکم بتادیئے۔ کہنے لگا: کیا مطلب؟ میں نہیں سمجھا۔ میں نے کہا: ''لا اِلٰہ اِلَّا اللہ'' کہنے پر جو ثواب ملتا ہے اور شریعت نے مقرر کیا ہے اگر تمہارا عقیدہ یہ ہے کہ اس طرح ضرب لگانے سے ثواب میں اضافہ ہوگا تو یہ حرام ہے، ثواب اتنا ہی ملے گا جیسا ثواب ''لا اِلٰہ اِلَّا اللہ'' کہنے کا، وہی ثواب ضرب لگا کر کہنے کا ہے، جو ثواب آہستہ پر ہے وہی اُونچا پڑھنے پر بھی ملے گا، تو اگر یہ

عقیدہ رکھتے ہو کہ اس سے ثواب بڑھ جائے گا یا یہ کہ یہ لازم ہے، اس کے بغیر ثواب ہی نہیں ہوتا، تو تم گمراہ ہو، حرام ہے ایسا کہنا۔ یہ تو حرام کی تفصیل ہوئی۔ اور جو میں نے کہا کہ فرض ہے، اس کی شرح یہ ہے کہ اگر کسی محقق شیخ نے تمہیں یہ علاج بتایا ہے تو اپنے نفس کی اصلاح کرنا اور شیخ کی تدبیر پر عمل کرنا فرض ہے، اس کے بغیر تمہارا علاج نہیں ہوگا۔

اب کیا بتائیں دُنیا بھی کہاں کی کہاں پہنچ گئی، ان چیزوں کی حقیقت یہ کسی کو معلوم نہیں۔ بہت سے اکابر اولیاء اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ کوئی بیعت ہونے کے لئے آیا، فرماتے ہیں کہ اتنی مدت کے لئے قرآن نہیں پڑھو گے۔ دیکھئے قرآن چھڑا دیا، وہ چھڑا نہیں رہے بلکہ پہلے قرآن والی زبان پیدا کر رہے ہیں۔ خاص خاص اَوراد و اَشغال بتاتے ہیں، اس تدبیر سے یہ کام کرو، اس کے بعد پھر آ جاؤ۔ قرآن ہم بھی پڑھتے ہیں اور وہ حضرات بھی پڑھتے تھے، ان کے دِل پر اثر کرتا تھا، ہمارے کانوں تک بھی نہیں پہنچتا اور حلق سے نیچے نہیں اُترتا۔

تو میں نے کہا کہ جو چیزیں کہ وسائل کا درجہ رکھتی ہیں، ان کو کارِ ثواب نہیں سمجھا جاتا، وہ بدعت نہیں ہیں، اور ان کے دلائل تلاش کرنا قرآن اور سنّت میں یہ غلط ہے، یہ تو تدابیر ہیں، مقصود ہے احسانی کیفیت کو دِل میں پیدا کرنا، جس کو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا: "أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنَّكَ إِنْ لَا تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ"۔

تمہاری وہ کیفیت پیدا ہو جائے تمہارے اندر اِستحضار مع اللہ، حضور مع اللہ کی کہ جب تم عبادت کے لئے کھڑے ہو تو ایسا لگے کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، تم اللہ کے سامنے ہو، اگر یہ کیفیت حاصل ہے تمہیں تو بہت مبارک، سبحان اللہ، کسی صوفی کے پاس مت جایئے، کسی بزرگ کے پاس مت جایئے، اور اگر نہیں تو میری جان! اس کو تو حاصل کرنا پڑے گا، یہ تو شریعت کے مقاصد میں سے ہے، کسی سے جا کر پوچھو کہ کیا تدبیر کروں اس کی؟ یہ کیفیت مجھے کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ اب وہ جو تدبیر بتائے گا وہ تدبیر تو کسی نص سے ثابت ہونا ضروری نہیں، قرآن اور سنّت سے ثابت ہونا ضروری نہیں، ہاں! یہ دیکھو کہ تجربے سے وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے یا نہیں، تو وہ چیز ایک ہے مقصود ہے شرعی اور یہ اس کی تدبیر ہے تعلیم مقصود ہے اور بخاری شریف، ترمذی شریف اور دیگر کتب اس کا ذریعہ ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نحو نہیں پڑھاتے تھے کوئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مرتب ہوئی ہے یہ، ابو الاسود الدؤلی نے یہ مرتب کی تھی، اب یہ بعد میں مرتب ہوئی، قرآنِ کریم کی ایک آیت پڑھ رہے تھے ایک صاحب، اس وقت زیر زبر تو لگے ہوئے تھے نہیں، تو پڑھا: ﴿أَنَّ اللهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ۙ وَرَسُولِهِ﴾ نعوذ باللہ، حالانکہ آیت شریفہ اس طرح ہے: ﴿أَنَّ اللهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ۙ وَرَسُولُهُ﴾ (التوبۃ: ۳) اس لئے نحو اور قواعد بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی، لہٰذا یہ

بدعت نہیں، اس لئے کہ ذریعہ ہے، اسی طرح عبادت کا ذریعہ بدعت نہیں۔

ف: [آیت شریفہ کا ترجمہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول، مشرکوں سے بیزار ہیں، اور اس شخص نے جو ﴿مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلِهٖ﴾ پڑھا اس کا معنی بدل گیا کہ اللہ تعالیٰ مشرکوں اور اپنے رسول سے بیزار ہیں (معاذ اللہ) کفر ہے۔]

سنّتِ حسنہ بھی صدقۂ جاریہ کی طرح ہے

[حدیث: ۱۹۳ ا] "عَنِ الْمُنْذِرِ بْنِ جَرِيرٍ عَنْ أَبِيهِ......، مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْءٌ، وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ۔"

(صحیح مسلم ج: ۵، ص: ۱۹۸، حدیث نمبر: ۱۶۹۱، بَابُ الْحَثِّ عَلَى الصَّدَقَةِ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ أَوْ كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ...)

ترجمہ: "حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے اسلام میں سنّتِ حسنہ جاری کی، اس کو اس کا بھی ثواب ملے گا اور ان لوگوں کا بھی جو اس پر عمل کریں گے اس کے بعد، بغیر اس کے کہ ان کے اَجر میں کوئی کمی کی جائے۔ اور جس شخص نے اسلام میں کوئی بُری رسم جاری کی، اس پر اس کا بھی گناہ ہوگا اور ان لوگوں کا بھی گناہ ہوگا جو اس کے بعد اس پر عمل کریں گے، بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں اور بوجھ میں سے کچھ ہلکا کیا جائے۔"

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ جو اسلام میں اچھا طریقہ جاری کرے، اس کو اس کا بھی ثواب ملے گا اور اس کو دیکھ کر جتنے لوگ عمل کریں گے اس کو ان کا بھی ثواب ملے گا، اور بعد میں عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی، اور جو کوئی بُری رسم یا گناہ کی کوئی بات جاری کرے گا، اس کو اپنا بھی بوجھ اُٹھانا پڑے گا اور ان لوگوں کا بھی جو بعد میں اس پر عمل کریں گے اور ان کے بوجھ میں کوئی کمی نہیں ہوگی، یعنی یہ نہیں کہ ان کا لے کر اس کو دیا جائے، ان کو اپنا ملے گا، اس کو اپنے ملے گا۔

یہاں سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ بدعات کو جاری کرنا یہ بھی اچھی بات ہے، سنّتِ حسنہ ہے، جیسے کوئی اچھا طریقہ جاری کر دیا اسلام میں۔ نہیں بھائی! میرا جی کسی کو اچھا کہے، آپ کا جی کسی کو اچھا کہے، وہ اچھی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ یا سلف صالحین جس چیز کو اچھا کہیں وہ اچھی ہوتی ہے، اس حدیث کا مفہوم اور منشا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ایک سنّت مٹ گئی تھی، لوگوں کے رواج میں نہیں رہی تھی، دین کا

کوئی طریقہ مٹ گیا تھا، ایک شخص نے لوگوں کی پروانہ کرتے ہوئے اس پر عمل کیا، اس کو رواج دینے کی کوشش کی، یہاں تک رفتہ رفتہ بہت سے لوگ اس کام کو کرنے والے ہو گئے، تو اس کو اپنا اَجر ملے گا اور بعد کے لوگوں کا اَجر بھی ملے گا، جب تک یہ عمل جاری رہے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اَجر عطا فرماتے رہیں گے۔ اور اگر کسی نے گناہ کا کام یا کوئی بُرا طریقہ ایجاد کر دیا تو خود تو پھنسا تھا اور باقی جو لوگ پھنسیں گے ان کا وبال بھی اس پر اثر ہوگا۔

آنحضرت ﷺ ایک دفعہ مسجد میں تشریف فرما تھے، کچھ لوگ مفلوک الحال آئے، بہت تنگ دست تھے، ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، کمبل اوڑھے ہوئے تھے، اور بٹن کی جگہ ببول کے کانٹے لگے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ کو ان کی حالت دیکھ کر بہت رحم آیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ان کو کچھ صدقہ دو! صحابہ بھی اس وقت زیادہ خوش حال نہیں تھے، تو کچھ زیادہ حرکت محسوس نہ ہوئی صحابہ میں، اتنے میں حضرت عمر یا کوئی انصاری صحابی اُٹھے اور ایک دراہم کی تھیلی لاکر آنحضرت ﷺ کے سامنے رکھ دی، ان کو سیکھ کر پھر لوگ شروع ہو گئے، کوئے کپڑے لائے، کوئی کھجور لائے، اچھا خاصا ڈھیر ہو گیا، یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ کا چہرہ کِھل گیا اور آپ ﷺ نے اس موقع پر فرمایا: جس شخص نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ جاری کیا، اس کو اپنا بھی اَجر ملے گا اور بعد میں جو اس پر عمل کرنے والے ہیں ان کا بھی ملے گا۔

اختلاف کی ممانعت

[حدیث: ۱۱۹۴] "عَنِ ابنِ مَسعُودٍ......، وَلَا تَختَلِفُوا فَإِنَّ مَن كَانَ قَبلَكُم اختَلَفُوا فَهَلَكُوا۔"

(صحیح مسلم ج: ۱۱، ص: ۲۹۵، حدیث نمبر: ۳۲۱۷، باب حَدِيثُ الْغَارِ)

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اختلاف نہ کیا کرو، اس واسطے کہ جو لوگ تم سے پہلے ہوئے انہوں نے اختلاف کیا پس برباد ہو گئے۔"

تشریح: اس حدیث میں ہے: آپس میں اختلاف اور جھگڑا نہ کیا کرو، تم سے پہلی اُمتوں نے اختلاف اور جھگڑا کیا، پس ہلاک اور برباد ہو گئے۔ یہاں اس ارشاد کا واقعہ ذکر نہیں کیا، مصابیح کی روایت میں اس کا واقعہ ذکر کیا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو اس حدیث کے راوی ہیں فرماتے ہیں: ایک شخص نے قرآن مجید پڑھا اور میں نے رسول اللہ ﷺ سے دوسری طرح پڑھا تھا، میں اس کو پکڑ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لایا، میں نے کہا: پڑھو! اس نے پڑھ کر سنایا، فرمایا: ٹھیک ہے! مجھ سے فرمایا: تم کیسے پڑھتے ہو؟ میں نے

جس طرح حضور نے مجھے پڑھایا تھا اس طرح پڑھا، فرمایا: ٹھیک ہے! اس کے بعد ارشاد فرمایا: جھگڑا اور اختلاف نہ کرو، تم سے پہلے لوگوں نے جھگڑا اور اختلاف کیا تباہ ہو گئے۔

یہی قصہ حضرت اُبیؓ بن کعب رضی اللہ عنہ کو بھی پیش آیا تھا، وہ بھی بہت بڑے قاری ہیں، بلکہ اُمّت کے سب سے بڑے قاری ہیں، ان کو بھی رسول اللہ ﷺ نے قرآنِ کریم کی سند عطا فرمائی تھی، ایک روایت میں آتا ہے کہ: "اسْتَقْرِءُوا الْقُرْآنَ مِنْ أَرْبَعَةٍ مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ فَبَدَأَ بِهِ" (صحیح بخاری ۱۲/ ۱۰۴، ۳۴۷۵) خذُوا الْقُرْآنَ عَنْ أَرْبَعَةٍ عَنِ ابْنِ أُمِّ عَبْدٍ فَبَدَأَ بِهِ (مسند احمد ۱۳/ ۲۷۵، ۶۲۳۷) قرآن چار آدمیوں سے پڑھا کرو، سب سے پہلے فرمایا: "عبداللہ بن مسعود" ان کی والدہ کو "اُمّ عبد" کہا کرتے تھے اور ان کو "ابنِ اُمّ عبد"، تو سب سے پہلے ان ہی کا نام لیا کہ ان سے قرآن پڑھا کرو، "وَسَالِمٍ مَوْلَى أَبِي حُذَيْفَةَ وَأُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ وَمُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ" اُبیؓ بن کعب سے، سالم مولیٰ حذیفہ سے اور معاذ بن جبل سے۔

تو یہی قصہ اُبیؓ بن کعب کو بھی پیش آیا اور عجیب بات یہ ہے کہ یہی قصہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی پیش آیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں: ایک آدمی مسجد میں قرآن پاک پڑھ رہا تھا، وہ کچھ اور ہی طریقے سے پڑھ رہا تھا، اور میں نے خود رسول اللہ ﷺ کی زبان سے سنا تھا اور پڑھا تھا تو جب اس نے نماز ختم کی تو میں نے اس سے کہا کہ: میاں تم غلط پڑھتے ہو۔ کہنے لگا: میں غلط نہیں پڑھتا، مجھے رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح پڑھایا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو شمشیر بے نیام تھے، اس کا گریبان پکڑ لیا اور اس کو گھسیٹ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائے کہ غلط بھی پڑھتا ہے اور حضور کی طرف منسوب بھی کرتا ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو! اس سے کہا کہ: پڑھو! اس نے اسی طرح پڑھا جس طرح مسجد میں پڑھ رہا تھا، فرمایا: "هكذا أنزلت" اسی طرح نازل کی گئی ہے، پھر مجھے کہا کہ: تم پڑھو! میں نے اس طرح پڑھا جس طرح مجھے پڑھایا تھا، فرمایا: "هكذا أنزلت" اسی طرح نازل کی گئی۔ ذہین آدمی کو لغزش بھی ہوتی ہے اور جب پھسلتا ہے تو چاروں شانے چت گرتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب میں نے حضور ﷺ کا ارشاد سنا، فرماتے ہیں: مجھے ایسا شک پڑ گیا کہ جاہلیت میں بھی ایسا نہیں پڑا تھا، دِل میں کیا وسوسہ آیا کہ یہ تو دھوکا ہے، اس کو کسی طرح بتادیا مجھے کسی طرح بتادیا اور دونوں کو کہہ دیا کہ یہ اسی طرح نازل ہوئی ہے، اب یہ کسی کو ظاہر تو نہیں کیا تھا، لیکن آنحضرت ﷺ کو میرے دِل کے وسوسے پر اطلاع ہو گئی، فرمایا: "أين أنت يا ابن الخطاب!" خطاب کا بیٹا! کہاں پھر رہا ہے؟ مجھے اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ قرآن اس طرح پڑھا کرو، میں نے کہا: میری اُمّت اُمّی ہے ایک حرف پڑھنا ان کے لئے مشکل ہوگا، کسی کا لہجہ کسی طرح ہے، کسی کا لہجہ کسی طرح ہے، اور قرآن فوری طور پر پڑھانا ہے، اب لاہوریوں کو آپ لکھنوی اُردو پڑھانے لگیں تو ان کا لہجہ تو نہیں بدلے گا، وہ تو اسی طرح بولیں گے، اور ہمارے بنگالیوں کو پڑھانے لگیں یا خان بابا کو یہ تو اپنی زبان بولیں

گے، ایک عرب کہنے لگا: میں نے بھی اُردو سیکھ لی ہے۔ کہا سناؤ! کہنے لگا: القثا ککری، قثاء ککڑی کو کہتے ہیں، وہ تو ایسی ہی اُردو بولے گا عربی لہجے میں۔

جب میرے دوست باہر مجھ سے کہتے ہیں کہ نماز پڑھاؤ تو میں کہتا ہوں: بھائی میں پنجابی ہوں، پنجابی لہجے میں قرآن پڑھتا ہوں۔ تو عربی کے لہجے بھی مختلف ہیں، اب پوری اُمت کو ایک ہی وقت میں مجبور کیا جاتا ہے کہ تم اس لہجے میں پڑھو تو کام نہیں چلتا، فرمایا: یا اللہ! میری اُمت اُمی ہے ان سے ایک لہجے میں پڑھا نہیں جائے گا، ایک طرز پر نہیں پڑھا جائے گا، فرمایا: دو میں پڑھ لو! میں نے کہا: دو میں بھی نہیں پڑھا جاسکے گا، چلتے چلتے سات لہجوں میں اجازت دے دی اور آنحضرت ﷺ کا یہ معجزہ تھا کہ پورے عرب میں جتنے قبائل تھے اور ان میں جتنی لغتیں تھیں، تمام لغات کو بھی جانتے تھے اور ہر ایک کے ساتھ اس کے لہجے میں گفتگو فرماتے تھے۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان میں پیدا ہوئے، خالص معیاری اُردو ان کی زبان تھی، لیکن امرتسر میں رہے اس لئے لاہوری زبان بھی بولتے تھے، اب ان کی اولاد وہی زبان بولتی ہے، ادھر آئے ملتان کی طرف یہاں سرائیکی چلتی ہے، ایسی نفیس زبان بولتے تھے کہ کوئی یہ سمجھے کہ یہیں پیدا ہوا ہے، یہ شاہ جی کا کمال تھا، لیکن آنحضرت ﷺ عرب کی ایک ایک لغت سے واقف تھے اور یہ بھی اعجاز تھا کہ ہر ایک سے اسی انداز سے گفتگو فرماتے تھے اور چونکہ سب قراءتیں متواتر کرنا مقصود تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے مختلف قراءتوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن پاک سکھایا، اور یہی مطلب ہے سبعہ قراءت یا عشرہ قراءت کا، اور بعد میں لوگوں کو لغتِ قریش پر پابند کر دیا گیا، پہلے لغات بھی الگ الگ تھیں کہ ہر قبیلہ اپنی لغت پڑھے لیکن بعد میں لغات بند کر دی گئیں، جب لوگوں کو قرآن پاک کی مشق ہوگئی قریش کی لغت پر لوگوں کو پابند کر دیا گیا، لیکن خاص ادا کا طریقہ اب بھی باقی ہے، چنانچہ قاری حضرات سبعہ عشرہ کی قراءت میں بھی پڑھتے ہیں، چودہ قراءتیں ہیں جن میں سے سات متواتر ہیں، تین مشہور ہیں اور باقی چار قراءتیں شاذ ہیں، یعنی خبر واحد کا درجہ ہے، لیکن اُمت نے ایک ایک قراءت کو محفوظ رکھا ہے، اس کے علاوہ اور قراءتیں بھی ہیں لیکن وہ قراءتیں مقبول نہیں ہیں۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝٢ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٣﴾ (الفاتحۃ:۱-۳)۔

یہاں دو مشہور قراءتیں ہیں، ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' اور ''مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' دونوں قراءتیں متواتر ہیں، دو قاری ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' پڑھتے باقی پانچ قاری ''مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' پڑھتے ہیں سات متواتر قراءتوں میں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' میم کے بعد الف کے ساتھ نہیں لکھتے بلکہ میم، لام، کاف لکھ کر میم کے اُوپر کھڑا زبر لکھتے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب مصاحف کی کتابت کروائی گئی تو اس انداز سے کرائی گئی کہ اس میں تمام لغات سما جائیں اور تمام قراءتیں جمع ہو جائیں اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف قراءت منسوب ہے "مَلَكَ يَوْمَ الدِّيْنِ" تو تین قراءتیں تو اسی میں ہو گئیں، لیکن یہ شاذ قراءت ہے، لیکن "مَالِكِ" اور "مَلِكِ" دونوں قراءتیں مشہورہ ہیں۔ "مَالِكِ" کا معنی مالک، اور "مَلِكِ" کا معنی بادشاہ، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مالک بھی ہیں اور بادشاہ بھی ہیں اور ایک ہی لفظ کی دو مختلف قراءتوں سے دو آیتیں بن گئیں، یہ اختلافِ قراءت کا فائدہ تھا، تو اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: خطاب کا بیٹا کہاں پھر رہا ہے؟ جبریل میرے پاس آئے اور کہا کہ اس طرح قرآن پڑھو! میں نے کہا: میرے رَبّ کی بارگاہ میں میرا اسلام عرض کر دو اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کر دو کہ میری اُمّت اس کی طاقت نہیں رکھتی، میری اُمت اَن پڑھ ہے دو قراءتوں کی اجازت دی، تو میں نے کہا: یہ بھی کم ہے، یہاں تک کہ سات پہنچ گئی اور مجھ سے فرمایا گیا: اب راضی ہو؟ میں نے کہا: ہاں! اب راضی ہوں، اب کافی وسعت پیدا ہو گئی۔ اور فرمایا: اَن میں سے ہر ایک قراءت کافی شافی ہے، تو میں نے اللہ تعالیٰ سے مانگ کر لی ہے اور تیرے دِل میں شک کا کانٹا چبھ رہا ہے کہ یہ فراڈ اور دھوکا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، کیونکہ وسوسے کا میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا، لیکن ادھر وسوسے کا کانٹا چبھا اور ادھر ڈاکٹر نے آپریشن شروع کر دیا۔ فرماتے ہیں: مجھے بعد میں اتنا صدمہ اور افسوس ہوا۔ تو یہ مطلب ہے کہ قرآنِ کریم کی آیتیں متواتر ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعلیم فرمائی ہے اور اللہ تعالیٰ سے لے کر فرمائی ہے، تو تم آپس میں قراءتوں پر جھگڑو گے، وہ کہے گا میری کتاب صحیح ہے، وہ کہے گا میری کتاب صحیح ہے، کتاب کا انکار کرو گے نتیجہ ہلاکت نکلے گا اس لئے اختلاف نہ کرو۔

اور آج منکرینِ حدیث نے اس قراءتوں کے اختلاف کو لے کر اپنی عقل کا ماتم کیا ہے اور اُمّت کو گمراہ کیا ہے، وہ کہتے ہیں یہ بھی مولویوں کی بنائی ہوئی ہے، ایسے بے وقوف لوگ ہیں، ہر چیز مولویوں کی بنائی ہوئی ہے۔

میں آج کل ایک مضمون لکھ رہا ہوں، اس میں میں نے لکھا ہے کہ کسی ماں نے آج تک ایسا بچہ جنا ہے جو قرآنِ کریم کی روشنی میں اسلام کی تمام باتوں کی تفصیلات کو بیان کر دے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کی ہیں، نماز کے بارے میں بتا دو، قرآن کھول کر بتا دو کہ نماز کی کتنی رکعتیں ہوتی ہیں؟ لے آؤ بڑے بڑے لوگوں کو، یہ ساری چیزیں غریب مُلّا اپنی طرف سے بنا لے گا۔ میں نے کہا کہ مُلّا کیا تم اگر پہلے کے انبیائے کرام کو لے آتے تو بھی نہیں بنا سکتے تھے، یہ تفصیل نہیں کر سکتے تھے جس طرح کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اگر

تمہیں اس کے من جانب اللہ ہونے میں شک ہے تو اس کے مقابلے میں ایک قرآن کریم ایسا ہی بنا لاؤ اور جو تم کو مددگار مل سکتا ہے اس سے مدد لے لو، میں نے کہا کہ یہ تو قرآن ہے اور یہ قرآن کی شرح ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہے، جس طرح قرآن نے متن کے بارے میں کہا تھا کہ تم ساری دُنیا کے انسانوں کو جمع کرلو، ایسا قرآن کوئی نہیں لاسکتا، میں نے وہاں لکھا کہ میں آج چیلنج کرتا ہوں کہ اس قرآن کی جو شرح محمد رسول اللہ ﷺ نے بیان کی اس کی مثل کوئی شرح لے کر آؤ، پھر مجھے بتائے کہ یہ شرح مُلّاؤں کی ہے ہم اس کو نہیں مانتے اور ہم اس کو مانتے ہیں ذرا بنا کے تو دِکھاؤ، مجھے صرف قرآن پڑھ کے ایک نماز یا دو رکعت پڑھ کے دِکھادو، یہ تو ہمارے آقا کا کمال تھا کہ دو رکعت پڑھی اور فرمادیا: ''صلوا کما رأیتمونی أصلي'' جیسے میں پڑھتا ہوں ویسے ہی پڑھا کرو، یہ ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (البقرۃ: ۴۳) کی شرح ہوگئی۔

آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حج کرکے دِکھادیا، صرف ایک دفعہ حج کیا، جبکہ علماء نے کئی کئی ضخیم کتابیں لکھی ہیں حج کو سمجھانے کے لئے، اِمام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ہزار اوراق پر کتاب الحج لکھی تھی، لیکن آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حج کرکے دِکھادیا بس، یہ لوگ جانتے ہی نہیں کہ نبی کیا ہوتا ہے اور نبی کی تعلیم کیا ہوتی ہے؟ ان بے چاروں کو پتا ہی نہیں:

گل کو ناز ہے اپنی نزاکت پر اے ذوق!
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز ونزاکت والے

ان بے چاروں کو معلوم ہی نہیں کہ انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ کیا کمالات عطا فرماتے ہیں اور ان کی تعلیم کیسی ہوتی ہے؟ جو کچھ نبی ﷺ سے صحیح اسانید کے ساتھ منقول ہے بالکل برحق ہے، آمنا وصدقنا، اور یہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ کی بات نہیں مانتے فالتو بکتے ہیں اور اپنے کو اُمتی کہلاتے ہیں۔

اہلِ حق کی علامت

[حدیث:۱۱۹۵] ''.......جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ......، لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي يُقَاتِلُونَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ قَالَ فَيَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَقُولُ أَمِيرُهُمْ تَعَالَ صَلِّ لَنَا فَيَقُولُ: لَا! إِنَّ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ أُمَرَاءُ تَكْرِمَةَ اللهِ هٰذِهِ الْأُمَّةَ۔''

(صحیح مسلم ج:۱، ص:۳۷۳، حدیث نمبر:۲۲۵، بَاب نُزُولِ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ حَاكِمًا بِشَرِيعَةِ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ...)

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہمیشہ رہے گا ایک گروہ میری اُمت کا اس حال پر کہ حق پر لڑتے رہیں گے، غالب رہیں گے

قیامت تک، فرمایا کہ: پس نازل ہوں گے عیسیٰ بن مریم پس وہ کہیں گے ان کے امیر: آپ ہمیں نماز پڑھایئے! وہ فرمائیں گے: نہیں! تم میں سے بعض بعض کے امیر ہیں، یہ حق تعالیٰ کی طرف سے اُمت کا اعزاز ہے۔"

تشریح: اس حدیث میں فرمایا: میری اُمت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر رہے گا اور یہ غالب رہیں گے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: کوئی ان کی مدد کرے یا نہ کرے، کوئی ان سے دوستی کرے، کوئی ان سے دشمنی کرے، ان کا کچھ نہیں بگڑے گا، وہ اللہ کے فضل سے اپنا کام کرتے رہیں گے، ملا کو جتنا چاہے گالیاں نکالو، ملا بھی بڑا سخت جان ہے، چلتا رہے گا ان شاء اللہ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو جائیں گے اور عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا قیامت کی گھنٹی ہے۔ اس کے بعد ان کا واقعہ ذکر فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عین اس وقت تشریف لائیں گے کہ جماعت کھڑی ہوگی اور امام مصلیٰ پر جا چکا ہوگا، پس مسلمانوں کا اس وقت کا جہاد کا امام وہی امام ہوگا، مراد اس سے حضرت مہدی رضی اللہ عنہ ہیں، وہ کہیں گے کہ: "تَقَدَّمْ يَا رُوحَ اللهِ!" [مسند احمد بن حنبل ۲۹/۵۷۴، ۱۴۴۲۶] اے روح اللہ! تشریف لایئے نماز پڑھایئے۔ فرمائیں گے: نہیں! دوسری جگہ یہ بھی الفاظ ہیں کہ وہ فرمائیں گے: یہ نماز آپ ہی پڑھائیں گے اس لئے کہ اس کی اقامت آپ کے لئے ہوئی ہے، جب اقامت ہوئی ہے امام آپ تھے، میرا وہاں کھڑا ہونا ٹھیک نہیں۔

تم میں سے بعض لوگ بعض کے امیر ہیں اور یہ اعزاز ہے اللہ کی جانب سے اس اُمت کا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو حضرت امام مہدی رضی اللہ عنہ خود بخود معزول ہو گئے، بڑے جرنیل آنے کے بعد اب ماتحتوں کا حکم تو نہیں چلے گا لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری پر یکا یک حضرت مہدی رضی اللہ عنہ کا معزول کر دیا جانا، اس سے تھوڑا سا شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ اپنی چلائیں گے، کہا آئے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں ہیں تو پہلی نماز کی امامت وہ نہیں کریں گے بلکہ حضرت امام مہدی رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھیں گے، یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ تم ایک دوسرے کے امیر ہو اور میں تم میں شامل ہو کر امیر بن رہا ہوں، میں اب اپنے منصب پر نہیں آ رہا، منصب تو نبوت کا ہے وہ صاحب کتاب نبی ہیں، بلکہ اب میں اس فوج کا سپاہی بن کر آ رہا ہوں۔ یہ ہے اعزاز اس اُمت کا اللہ کی جانب سے، کیا اعزاز ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو کہ جلیل القدر رسول ہیں اور جو کہ پانچ اولوا العزم انبیائے کرام میں سے ہیں، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ پانچ اولوا العزم انبیاء کہلاتے ہیں:
﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ﴾ (الاحزاب: ۷) آپ سے عہد لیا، نوح سے، ابراہیم سے موسیٰ سے اور حضرت عیسیٰ سے، اور باقیوں کو نبیوں کی فہرست میں ذکر فرمایا۔

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو خود صاحب شریعت نبی ہیں جن کا شماران پانچ اولوالعزم رسولوں میں ہے جو پوری جماعت انبیاء میں افضل ہیں، ان کی اللہ نے اس اُمّت میں تشریف آوری مقدر فرمائی تھی تو ان سے نماز پڑھوائی گئی اس امتی کے پیچھے تا کہ معلوم ہو جائے کہ وہ اس وقت امام الانبیاء کے مقتدی ہیں خود مقتدا نہیں ہیں، یہ ہے اس اُمّت کا اعزاز کہ تم میں سے بعض بعض کے امیر ہیں اور میں جو امیر بن کر آیا ہوں وہ بھی اس اُمّت میں شامل ہو کر پہلے اس اُمّت میں شامل ہوا پھر امیر بنا ہوں۔

یہ حدیث پاک کہ میری اُمّت کا ایک گروہ دین حق پر قائم رہے گا، یہ دس سے زیادہ صحابہ کرام سے مروی ہے اور حدیث متواتر ہے، علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تدریب میں لکھا ہے کہ جو حدیث دس صحابہ سے مروی ہو وہ حدیث متواتر کہلاتی ہے، اس لئے کہ دس صحابی نہ تو مل کر جھوٹ بول سکتے ہیں اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ دسوں کو غلطی لگی ہو، اور یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ضرور آنا ہے، مرزا اور مرزائیوں کا منہ ضرور کالا ہوگا، مرزا غلام احمد نے دھوکا دیا ہے "إزالة الأوهام" میں لکھتا ہے کہ اس وقت تو عیسیٰ میں ہی ہوں اگر اصلی عیسیٰ آجائے تو ہم اس کو بھی مان لیں گے۔ اور مسلمانوں سے کہتا ہے کہ اگر تمہارا عیسیٰ نہ آیا اور سچ مچ عیسیٰ میں ہوا تو پھر تم عیسیٰ کے بغیر رہ جاؤ گے۔

اس کا جواب یہ ہے فارسی کا مقولہ ہے:

بصاحب ہنر بنما گوہر خود را
عیسیٰ نتوانگشت بتصدیق خر چند

اپنا گوہر یا جوہر کسی صاحبِ ہنر کو دکھایا کرو، چند گدھے اگر حضور عیسیٰ کہنے لگ جائیں تو انسان عیسیٰ نہیں بن جاتا۔

تو چند گدھوں نے غلام احمد کو کہہ دیا "عیسیٰ" حالانکہ وہ تو خر کافر ہے۔ یہ تو اس کے پہلے حصے کا جواب ہوا کہ تو اگر سو مرتبہ بھی پیدا ہو مرے تو بھی عیسیٰ نہیں بن سکتا، عیسیٰ کوئی اور ہی ہے، اور اس کا یہ کہنا ہے کہ اصلی عیسیٰ آ گیا تو ہم مان لیں گے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے، جنہوں نے عیسیٰ کو اتنی گالیاں دیں ہیں ان کو عیسیٰ ماننے کی کب توفیق ہو سکتی ہے؟ سو سال سے یہ قادیانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، یہ یہودیوں کے ساتھ ہی قتل ہوں گے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہودیوں کے سامنے تھے اور جب دوبارہ آئیں گے تو پھر مقابلہ یہودیوں ہی کے ساتھ ہوگا، ان بدبختوں سے یہ نہیں ہوگا کہ یوں کہہ دیں کہ حضور! توبہ کرتے ہیں، ایمان لاتے ہیں، مر جائیں گے لیکن ایمان نہیں لائیں گے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن یہودی ہیں، ان کو کبھی ایمان لانے کی توفیق نہ کبھی ہوئی نہ کبھی ہوگی، اور دوسرے نمبر پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن یہ مرزائی ہیں۔

ایک جماعت حق پر رہے گی

[حدیث:۱۱۹۷] "......الْمُغِيرَةَ بْنَ شُعْبَةَ......، لَا يَزَالُ نَاسٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ حَتَّى يَأْتِيَهُمْ أَمْرُ اللهِ وَهُمْ ظَاهِرُونَ۔"

(صحیح بخاری ج:۱۱ص:۱۷۴،حدیث نمبر:۳۳۶۸،باب سُؤَالِ الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُرِيَهُمُ النَّبِيُّ...)

ترجمہ: ''حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کچھ لوگ میری اُمّت میں سے ہمیشہ قائم اور غالب رہیں گے جب تک کہ قیامت آجائے اور وہ غالب ہی رہیں گے۔''

تشریح: اس حدیث شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی ہے کہ میری اُمّت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی اور وہ غالب رہیں گے کوئی ان کا ساتھ دے یا نہ دے، بہر حال وہ اپنی جگہ پر قائم رہیں گے، اور یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا، یہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی ہے اس گروہ سے کون سا گروہ مراد ہے؟ بعض نے فرمایا کہ: اس سے مراد مجاہدین ہیں، اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا، یہ سلسلہ قیامت تک رہے گا، کہیں نہ کہیں مسلمانوں کا کافروں کے ساتھ مقابلہ ہوتا رہے گا۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اگر اس سے مراد محدثین مراد نہیں ہیں تو پھر مجھے معلوم نہیں کہ اس سے کون مراد ہیں؟ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث شریف کی حفاظت کرنے والے، اور آپ کی سنتوں کی پابندی کرنے والے، کیونکہ لوگ بدعتیں ایجاد کرتے ہیں، نئی نئی رسمیں ایجاد کرتے ہیں تو حضرات محدثین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا حوالہ دے کر ان کو ٹوکتے ہیں، ان کی اصلاح کرتے ہیں۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ: اس سے فقہاء مراد ہیں اس لئے قیامت تک اہل علم دینی مسائل میں اُمّت کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ لیکن میں کہتا ہوں اور ان اکابر نے جو کچھ فرمایا اسی کی روشنی میں کہتا ہوں کہ حدیث میں کسی خاص گروہ کا تذکرہ فرمانا مقصود نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ پوری کی پوری اُمّت گمراہی پر متفق ہوجائے، یہ ممکن نہیں، یہ نہیں ہوسکتا کہ پوری کی پوری اُمّت گمراہی پر متفق ہوجائے، ان کی گمراہی پر ٹوکنے والا نہ رہے، جیسا کہ ایک حدیث شریف میں فرمایا: "لا يجتمع الله أمتي على الضلالة" [مستدرک الحاکم ۱/۳۸۰،۳۶۰] میری اُمّت گمراہی پر جمع نہیں ہوگی اور ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ وعدہ فرما رکھا ہے کہ میری اُمّت کو گمراہی پر جمع نہیں ہونے دیں گے، تو جب بھی کوئی قوم بدعت نکالے گی یا اس اُمّت کے اندر گمراہیاں پھیلیں گی تو یہ ممکن نہیں کہ کوئی بھی اس کی مخالفت کرنے والا نہ رہے، جس دن ایسا ہوگا اس دن نظام ہی کو ختم کر دیں گے یہ سب کوڑا ہے جلانے کے قابل۔ اُمّت گمراہی میں مبتلا ہوجائے اور کوئی بھی

ٹوکنے والا نہ رہے، یہ نہیں ہوسکتا، بلکہ اُمّت کا ایک گروہ ہر زمانے میں ہر حالت میں ہر صورت میں حق کو تھامے ہوئے ہوگا، اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور یہ رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی ہے، اور چودہ سو سال کی تاریخ اس پیش گوئی پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے، الحمدللہ! یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوجانی چاہئے کہ دین وہی ہے جو چودہ صدیوں کے تسلسل اور تعامل سے چلا آرہا ہے، اُمّت کے اندر جو نئے نئے فرقے بنتے ہیں کہ جن کا کوئی پس منظر نہیں وہ ایسے ہوتے ہیں جیسے بے باپ کی اولاد ہوتی ہے، ان کا نسب نامہ تم کیا تلاش کروگے، جیسے یہ قادیانی ہیں، مرزا غلام احمد سے چلے، ان سے کہا جائے اوپر چلو! کہتے ہیں: آگے کچھ نہیں! یہ جو تمہارا فرقہ ہے اس کے عقائد اس سے پہلے کیا تھے؟ کہتے ہیں نہیں معلوم کہ یہ بے باپ ہے، اس سے آگے نہیں چلتا۔

یہ اب ''جماعت المسلمین'' والے کھڑے ہوئے ہیں ماشاء اللہ کہتے ہیں کہ ہم ''المسلمین'' ہیں، اور حدیث شریف میں فرمایا: جب فرقے بہت ہوجائیں اور اختلافات بہت زیادہ ہوجائیں تو ''**الزم جماعة المسلمين وإمامهم**'' [السنن الکبریٰ للبیہقی] تو جماعت المسلمین کو لازم پکڑ لینا اور ان کے امام کو۔ میں دو چار دوستوں کو ملاکر ''جماعت المسلمین'' بنالوں گا اور خود بن جاؤں امام اور کہوں: رسول اللہ ﷺ کی حدیث کا مصداق میں ہوں۔ ماشاء اللہ! چشم بد دور!

ان سے پوچھو کہ: تم سے پہلے ''جماعت المسلمین'' کہاں تھی؟ ذرا ہمیں بھی پتا نشان بتاؤ، کہتے ہیں کہ پہلے تو نہیں تھی۔ ہم نے کہا: یہ بھی بے باپ کے نکلے، نسب نامہ ان کا بھی نہیں۔ ایک اور توحیدی پارٹی ہے، کیپٹن مسعود عثمانی کی، وہ بھی ایسے ہی ہیں، کہتے ہیں: باقی سارے گمراہ ہیں، ہم ہدایت پر ہیں۔ ان تمام فرقوں کی خصوصیت یہ ہے کہ جس برتن میں کھاتے ہیں اسی میں پیشاب کرتے ہیں، پوری اُمّت کو گمراہ بھی کہتے ہیں اور اسی اُمت کو جو قرآن دیا گیا ہے اسی سے تمسک بھی کرتے ہیں، یعنی اسی سے دلیل بھی پکڑتے ہیں، اگر اُمّت پوری گمراہ ہے تو اس کا قرآن کیسا معتبر ہوگا؟ یہ بخاری اور مسلم کیسے قابل اعتبار ہوگی؟ جماعت المسلمین والوں سے ذرا یہ تو پوچھو! تمہیں پیدا ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں، اس سے پہلے جو یہ بخاری اور مسلم کو نقل کرنے والے تھے یہ احادیث شریفہ کو وہ لائق اعتماد تھے یا گمراہ تھے؟ اگر کہو کہ وہ گمراہ تھے تو پھر ان گمراہوں کے راستے سے جو چیز تمہیں ملی ہے تو وہ قابل اعتبار کیسے ہوگئی تمہارے نزدیک؟ اور اگر وہ مسلمان تھے پاک صاف تھے تو تمہیں الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کی کیا ضرورت ہوئی؟ یہاں ضیاء الدین ہسپتال سے ادھر جائیں وہاں لکھا ہوتا ہے مسجد جماعت المسلمین ان کی نماز ہی نہیں ہوتی تمہاری مسجدوں میں، اور تمہیں کہتے ہیں کہ ہماری مسجد میں نماز پڑھو بشرطیکہ تم ان کے دین پر آجاؤ، پہلا دین چھوڑ دو۔

تو آنحضرت ﷺ اس حدیث پاک میں ارشاد فرماتے ہیں میری اس اُمّت میں ایک جماعت

تسلسل کے ساتھ حق پر قائم رہے گی یہ ممکن نہیں کہ حق کو ختم کر دیا جائے، اور یہ بھی ممکن نہیں کہ پوری کی پوری اُمّت باطل پر متفق ہو جائے، یہ کبھی ہوا ہی نہیں۔ اگر لوگ ایک غلط راستہ اختیار کرلیں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کھڑا کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے، رسول اللہ ﷺ کی سنّت اور دین کے خلاف ہے۔

معصیت میں طاعت نہیں

[حدیث:۱۱۹۸] ”عَنْ عَلِيٍّ، لَا طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةِ اللهِ، إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ۔“

(صحیح مسلم ج:۹،ص:۱۷۳،حدیث نمبر:۳۴۲۴،باب وُجُوبِ طَاعَةِ الْأُمَرَاءِ فِي غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيمِهَا۔)

ترجمہ: ”حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی کی اطاعت نہ چاہئے خدا کے گناہ میں، اطاعت تو صرف نیک کام میں ہے۔“

تشریح: اس حدیث میں ارشاد فرمایا ہے: گناہ کے کام میں کسی کی فرمانبرداری نہیں، کسی کی فرمانبرداری نیک یا جائز کام میں ہے۔ یہ شریعت کا ایک بہت بڑا اصول ہے جو اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے، جس کام سے اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے کسی کے کہنے سے اس کا کرنا جائز نہیں، نہ کسی حاکم کے کہنے پر، نہ ماں باپ کے کہنے پر، نہ پیر واستاد کے کہنے پر، نہ کسی اور کے کہنے پر، بلکہ اس کا کرنا گناہ ہو گا، بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ماں باپ نیک کام سے روکتے ہیں، یا غلط کام کا ہمیں حکم دیتے ہیں تو گناہ ان پر ہوگا، ہم پر نہیں ہوگا، یہ غلط ہے، جس کام کا نیک ہونا یا بد ہونا آپ کو معلوم ہے کہ یہ برا کام ہے اگر کوئی اس کے کرنے کی فرمائش کرتا ہے تو اس کا کرنا جائز نہیں، حکم دینے والا بھی گناہ گار ہوگا اور اس کی تعمیل کر نے والا بھی گناہ گار ہوگا، اگر کوئی نیک کام ہے تو اس کا روکنا کسی کے لئے جائز نہیں ہوگا، روکنے والا گناہ گار ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے رکنے والا بھی گناہ گار ہوگا، تو اس اصول کو اچھی طرح محفوظ رکھنا چاہئے۔ حضرت سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے تو آپ نے تصورِ شیخ کی بطور علاج تعلیم فرمائی، بزرگ اس کی تعلیم فرماتے تھے کہ تم ہر وقت اس بات کا تصور رکھو کہ شیخ میرے سامنے ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے، اس کے بعد اس کے اوپر ترقی ہوئی اور پھر اس سے ترقی ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ مجھے دیکھ رہا ہے، تو یہ شیخ کے تصور کی تعلیم دینا بطور علاج کے تھا۔ حضرت سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: حضرت! یہ تو مجھ سے نہیں ہو سکے گا، یعنی تصورِ شیخ مجھ سے نہیں ہو سکے گا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فارسی شعر پڑھا:

بمئے سجادہ رنگین کن اگر پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زیراہ ورسم منزل را

پیر مغاں اگر کہے کہ اپنا سجادہ شراب سے رنگین کردو، تو کرڈالو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے
راستے پر چلنے والا شیخ وہ راستے کے راہ ورسم منزل سے بے خبر نہیں ہوتا، اس کو معلوم ہے
کہ اس کو کس راستے پر لئے جانا ہے۔

یہ سن کر حضرت سیّد صاحب نے ارشاد فرمایا: حضرت آپ کے کہنے پر گناہ کا کام کرلوں گا، میں جانتا ہوں کہ یہ گناہ ہے، اس سے توبہ واستغفار کرلوں گا، لیکن تصور شیخ کو تو میں شرک سمجھتا ہوں، اس کو کیسے کرسکتا ہوں؟ حضرت شاہ صاحب مسکرائے اور فرمایا: تمہاری طبیعت کو طریقِ نبوّت سے مناسبت ہے، طریقِ ولایت سے نہیں، میں تمہیں اس راستے پر لے چلتا ہوں اور یہ قریب تر راستہ ہے، تمہیں اگر گناہ کی بات پیر کہے تو بھی نہیں کرنی چاہئے اور اگر پیر کے کہنے پر کرنی پڑے تو سمجھ لو کہ گناہ گار ہوگے، گناہ سے بری الذمہ نہیں ہوسکتے، کسی پیر یا استاد کا قول حجت نہیں ہے، ماں باپ کا قول، کسی حاکم کا قول دین میں حجت نہیں، صرف اللہ اور اس کے رسول کا قول حجت ہے۔

عید کے دن شام کے وقت میرے پاس ایک نوجوان آیا، کہنے لگا: میری امی مجھے داڑھی نہیں رکھنے دیتی، میں نے آپ کے کہنے سے توبہ کرلی ہے لیکن امی نہیں رکھنے دیتی، وہ کہتی ہیں: ابھی تمہارا داڑھی رکھنے کا وقت ہی نہیں آیا، اور یہ کہتی ہیں: تم جو یہ مولویوں کے پاس مسجد چلے جاتے ہو بگڑ کر آتے ہو، یہ کون مولوی ایسا ہے جو بگاڑتا ہے؟ میں نے اس سے پوچھا: تمہارے اور بھائی ہیں؟ کہا: ہاں ہیں! میں نے کہا: پھر اماں سے کہہ دو کہ یا تو مجھے داڑھی رکھنے کی اجازت دے دیں ورنہ میں آپ کے ساتھ نہیں رہتا، میں اس گھر میں نہیں آؤں گا، رہا اماں کا یہ کہنا کہ تمہارا ابھی وقت نہیں آیا تو شاید وہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ جانتی ہے، نعوذ باللہ! اللہ تعالیٰ نے تو چہرے پر داڑھی اگا دی اور اماں کہتی ہے کہ ابھی وقت نہیں آیا۔ میری مرحومہ خوش دامن (ساس) کہا کرتی تھیں: داڑھی رکھنے سے کیا آدمی کی عمر کچھ زیادہ ہوجاتی ہے؟ اور داڑھی منڈوانے سے کیا کچھ کم ہوجاتی ہے؟ اور میری طرف اشارہ کرکے کہتی تھیں: دیکھو! ان کی بھی تو داڑھی ہے یہ بڈھے بن گئے داڑھی رکھ کے؟

یہ بیہودگی ہے جو لوگوں کے دل ودماغ میں بیٹھ گئی ہے، باقی اگر ماں باپ تمہیں دوزخ میں دھکے دیتے ہیں اور تم کہو کہ ہم مجبور ہیں ماں باپ کے آگے تو دوزخ میں تو تم جاؤ گے مجبور ہو یا نہ ہو۔ دوسرے کاموں کے لئے تو ماں باپ کی نافرمانی کرلیتے ہو لیکن جب شریعت کا مسئلہ آتا ہے تو کہتے ہو کہ ماں باپ کہتے ہیں۔ میں اکثر نوجوانوں کو جو اس قسم کی باتیں کرتے ہیں یہ کہتا ہوں کہ تمہارے والد محترم دوزخ میں تشریف لے جانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میرا صاحبزادہ بھی ساتھ چلے، سیدھے دونوں جہنّم میں جاؤ گے۔

کہنا یہ ہے کہ اگر ماں باپ دوزخ میں دھکے دیتے ہیں یا بیوی صاحبہ فرماتی ہیں کہ تم مجھے بہت

پیارے لگتے ہو تم دوزخ میں چلے جاؤ، جاؤ دوزخ میں! یا اولاد کہتی ہے کہ تم دوزخ میں جاؤ، ہمارے ابا بہت اچھے ہیں جہنّم میں جائیں تو تمہاری خوشی، ماں باپ کے، بیگم صاحبہ کے یا اولاد کے کہنے سے اگر تم جہنّم میں جانا چاہتے ہو تو شوق سے جاؤ، لیکن یہ کبھی مت بھولو کہ کسی کے کہنے سے گناہ گناہ ہونے سے نکل نہیں جاتا، گناہ گناہ ہی رہے گا۔

اور ایک بات یہ کہ اگر مولوی صاحب فتویٰ دیں تو مولوی صاحب اگر شریعت کی روشنی میں فتویٰ دیتے ہیں تو گو تمہیں انہوں نے غلط فتویٰ دیا ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں، اس لئے کہ تم شریعت کو جانتے نہیں ہو، مولوی پر اعتماد کیا ہے اس لئے غلط فتویٰ دیا ہے اور وہ شریعت کو جاننے والا ہے، اور اگر مولوی ایسا ہے کہ اپنی روٹی ٹکڑے سیدھے کرتا ہے اور اپنے حلوے کا سامان کرتا ہے تو تم بھی سوچ سکتے ہو کہ ایسے مولوی کے کہنے سے شریعت تو نہیں بدل سکتی، شریعت کسی مولوی کے کہنے سے نہیں بدل سکتی، ہوسکتا ہے کہ مولوی کو غلطی ہو گئی ہو، لیکن اگر تم جانتے ہو کہ یہ مولوی قابل اعتماد نہیں ہے تو پھر تمہارے لئے اس فتوے پر عمل کرنا بھی جائز نہیں ہے، اور اگر تمہارا علم یہ ہے کہ یہ اللہ کا نیک بندہ ہے اور شریعت کا ماہر ہے تو عامی کے لئے مفتی کا فتویٰ ہی شریعت، اس سے اللہ تعالیٰ خود ہی نمٹ لیں گے، تم پر کوئی گناہ نہیں، یہ میں نے اچھی طرح سمجھا دیا ہے، اس کو اچھی طرح سمجھ لو!

ہم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فتوے پر عمل کرتے ہیں اس لئے کہ ہمارا یقین ہے اور ہمارا نہیں بلکہ تمام دنیا کے علماء کا یقین ہے کہ وہ نہ صرف مجتہد تھے بلکہ امام اعظم مجتہد اعظم تھے "امام اعظم" ان کا لقب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جیسا شخص کہتا ہے کہ "من أراد الفقه فهو عيال أبي حنيفة" جو شخص دین میں تفقہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ابوحنیفہ کا محتاج ہے، اب اگر امام صاحب کو کسی مسئلے کے سمجھنے میں غلط فہمی ہوگئی تو وہ معذور ہیں اور ان کے مذہب پر جو عمل کرنے والے ہیں وہ بھی معذور ہیں، ان کے لئے یہی شریعت ہے کیونکہ یہ خود شریعت کو نہیں جانتے، البتہ علمائے کرام جو شریعت کے ماہر ہیں ان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اس پر غور کریں اور الحمدللہ فقہ حنفی کے ایک ایک مسئلے کو کتاب وسنّت کی میزان پر رکھ کر علماء نے فتویٰ دیا ہے، جہاں دیکھا کہ شریعت کے خلاف ہے اور حضرت امام سے اس میں خطا ہوئی ہے انہوں نے وہاں امام صاحب کے قول کو نہیں لیا۔

لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے یہ کہنا کہ حضرت امام نے کہا ہے کہ جب حدیث تمہارے سامنے آجائے تو میرے قول کو دیوار پر ماردو، یہ بے ہودہ بات ہے، حدیث تمہارے سامنے آجائے تو تمہیں یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ اس حدیث کا یہی مطلب ہے جو تم بیان کرتے ہو؟ اور وہ حدیث امام حدیث امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو نہیں پہنچی تھی: "لا صلوٰة الا بفاتحة الكتاب" [صحیح البخاری] یہ حدیث امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو نہیں پہنچی تھی؟ تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ علمائے اُمّت کے فتوے پر عمل کرنا جب کہ وہ محقق علماء ہوں اور شریعت کے

ماہر ہوں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوں، وہ ہوائے نفس اور خواہش نفس کی بنیاد پر فتویٰ نہ دیتے ہوں، اگر کسی مسئلے میں ان سے خطا ہو جاتی ہے تو ان شاء اللہ ان پر بھی گرفت نہیں اور تم پر بھی گرفت نہیں اور یہ معصیت خالق ہے ہی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (الانبیاء:۷) اگر تم علم نہیں رکھتے تو اہل علم سے پوچھو، جو مسئلہ ہم نہیں جانتے، ہمیں حکم ہے کہ جاننے والوں سے پوچھیں، اب جاننے والے سے بھی غلطی ہو سکتی ہے، وہ بھی بشر ہے، سہو ونسیان وخطا ہو سکتی ہے جیسے آدمی کا قدم پھسل جاتا ہے اسی طرح کبھی کبھی انسان کی فکر بھی پھسل جاتی ہے، سوچ بھی پھسل جاتی ہے انسان معصوم نہیں ہے، ہم اپنے ائمہ دین کو معصوم نہیں سمجھتے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جو چاروں اماموں میں دوسرے امام ہیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس کے پاس حدیث شریف پڑھایا کرتے تھے، یہ مدنی ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں: ہم میں سے ہر ایک کی تردید کی جائے گی سوائے اس قبر والے کے کہ انہوں نے جو بات کہہ دی وہ لاجواب ہے، ان کی کہی ہوئی بات کو کوئی رد نہیں کر سکتا اور کسی کے لئے گنجائش نہیں کہ اس کا انکار کرے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک بات کہیں دوسرے امام اس کی تردید کریں، ایک امام ایک بات کہیں اور دوسرے امام اس کی تردید کر دیں، ہر ایک کو دوسرے کی تردید کا حق پہنچتا ہے جب کہ اس کی ٹکر کا ہو، امام امام کی تردید کر سکتا ہے جو اس درجے کا آدمی ہو، جس غریب کو استنجا کرنا نہ آتا ہو، وہ اٹھ کر امام کے قول کی تردید کرے، تو اس کو میں کیا کہوں؟ صحابہ کرام ایک دوسرے کی تردید کر سکتے ہیں، ایک صحابی دوسرے سے اتفاق نہیں رکھتا کہہ سکتا ہے کہ یہ غلط ہے، لیکن تم صحابہ کے قول کی تردید کرو تمہیں یہ حق نہیں دیا جائے گا، یہ علمائے اصول نے ایک اصول بیان کیا ہے کہ جس مسئلے پر صحابہ کرام کا اتفاق ہو اور کسی صحابی نے اس کی تردید نہیں کی بعد کی اُمّت کے کسی بڑے سے بڑے مولوی کے لئے جائز نہیں کہ اس کی خلاف ورزی کرے، ممکن ہی نہیں، اور اگر صحابہ کرام کے درمیان اختلاف تھا تو حضرات ائمہ دین جو ان کے بعد آئے ہیں وہ ان میں سے کسی ایک قول کو لے لیتے ہیں کچھ لوگ دوسرے قول کو لے لیتے ہیں، لیکن کسی کے لئے یہ حلال نہیں کہ ان دو قولوں کو چھوڑ کر تیسرا قول اختیار کرلے، حق ان دونوں کے درمیان دائر ہے یا وہ ہے یا وہ، تیسرا قول نہیں۔

مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ اُمّت مرتبہ شناس نہیں رہی، ہر آدمی کو اس کا مرتبہ دینا چاہئے، مولوی مولویوں سے لڑتے ہیں، لڑنے دو، لیکن آپ کو مولوی کے خلاف بولنے کا حق نہیں، اہل علم ایک دوسرے کی تردید کریں، ائمہ دین آپس میں اختلاف کریں جو اس قدر چوٹی کے اہل شریعت ہیں لیکن میرے جیسے عامی کو یہ حق نہیں پہنچتا، ہاں! میں اپنے امام کی تائید میں بات کر سکتا ہوں کہ میرے امام یہ فرماتے ہیں اور دوسرے امام یہ فرماتے ہیں اور میرے امام یہ فرماتے ہیں اور دوسرے امام یہ فرماتے ہیں اور میرے امام کی وجہ ترجیح یہ ہے، یہ بات تو میں کہہ سکتا ہوں، لیکن مجھے حق نہیں پہنچتا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تردید

خود کردوں، میں کون ہوتا ہوں؟ بڑے سے بڑا عالم بھی کسی امام کی تردید نہیں کرسکتا، اس لئے یہ جائز نہیں اور ائمہ دین صحابہ کرام سے فیض یافتہ ہیں وہ صحابہ کے اقوال کو ترجیح دے سکتے ہیں کہ یہ قول مجھے زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے دوسرا کہتا ہے کہ مجھے یہ زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے، ترجیح دے سکتے ہیں، لیکن کسی بڑے سے بڑے امام کو یہ حق نہیں پہنچتا نہ امام ابوحنیفہ کو نہ امام مالک کو نہ امام شافعی کو کہ صحابہ کے اقوال کو چھوڑ کر کسی اور کے قول کو اختیار کرلیں۔

جیسا کہ کسی صحابی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ نعوذ باللہ! رسول اللہ ﷺ کے قول کی تردید کردیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ہاں صحابی یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہوگیا یہ ٹھیک ہے، صحابی یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضور ﷺ کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں جو تم نے سمجھا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے، یہ کہہ سکتا ہے، لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ قول غلط ہے۔ اور اب مرتبہ ناشناس اُمّت حضور ﷺ کے ارشاد کو بے دھڑک کہتی ہے کہ یہ غلط ہے، نعوذ باللہ! میں کہتا ہوں کہ تمہیں تو کسی عالم کی تردید کا بھی حق نہیں، عالم عالم کی تردید کرسکتا ہے، ہم جیسے عامیوں کو اس کا حق نہیں، اب کسی مسئلے میں حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ہمارے شیخ بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے تو مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ مفتی صاحب کی تردید کروں؟ میں ان کے مرتبے کا آدمی ہوں تو تردید کروں اور نعوذ باللہ! یہاں صاحب شریعت نبی ﷺ کے ارشادات کی لوگ بے دھڑک تردید کردیتے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں۔

کتابُ الجہاد

جہاد کے گھوڑے کی فضیلت

[حدیث:۱۱۹۹] "أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ......، مَنْ احْتَبَسَ فَرَسًا فِي سَبِيلِ اللهِ إِيمَانًا بِاللهِ وَتَصْدِيقًا بِوَعْدِهِ فَإِنَّ شِبَعَهُ وَرِيَّهُ وَرَوْثَهُ وَبَوْلَهُ فِي مِيزَانِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ."

(صحیح بخاری ج:۹،ص:۴۵۵،حدیث نمبر:۲۶۴۱،باب مَنْ احْتَبَسَ فَرَسًا فِي سَبِيلِ اللهِ لِقَوْلِهِ تَعَالٰى.......)

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے روک رکھا گھوڑا جہاد کے لئے، اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس کے وعدے کی تصدیق کرتے ہوئے تو اس کا چارہ پانی، رزق حتیٰ کہ اس کا بول و براز بھی قیامت کے دن اس کے میزان میں ہوگا۔"

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ جس شخص نے جہاد کے لئے اللہ کے راستے میں گھوڑا باندھا تو اس کا چارہ، اس کا پانی، اس کی لید اور پیشاب یہ سارے کا سارا قیامت کے دن اس کی میزانِ عمل میں ہوگا، متفق علیہ۔

کتنا بابرکت ہوگا وہ گھوڑا جس کی لید بھی نیکیوں میں تولی جارہی ہے، اس لئے کہ یہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے لئے ہے، یہ صحیح بخاری کی روایات ہیں۔ اور دُوسری روایت میں یہ آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جن جن جگہوں پر اس کے قدم پڑتے ہیں، وہ جگہیں بھی قیامت کے دن میزانِ عدل میں ہوں گی، اس کے میزانِ عدل میں ڈال دی جائیں گی۔

اللہ کے راستے کے گرد و غبار کی فضیلت

[حدیث:۱۲۰۰] "أَدْرَكَنِي أَبُو عَبْسٍ ......، مَنْ اغْبَرَّتْ قَدَمَاهُ فِي سَبِيلِ

اللهِ حَرَّمَهُ اللهُ عَلَى النَّارِ۔"

(صحیح بخاری ج: ۳،ص: ۴۳۲، حدیث نمبر: ۸۵۶،باب الْمَشْيِ إِلَى الْجُمُعَةِ وَقَوْلِ اللهِ جَلَّ ذِكْرُه......)

ترجمہ: ''حضرت عبدالرحمن بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ کے راستے میں جس شخص کے پیر غبار آلود ہوئے، اللہ تعالیٰ اس پر جہنم حرام کردیں گے۔''

تشریح: اس حدیث میں خروج فی سبیل اللہ کی فضیلت ہے، یعنی اللہ کے راستے میں نکلنا، فرمایا: جس شخص کے قدم اللہ کے راستے میں غبار آلود ہوئے یعنی اس کے پیروں پر مٹی پڑی، اللہ اس پر دوزخ کو حرام کردیں گے۔

''فی سبیل اللہ'' سے کیا مراد ہے؟ عام طور پر یہ لفظ معروف ہے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے، اللہ کے راستے میں جہاد کرنا، اور فی سبیل اللہ کا معنی اللہ کے راستے میں، یعنی جو کام بھی اللہ کی رضا کے لئے کیا جاتا ہے فی سبیل اللہ کہلاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں صدقات کی آٹھویں مد (قسم) فی سبیل اللہ ذکر کی گئی ہے، اس فی سبیل اللہ کی تفصیل میں علماء کے اقوال ہیں:

بعض نے کہا کہ اس سے ''منقطع الغزات'' مراد ہے، یعنی وہ مجاہد اور غازی جو سفری خرچ نہ ہونے کی وجہ سے جا نہ سکے۔ ابوداؤد شریف میں روایت ہے کہ ایک صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، اور فرمایا: اے اللہ کے نبی! جہاد میں جانا چاہتا ہوں اور سواری کوئی نہیں ہے۔ فرمایا: فلاں انصاری کے گھر جاؤ، اس نے جہاد کا سامان تیار کرلیا تھا، لیکن غریب بیمار ہوگیا، جا نہیں سکتا، اس سے کہو کہ سفر کے لئے اُونٹنی بھی دیدے اور سفر کا توشہ بھی ساتھ دیدے۔ یہ صاحب گئے اور جاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام دیا تو وہ صحابی فرمانے لگے اپنی بیوی سے: اُمّ فلاں! آپ نے جو کچھ میرے سفر کے لئے تیار کر رکھا تھا، وہ سارے کا سارا ان کو دے دو، ایک پیسہ بھی بچا کر نہ رکھنا، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ اللہ کے راستے میں جتنا خرچ ہوجائے ہونے دو اس کو۔

تو منقطع الغزات یعنی وہ غازی کہ جن کے توشے ختم ہوگئے ہوں، وہ فی سبیل اللہ میں داخل ہے اور بعض نے منقطع الحاج سے تفسیر کی ہے اس کی، یعنی وہ حاجی کہ جن کا توشہ ختم ہوگیا ہو، کبھی ایسا ہوجاتا ہے کہ حج کے موقع پر ایک آدمی اچھا خاصا آیا تھا، مگر اس کی جیب کٹ گئی یا سامان گم ہوگیا، اب تو بعض لوگوں نے اس کو پیشہ بھی بنالیا ہے مستقل، اب تو جنازہ فروشی بھی ایک پیشہ بن گیا ہے، ایک جنازے کی چارپائی لے کر اس میں اُوپر پردہ ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جی وہ بیچارہ مرگیا ہے دفن کے پیسے نہیں، حالانکہ اندر کچھ بھی نہیں ہے، اس کے لئے چندہ مانگتے ہیں، شیطان یہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے سارے راستے روک

دیئے جائیں، کوئی مردے کے لئے بھی پیسے نہ دے۔

ایک دفعہ ہم حرم شریف میں بیٹھے ہوئے تھے، اُوپر کی منزل میں تھے، تو ایسے ہی ایک آدمی آیا اور آ کر اس نے ایک کہانی سنائی کہ وہ اصل میں جی میرا پاسپورٹ بھی گم ہو گیا، شناختی کارڈ بھی گم ہو گیا۔ خیر میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا، اس وقت میرے پاس تین سو ریال تھے، میں نے کہا کہ: بھئی! ابھی یہی ہے میرے پاس، یہی آپ کی نذر کرتا ہوں۔ جب ہم حرم شریف سے نکل آئے تو میرے ساتھی کہنے لگے کہ یہ تو فراڈی لوگ ہوتے ہیں، آپ نے اس کو کیوں دے دیئے؟ میں نے کہا: اس وقت مجھے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی بات یاد آ گئی، انہوں نے فرمایا تھا کہ جو شخص اللہ کے نام پر دھوکا دینا چاہتا ہے ہم اس کے دھوکے میں آنا چاہتے ہیں، ہمارا کیا نقصان ہوتا ہے؟ اس نے دھوکا دیا اپنے آپ کو، ہمیں اس نے دھوکا نہیں دیا، اس نے اللہ کے نام پر کہا تھا اور حرم میں بیٹھ کر کہا تھا، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہر کسی کو دینے کو جی بھی نہیں چاہتا، کسی کو دے دیا بعد میں معلوم ہوا کہ فراڈی تھا، دھوکے باز تھا لیکن آپ کو ثواب مل گیا، اِن شاء اللہ مکمل جتنا کسی محتاج ترین آدمی کو دینے کا ثواب ملتا اتنا ہی آپ کو مل گیا، اس کا افسوس ہوتا ہے کہ اس غریب کی بُری عادت پختہ ہو گئی، اپنے پیسے جانے کا افسوس نہیں ہوتا، افسوس اس غریب کے نقصان کا ہے کہ اس کی عادت پختہ ہو گئی، ایک دفعہ دھوکا کامیاب ہو گیا، دُوسری دفعہ کامیاب ہو گیا، تیسری دفعہ کامیاب ہو گیا، اب وہ پکا دھوکے باز بن جائے گا، لیکن پکڑا جائے گا کسی نہ کسی دن، جوتے کھائے گا۔ سنا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک چور لایا گیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تجھے شرم کرنی چاہئے! کہنے لگا: امیرالمؤمنین! میری پہلی چوری ہے، مجھے معاف فرما دیں۔ فرمانے لگے: یہ جھوٹ بولتا ہے، میرا مالک اس سے زیادہ کریم ہے کہ پہلے جرم پر کسی کو رُسوا کر دے۔

تو منقطع الحاج جن حاجیوں کے پیسے گم ہو گئے ہوں، سامان گم ہو گیا ہو۔ جس سال مولوی منیر میرے ساتھ گئے ہیں، میرا آپریشن ہوا تھا پچھلے سے پچھلے سال، یہ جمیل ہمارا بکسا اُٹھا کر لے گیا کپڑوں کا، ملا ہی نہیں، وہ کہتا ہے: میں وہاں رکھ گیا تھا تمہیں چڑھانا تھا۔ سفر میں میرے بکسے بہت گم ہوتے ہیں، پتا نہیں کیا بات ہے، لوگوں کو پسند آ جاتے ہیں۔ تاشقند کے سفر میں بھی ایسا ہی ہوا، سرد ملک ہے جتنے دن وہاں رہا لوگوں کے کپڑے مانگ کر پہنتا رہا، سوئٹر بھی لے کر گیا تھا دو دو جوڑے یعنی دو دو قسم کے گرم۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے، تیرا علاج یہی ہے۔ تو وہاں سارے کپڑے گئے، پیسے ہوتے وہ بھی چلے جاتے۔ کہنے کا مطلب ہے کبھی اتفاق سے ایسا ہو جاتا ہے، ایک شریف آدمی جو واقعتا مانگنے والا نہیں ہے، اب خدانخواستہ ایسا ہو جائے اور کوئی ساتھ ساتھی نہ ہو تو انسان کو مانگنا پڑ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھے۔

اور اسی طرح تمام عبادت کی چیزوں پر بھی فی سبیل اللہ کا اطلاق ہوتا ہے، اور خاص طور پر تعلیمِ دین کے لئے خرچ کرنا یہ بھی فی سبیل اللہ ہے۔ اور امامِ ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: میرے نزدیک

موجودہ دور میں، یہ ان کے دور کی بات ہو رہی ہے آج سے تقریباً چار سو سال پہلے، دُوسرے مصارفِ خیر پر ایک لاکھ روپیہ خرچ کرنا اور تعلیمِ دین پر ایک پیسہ خرچ کرنا برابر ہے یا اس سے بہتر ہے۔

اطاعتِ امیر کا حکم

[حدیث: ۱۲۰۱] ''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ......، مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللهَ وَمَنْ أَطَاعَ أَمِيرِي فَقَدْ أَطَاعَنِي وَمَنْ عَصَى أَمِيرِي فَقَدْ عَصَانِي۔''

(صحیح مسلم ج:۹،ص:۳۶۵، حدیث نمبر:۳۴۱۸، بَاب وُجُوبِ طَاعَةِ الْأُمَرَاءِ فِي غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيمِهَا...)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: بے شک جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے بلاشبہ اللہ کی نافرمانی کی، جس نے میرے اَمیر کا کہنا مانا اس نے میرا کہنا مانا، اور جس نے میرے اَمیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔''

تشریح: اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جس شخص نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی، جس نے میرے اَمیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی، جس نے میرے اَمیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

بلاشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اُصولاً اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے اور یہاں سے منکرینِ حدیث کی قیمت معلوم ہوجاتی ہے جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو مانتے ہیں نہیں کہ حجت صرف قرآن ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات معتبر نہیں۔

اور چونکہ اُمّت کا نظامِ اجتماع امیر کے بغیر نہیں چل سکتا اس لئے امیر کی اطاعت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اطاعت اور امیر کی نافرمانی کو اپنی نافرمانی قرار دیا۔ امیر کی حیثیت مسلمانوں کے اجتماعی نظام میں ایسی ہے جیسے تسبیح کے دھاگے کی ہوتی ہے، اگر تسبیح کا دھاگہ ٹوٹ جائے تو موتی منتشر ہوجاتے ہیں، اس لئے جو شخص امیر کی اطاعت میں رخنہ ڈالنا چاہتا ہے درحقیقت وہ اس دھاگے کو توڑ دینا چاہتا ہے، جس پر مسلمانوں کی اجتماعیت کا دار و مدار ہے اور یہ حرام ہے، اور اَمیر کی نافرمانی کرنے والا جائز اُمور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرنے والا ہے۔

البتہ یہاں ایک بات سمجھ لینا چاہئے وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مطلق ہے، اس میں چوں وچرا نہیں، یہ کیوں ہے؟ اور کس لئے ہے؟ بخلاف امیر کی اطاعت کے کہ وہ مطلق نہیں ہے بلکہ دائرۂ شریعت

کے اندر محدود ہے، اگر وہ شریعت کے مطابق حکم دے گا تو اس کی اطاعت کی جائے گی اور اگر شریعت کے خلاف کا حکم دے گا تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی، بلکہ اس کو اُمیر بھی نہیں رکھا جائے گا۔

دُوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کو اور اس کے رسول اللہ ﷺ کو تو حق ہے کہ ہر چیز میں حکم دیں:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴾

(الأحزاب:۳٦)

ترجمہ: ''اللہ اور اللہ کے رسول کسی مؤمن کی زندگی کے ذاتی جزیئے کے بارے میں بھی حکم صادر فرمادیں تو اس کو اس کی تعمیل لازم ہے۔''

اگر کہیں کہ اس لڑکی کا نکاح فلاں جگہ پڑھا دو تعمیل لازم ہے، بخلاف اس کے اللہ اور اللہ کے رسول کے علاوہ خواہ کسی ملک کا امیر ہو یا کسی صوبے کا امیر ہو یا کسی علاقے کا امیر ہو یا کسی جماعت کا امیر ہو اس کی اطاعت مطلق نہیں بلکہ انہی اُمور میں اس کی اطاعت ہے جن اُمور میں حکم دینے کا اس کو حق ہے۔

ہمارے تبلیغی جماعت والوں میں اطاعتِ امیر پر بہت زور دیا جاتا ہے، اور ہونا بھی یہی چاہئے، اس لئے کہ اُمت میں سب سے بڑی چیز جو چھوٹی ہے وہ یہی ہے، اُمّت کا شیرازہ جو منتشر ہوا ہے وہ اسی سے ہوا ہے، سب شترِ بے مہار ہیں، ''وَ كُلٌّ أَمِيْرٌ عَلٰى نَفْسِه'' ہر کوئی اپنے نفس پر اَمیر ہے، لیکن ان میں سے جو بے وقوف ہیں وہ حد سے تجاوز کرنے لگتے ہیں، بے وقوف اس اعتبار سے کہ خود جانتے نہیں اور دُوسروں سے معلوم بھی نہیں کرتے۔

انگلینڈ میں بزرگ ہیں مولوی صاحب ہیں قاری صاحب ہیں، انہوں نے ایک عالم کے یہاں شادی کرلی، تبلیغ والے ناراض ہوگئے کہ تم نے امیر کی اطاعت نہیں کی۔ بھائی! تمہیں کس نے حکم دیا تھا کہ حکم دو؟ تمہیں اس کا اُمیر کس نے بنایا تھا؟ میرے سامنے انہوں نے یہ قصہ پیش کیا، مجھے سخت غصہ آیا، یہ بے وقوفی کی بات ہے، تم مشورہ دے سکتے ہو کہ بھائی! یہاں رشتہ کرنا بہتر رہے گا یا نہیں، مشورہ دینے کا تمہیں حق ہے اور وہ بھی اخلاص کے ساتھ، اس کی منفعت کو سامنے رکھتے ہوئے، اپنی ذاتی منفعت کے لئے نہیں، یا اس عالم اور بزرگ سے تمہیں ضد ہے اس بنا پر نہیں۔ بہرحال امیر مشورہ دے سکتا ہے اس کا اس درجے میں نہیں جو مرتبہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کا ہے۔

مجاہد کی تیاری کرانے کا اجر

[حدیث: ۱۲۰۲] ''عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِيِّ......، مَنْ جَهَّزَ غَازِيًا فِي

سَبِيلِ اللهِ فَقَدْ غَزَا وَمَنْ خَلَفَهُ فِي أَهْلِهِ بِخَيْرٍ فَقَدْ غَزَا۔"

(صحیح مسلم ج:۹،ص:۴۸۸،حدیث نمبر:۳۵۱۱،بَاب فَضْلِ إِعَانَةِ الْغَازِي فِي سَبِيلِ اللهِ بِمَرْكُوبٍ وَغَيْرِه......، صحیح بخاری ج:۹،ص:۴۳۸،حدیث نمبر:۲۶۳۱،بَاب فَضْلِ مَنْ جَهَّزَ غَازِيًا أَوْ خَلَفَهُ بِخَيْرٍ)

ترجمہ: "حضرت زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص راہِ خدا میں لڑنے والے کا سامان دُرست کردے گا تو بے شک وہ بھی غازی ہوا، اور جو غازی کے پیچھے اس کے گھر والوں کی اچھی طرح خبر لیتا رہا تو وہ بھی غازی کے برابر ثواب پاوے گا۔"

تشریح: یہ حدیث حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ کی ہے، اس میں دو مضمون ارشاد فرمائے ہیں، ایک یہ کہ جو شخص اللہ کے راستے میں جانے والے کا سامان دُرست کردے، اس کو اتنا ہی ثواب ملتا ہے جتنا کہ غازی کو ثواب ملتا ہے، دُوسرے یہ کہ جو شخص کسی غازی کے گھر میں خیر کے ساتھ رہے، اس کو اطمینان دلادے کہ گھر کے کام میں کردُوں گا اور اسی کے ساتھ اس کے گھر کی عزّت وآبرو کا بھی لحاظ رکھے تو اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ اللہ کے راستے میں جانے والے کو ملے گا۔

جو اطاعتِ امیر سے نکلا وہ جاہلیت کی موت مرا

[حدیث:۱۲۰۳] "عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ.....، مَنْ خَرَجَ مِنَ الطَّاعَةِ وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ فَمَاتَ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً، وَمَنْ قَاتَلَ تَحْتَ رَايَةٍ عِمِّيَّةٍ يَغْضَبُ لِعَصَبَةٍ أَوْ يَدْعُو إِلَى عَصَبَةٍ أَوْ يَنْصُرُ عَصَبَةً فَقُتِلَ فَقِتْلَةٌ جَاهِلِيَّةٌ، وَمَنْ خَرَجَ عَلَى أُمَّتِي يَضْرِبُ بَرَّهَا وَفَاجِرَهَا وَلَا يَتَحَاشَى مِنْ مُؤْمِنِهَا وَلَا يَفِي لِذِي عَهْدٍ عَهْدَهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَلَسْتُ مِنْهُ۔"

(صحیح مسلم ج:۹،ص:۳۸۸،حدیث نمبر:۳۴۳۶،بَاب وُجُوبِ مُلَازَمَةِ جَمَاعَةِ الْمُسْلِمِينَ عِنْدَ ظُهُورِ......)

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص امام کی تابعداری سے نکل گیا اور جس نے مسلمانوں کی جماعت کو چھوڑا، پھر وہ مرگیا تو کفر کی موت مرا۔ اور جو لڑا اندھا دُھند جھنڈے کے تلے، غصہ ہوا تو برادری کے واسطے نہ کہ خدا کے لئے، لوگوں کو بلایا تو برادری کے واسطے، کسی کی مدد کی تو برادری کی خاطر، پھر وہ اس حالت میں مرا تو اس کا قتل جاہلیت کا قتل ہے، اور جو شخص میری اُمّت کو ستانے کے واسطے کمر باندھ کر نکلے اور مارے اُمّت کے نیک کو اور بد کو اور حیا نہ کرے

اُمّت کے ایمان داروں سے اور پورا نہ کرے ذِمّی کے عہد کو، پس وہ مجھ سے نہیں اور میں اس سے نہیں۔''

معاہد کو قتل کرنا منع ہے

[حدیث:۱۲۰۴] ''عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا......، مَنْ قَتَلَ مُعَاهَدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ وَإِنَّ رِيحَهَا تُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ أَرْبَعِينَ عَامًا۔''

(صحیح بخاری ج:۱۰ ص:۴۲۳، حدیث نمبر:۲۹۳۰، باب إِثْمِ مَنْ قَتَلَ مُعَاهَدًا بِغَيْرِ جُرْمٍ)

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی معاہدے والے کو مار ڈالے وہ بہشت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا، اور بہشت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے آرہی ہوگی۔''

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی معاہد کو قتل کرے اس کو جنّت کی خوشبو بھی نصیب نہ ہوگی، حالانکہ جنّت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے آرہی ہوگی۔ ''معاہد'' سے مراد ہے وہ غیر مسلم جس نے اسلامی مملکت میں اس کے وفادار شہری بن کر رہنے کا معاہدہ کرلیا ہو۔ اسلامی مملکت کے غیر مسلم باشندے کو ''ذِمّی'' بھی کہتے ہیں، ''معاہد'' بھی کہتے ہیں، اس لئے کہ ان کا معاہدہ ہے کہ اسلامی مملکت کی خیر خواہی کریں گے، اس کے قانون کو مانیں گے، اس کے مطابق رہیں گے، قانون شکنی نہیں کریں گے، اور اس کے علاوہ باقی جو شرائط ان کے ساتھ طے ہوں، یہ ''ذِمّی'' کہلاتے ہیں اور ذِمیوں کے بڑے حقوق ہیں۔

اس حدیث میں فرمایا کہ اگر کسی نے ذِمّی کو بغیر کسی وجہ کے قتل کیا تو اس کو جنّت کی خوشبو بھی نصیب نہ ہوگی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جو شخص معاہد اور ذِمّی کے ساتھ کوئی زیادتی کرے گا قیامت کے دن میں اس کی طرف سے وکیل بن کر جھگڑا کروں گا، یعنی فرمایا ذِمّی کی طرف سے میں وکیل ہوں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم نے اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دیا ہے، اگر ہم اس کی خلاف ورزی کریں گے تو گویا اللہ اور اللہ کے رسول کے عہد کے توڑنے والے ہوں گے۔

دُوسری بات یہ کہ جاہل لوگ یہ نہیں دیکھتے، مسلمان اسلام و قانون پر عمل نہیں کر رہے، وہ سیدھا اسلام پر حملہ کرتے ہیں کہ ان کا دین ان کو یہی سکھاتا ہے، عہد شکنی، بدعہدی ان کا دِین ان کو سکھاتا ہے۔ مرزائیوں کے بارے میں میرا فتویٰ یہ ہے اور میں نے اس فتوے کو چھاپا ہوا ہے کہ یہ ذِمّی کافر نہیں ہیں بلکہ محارِب کافر ہیں، ان کے ساتھ ہماری جنگ ہے، وجہ یہ ہے کہ ان کو رعایت دی گئی تھی کہ وہ پاکستان کے غیر مسلم شہری کی حیثیت سے یہاں رہ سکتے ہیں، لیکن پاکستان کے آئین اور قانون کی ان کو پابندی کرنا

ہوگی، لیکن انہوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور آج تک تسلیم نہیں کیا، وہ اپنے آپ کو غیر مسلم تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں، علمائے کرام نے ان کے غیر مسلم ہونے کا فتویٰ دیا ہے، مشرق و مغرب کے اسلامی ممالک نے ان کے غیر مسلم ہونے کا فیصلہ کیا ہے، ہماری قومی اسمبلی نے ان کے غیر مسلم ہونے کا فیصلہ کیا ہے، ماتحت اور چھوٹی عدالتوں سے لے کر عدالتِ عالیہ اور عظمیٰ تک، ساری عدالتوں نے ان کے غیر مسلم ہونے کا فیصلہ کیا، لیکن یہ کہتے ہیں: ''نہیں! ہم مسلمان ہیں'' ہمارے حضرت علّامہ انور شاہ کشمیری صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا کہ لے جاؤ ان کو جہنّم میں تو اس وقت بھی یہ یہی کہیں گے کہ ظلم ہو رہا ہے ہم پر۔

غرضیکہ کسی معاہد اور ذِمّی کو قتل کرنا بڑا گناہ ہے اور یہاں یہ مسئلہ ذکر کرنا چاہوں گا کہ اگر کوئی مسلمان کسی ذِمّی کو قتل کردے تو اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سے قصاص لیا جائے گا، یعنی اس کو سزائے موت ملے گی اِلّا یہ کہ مقتول کے وارث اس کو معاف کردیں یا اس سے مصالحت کرلیں، جیسا کہ کسی مسلمان کے قتل پر اس کو بدلے میں قتل کیا جائے گا اِلّا یہ کہ وہ معاف کردیں۔ اسی طرح غیر مسلم ذِمّی کے قتل پر بھی مسلمان قاتل کو قتل کیا جائے گا اِلّا یہ کہ وہ معاف کردیں۔

امام شافعی اور دُوسرے امام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ذِمّی کے مقابلے میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا، کافر کے مقابلے میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ حدیث میں کہا گیا: ''وَلَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ'' کسی مسلمان کو کسی کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا، اور نہ کسی معاہدے والے کو اس کے معاہدے میں یعنی ذِمّی کو۔

بہرحال یہ علمی اَبحاث ہیں، مجھے تو یہاں یہ ذکر کرنا تھا کہ ہمارے اِمام کے نزدیک اگر مسلمان کسی اسلامی ملک کے ذِمّی کو قتل کرے گا تو اس سے قصاص لیا جائے گا، دُوسرے اَئمہ اس کے قائل نہیں ہیں۔

کافر کو قتل کرنے کا دُنیاوی اِنعام

[حدیث:۱۲۰۵] ''عَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ ......، مَنْ قَتَلَ قَتِيلًا لَهُ عَلَيْهِ بَيِّنَةٌ فَلَهُ سَلَبُهُ۔''

(صحیح بخاری ج:۱۰، ص:۳۹۴، حدیث نمبر:۲۹۰۹، باب مَنْ لَمْ يُخَمِّسِ الْأَسْلَابَ وَمَنْ قَتَلَ قَتِيلًا فَلَهُ سَلَبُهُ مِنْ ...، صحیح مسلم ج:۹، ص:۱۸۵، حدیث نمبر:۳۲۹۵، باب اسْتِحْقَاقِ الْقَاتِلِ سَلَبَ الْقَتِيلِ)

ترجمہ: ''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مسلمان جہاد میں کسی کافر کو مارے اور اس کے پاس گواہ بھی موجود ہو تو اس کے اسباب اور اس کا

ہتھیار مارنے والے کا ہے۔“

تشریح: اس حدیث کا قصہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بخاری اور مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مَنْ قَتَلَ قَتِيلًا لَهُ فَلَهُ سَلَبُهُ“ جو شخص جہاد میں کسی کافر کو قتل کرے تو اس کافر کا ذاتی سامان اس کو دیا جائے، اس مجاہد کو۔

اس حدیث کا ایک قصہ ہے، حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جنگِ ہوازن میں میں نے ایک کافر کو قتل کیا، اس کا ہتھیار اور سامان ایک صاحب نے اپنے قبضے میں لے لئے، میں نے کچھ نہیں کہا، لڑائی ختم ہوئی، مالِ غنیمت جمع ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مَنْ قَتَلَ قَتِيلًا لَهُ فَلَهُ سَلَبُهُ“ جس نے کسی کافر کو قتل کیا ہو اس کافر کا سامان اسی مجاہد کو دیا جائے گا۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں کھڑا ہو گیا، حضرت نے پوچھا: کیوں کھڑے ہو گئے ہو؟ میں نے کہا: میں نے بھی ایک کافر کو قتل کیا تھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مَنْ قَتَلَ قَتِيلًا لَهُ عَلَيْهِ بَيِّنَةٌ فَلَهُ سَلَبُهُ“ جس نے کسی کافر کو قتل کیا ہو اور اس کے پاس اس پر گواہ بھی موجود ہو تو اس کا چھینا ہوا مال اس مجاہد کا ہے۔

دُشمن سے ملاقات کی تمنا

[حدیث:۱۲۰۶] ”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ..... ، لَا تَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ فَإِذَا لَقِيتُمُوهُمْ فَاصْبِرُوا۔“

(صحیح بخاری ج:۱۰، ص:۲۲۵، حدیث نمبر:۲۸۰۲، باب لَا تَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ)

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دُشمن سے مقابلے کی آرزو نہ کیا کرو، لیکن جب ان سے مقابلہ آن پڑے تو جم جایا کرو۔“

تشریح: اس حدیث میں ارشاد فرمایا: دُشمن سے مقابلے کی آرزو نہ کیا کرو: کافروں کے ساتھ لڑائی ہوتی تو ہم بھی اپنی مردانگی کے جوہر دکھاتے، یہ آرزو نہ کیا کرو، جنگ سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے، لیکن اگر مقابلہ آن پڑے تو پھر ڈٹ جاؤ پھر پیچھے نہ ہٹو، بھاگو نہیں صبر سے کام لو، استقامت سے کام لو۔ جنگ بدر اچانک ہوئی تھی اس لئے اس میں صرف تین سو تیرہ حضرات شریک ہوئے، چند حضرات اور بھی تھے وہ شہید ہو گئے، ان کے نام پھر نہیں آتے، مشہور تین سو تیرہ ہیں، بہت سے صحابہ کو آرزو ہوئی کہ ہم نے جہاد میں شرکت نہیں کی اور انہوں نے کہا کہ خدا کرے کہ اب پھر لڑائی ہو تو ہم بھی جائیں، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، دُشمن سے ملاقات یعنی میدان جنگ میں مقابلے کی آرزو نہ کیا کرو، لیکن جب مقابلہ آپڑے تو پھر ڈٹو اور پھر و نہیں۔

یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ فرمایا گیا: موت کی تمنا نہ کیا کرو، کوئی تکلیف پہنچے تو اس تکلیف سے رہائی پانے کے لئے یا زندگی سے تنگ آکر موت کی تمنا نہ کرو، بلکہ یہ کہا کرو: "اَللّٰھُمَّ..... أَحْیِنِيْ مَا عَلِمْتَ الْحَیَاۃَ خَیْرًا لِّي وَتَوَفَّنِيْ إِذَا کَانَتِ الْوَفَاۃُ خَیْرًا لِّي" (مسند احمد بن حنبل ۷ /۳، ۲۸۲، ۲۰۵، ۱۷، کذا فی البدایۃ) یا اللہ! مجھے زندہ رکھ جب تک کہ زندگی میرے حق میں بہتر ہو، اور مجھے موت دے جبکہ مرنا میرے حق میں بہتر ہو۔ تو موت سے گھبراؤ بھی نہیں لیکن اس کی تمنا بھی نہ کرو، زندگی کو غنیمت سمجھو، اسی طرح دشمن سے مقابلے کی تمنا نہ کرو بلکہ عافیت کو غنیمت سمجھو لیکن اگر مقابلہ آن پڑے تو اللہ کا نام لے کر ثابت قدمی اختیار کرو۔

غازی کا اجر

[حدیث: ۱۲۰۷] "عَنْ أَبِي هُرَیْرَۃَ......، لَا یَجْتَمِعُ کَافِرٌ وَقَاتِلُهٗ فِي النَّارِ أَبَدًا۔"

(صحیح مسلم ج: ۹، ص: ۴۸۱، حدیث نمبر: ۳۵۰۶، باب مَنْ قَتَلَ کَافِرًا ثُمَّ سَدَّدَ)

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جمع نہیں ہوگا کافر اور اس کو قتل کرنے والا مسلمان جہنم میں کبھی بھی۔"

تشریح: اس حدیث میں فرمایا: کافر اور کافر کو قتل کرنے والا دوزخ میں جمع نہیں ہوں گے کبھی بھی، ابداً، یہ نہیں ہوگا کہ کافر دوزخ میں جائے تو اس کا قتل کرنے والا بھی دوزخ میں نہیں بھیجیں گے، ابداً اس کے دو مطلب ہوسکتے ہیں، ابد کا معنی ہمیشہ کے لئے اور کبھی کبھی یہ تاکید کے لئے استعمال ہوتا ہے، اگر پہلے معنی مراد لئے جائیں تو اس کا مطلب ہے ہمیشہ کے لئے دونوں دوزخ میں جمع نہیں ہوں گے، اگر مسلمان گناہگار کو دوزخ میں بھیجا گیا تو کچھ مدت کے بعد اس کو نکال لیا جائے گا، اور اگر دوسرا معنی مراد لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کافر اور کافر کا قاتل ہرگز کبھی بھی جہنم میں جمع نہیں ہوں گے۔

یہاں پر یہ بات یاد رکھو، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، اللہ تعالیٰ سے دوزخ کے عذاب اور قبر کے عذاب سے پناہ مانگو، بعض گناہگار مسلمانوں کو بھی دوزخ میں ڈالا جائے گا لیکن اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر بلکہ بعض کو اس سے پہلے بھی لیکن جہنم کی شکل دیکھنا بھی بس سے باہر ہے، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب بعض مسلمان گناہگار دوزخ میں بھیجے جائیں گے تو بعض کفار طعنہ دیں گے: "اے مُسلّے بھی اِتّھے ہی آگئے، بڑے مسلمان بنے پھرتے تھے، تم بھی تو ہمارے ساتھ ہی ہو" اس وقت غیرتِ الٰہی جوش میں آئے گی اور حکم دیں گے کہ تمام مسلمانوں کو جہنم سے نکال لو، صرف کافر رہ جائیں۔ دوزخ میں صرف کافر رہ جائیں گے اور مسلمان سارے نکال لئے جائیں گے۔

جہاد کو چھوڑنا اور دُنیا میں لگ جانا ذِلّت کا سبب ہے

[حدیث:۱۲۰۸] ''عَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ ..... لَا يَدْخُلُ هٰذَا بَيْتَ قَوْمٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الذُّلَّ (قَالَهُ لِمَا رَأَى شَيْئًا مِنْ آلَةِ الْحَرْثِ)۔''

(صحیح بخاری ج:۸،ص:۱۲۰، حدیث نمبر:۲۱۵۳، باب: يُحْذَرُ مِنْ عَوَاقِبِ الْاِشْتِغَالِ بِآلَةِ الزَّرْعِ.......)

ترجمہ:''حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاشتکاری کے آلات دیکھے تو ارشاد فرمایا کہ: نہیں داخل ہوتی یہ چیز کسی قوم کے گھر میں مگر اس میں ذِلّت اور خواری کو داخل کر دیتی ہے۔''

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھیتی باڑی کے آلات جیسے ہل ہے اور دُوسری چیزیں ہیں ان کو دیکھا تو دیکھ کر فرمایا: جن لوگوں کے گھر میں یہ چیز داخل ہوجاتی ہے اس میں ذِلّت اور خواری کو داخل کر دیتی ہے۔ مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے کام پر لگایا تھا اور ان کی کھیتی باڑی کا کام کرنے کے لئے کافر اور ذِمّی لوگ تھے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خیبر کو فتح کیا تو زمین جوتنے اور کاشتکاری کے کام کے لئے یہودیوں کو مقرر فرمایا، اور ان سے یہ معاملہ طے فرمایا کہ جو پیداوار ہوگی وہ آدھی ہماری اور آدھی تمہاری۔ تو اس حدیث شریف میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ مسلمان جب جہاد کو چھوڑ کر کھیتی باڑی کے کام میں لگ جائیں گے اور جب دین کے لئے محنت کرنے کے بجائے اپنی دُنیا کی محنت میں مشغول ہوجائیں گے تو ذلیل و خوار ہوجائیں گے۔

کاشتکار کسان بے چارہ کس قدر ذلیل ہوتا ہے سب کو معلوم ہے، وہ کتنی شدید محنت کرتا ہے، کاشتکاری کرنے والا اپنی کاشتکاری کی محنت میں رات دن ایک کر دیتا ہے، دن کی گرمی اور رات کی سردی کی پروا نہیں کرتا لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب وہ فصل اُٹھاتا ہے تو بہت سی آفتیں اس کے ذمے لگ جاتی ہیں، معاملہ ہے، آبیانہ ہے، حکومتوں کے ٹیکس اور محصول ہیں اور اس کے ادا کرنے میں تاخیر ہوجاتی ہے تو اس کو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے کہ اس نے معاملہ نہیں دیا، زمین اس کی اپنی ہے، محنت اس کی اپنی ہے اور وہ غریب سارا سال محنت کر کے اتنی پیداوار اُٹھالیتا ہے جو بمشکل اس کے بیوی بچوں کو پوری ہوجائے لیکن اس کے بال بچوں کی کوئی پروا نہیں کی جاتی، دُوسرے لے جاتے ہیں اور اس کو ذلیل کیا جاتا ہے، بڑے بڑے جو زمین دار کہلاتے ہیں انہوں نے اپنے مزارع رکھے ہوئے ہیں، خود عیش کرتے ہیں لیکن کسان کی قسمت میں وہی سوکھی روٹی۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد واقعتاً مشاہدے کے مطابق نکلا کہ جس گھر میں یہ کاشتکاری کے اسباب آجائیں گے اس گھر میں ذِلّت داخل ہوجائے گی۔

کتابُ الشَّهید

شہادت کی فضیلت واقسام

[حدیث: ۱۲۰۹] "......فَاِنَّ اَصْدَقَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللہِ، وَ اَوْثَقُ الْعُرٰی کَلِمَةُ التَّقْوٰی، وَخَیْرُ الْمِلَلِ مِلَّةُ اِبْرَاهِیْمَ، وَخَیْرُ السُّنَنِ سُنَّةُ مُحَمَّدٍ (صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ)، وَاَشْرَفُ الْحَدِیْثِ ذِکْرُ اللہِ وَاَحْسَنُ الْقَصَصِ هٰذَا الْقُرْآنُ، وَخَیْرُ الْاُمُوْرِ عَوَازِمُهَا، وَشَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا، وَاَحْسَنَ الْهَدْیِ هَدْیُ الْاَنْبِیَاءِ، وَاَشْرَفُ الْمَوْتِ قَتْلُ الشُّهَدَاءِ، ......الخ۔"

(حیاۃ الصحابہ ج:۶ ص:۶۲۳)

ترجمہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا کہ: بے شک سب سے سچا کلام اللہ کی کتاب ہے، سب سے مضبوط کڑا تقویٰ ہے، سب سے بہتر ملّت حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملّت ہے، سب سے بہتر طریقہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہے، سب سے اشرف کلام اللہ کا ذکر ہے، سب سے بہتر قصہ یہ قرآن ہے، تمام کاموں میں سب سے بہتر وہ ہے جس کو عزیمت سے ادا کیا جائے، اور بدترین کام وہ ہیں جو نئے نئے ایجاد کئے جائیں، سب سے بہتر طور طریقہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا طور طریقہ ہے، سب سے اشرف موت شہداء کی شہادت اور ان کا قتل ہے۔"

تشریح: اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ شہید کا قتل ہونا سب سے اشرف موت ہے، اشرف کے معنی سب سے زیادہ بزرگی والی، سب سے زیادہ لائق عظمت۔

قرآن کریم نے حضراتِ شہداء کا تیسرا درجہ بیان فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ یُّطِعِ اللہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللہُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ

وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ (النسآء)

ترجمہ: ''اور جس نے کہا مان لیا اللہ کا اور رسول اللہ کا تو یہ لوگ ہوں گے نبیوں کے ساتھ اور صدیقین کے ساتھ اور شہداء کے ساتھ اور نیک لوگوں کے ساتھ اور بہت ہی عمدہ ہیں یہ سب حضرات رفیق ہونے کے اعتبار سے (ان سے زیادہ عمدہ رفیق کس کو میسر آسکتے ہیں؟)۔''

قرآن کریم نے پہلا درجہ اللہ کے نبیوں کا بیان فرمایا، دوسرا صدیقین کا، تیسرا شہداء کا اور چوتھا صالحین یعنی اعلیٰ درجہ کے نیک لوگوں کا، جن کو ہم اولیاء اللہ کہتے ہیں۔ ہم جیسے گناہگار مسلمان جو اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کی اطاعت کریں اور اطاعت کی کوشش کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو خوشخبری دے رہے ہیں کہ: قیامت کے دن ان کا حشر نبیوں، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوگا، اور یہ بہت اچھے ساتھی ہیں۔

﴿ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نصیب فرمادے۔ (اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمادے، آمین!)۔

تو بہر حال شہیدوں کا مرتبہ اللہ نے تیسرے نمبر پر فرمایا ہے، انبیاء اور صدیقین کے بعد پھر شہداء کا درجہ ہے۔ اس لئے کہ سب سے اشرف واعلیٰ موت تو حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ہے، اور دوسرے نمبر پر اشرف واعلیٰ موت صدیقین کی ہے، صدیقین حضراتِ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ملحق ہوتے ہیں۔ یعنی اپنے اوصاف اور اپنے کمالات کے اعتبار سے یہ حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مشابہ ہوتے ہیں، لیکن ان کے پاس نبوت نہیں ہوتی، ان کے بعد پھر جتنے اُمتی ہیں، ان سب میں سے سب سے زیادہ شریف تر موت حضراتِ شہداء کی ہے۔

شہید کسے کہتے ہیں؟

چند باتیں یہاں سمجھ لینی چاہئیں۔

۱:.....شہید کس کو کہا جاتا ہے؟

اصل شہید تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرتے ہوئے کافروں کے ہاتھ سے قتل ہو جائے۔ میدانِ جہاد میں کافروں کے ہاتھ سے جو مسلمان قتل ہو جائے تو وہ شہید ہے۔

الف:.....حضراتِ فقہاء کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص میدانِ جہاد میں مقتول پایا گیا اور اس کے بدن پر زخم کا نشان تھا، لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ اس کو کس کافر نے قتل کیا ہے تو وہ بھی شہید کہلائے گا۔

ب:......اسی طرح میدانِ جہاد سے کسی شخص کو زخمی ہونے کی حالت میں زندہ اٹھالیا گیا ہو، لیکن دوا دارو کی، مرہم پٹی کی، کھانے پینے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اس نے دم توڑ دیا تو وہ بھی شہید ہے۔

ج:......اسی طرح جس شخص کو ڈاکوؤں نے قتل کر دیا یا ڈاکوؤں سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ مارا گیا، یا باغیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا تو وہ بھی شہید ہے۔

د:......اسی طرح جس شخص کو کسی مسلمان نے بغیر کسی وجہ کے ظلماً قتل کر دیا ہو تو وہ بھی شہید ہے۔

یہ شہداء کی پانچ قسمیں ہوئیں جو دنیا کے احکام کے اعتبار سے بھی شہید ہیں اور آخرت کے اعتبار سے بھی شہید ہیں۔ گویا:

۱:......جو شخص کسی کافر کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

۲:......جو شخص میدانِ جہاد میں مرا ہوا پایا گیا اور اس پر زخم کا نشان تھا، غالب یہی ہے کہ کسی کافر نے اس کو قتل کیا ہوگا یا کافر کے زخم لگانے سے قتل ہوا ہوگا۔

۳:......جو شخص زخمی حالت میں میدانِ جہاد سے لایا گیا اور ابھی تک کھانے پینے کی یا مرہم پٹی کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اس کا پیمانۂ حیات لبریز ہو گیا۔

۴:......جس شخص کو ڈاکوؤں یا باغیوں نے قتل کر دیا۔

۵:......جس شخص کو کسی مسلمان نے ظلماً قتل کر دیا۔

یہ پانچ قسم کے افراد فقہی اعتبار سے شہید کہلاتے ہیں۔

شہید کے احکام:

شہید کا حکم یہ ہے کہ شہید کو انہی کپڑوں میں بغیر غسل کے دفن کیا جاتا ہے، اس کو کفن نہیں پہنایا جاتا اور اس کے بدن کے کپڑے نہیں اتارے جاتے، البتہ کوئی زائد کپڑے ہوں جیسا کہ سردیوں کے موسم میں پوستین وغیرہ پہن لیتے ہیں، جیسے صدری، وغیرہ پہن لیتے ہیں یا کوئی اور بھاری کپڑا پہن لیتے ہیں، ایسا کپڑا اگر کوئی پہنا ہوا ہو تو اس کو اتار دیا جائے گا، اسی طرح اگر اوپر چادر دینے کی ضرورت ہو تو وہ بھی دے دی جائے گی، لیکن معروف طریقے سے جیسا کہ کفن کے تین کپڑے ہوتے ہیں وہ کفن شہید کو نہیں دیا جاتا، اب اس کے وجود کو ڈھانکنے کے لئے اوپر ایک چادر ڈال دیں گے، شہید کے اپنے کپڑے اس کا کفن ہیں، حالانکہ میت کو سلے ہوئے کپڑے تو نہیں پہنائے جاتے، لیکن شہید کے لئے اس کے سلے ہوئے کپڑے اس کا کفن ہیں۔

حدیث شریف میں فرمایا ہے:

"... وَاَنْ یُّدْفَنُوْا بِدَمَائِهِمْ وَثِيَابِهِمْ۔" (مشکوٰۃ ص: ۱۴۴)

ترجمہ: ''ان کو ان کے زخموں سمیت اور ان کے کپڑوں سمیت دفن کیا جائے۔''

ایک حدیث شریف میں آتا ہے:

''قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: لَا یُکْلَمُ اَحَدٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَنْ یُکْلَمُ فِیْ سَبِیْلِہٖ اِلَّا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَجُرْحُہٗ یَثْعَبُ دَمًا، اَللَّوْنُ لَوْنُ دَمٍ وَالرِّیْحُ رِیْحُ الْمِسْکِ۔'' (مشکوٰۃ ص:۳۳۰)

ترجمہ: ''جو شخص اللہ کے راستے میں شہید ہوا، وہ قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کے بدن سے جہاں زخم آیا تھا، خون کا فوارہ پھوٹ رہا ہوگا، رنگ تو خون کا ہوگا لیکن خوشبو کستوری کی ہوگی۔''

شہید کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے:

لیکن شہید کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تو فرماتے ہیں کہ اس کا جنازہ بھی نہیں ہے، ویسے ہی دفن کردو، تمہاری شفاعت کی اب اس کو ضرورت نہیں رہی ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ: ''اَلسَّیْفُ مَحَّاءٌ لِلْخَطَایَا'' (کنز العمال حدیث:۳۹۶۸۸) یعنی تلوار گناہوں کو مٹانے والی ہے۔

کافر کی تلوار نے ہی اس کی شفاعت کردی اور وہ بخشا گیا۔ یہ بھی ارشاد فرمایا:

ترجمہ: ''شہید کے خون کا قطرہ زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرمادیتے ہیں۔''

قبر میں اس سے حساب و کتاب نہیں ہوتا، جیسا عام مُردوں سے سوال و جواب ہوتا ہے اس سے نہیں ہوتا۔

لیکن ہمارے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شہید کا جنازہ ہے (اس پر طویل گفتگو ہے، اس علمی بحث کو یہاں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں)۔ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ شہید کا یہ حکم ہے، شہید کی موت اتنی قیمتی ہے کہ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشرف موت فرمارہے ہیں۔

شہادت کی موت کا درجہ!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی تھی، اور شہداء آپ کے جوتوں کی خاک ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کے سردار ہیں، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''لَوَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ۔'' (مشکوٰۃ ص:۳۲۹)

ترجمہ: ''میرا جی چاہتا ہے کہ میں اللہ کے راستے میں قتل ہو جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل ہو جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل ہو جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں (یہ سلسلہ چلتا ہی رہے)۔''

ذرا اندازہ فرمالیں! جس موت کی تمنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں، وہ موت کتنی اشرف اور کتنی قیمتی ہوگی؟ صحیح احادیث میں حضراتِ شہداء کے بہت فضائل وارد ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو شہادت کی موت نصیب فرمائے، آمین!

شہید جنّت الفردوس میں:

ایک روایت میں ہے:

''عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ اَنَّ اُمَّ الرُّبَیِّعِ بِنْتَ الْبَرَاءِ وَھِیَ اُمُّ حَارِثَۃَ بْنِ سُرَاقَۃَ اَتَتِ النَّبِیَّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ: یَا رَسُوْلَ اللہِ! اَلَا تُحَدِّثُنِیْ عَنْ حَارِثَۃَ وَکَانَ قُتِلَ یَوْمَ بَدْرٍ اَصَابَہٗ سَھْمٌ غَرْبٌ، فَاِنْ کَانَ فِی الْجَنَّۃِ صَبَرْتُ وَاِنْ کَانَ غَیْرَ ذَالِکَ اجْتَھَدْتُ عَلَیْہِ فِی الْبُکَاءِ؟ فَقَالَ: یَا اُمَّ حَارِثَۃَ! اِنَّھَا جِنَانٌ فِی الْجَنَّۃِ وَاِنَّ ابْنَکِ اَصَابَ الْفِرْدَوْسَ الْاَعْلٰی۔'' (مشکوٰۃ ص:۳۳۱)

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حارثہ بن سراقہ کی ماں ام ربیعہ بنت براء رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئیں اور کہنے لگیں کہ یا رسول اللہ! میرا لڑکا سراقہ آپ کے ساتھ غزوۂ بدر میں شہید ہو گیا ہے، اگر اس کی بخشش ہو گئی ہے اور وہ جنّت میں ہے تو میں صبر کروں، ورنہ میں اس پر رنج و غم اور صدمہ کا اظہار کروں اور اپنا حق ادا کروں۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: حارثہ کی ماں! جنّت ایک نہیں بہت ساری جنتیں ہیں، (اوپر نیچے سو جنتیں ہیں اور ہر جنّت سے دوسری جنّت کا فاصلہ اتنا ہے جتنا آسمان و زمین کا فاصلہ، سو جنتیں اوپر نیچے اتنی ہیں، اور سب سے اوپر جو جنّت ہے وہ جنّت الفردوس ہے) اور تیرا بیٹا سب سے اوپر کی جنّت جنّت الفردوس میں ہے۔''

شہید زندہ ہیں

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا

تَشۡعُرُوۡنَ﴾ (البقرۃ:۱۵۴)

ترجمہ: ''اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، مگر اس کی زندگی کا تم شعور نہیں رکھتے (اس کی زندگی تمہارے حواس سے بالاتر چیز ہے)۔''

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ﴾ (آل عمران:۱۶۹)

ترجمہ: ''بلکہ وہ زندہ ہیں اور ان کے رب کے پاس ان کو رزق دیا جاتا ہے۔''

صحیح بخاری کے حوالہ سے مشکوۃ میں حدیث ہے:

''...... فَقَالَ اَرۡوَاحُهُمۡ فِیۡ اَجۡوَافِ طَیۡرٍ خُضۡرٍ لَهَا قَنَادِیۡلُ مُعَلَّقَةٌ بِالۡعَرۡشِ تَسۡرَحُ مِنَ الۡجَنَّةِ حَیۡثُ شَاءَتۡ ...... الخ۔'' (مشکوۃ ص:۳۳۰)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کے عرشِ اعظم کے ساتھ قندیلیں لٹکی ہوئی ہیں، اور وہ شہدا کا مستقر ہیں، وہ شہداء کے رہنے کی جگہ ہے، اور سبز پرندوں کی شکل میں اللہ تعالیٰ ان کو سواریاں عطا فرماتے ہیں اور ان کی روحیں ان سبز پرندوں میں جنّت کے اندر پرواز کرتی ہیں اور جہاں چاہتی ہیں کھاتی پیتی ہیں۔''

یہ قیامت سے پہلے کا قصہ ہے، قیامت کے دن ان کے ساتھ جو معاملہ ہوگا وہ تو سبحان اللہ! کیا بات ہے!

نذرانہ حیات

لوگ بارگاہِ عالی میں مختلف نذرانے پیش کیا کرتے ہیں، شہید اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کے اس نذرانہ کو قبول فرما لیتے ہیں۔

مرنا تو سب کو ہے:

باقی مرنے کو تو بالآخر سب ہی مریں گے، جیئے گا کون؟ کوئی مرنا چاہے اس کو بھی موت آئے گی، اور کوئی مرنا نہ چاہے تب بھی اس کو موت آئے گی۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا:

''قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ: اَلۡمَيِّتُ تَحۡضُرُهُ الۡمَلَائِكَةُ فَاِذَا كَانَ الرَّجُلُ صَالِحًا قَالُوۡا: اُخۡرُجِیۡ اَيَّتُهَا النَّفۡسُ الطَّيِّبَةُ كَانَتۡ فِی الۡجَسَدِ الطَّيِّبِ اُخۡرُجِیۡ حَمِيۡدَةً وَّاَبۡشِرِیۡ بِرَوۡحٍ وَّرَيۡحَانٍ وَّرَبٍّ غَيۡرِ غَضۡبَانٍ فَلَا تَزَالُ يُقَالُ

لَهَا ذَالِکَ حَتّٰی تَخرُجَ ... فَاِذَا کَانَ الرَّجُلُ السُّوْءُ قَالَ اُخرُجِیْ اَیَّتُهَا النَّفسُ الْخَبِیْثَةُ کَانَتْ فِی الْجَسَدِ الْخَبِیْثِ اُخرُجِیْ ذَمِیْمَةً وَّاَبْشِرِیْ بِحَمِیْمٍ وَّغَسَّاقٍ وَّآخَرَ مِنْ شَکْلِهٖ اَزْوَاجٌ، فَمَا تَزَالُ یُقَالُ لَهَا حَتّٰی تَخرُجَ ... الخ۔"

(مشکوٰۃ ص:۱۴۱)

ترجمہ: "نیک آدمی کے پاس جب ملک الموت آتا ہے تو فرشتہ اس کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ اے پاک روح! پاک جسم میں رہنے والی، اپنے رب کی مغفرت اور رحمت و رضوان کی طرف نکل، جو تجھ پر غضبناک نہیں، (جب وہ آدمی اپنے رب کا نام سنتا ہے تو اس وقت اس کی روح کو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا اتنا اشتیاق ہو جاتا ہے کہ وہ روح بے چین ہو جاتی ہے جیسا کہ پنجرہ میں پرندہ، پنجرہ توڑ کر نکلنے کے لئے مشتاق ہوتا ہے، اس مؤمن آدمی کی روح اتنی بے چین ہو جاتی ہے، اتنے میں ملک الموت اس کی روح قبض کر لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اتنی سہولت کے ساتھ اور آسانی کے ساتھ روح نکل جاتی ہے جیسے مشکیزہ کے منہ سے قطرہ ٹپک جاتا ہے) اور دوسرے قسم کے آدمی کے پاس ملک الموت آتا ہے، تو کہتا ہے کہ اے گندی روح! جو گندے جسم میں تھی، نکل اپنے رب کے غضب کی طرف اور اس کے عذاب کی طرف (نعوذ باللہ! اللہ کی پناہ!)۔"

روح تو پہلے ہی بدن میں سرایت کی ہوتی ہے، لیکن وہ بالوں تک میں سرایت کر جاتی ہے تا کہ وہ نہ نکلے اور وہ فرشتہ پھر اس کو کھینچتا ہے۔ اور فرمایا کہ بالکل ایسی مثال ہو جاتی ہے کہ دُھنی ہوئی روئی کے اندر گرم یا بھیگی ہوئی سلائی ماری جائے اور پھر اس کو کھینچا جائے، بدن اور روح کا رشتہ چھڑانے کے لئے اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ کوئی اس دنیا سے جانا چاہے، روح اس کی بھی نکلتی ہے اور جو نہ جانا چاہے روح اس کی بھی نکلتی ہے۔ لیکن شہید اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بارگاہِ الٰہی میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے، حق تعالیٰ شانہ اس کی قدر افزائی فرماتے ہیں، اس کو قبول فرماتے ہیں، اس لئے فرمایا کہ: شہید کی موت اشرف موت ہے۔

یہاں پر یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ شہید تین قسم کے ہوتے ہیں:

دُنیا و آخرت کے اعتبار سے شہید:

۱:...... ایک تو وہ جو دنیا و آخرت دونوں کے اعتبار سے شہید ہیں۔

آخرت کے اعتبار سے شہید:

۲:......اور ایک وہ جو دنیاوی اعتبار سے شہید نہیں، لیکن آخرت میں اس کا نام بھی شہیدوں کی فہرست میں لکھا جاتا ہے۔ایک حدیث میں آتا ہے:

''قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مَاتَعُدُّوْنَ الشَّھِیْدَ فِیْکُمْ؟ قَالُوْا: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! مَنْ قُتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَھُوَ شَھِیْدٌ۔ قَالَ: اِنَّ شُھَدَاءَ اُمَّتِیْ اِذًا لَقَلِیْلٌ۔ مَنْ قُتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَھُوَ شَھِیْدٌ، وَمَنْ مَاتَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَھُوَ شَھِیْدٌ، وَمَنْ مَاتَ فِی الطَّاعُوْنِ فَھُوَ شَھِیْدٌ، وَمَنْ مَاتَ فِی الْبَطْنِ فَھُوَ شَھِیْدٌ۔'' (مشکوٰۃ ص:۳۳۱)

ترجمہ:''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم شہید کس کو سمجھتے ہو؟ (جو جواب دیا جاسکتا تھا وہی دیا گیا کہ) یارسول اللہ! جو اللہ کے راستے میں قتل ہوجائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پھر تو میری اُمت کے شہید بہت تھوڑے رہ جائیں گے۔اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو اللہ کے راستے میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے، اور جو اللہ کے راستہ میں مرجائے وہ بھی شہید ہے، اور جو طاعون کی بیماری سے مرجائے وہ بھی شہید ہے، اور جو پیٹ کی بیماری سے مرے وہ بھی شہید ہے۔''

اسی طرح کوئی دریا میں ڈوب کر مرگیا وہ بھی شہید، کسی پر دیوار گرگئی یا کسی حادثہ میں مرگیا وہ بھی شہید ہے، عورت زچگی کی حالت میں مرگئی وہ بھی شہید ہے، بچہ جنتے ہوئے مرگئی وہ بھی شہید۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شہیدوں کی بہت سی قسمیں بیان فرمائی ہیں جن کو معنوی شہید کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ دنیا کے احکام کے اعتبار سے شہید نہیں ہوتے، ان کو غسل دیا جائے گا، ان کو کفن پہنایا جائے گا، ان کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، یہ لوگ دنیا کے اعتبار سے شہید نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی فہرست میں ان کا نام بھی شہیدوں میں لکھا جائے گا۔

دُنیا والوں کے اعتبار سے شہید:

۳:......تیسری قسم شہیدوں کی وہ ہے جن کو ہم اور آپ شہید کہتے ہیں، مگر اللہ کی فہرست میں ان کا نام شہیدوں میں نہیں ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک! وجہ یہ تھی کہ اندر ایمان صحیح نہیں تھا، جان کا نذرانہ اللہ کو راضی کرنے کے لئے پیش نہیں کیا گیا، بلکہ قومی عصبیت کی بنا پر قتل کیا گیا، یا اپنی جواں مردی اور شجاعت کے جوہر دکھلانے کے لئے مرا، بہادر کہلوانے کے لئے مرا، بھائی! ان کے دلوں کو تو ہم نہیں جانتے کہ کس کی نیت کیا

ہے؟ ہم تو اس کے ساتھ معاملہ شہیدوں کا ہی کریں گے، مگر اللہ تعالیٰ دلوں کی کیفیت کو خوب جانتے ہیں، وہ صرف ظاہری عمل کو نہیں دیکھتے، یہ لوگ جور یا کاری کے لئے یا دکھلاوے کے لئے یا کسی اور غرض اور مقصد کے لئے قتل ہوئے، چاہے میدانِ جہاد میں ہی قتل کیوں نہ ہوئے ہوں، یہ لوگ اللہ کی فہرست میں شہید نہیں ہیں، دنیاوی اور اپنے علم کے اعتبار سے ہم لوگ ان کو شہید ہی کہیں گے، باقی راہِ حق میں شہادت کی تمنا ہر مؤمن کو رکھنی چاہئے، اللہ تعالیٰ شہادت کی موت نصیب فرمائے اور اللہ تعالیٰ شہیدوں میں اٹھائے، آمین!

شہادت کی موت کی دُعا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ دُعا فرماتے: یا اللہ! شہادت کی موت نصیب فرما اور اپنے رسول ﷺ کے شہر میں موت نصیب فرما۔ پھر فرماتے کہ عمر! دو باتیں اکٹھی کیسے ہوں گی؟ شہادت کی موت بھی مانگتے ہو اور رسول اللہ ﷺ کے شہر میں بھی مانگتے ہو، جہاد تو باہر ہوتا ہے، مدینہ میں بیٹھ کر کیسے شہادت مل جائے گی؟ خود ہی سوال کرتے تھے اور خود ہی فرماتے تھے: اگر اللہ چاہے تو دونوں کو جمع کر سکتے ہیں۔ اور واقعی اللہ تعالیٰ نے دونوں کو جمع کر کے دکھلا دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دُعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی۔

حصولِ شہادت کا وظیفہ:

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص روزانہ پچیس مرتبہ یہ پڑھا کرے:

"اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لِيْ فِي الْمَوْتِ وَفِيْ مَا بَعْدَ الْمَوْتِ۔"

(الاتحاف ج:۱۰ ص:۲۲۷)

ترجمہ: "یا اللہ! برکت فرما میرے لئے موت میں اور موت کے بعد کی زندگی میں۔"

اللہ پاک اس کو شہادت کی موت نصیب فرمائیں گے، اور اللہ تعالیٰ اس کا نام شہیدوں کی فہرست میں درج فرمادیں گے، خواہ اس کی موت بستر پر ہی کیوں نہ آئے، یہ تو کچھ مشکل نہیں بشرطیکہ تمنا کرو، مانگو، اور اگر تمنا ہی نہ ہو تو پھر کیسے ہوگا؟

مشکوٰۃ شریف میں حدیث ہے:

"مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ، مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنْ نِفَاقٍ۔"

(مشکوٰۃ ص:۳۳۱)

ترجمہ: "جس نے جہاد میں حصہ نہیں لیا اور کبھی اس کے دل میں خیال بھی پیدا نہ ہوا تو وہ آدمی نفاق کی موت مرا۔"

جہاد کی تمنّا کرو:

جہاد کی تمنّا تو کرو ناں! فی سبیل اللہ کی تمنا کرو اور اللہ سے مانگو، کیا بعید ہے کہ اللہ پاک اپنی رحمت سے ہم گناہگاروں کو بھی شہادت کی موت نصیب فرمادیں۔

حج نہ کرنے کی وعید:

اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مشکوٰۃ شریف میں ہے، فرمایا:

”مَنْ لَّمْ یَمْنَعْهُ مِنَ الْحَجِّ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ اَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ اَوْ مَرَضٌ حَابِسٌ، فَمَاتَ وَلَمْ یَحُجَّ فَلْیَمُتْ اِنْ شَاءَ یَهُوْدِیًّا وَاِنْ شَاءَ نَصْرَانِیًّا۔“ (مشکوٰۃ ص:۲۲۲)

ترجمہ: ”جو شخص اس حال میں مرا کہ حج سے کوئی چیز اس کے لئے مانع نہیں تھی، نہ بیمار تھا اور نہ کسی ظالم بادشاہ نے اسے روکا تھا، پھر بھی بغیر حج کئے مر گیا تو وہ چاہے یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے (اللہ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں)۔“

حج کی تمنّا بھی نہ ہوئی اور جو شخص مر گیا باوجود قدرت کے حج نہ کیا، مال تھا امریکہ اور فرانس کی سیریں ہوتی تھیں اور دوسری لغویات میں پیسہ ضائع ہوتا تھا، لیکن حج نہیں کیا اور حج کرنے کا کیا معنی؟ اس کو تو تمنّا بھی، تڑپ بھی پیدا نہیں ہوئی، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کو اختیار ہے کہ چاہے یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ!

نیک کام کی تمنّا تو کرو:

بھائی! نیک کام کرو، اگر کر نہیں سکتے تو نیک کام کی تمنّا تو کرو، یہ کیا بات ہوئی کہ کام بھی نہ کرو اور کام کی تمنّا بھی نہ رکھو، نیک کام کرو، نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کی آرزو تو کرو، اللہ سے دُعا تو کرو، دُعا تو کر سکتے ہو کہ یا اللہ! مجھے بھی عطا فرما، مجھے بھی نصیب فرما۔

بُرے کام سے بچو، نہیں تو بُرا سمجھو:

بُرے کام سے بچو اور اگر بچ نہیں سکتے تو بُرے کام کو بُرا تو سمجھو اور اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگو کہ یا اللہ! مبتلا ہوں معاف کردے، اتنا تو کم از کم کرو، دیکھو کتنا سستا نسخہ میں نے بتلادیا۔

شہادت کو طلب کرنا

[حدیث: ۱۲۱۰] "أَنَّ سَهْلَ بْنَ أَبِي أُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ ......، مَنْ سَأَلَ اللهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ بَلَّغَهُ اللهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَإِنْ مَاتَ عَلَى فِرَاشِهِ۔"

(صحیح مسلم ج:۱۹، ص:۱۷، حدیث نمبر: ۳۵۳۲، باب اسْتِحْبَابِ طَلَبِ الشَّهَادَةِ فِي سَبِيلِ اللهِ تَعَالَى)

ترجمہ: "حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص سچے دِل سے اللہ سے شہادت مانگے، تو اللہ تعالیٰ اس کو شہیدوں کے مرتبے پر پہنچائے گا اگرچہ وہ بستر پر مرا ہو۔"

تشریح: یہ حدیث شہادت کی طلب کے متعلق ہے، اس سے ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ ہر مسلمان کے دل میں اس بات کی تمنا ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو شہادت کی موت نصیب کرے، اور اللہ تعالیٰ بُری موت سے بچائے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی شہادت کی موت نصیب فرمائے (حضرت کی دُعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور شہادتِ عظمیٰ کے اعلیٰ مراتب پر فائز فرمایا)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی دُعا میں فرماتے تھے:

"اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ شَهَادَةً فِيْ سَبِيْلِكَ وَمَوْتاً فِيْ بَلَدِ حَبِيْبِكَ۔"

ترجمہ: "یا اللہ! آپ کے راستے میں شہادت مانگتا ہوں اور آپ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں موت۔"

پھر فرماتے: عمر! یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟ شہید ہونا ہے تو سرحد پر جاؤ، جا کر جہاد کرو، اللہ کے راستے میں دُشمنوں سے لڑو، مدینہ کی موت بھی مانگتے ہو اور شہادت کی موت بھی۔ پھر فرماتے: ہے تو مشکل لیکن اللہ چاہے تو دونوں کو جمع بھی کر سکتے ہیں، مدینہ میں مریں اور شہید۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں یہ دونوں باتیں جمع فرما دیں، ابولؤلؤ کافر مجوسی فارسی کے ہاتھ سے شہید ہوئے اور روضۂ اقدس میں دفن ہوئے۔

غرضیکہ شہادت کی تمنا صدقِ دل سے ہونی چاہئے، بات یہ ہے کہ موت تو آنی ہے پھر کیوں نہ آدمی اللہ کے راستے میں مرے! اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ شہید کو تلوار یا جو بھی چیز ہو اس کی تکلیف اتنی ہی ہوتی ہے جتنی چیونٹی کے کاٹنے کی، اِنجکشن لگاتے ہیں تو ذرا سی تکلیف ہوتی ہے، بس اتنی تکلیف ہوتی ہے تو شہادت کی موت اس اعتبار سے بھی سستا سودا ہے کہ اس میں تکلیف نہیں ہوتی، باقی بدن کے تڑپنے کو نہ دیکھا جائے، اگر شہید کے گولی لگی ہو یا کوئی اور آلۂ جارحہ لگا ہو تو بدن تو پھڑ پھڑائے گا اس کو نہ دیکھا جائے، گفتگو ہو رہی ہے رُوح سے متعلق، تکلیف ہوتی ہے رُوح کو اور شہید کے متعلق صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ شہید

قیامت کے دن آئے گا کہ اس کے زخم سے خون کا فوارہ پھوٹ رہا ہوگا:

"اللَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ وَالرِّيحُ رِيحُ الْمِسْكِ" (مسند احمد بن حنبل ۸/۴۸، ۱۶۰، ۲۲۵۴۸)

ترجمہ: "رنگ خون کا ہوگا اور خوشبو مشک کی ہوگی، مشک نکل رہی ہوگی اس کے بدن سے۔"

تم جانتے نہیں ہو کہ جو حلال جانور ہیں، اگر کوئی مرنے لگے تو اس پر جلدی سے چھری پھیرتے ہیں، جس جانور کو شرعی طریقے سے ذبح کرلیا گیا وہ شہید فی سبیل اللہ ہے، حرام موت سے اس کو بچاتے ہیں۔ تو ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ ہر مؤمن کے دِل میں شہادت کی تمنا ہونی چاہئے، اللہ تعالیٰ ہمیں نصیب فرمائے۔

دُوسری بات یہ کہ آدمی جس چیز کا عزم کرلیتا ہے اور اللہ سے مانگتا ہے جس عبادت یا نیکی کو اگرچہ وہ ظاہری شکل میں نیکی نہ کرپائے لیکن حق تعالیٰ شانہٗ اس کو اس نیکی کے ثواب سے محروم نہیں فرماتے۔ یہاں فائدے میں لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ ہر کام میں سچی نیت کو دخل ہوتا ہے، دُوسری حدیث میں یہ مضمون صاف آیا ہے کہ: "نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهِ" (مستدرک حاکم) مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔

اپنے مال کی حفاظت میں مارا جانے والا شہید ہے

[حدیث:۱۲۱۱] "فَقَالَ عَبْدُ اللهِ بْنُ عَمْرٍو........، مَنْ قُتِلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ۔"

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۸۱، ۳۴، حدیث نمبر: ۲۰۲، بَابُ الدَّلِيلِ عَلَى أَنَّ مَنْ قَصَدَ أَخْذَ مَالِ غَيْرِهِ بِغَيْرِ حَقٍّ كَانَ...)

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے مال کے ورے یعنی اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے۔"

تشریح: حدیث یہ ہے کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے، مصابیح میں اس حدیث کے ضمن میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک شخص حاضرِ خدمت ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! ایک آدمی میرا مال چھیننا چاہتا ہے، فرمایا: اس کو چھیننے نہ دے، اس کی مدافعت کر! کہا: وہ ہتھیار اُٹھالیتا ہے، فرمایا: تو بھی اُٹھالے! کہا: اگر میں اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جاؤں؟ فرمایا: تو شہید ہے! کہا: اگر وہ میرے ہاتھ سے مارا جائے؟ فرمایا: وہ جہنمی ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: جو شخص اپنی جان کی مدافعت کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے اور جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے اور جو شخص اپنی آبرو کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے۔

شہیدوں کی مختلف اَقسام

[حدیث:۱۲۱۳] ”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ......، مَنْ قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللهِ فَهُوَ شَهِيدٌ، وَمَنْ مَاتَ فِي سَبِيلِ اللهِ فَهُوَ شَهِيدٌ، وَمَنْ مَاتَ فِي الطَّاعُونِ فَهُوَ شَهِيدٌ، وَمَنْ مَاتَ فِي الْبَطْنِ فَهُوَ شَهِيدٌ، (وَفِي رِوَايَةٍ: وَمَنْ غَرِقَ فَهُوَ شَهِيدٌ۔“

(صحیح مسلم ج: ۱۰، ص: ۲۹، حدیث نمبر: ۳۵۳۹، بَاب بَيَانِ الشُّهَدَاءِ)

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص اللہ کے راستے میں مارا گیا وہ شہید ہے، جو شخص اللہ کے راستے میں مرجائے وہ شہید ہے، جو شخص طاعون میں انتقال کر جائے وہ شہید ہے، جو شخص پیٹ کی بیماری میں مرے وہ شہید، جو شخص غرق ہوجائے پانی میں ڈوب جائے وہ شہید ہے۔“

تشریح: اس حدیث میں چھ آدمیوں کا ذکر فرمایا جو شہید ہیں، جس کا قصہ یوں ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے پوچھا کہ: تم شہید کس کو سمجھتے ہو؟ عرض کیا گیا: جو اللہ کے راستے میں لڑائی کرے جہاد فی سبیل اللہ ”مُقْبِلاً غَيْرَ مُدْبِرٍ“ آگے بڑھتا ہو پیچھے نہ ہٹتا ہو تو وہ شہید ہے۔ ارشاد فرمایا: پھر تو میری اُمّت کے شہید بہت تھوڑے رہ جائیں گے، اس پر یہ ارشاد فرمایا: اللہ کے راستے میں قتل ہوجائے وہ شہید، جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنی موت مرجائے وہ شہید، جو طاعون میں مرے وہ شہید، جو پیٹ کی بیماری میں مرے وہ شہید، جو ڈوب کر مرے وہ شہید۔

اللہ کے راستے میں مرجائے یا قتل ہوجائے یعنی کافروں کے ہاتھ سے مارا جائے سب شہید، یہاں اللہ کے راستے سے مراد عام ہے، جہاد فی سبیل اللہ کے لئے گیا تھا راستے میں بیمار ہوگیا مرگیا وہ شہید ہے، حج کے لئے گیا تھا انتقال ہوگیا تو بھی شہید، طلبِ علم کے لئے نکلا تھا اور مرگیا تو شہید ہے اور اسی طرح تبلیغ کے کام میں گیا، اسی طرح ہر وہ سفر جو خالص اللہ کی رضا کے لئے ہو دُنیا کے مفاد کے لئے نہ ہو وہ سفر فی سبیل اللہ کہلاتا ہے، اور اس سفر میں مرنے والا ”شہید“ کہلاتا ہے۔

جو طاعون میں مرجائے وہ بھی شہید، ”طاعون“ ایک وبا ہے اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں طاعون جارف شام میں پھوٹی تھی، اس نے جھاڑو دے دی تھی، حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اَمیرِ لشکر تھے اور اَمیرِ شام بھی تھے، ملک کے بھی اَمیر تھے، لشکر کے بھی سپہ سالار تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے، طاعون کا بہت زور تھا، لوگ دھڑا دھڑ مر رہے تھے لیکن یہ بالکل تندرست تھے، ایک دن کہنے لگے: یا اللہ! یہ سارے لوگ مر رہے ہیں ابو عبیدہ کا وقت نہیں آیا، شام کو ان کو پھنسی نکلی اگلے دن ان کا انتقال ہوگیا۔

تو طاعون میں مرنے والا بھی شہید ہے، اس کے لئے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: طاعون سے بھاگنے والا بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ جہاد سے بھاگنے والا، اور یہ بھی ارشاد فرمایا: اگر کسی زمین میں طاعون پھیلا ہوا ہو تو وہاں مت جاؤ اور جو وہاں موجود ہیں وہ بھاگیں نہیں۔

اسی طرح پیٹ کی بیماری سے مرنے والا بھی شہید ہے، اس کی بھی کئی قسمیں ہیں، اِسہال ہو جائے، پیٹ جاری ہو جائے یا پیٹ میں خطرناک پھوڑا نکل آئے اور اسی میں انتقال ہو جائے، اسی طرح جو شخص پانی میں ڈوب کر مر جائے وہ بھی شہید۔

اس حدیث میں پانچ آدمیوں کا ذکر آیا اور ایک حدیث میں ہے جو شخص آگ میں جل کر مرے وہ بھی شہید، جس پر دیوار گر جائے وہ بھی شہید، جس عورت کا بچے کی ولادت کی وجہ سے زچگی میں انتقال ہو جائے وہ بھی شہید، اس قسم کے چند اور لوگوں کا بھی تذکرہ آتا ہے۔ سل (ٹی، بی) کی بیماری میں مر جائے وہ بھی شہید، پھیپھڑوں میں زخم ہو جاتا ہے۔ اور یہ جو آج کل ایک بیماری پھیلی ہے کینسر، اس میں مرنے والا بھی شہید۔

یہاں دو باتیں قابلِ ذکر ہیں، ایک یہ کہ شہید کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو دُنیا کے اَحکام کے اعتبار سے شہید ہے، اور دُوسرا وہ جو دُنیا کے اَحکام کے اعتبار سے شہید نہیں ہے، عنداللہ شہید ہے۔

دُنیا کے اَحکام کے اعتبار سے شہید وہ شخص کہلائے گا جو معرکۂ جہاد میں کسی کافر کے ہاتھ سے قتل ہوا ہو، یا جہاد کے میدان میں مقتول پایا گیا ہو اور یہ معلوم نہیں کہ کس نے مارا ہے؟ یا کسی مسلمان نے ظلماً اس کو قتل کیا ہو، غلطی سے نہیں بلکہ دیدہ و دانستہ ظلماً اس کو قتل کیا ہو۔

یہ افراد دُنیاوی اَحکام کے اعتبار سے شہید کہلاتے ہیں اور ان کا حکم یہ ہے کہ ان کو غسل نہیں دیا جاتا کفن نہیں دیا جاتا، ان کے پہنے ہوئے کپڑے نہیں اُتارے جاتے، ان کے انہی کپڑوں میں ان کو دفن کیا جاتا ہے بغیر غسل کے، البتہ اگر وہ کپڑے پورے نہ ہوں تو مزید کپڑے دے سکتے ہیں، چادر ڈال دی لپیٹنے کے لئے۔

یہ تعجب کی بات ہے کہ ان کو غسل نہیں دیا جاتا، شہید کو غسل نہیں دیا جاتا۔

شہید نے اپنے خون میں غسل کرلیا ہے، اور خون تمہارے لئے تو ہے نجس لیکن شہید کے لئے پاک ہے اس کے لئے یہ خون پانی سے زیادہ بہتر ہے، اور یہ خون اگرچہ نجس ہے لیکن یہ غلطی سو دُرستگی سے بہتر ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث میں آتا ہے کہ جب قیامت کے دن شہید اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوگا اس کے بدن میں جو زخم ہوا تھا اس سے خون فوارے کی طرح پھوٹ رہا ہوگا:

"اَللَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ وَالرِّيحُ رِيحُ الْمِسْكِ" (مسند احمد بن حنبل ۴۸/۸، ۱۶۰، ۲۲۵۴۸)

ترجمہ: ''رنگ خون کا ہوگا، لیکن خوشبو مشک کی ہوگی۔''

کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلوائیوں نے شہید کیا تھا، ان کے بعد ان کو کسی نے خواب میں دیکھا کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی عدالت قائم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دُوسرے صحابہ بھی تشریف فرما ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے اور اسی طرح خون کا فوارہ پھوٹ رہا تھا، اور پھر انہوں نے کہا کہ: یا اللہ! ان سے پوچھئے کہ انہوں نے مجھے کیوں قتل کیا؟ کس جرم میں مجھے قتل کیا؟

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کو شیعوں نے شہید کیا تھا، مکان میں گھس آئے اور آکر قتل کردیا، اپنی شہادت سے چند دِن پہلے اپنے دوستوں سے فرمایا کہ: بھائی! ہماری قبر پر یہ شعر لکھ دینا:

بلوح تربت من نہ یافتند غیر تحریرے کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

ترجمہ: ''میری قبر کی لوح (تختی) پر لوگوں کو غیب سے یہ تحریر لکھی ہوئی ملی کہ اس مقتول کا گناہ بے گناہی کے سوا کچھ نہیں ہے، بے گناہی اس کا گناہ تھا، جس کی بنا پر اس کو قتل کیا گیا۔''

اور اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

لوگ کہتے ہیں کہ مرگیا مظہرؔ حالانکہ اپنے گھر گیا مظہرؔ

تو یہ شہید ہیں جن کو غسل نہیں دیا جائے گا۔

شہید کی نماز پڑھی جاتی ہے یا نہیں؟ اس میں اہلِ علم کا اختلاف ہے، ہمارے اِمام (امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہدائے اُحد کی نماز پڑھی تھی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نہ اس کا غسل ہے، نہ اس کی نماز ہے، سارا قصہ ہی پاک!

بہرحال اس شہید کے نہ جنازے کی ضرورت ہے نہ کفن کی ضرورت۔ ہمارے امام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کفن نہیں دیا جائے گا، جنازے کی نماز پڑھی جائے گی۔

یہ تو وہ شہید ہے جو دُنیا کے اَحکام کے اعتبار سے شہید ہے لیکن اس حدیث شریف میں جو دُوسرے لوگوں کا تذکرہ فرمایا ہے، یہ آخرت کے اعتبار سے شہید ہیں، دُنیا کے اعتبار سے شہید نہیں ہیں۔ جو طاعون یا پیٹ کی بیماری میں انتقال کرجائے یا اللہ کے راستے میں ویسے ہی اس کا انتقال ہوجائے یا ڈوب کر مرجائے، جل کر مرجائے، دیوار کے نیچے دَب کر مرجائے یا عورت نفاس میں مرجائے، یہ سارے کے سارے معنوی شہید ہیں، دُنیاوی اَحکام کے اعتبار سے شہید نہیں، دُنیاوی اَحکام کے اعتبار سے ان کا غسل، کفن، دفن وجنازہ اسی طرح ہوگا جس طرح عام مسلمانوں کا ہوتا ہے۔

دُوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ شہید مسلمان ہوتا ہے، ایمان ہو تو یہ ساری چیزیں شہادت کا

موجب ہیں، لیکن اگر ایمان ہی نہ ہو، نہ نماز، نہ روزہ، نہ کلمہ، نہ کچھ تو پھر شہید کیسا؟ اور بلوؤں میں جو لوگ مارے جاتے ہیں جیسے آج کل بلوے ہورہے ہیں، لوگ مرجاتے ہیں، یہ تمہارے ہاں شہید ہوگا اللہ کے ہاں شہید نہیں، یہاں تو ''شگاگو'' کے شہداء کی یاد منائی جاتی ہے یکم مئی کو، وہ تھے کافر اور ان کی یاد مناتے ہیں مسلمان، کوئی تک ہے؟ اگر تمہارے نزدیک وہ بھی شہید ہیں تو پھر تم کون ہو؟

بہرحال اللہ تعالیٰ شہادت کی موت نصیب فرمائے، ایک حدیث میں ہے کہ شہید کو مرنے کی اتنی تکلیف ہوتی ہے جیسے کسی کو چیونٹی کاٹ لیتی ہے بس اتنی سی تکلیف ہوتی ہے، بڑی راحت کی موت ہے، بدن کو تڑپتے ہوئے نہ دیکھو، یہ راحت اور تکلیف معنوی شے ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ایمانِ صحیح نصیب فرمائے اور اللہ تعالیٰ شہادت کی موت نصیب فرمائے۔

شہداء کا مرتبہ

[حدیث:۱۲۱۴] ''قَالَ سَأَلْنَا عَبْدَاللهِ.....، (إِنَّ أَرْوَاحَ الْمُؤْمِنِيْنَ طَيْرٌ خُضْرٌ تَعَلَّقُ فِيْ شَجَرِ الْجَنَّةِ، هٰكَذَا ذَكَرَهُ الْأَقْلِيْشِيُّ وَاخْتَصَرَهُ، وَالرِّوَايَةُ:) أَرْوَاحُهُمْ فِي جَوْفِ طَيْرٍ خُضْرٍ لَهَا قَنَادِيلُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ ثُمَّ تَأْوِي إِلَى تِلْكَ الْقَنَادِيلِ فَاطَّلَعَ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمُ اطِّلَاعَةً، فَقَالَ هَلْ تَشْتَهُونَ شَيْئًا؟ قَالُوا: أَيَّ شَيْءٍ نَشْتَهِي وَنَحْنُ نَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شِئْنَا، فَفَعَلَ ذٰلِكَ بِهِمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، فَلَمَّا رَأَوْا أَنَّهُمْ لَنْ يُتْرَكُوا مِنْ أَنْ يَسْأَلُوا قَالُوا: يَا رَبِّ! نُرِيدُ أَنْ تَرُدَّ أَرْوَاحَنَا فِي أَجْسَادِنَا حَتّٰى نُقْتَلَ فِي سَبِيلِكَ مَرَّةً أُخْرٰى، فَلَمَّا رَأَى أَنْ لَيْسَ لَهُمْ حَاجَةٌ تُرِكُوا۔''

(صحیح مسلم: باب بیان ارواح الشہداء، حدیث:۳۵۰۰)

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: شہیدوں کی رُوحیں سبز چڑیاں ہیں، بہشت کے دَرختوں سے میوے کھاتی ہیں، اقلیشی نے اتنی ہی روایت کی ہے اور اس کو مختصر ذکر کیا ہے، پوری روایت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: بے شک شہیدوں کی رُوحیں سبز چڑیوں کے پیٹ میں ہیں، ان کے واسطے عرش کے نیچے قندیلیں لٹکی ہوئی ہیں، جہاں جی چاہے بہشت میں کھاتی پھرتی ہیں، اور پھر یہ ان قندیلوں میں آکر پناہ لیتی ہیں، ٹھہر جاتی ہیں، پھر ان کو ان کے رَبّ نے دیکھا اور فرمایا کہ: بھلا کسی چیز کو تمہارا جی بھی چاہتا ہے؟ شہیدوں نے

کہا کہ: کس چیز کو ہمارا جی چاہے، ہم تو اس چین میں ہیں کہ بہشت میں کھاتے پھرتے ہیں جہاں چاہتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے تین بار اسی طرح پوچھا، جب شہیدوں نے دیکھا کہ بدون مانگے نہیں چھوٹتی تو کہا: اے رَبّ! ہم چاہتے ہیں کہ ہماری رُوحیں ہمارے بدنوں میں پھر ڈالی جائیں تو ایک اور بار بھی تیری راہ میں مارے جائیں اور ٹکڑے ٹکڑے ہوں۔ جب خدا تعالیٰ نے دیکھا کہ ان کو کسی چیز کی ہوس اور آرزو باقی نہیں رہی تو پھر انہیں پوچھنا چھوڑ دیا۔"

تشریح: یہ حدیث شہیدوں سے متعلق ہے، جب قرآنِ کریم کی یہ آیت نازل ہوئی کہ تم ان لوگوں کو جو اللہ کے راستے میں شہید کر دیئے جاتے ہیں مردے نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، انہیں ان کے رَبّ کے پاس رزق دیا جاتا ہے، اللہ نے اپنا فضل جو ان کو عطا فرمایا ہے اس پر بہت خوش رہتے ہیں، اور ان کے وہ عزیز قریب جو ان سے ابھی تک نہیں ملے ان کے بارے میں بھی وہ بھی خوش ہوتے ہیں کہ ان پر بھی کوئی خوف اور غم نہیں ہے، اِن شاء اللہ مرنے کے بعد وہ بھی سیدھے جنّت میں آجائیں گے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ان آیات کا کیا مطلب ہے؟ اور شہداء کی زندگی کے کیا معنی ہیں؟ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: شہیدوں کی رُوحیں سبز پرندوں کے پیٹ میں ہوتی ہیں اور جنّت میں وہ پرندے اُڑتے پھرتے رہتے ہیں، جہاں سے جو چیز چاہیں کھائیں پئیں، اور پھر ان کے لئے عرش کے نیچے قندیلیں لٹکی ہوئی ہیں، ان میں وہ آرام کرتے ہیں اور آرام کر کے جھولے لیتے رہتے ہیں۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نظرِ عنایت کے ساتھ جھانکا اور ان کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: تم کو کسی چیز کی حاجت اور خواہش ہے؟ کچھ چاہئے؟ کوئی آرزو کوئی تمنّا ہے؟ کہنے لگے: کچھ نہیں! آپ کی جنّت میں اُڑتے پھرتے ہیں اور کیا چاہئے؟ کہنے لگے: پھر بھی کوئی چاہت، فرمائش ہو پوری کریں؟ کہا: نہیں! کچھ نہیں چاہئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کچھ تو چاہئے؟ تین مرتبہ پوچھا تو کہنے لگے: پھر آپ چاہتے ہی ہیں کہ ہم کچھ مانگیں تو پھر ایسا کیجئے کہ ہماری رُوحیں ہمارے ابدان و اجسام میں دوبارہ لوٹا دیجئے اور ہمیں دوبارہ دُنیا میں بھیج دیجئے تاکہ ہم آپ کے راستے میں دوبارہ شہید ہوں اور ہمارے بدن کے پُرزے اُڑائے جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ ان کو کوئی حاجت نہیں، یہ تو ہمارا فیصلہ ہے کہ کسی کو واپس بھیجتے نہیں، یہ تو اُلٹی فرمائش کرتے ہیں، جب دیکھا کہ ان کو کوئی حاجت نہیں تو ان کو چھوڑ دیا۔

یہ حدیث بہت اہم ترین اُمہات مسائل پر مشتمل ہے، میں مختصر لفظوں میں چند کی طرف اشارہ کر دیتا ہوں:

ایک یہ کہ شہداء کی ارواح جنّت میں ہوتی ہیں، دُوسروں کو تو جنّت قیامت کے بعد ملے گی لیکن ان کو ابھی سے مل گئی اگرچہ قیامت کے دن جو جنّت ملے گی اس کی نوعیت اور ہوگی اور یہاں جو ان کو جنّت میں رہنے کی اجازت دی ہے اس کی نوعیت الگ ہے۔

دُوسری یہ کہ جنّت اور دوزخ اس وقت بھی موجود ہیں، یہی اہلِ سنّت کا اور اہلِ حق کا عقیدہ ہے، اور بعض لوگوں نے جن کی عقل ٹھوکریں کھاتی ہے اور وہ عقل کی اُنگلی پکڑ کر چلتے ہیں، ظاہر ہے کہ وہ بھی ٹھوکر کھائیں گے، انہوں نے کہا کہ جنّت اور دوزخ کو قیامت کے دن پیدا کیا جائے گا، یہ بات غلط ہے۔ وہ دونوں اب بھی موجود ہیں، پیدا کی ہوئی ہیں، اور بے شمار نصوص اس پر دلیل ہیں۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ آتا ہے: "اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ" (آل عمران) متقیوں کے واسطے تیار کی گئی ہے، جہنّم کے بارے میں فرمایا کافروں کے واسطے تیار کی گئی ہے۔

تیسرا مسئلہ شہداء کی اَرواح کو جو یہ پرندہ نما دھڑ دیئے جائیں گے یہ ان کا جسم مثالی نہیں ہے، یہ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ ان کو جسم مثالی دیا جائے گا، جسم مثالی کوئی اور ہوتا ہوگا، واللہ اعلم! اور اگر کوئی ہم سے پوچھے تو ہم تو اس کے قائل ہیں کہ خود رُوح ہی جسم کی شکل اختیار کر لیتی ہے، اس کو کوئی جسم مثالی دینے کی ضرورت نہیں ہے، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جسم رُوح بن گیا، اور وہ رُوح بن کر اُوپر چلے گئے، ان پر رُوح کے اَحکام طاری ہوگئے، اسی طرح اَرواح کا تجسد ہو جاتا ہے یعنی خود رُوح کو بھی ایک جسمانی شکل عطا کی جاتی ہے۔

تو اَرواح خود ایک جسم کی شکل اختیار کر لیتی ہیں ان کو کوئی جسم مثالی دیا جاتا ہو عالمِ برزخ میں، وہ الگ چیز ہے، یہاں یہ کہنا ہے کہ یہ چڑیاں جو ان کو دی گئی ہیں اور جس میں وہ جنّت کی سیر کرتے ہیں اور قندیلوں پر جا کر وہ لٹکتی ہیں، یہ ان کی سواریاں ہیں ان کا جسم نہیں، تم یوں کہو کہ ان کو ہوائی جہاز دیئے گئے ہیں، ایک یہ جنّت کے ہوائی جہاز ہیں جو ان کو سیر کے لئے دیئے گئے ہیں اور تم جانتے ہو کہ ہوائی جہاز کی شکل بھی تو پرندے کی طرح ہوتی ہے، وہ اُڑتا ہے ایندھن کے ذریعے اور یہ اُڑتے ہیں اللہ کی قدرت کے ذریعے سے، جیسے کہ یہ پرندے ان میں اللہ نے جان ڈالی ہوتی ہے تو ان میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی کوئی جان ڈالی ہوتی ہوگی ان میں بیٹھ کر وہ رُوحیں اُڑتی ہوں گی۔

بہرحال یہ جو سبز رنگ کے پرندے ان کو دیئے گئے ہیں یہ ان کے مثالی جسم نہیں بلکہ یہ ان کی سواریاں ہیں، اور ایک مسئلہ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ رُوحیں فنا نہیں ہوتیں، رُوحیں باقی رہتی ہیں لیکن اس میں ذرا سا اختلاف ہوا ہے کہ قیامت کے دن بھی رُوحیں باقی رہیں گی یا مر جائیں گی، ختم ہو جائیں گی؟ تو بعضوں نے کہا کہ جب قیامت کا صور پھونکا جائے گا تو ساری کی ساری کائنات ختم ہو جائے گی، آسمان بھی، زمین بھی، آسمان والے بھی، زمین والے بھی، عرش بھی، کرسی بھی، اللہ کی ذات کے علاوہ کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔

اور بعض کہتے ہیں کہ یہاں گفتگو صرف ﴿کُلُّ مَنۡ عَلَیۡهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾﴾ (الرحمٰن) میں ہے کہ وہ تمام چیزیں جو زمین پر ہیں ختم ہو جائیں گی، آسمان چِر جائے گا اور پھٹ جائے گا کیونکہ یہ بھی اس عالم کے دائرے کی چیز ہے، وہ عرش، وہ کرسی، وہ دُوسرا عالم ہے، اس عالم کے بارے میں گفتگو نہیں، اور یہ عالمِ اَرواح بھی دُوسرا عالم ہے، یہ عالم فنا ہو جائے گا، باقی کوئی ضروری نہیں ہے کہ رُوحیں بھی فنا ہوں، واللہ اعلم بالصواب!

ایک یہ کہ قرآنِ کریم میں شہداء کو تیسرے مرتبے میں ذکر فرمایا ہے، سب سے پہلے نبی، پھر صدیق، پھر شہید۔ اور جب یہ کہا جائے کہ اپنے سب کمشنر کا منصب یہ ہے تو خود بخود سمجھ میں آجائے گا کہ کمشنر صاحب کا مرتبہ اس سے اُونچا ہی ہوگا، ہر ایک کی سمجھ میں آئے گا، چھوٹے منصب والے کا جو اِعزاز و اِکرام ہے ظاہر ہے کہ جو اس سے بڑے منصب پر ہوگا اس کا اِعزاز و اِکرام اس سے زیادہ ہی ہوگا، تو اس سے ثابت ہوا کہ شہداء کی رُوحیں زندہ ہیں اور ان کے ساتھ یہ اِعزاز و اِکرام کا معاملہ کیا جاتا ہے، تو صدیقین جن کا مرتبہ ان سے زیادہ ہے ان کے ساتھ اور اچھا معاملہ کیا جاتا ہوگا، اور ان کے انبیائے کرام علیہم السلام ان کا مرتبہ صدیقین سے بھی اُونچا ہے، ان کے ساتھ اور زیادہ اِکرام کا معاملہ ہوگا، اور ان انبیائے کرام علیہم السلام میں ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بلند مرتبہ ہیں، تو آپ کے ساتھ جو اِکرام کا معاملہ کیا جاتا ہے اس کا پوچھنا ہی کیا!

ایک مسئلہ یہ کہ بعض لوگوں کو وہم ہوا ہے کہ شہداء جن کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کہا ہے، ان کے بارے میں فرمایا کہ ان کی اَرواح جنّت میں چرتی پھرتی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ بدن کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں، یہ جو بدن قبر میں پڑا ہوا ہے، اور جب بدن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تو معلوم ہوا کہ جزا اور سزا کا محل بھی قبر نہیں ہے، یعنی اس قبر کے گڑھے میں کوئی جزا اور سزا نہیں ہوتی، یہ انہوں نے اس حدیث سے سمجھا ہے۔ میں نے اس قسم کے لوگوں کی کتابیں دیکھی ہیں، یہ ایسی اُلٹی سیدھی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

بیچ میں ہٹ کر ایک بات کرتا ہوں بطور جملہ معترضہ کے، میں نے ایک رسالہ لکھا تھا: ''عصرِ حاضر حدیثِ نبوی کے آئینے میں'' یعنی وہ فتنے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر فرمائے تھے اور ہمارے زمانے کے بارے میں جن کی نشاندہی کی تھی ان کا تذکرہ ہے، تو اس میں ایک لفظ آیا تھا ''فشو العلم'' علم کا پھیل جانا، اور ایک جگہ لفظ آیا: ''فشو القلم'' قلم کا پھیل جانا، یہ ایک فتنہ پیدا ہوگا کہ علم پھیلے گا اور قلم پھیلے گا۔ میری عقل میں نہیں آتا تھا کہ یہ علم کا پھیلنا اور قلم کا پھیلنا یہ فتنہ کیسے بنا؟ لیکن جب تجربہ اور مشاہدہ سامنے آیا تو بات عقل میں آگئی کہ علم پھیل گیا لیکن فہم نہیں پھیلا، علم ہے لیکن عقل اور سمجھ نہیں ہے، کتابیں دھڑا دھڑ لکھی جارہی ہیں اور یہی مطلب ہے کہ ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں قلم ہے اور قلم کا لٹھ گھما رہا ہے، جس کو دیکھو لکھ رہا ہے، پہلے زمانے میں تو قلم پر وقت لگانا پڑتا تھا کہ اس کو تراشو، اس کے لئے روشنائی تیار کرو، اس کو ڈبوؤ، اب تو کچھ ضرورت نہیں رہی اب تو خود کار قلم ہیں اور پھر زمانے نے ترقی کی، ہم وہ قلم لیتے تھے جس میں سیاہی بھر لیتے تھے، انہوں

نے کہا چھوڑ دو یہ بھی تکلف ہے، بنی بنائی ڈلی ڈلائی سیاہی مل جائے گی اسی کو استعمال کرلو اور ختم ہوجائے تو پھینک دو اور لے لو۔

تین تین، چار چار سال کے بچے قلم لئے پھر رہے ہیں، کاغذ عام ہے، ہم پہلے تختیوں پر لکھا کرتے تھے، اب صاحبزادے کاغذوں پر مشق کرتے ہیں۔ تو قلم بھی پھیلا علم بھی پھیلا، لیکن فہم بند ہوگیا، اب لوگوں کو بات سمجھ میں تو آتی نہیں لیکن تبصرہ ہر آدمی کرتا ہے، اور تبصرہ بھی کرتا ہے تو ان چیزوں کا جن کو نہ کبھی انہوں نے دیکھا نہ کبھی ان کے اَبّا نے دیکھا، بھائی! ہمارے دائرے سے نکلی ہوئی چیز ہے تو ہم اس پر کیا تبصرہ کریں گے؟ میں نے کبھی خواب میں بھی شاہی محل نہیں دیکھا کہ وہ کیسا ہوتا ہے؟ میں اس پر کیا تبصرہ کروں گا کہ اس کے لوازمات کیا ہوتے ہیں؟ ضروریات کیا ہوتی ہیں؟ ایک دیہاتی گھاس کھودنے والا وہ شاہی محل پر کیا تبصرہ کرے گا؟ ہم سب کے سب گھسیارے ہیں لیکن ان کے باوجود اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ آخرت کے معاملات اور برزخ کے معاملات پر تبصرہ کریں اپنی عقل و فہم کے اعتبار سے۔

اور ایک مصیبت کہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ پہلوں نے جو لکھا وہ غلط لکھا، اب مابدولت جو تحقیق فرمارہے ہیں وہ صحیح ہے، چاہے ساری دُنیا اس کو غلط سمجھتی ہو۔ آج کل لوگ نئے نظریات پھیلاتے ہیں، جب ہم کہتے ہیں کہ اِمام ابوحنیفہ، اِمام شافعی، اِمام احمد بن حنبل، امام مالک اور دُوسرے اولیاءِ اکابر رحمۃ اللہ علیہم یہ سب اس کے خلاف ہیں، تو کہتے ہیں کہ: ''یہ سب بے وقوف تھے، میں جو کہتا ہوں صحیح ہے'' اب بتاؤ! اس حماقت کا کوئی علاج ہے؟ تو میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ علم پھیلا، قلم پھیلا لیکن فہم سمٹ گیا۔

تو اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے ان لوگوں نے کہا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبر میں عذاب و ثواب نہیں ہوتا، یہ جو کیماڑی والا تھا کیپٹن مسعود عثمان جو مرگیا، اس کا عذابِ قبر پر رسالہ لکھا ہوا ہے، اس میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس گڑھے میں عذاب و ثواب نہیں ہوتا، لیکن اس سے کیسے معلوم ہوگیا؟ کہتا ہے کہ: رُوح تو جنت میں ہے! میں نے کہا: آفتاب اتنے کروڑ میل دُور ہے یہاں سے، چونکہ وہ بہت دُور ہے اس لئے آپ لوگوں کو یہ سمجھایئے کہ اس کا کوئی اثر یہاں تک نہیں پہنچتا، سب کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیجئے گا کہ ان کو سورج نظر نہ آئے پھر ان کو یہ پٹی پڑھایئے کہ آفتاب بہت دُور ہے اس لئے اس کا اثر یہاں نہیں پہنچ سکتا، مگر چونکہ لوگوں کی آنکھیں کھلی ہیں اس لئے اگر آپ ایسی منطق پیش کریں گے تو لوگ نہیں مانیں گے اس لئے کہ سامنے کی چیز ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جب آفتاب کے وہاں ہوتے ہوئے اس کا اثر یہاں پہنچتا ہے، سردی اور گرمی یہاں ہوتی ہے تو رُوح کے جنت میں یا علّیین یا سجین میں ہوتے ہوئے اس کے اثرات یہاں قبر میں مرتب کیوں نہیں ہوسکتے؟ کیا دلیل ہے آپ کے پاس اس کی نفی کی؟ ٹھیک ہے کہ شہیدوں کی رُوحیں جنت میں

ہیں، حدیث میں ہے میں نے مانا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کے اثرات قبر تک پہنچتے ہیں یا نہیں پہنچتے؟ اس کی نفی کی کیا دلیل ہے؟ اور ایک کافر کی رُوح سجین میں جکڑی ہوئی ہے، قرآن میں ہے: ﴿كَلَّا إِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ﴾ (المطففین) سجین ایک قید خانہ ہے جہاں کافروں کی رُوحیں قید ہیں، ٹھیک ہے رُوح وہاں قید ہے لیکن اس رُوح کے اثرات اس کی قبر تک نہیں پہنچتے، اس کی نفی کی کیا دلیل ہے؟

کتابُ الغزوات

فضیلت سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور واقعہ تبوک

[حدیث:۱۲۱۵] "..... أَنَّ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ......، مَنْ جَهَّزَ جَيْشَ الْعُسْرَةِ فَلَهُ الْجَنَّةُ."

(صحیح بخاری ج:۹،ص:۳۳۵،باب إِذَا وَقَفَ أَرْضًا أَوْ بِئْرًا أَوِ اشْتَرَطَ لِنَفْسِهِ مِثْلَ دِلَاءِ الْمُسْلِمِينَ وَأَوْقَفَ.)

ترجمہ: "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے تیار کیا لشکر تنگی کا اس کے لئے جنّت ہے۔"

تشریح: اس حدیث میں چھوٹا سا فقرہ ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص تنگی کے لشکر کا سامان دُرست کرے گا اس کے لئے بہشت ہے۔

فائدہ: تبوک شام کے ملک میں ایک مقام تھا، تقریباً مدینہ سے سولہ دن کی راہ پر، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں جہاد کا ارادہ کیا، ستر ہزار لشکر جمع ہوا، سامان کچھ نہ تھا، تنگی اور تکلیف بہت تھی، تب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کے سامان کرنے کے واسطے بہشت کا وعدہ کیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آدھے لشکر کا سامان کردیا، چار سو اُونٹ اور دو ہزار اشرفیاں راہِ خدا میں حاضر کیں، حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت راضی ہوئے، اشرفیوں کو اپنے دامن میں اُچھالتے تھے اور فرماتے تھے کہ: عثمان کو اب کوئی کام ضرر نہ کرسکے گا۔

یہ حدیث غزوۂ تبوک سے متعلق ہے، فتح مکہ کے بعد سن ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ شاہِ رُوم مدینہ پر حملے کی تیاری کررہا ہے، حجاز و نجد والوں سے تو نمٹ لئے تھے، اب ان سے باہر کے شاہانِ عالم دانت پیسنے لگے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دُشمن کو مدینے آنے کا نہیں بلکہ اس کو سرحد پر روکنا چاہئے، اس کو مدینہ آنے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔ چنانچہ ایک مہینے کی مسافت جانے کی اور ایک مہینے کی مسافت آنے کی، مدینہ سے اب سڑک جاتی ہے تبوک کو، جب ہم مدینہ میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں سے

سڑک پڑتی ہے تبوک کی، وہاں لکھا ہوتا ہے کہ کتنے کلومیٹر ہے، میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ نہایت شدّتِ گرمی کا زمانہ تھا، کھجور کا پھل پک رہا تھا، پھل اُترا نہیں تھا، اور مدینہ والوں کا زیادہ مدار کھجور کے پھل پر تھا۔

یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے بڑی ہی آزمائش کا وقت تھا کہ پھل تیار ہونے والا ہے، اس کی کٹائی کا موقع ہے اور پیچھے کوئی کٹائی کرنے والا نہیں رہے گا۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ ہوتی تھی کہ جنگ میں توریہ فرماتے تھے، یعنی جانا ہے مشرق کی جانب اور فرماتے تھے کہ ہم مغرب کی جانب نکلیں گے، پھر پلٹ کر مشرق ہی کی جانب جاتے تھے، لیکن نکلتے مغرب کی جانب سے تھے تاکہ جاسوسوں کو یہ پتا نہ چلے کہ کس طرف جارہے ہیں؟ قرائن اور قیاسات کے ذریعے سے اندازہ نہ لگائیں۔ فرمایا: "اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ" (صحیح مسلم ۵/۳۰۶، ۱۷۱، ترمذی ۶/۲۴۵، 1598، ابن ماجہ ۸/۳۵۵، ۲۸۲۳) لڑائی تو چال کا نام ہے، تم اپنے حریف کو جتنا چکما دے سکتے ہو اتنے کامیاب ہو لڑائی میں۔

تو معمول عام طور پر جنگ میں توریہ کا تھا، مگر اس جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توریہ نہیں فرمایا، سیدھا فرمایا: ہمیں تبوک جانا ہے۔ پوری کی پوری سورۂ توبہ اسی غزوے پر تبصرے کے لئے وقف ہے۔ اتنی بار "مِنْهُمْ" آیا ہے کہ عقل حیران، اور اس سورت کے بہت سے حصے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منسوخ کردیئے۔ غالباً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سورۃ نے ہم میں سے ایک کو نہیں چھوڑا کہ جس کا ذکر نہ کیا ہو، لیکن بعد میں اس کو منسوخ کردیا گیا اور اتنی مختصر باقی رکھی گئی۔

خیر یہاں تو تذکرہ یہ ہے کہ اس غزوے میں چاروں خلفاء کے چار الگ الگ وصف اللہ تعالیٰ نے ظاہر کئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا الگ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا الگ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا الگ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا الگ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چندے کا اعلان فرمایا کہ اس لشکر کی تیاری کے لئے چندہ دو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے یہ اعلان سن کر دل میں کہا کہ: ہر خیر اور نیکی کے کاموں میں ابوبکر رضی اللہ عنہ مجھ سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور آج کا مسئلہ مال سے تعلق رکھتا ہے، جو زیادہ پیش کرے گا وہ بڑھے گا اور مال میرے پاس زیادہ ہے، لہٰذا آج میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے آگے نکل کر دکھاؤں گا نیکی میں۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی چندہ لائے، میں بھی لے کر حاضرِ خدمت ہوا، دونوں نے اپنا اپنا صدقہ پیش کردیا، تو مجھ سے پوچھا: کتنا لائے؟ کتنا چھوڑ کر آئے؟ میں نے کہا: آدھا آدھا کرلیا ہے، آدھا لے آیا ہوں، آدھا بیوی بچوں کے لئے چھوڑ آیا ہوں۔ فرمایا: بہت اچھا! میرے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کتنا لائے؟ کتنا چھوڑا؟ فرمایا: جو کچھ تھا اللہ اور اللہ کے رسول کے لئے لے آیا ہوں، اور گھر میں اللہ اور اللہ کے رسول کو چھوڑ

آیا ہوں، ایک حبہ بھی نہیں گھر میں۔ آنحضرت ﷺ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: تم دونوں کا مرتبہ تمہارے جواب سے ظاہر ہے، فرماتے ہیں کہ: میں نے سوچ لیا کہ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا بھی کہ: میں یہ ہوسِ خام اپنے دِل سے نکال دُوں گا کہ میں کبھی ابو بکر سے آگے بھی بڑھ سکتا ہوں، ممکن ہی نہیں: ”وَاللّٰہِ لَا أَسْبِقُکَ أَبَداً“ اللہ کی قسم! میں کبھی بھی آپ سے آگے نہیں نکل سکتا کسی بھی خیر کے کام میں۔

اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: ابو بکر ایک دن اور ایک رات مجھ کو دیدے اور میری ساری زندگی کی نیکیاں مجھ سے لے لے، کسی نے پوچھا: کون سا دن؟ کون سی رات؟ فرمایا: رات تو وہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (التوبة: ۴۰)

ترجمہ: ”جب نبی ﷺ اپنے صاحب سے فرمارہے تھے: غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

اور صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ اس موقع پر نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا:

”مَا ظَنُّكَ يَا أَبَا بَكْرٍ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا“

ترجمہ: ”اے ابو بکر! ان دو آدمیوں کا کیا حال ہوگا جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہو۔“

اسی لئے ان کو ”ثانی اثنین“ کہتے ہیں۔ اور وہ دن جب رسول اللہ ﷺ کے وصال کی خبر پھیلتی گئی، اِرتداد پھیلتا گیا، ایک دفعہ سب کو جھٹکا لگا، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان سب سے جہاد کیا جائے۔ اب مجاہد کتنے رہ گئے پیچھے مدینہ میں، ہم نے مشورہ دیا کہ اتنے ساروں سے لڑنا ہمارے بس کا روگ نہیں ہے، ذرا تھوڑا آہستہ، ادھر لشکرِ اُسامہ کو آپ بھیج رہے ہیں، ادھر منکرینِ زکوٰۃ سے لڑنے کا حکم دے رہے ہیں، ادھر منکرینِ ختمِ نبوّت ہیں، لوگوں کے ساتھ ذرا تھوڑی نرمی کیجئے۔ تلوار سونت کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئے، اور کہا کہ تم میرے ساتھ نہ جاؤ گے تو میں اکیلا ہی جاؤں گا۔

روایت میں آتا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے بھاگ کر پیچھے گئے، حالانکہ وہ چلے گئے تھے اور کہا: یا خلیفۃ رسول اللہ! آپ واپس تشریف لائیے، جیسا آپ فرمائیں گے ویسا ہی کریں گے، آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی منقبت اس غزوے میں یوں ظاہر ہوئی، ہوا یہ تھا کہ جب منافقوں نے حضرت کے مکان کا گھیرا ڈال لیا تھا اور آخر میں شہید کر دیا تو اس موقع پر منہ نکال کر چند باتیں ارشاد فرمائی تھیں، ایک بات یہ ارشاد فرمائی تھی کہ جب ہم مدینہ آئے تو ایک ہی میٹھا کنواں تھا باقی سب کھارے تھے، اور وہ میٹھا کنواں ایک یہودی کے پاس تھا، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

'مَنْ یَشْتَرِی بِئْرَ رُومَةَ فَیَجْعَلُ دَلْوَہُ فِیھَا مَعَ دِلَاءِ الْمُسْلِمِینَ بِخَیْرٍ لَہُ مِنْھَا فِی الْجَنَّةِ'

(صحیح بخاری ۸/ ۱۶۳، بَابٌ فِی الشُّرْبِ وَقَوْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی، کنز العمال: ۱۳/ ۷۴، ۳۶۲۸۰، سنن الدار قطنی ۱۰/ ۲۳۸، ۴۴۹۰)

ترجمہ: ''کون ہے جو بئر رومہ مسلمانوں کے لئے خرید کر وقف کر دے، اپنا ڈول بھی مسلمانوں کے ڈول کے ساتھ ڈالے، میں اس کو جنّت کی ضمانت دیتا ہوں۔''

فرماتے ہیں: تو میں نے بئر رومہ خرید کر وقف کر دیا۔ لوگوں سے پوچھا کہ: ٹھیک کہتا ہوں یا غلط کہتا ہوں؟ سب کی طرف سے آواز آئی: ٹھیک کہتے ہیں۔ تو فرمایا: آج اسی کنویں کا پانی مجھے نہیں پینے دیتے ہو، آج وہی کنواں میرے لئے ممنوع ہے۔ اور پھر ارشاد فرمایا کہ: غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

''مَنْ یُجَھِّزْ جَیْشَ الْعُسْرَةِ أَضْمَنْ لَہُ الْجَنَّةَ'' (الجامع الکبیر، کنز العمال ۱۳/ ۱۰۱، ۳۶۳۳۶)

ترجمہ: ''کون ہے جو اس تنگی کے لشکر کا سامان تیار کر دے، میں اس کو جنّت کی ضمانت دیتا ہوں۔''

تو میں نے ٹاٹ بوری اور سواری تک کا انتظام کر کے دیا، اور جب چار ہزار درہم لا کر تھیلی گود میں ڈالی تو آپ ﷺ اس طرح اُلٹتے پلٹتے تھے اور تین بار فرمایا: عثمان آج کے بعد کچھ بھی عمل کرے اس پر کوئی الزام نہیں، سب کچھ معاف ہو گیا، جنّت کا ٹکٹ مل گیا۔ پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

''لَا یَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِإِحْدٰی ثَلَاثٍ، کُفْرٌ بَعْدَ إِسْلَامٍ أَوْ زِنًا بَعْدَ إِحْصَانٍ أَوْ ارْتِدَادٍ بَعْدَ إِسْلَامٍ أَوْ قَتْلِ نَفْسٍ بِغَیْرِ حَقٍّ فَقُتِلَ بِہٖ..... إلخ۔''

(سنن ابو داؤد ۱۲/ ۸۷، ۳۹۰۳، سنن نسائی ۱۲/ ۳۷۰، ۳۹۵۱، سنن ابن ماجہ ۷/ ۴۲۴، ۲۵۲۴)

ترجمہ: ''کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں، مگر تین باتوں میں سے ایک کے ساتھ، شادی شدہ ہونے کے باوجود بدکاری کرے پس اس کو رجم کیا جائے، کوئی کسی کو عمداً قتل کر دے اور تیسرے یہ کہ اسلام لانے کے بعد کوئی شخص مرتد ہو جائے، نعوذ باللہ! تو اس کو قتل کیا جائے۔''

پھر فرمایا: تم مجھے قتل کرنے کے درپے ہو، میں نے زنا نہیں کیا، میں نے کسی کو قتل نہیں کیا، میں اسلام لانے کے بعد مرتد نہیں ہوا! تم لوگ مجھے کیوں قتل کرتے ہو؟ اللہ کی قسم! میرا دایاں ہاتھ جب سے میں نے

رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں میں دیا، اس کے بعد سے آج تک شرمگاہ کو نہیں لگا اور بھی بہت سی باتیں فرمائی تھیں لیکن تقدیر مبرم اور یہ منافقوں کا ٹولہ تھا، ان کے دِل میں نہ نبی کا احترام، نہ نبی کے صحابہ کا احترام، نہ حرمِ مدینہ کا احترام، یہ عبداللہ بن سبا کی پارٹی تھی۔ یہ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی منقبت تھی۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت یہ کہ جب رسول اللہ ﷺ نے چندے کا اعلان فرمایا تو یہ چونکہ نبی کے گھر کے لوگ تھے، ان کے گھر میں مال کہاں تھا؟ گھر آئے اور سوچا کہ پاس ہاتھ میں کچھ نہیں، چندہ دینا بھی ضروری ہے، آج کی رات محنت کر کے گزارتے ہیں، ایک یہودی کے باغ میں چلے گئے، اس کا رہٹ چلایا اور ہر پھیرے کے بدلے میں ایک کھجور، صبح ہوئی تو دو صاع کھجوریں جمع تھیں، کتنے پھیرے دیئے ہوں گے! اور وہ لاکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیئے اور فرمایا: حضرت! میری طرف سے یہ قبول فرمالیجئے۔

اسی طرح کا معاملہ ایک اور صحابی نے بھی کیا، وہ بے چارے ساری رات مزدوری کرتے رہے، صبح کے وقت کچھ کھجوریں لے کر آئے، وہاں چندہ ڈھیر لگا ہوا تھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: یہ کھجوریں لے کر سب پر پھیلا دو، ان کی برکت سے سب کی قبول ہوجائیں گی۔ ایک خاتون نے جذبۂ اشتیاق میں اپنے بالوں کا جوڑا کاٹ کر بھیج دیا اور فرمایا: میرے پاس اور کچھ نہیں ہے سوائے اس کے، اللہ کے راستے میں کسی اُونٹ کی رَسّی ہی بنالیجئے گا۔ اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو۔

بئرِ معونہ کا قصہ

[حدیث:۱۲۱۶] "عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ ...... إِنَّ إِخْوَانَكُمْ قَدْ قُتِلُوا وَإِنَّهُمْ قَالُوا اللّٰهُمَّ بَلِّغْ عَنَّا نَبِيَّنَا أَنَّا قَدْ لَقِينَاكَ فَرَضِينَا عَنْكَ وَرَضِيتَ عَنَّا۔"

(صحیح مسلم ج:۱۰، ص:۲، ۳۵۲۲، باب ثُبُوتِ الْجَنَّةِ لِلشَّهِيدِ)

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تمہارے بھائی شہید کر دیئے گئے اور انہوں نے یہ بات کہی ہے کہ: اے اللہ! ہماری جانب سے ہمارے نبی محمد ﷺ کو یہ بات پہنچادیں کہ بے شک ہماری آپ سے ملاقات ہوگئی، پس آپ ہم سے راضی ہوگئے، ہم آپ سے راضی ہوگئے۔"

تشریح: یہ حدیث شہدائے بئرِ معونہ کے بارے میں ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ کچھ لوگ آئے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا، آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ مبلغوں کی ایک جماعت کر دیجئے تاکہ وہ تبلیغ کریں۔ آنحضرت ﷺ نے ستر (۷۰) حضرات جو قرآن کے قاری کہلاتے تھے، ان حضرات کے ساتھ کر دیئے کہ وہ ان کو تھوڑی مدت قرآن پڑھائیں۔

بئر معونہ ایک جگہ تھی وہاں جا کر انہوں نے غدر کیا اور ان حضرات کو گھیرے میں لے کر شہید کر دیا، ان حضرات کو سب سے زیادہ غم اس بات کا تھا کہ ہمارے نبی کو اس بات کا پتا ہی نہیں، کوئی ہم میں سے جا کر خبر ہی پہنچا دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم پہنچائیں گے، تمہارا پیغام ہم پہنچائیں گے، چنانچہ جبریل علیہ السلام نے آ کر حال احوال بتایا اور ان کی شہادت کا تذکرہ کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے ذریعے سے ان لوگوں نے اپنا یہ پیغام پہنچایا ہے: "اَللّٰهُمَّ بَلِّغْ عَنَّا نَبِيَّنَا أَنَّا قَدْ لَقِيْنَاكَ فَرَضِيْنَا عَنْكَ وَرَضِيْتَ عَنَّا" اے اللہ! ہماری طرف سے ہمارے نبی کو یہ پیغام پہنچا دیجئے کہ ہماری آپ سے ملاقات ہوئی، پس آپ ہم سے راضی ہوگئے، ہم آپ سے راضی ہوگئے۔

ایک وطن سے دُوسرے وطن جا کر انہوں نے گویا کہ پیغام پہنچایا اور پیغام بھی سب سے معتبر ذریعے کے ساتھ کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے جبریل کے واسطے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ پیغام پہنچایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو بتایا، اتنا مقدس ذریعہ ان کے ہاتھ آیا پیغام بھیجنے کا۔

اس حدیث میں بہت سے مسائل ہیں، ان میں سے ایک یہ کہ جب حق تعالیٰ شانہٗ چاہتے ہیں تو مرنے والوں کی طرف سے بھی پیغام پہنچا دیتے ہیں، اب یہاں تو نبوت کا سلسلہ جاری تھا، جبریل علیہ السلام صبح شام وحی لے کر آتے تھے، نہایت معتبر اور مستند ذریعہ پیغام رسانی کا موجود تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ تو بند ہوگیا، جبریل کسی کے پاس پیغام نہیں لائیں گے، لیکن یہ "منامات" کا سلسلہ پھر بھی جاری رہے گا، اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے" یعنی نبوت کے چھیالیس حصے کر دیئے جائیں تو ایک حصہ یہ سچا خواب رؤیا صالحہ ہے۔

"رؤیائے صالحہ" اس کو کہا جاتا ہے جو من جانب اللہ اِلقاء کیا جائے، میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور اس کے آگے بھی مفصل آئے گا کہ خواب تین قسم کے ہوتے ہیں:

[۱]: رحمانی [۲]: نفسانی [۳]: شیطانی

رحمانی: جو حق تعالیٰ شانہٗ اپنے نیک بندوں کو خواب میں کچھ اِلقاء فرما دیتے ہیں۔

نفسانی: کہ دن بھر کچھ سوچتے رہے، رات کو وہی خواب آ گیا، اپنے نفس کے خیالات جس کو خواب و خیال کہتے ہیں، بیداری میں خیال ہوتے ہیں، نیند میں خواب بن جاتے ہیں۔

اور شیطانی: یعنی شیطان دِکھاتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ شیطان پیچھے کی جانب گدی پر بیٹھا رہتا ہے، عجیب و غریب قسم کی اُلٹی باتیں ذہن میں ڈالتا رہتا ہے اور وہ خواب کی شکل میں انسان کے سامنے آتی رہتی ہیں، کبھی کچھ نظر آتا ہے، کبھی کچھ نظر آتا ہے، اُلٹی سیدھی چیزیں (اضغاث احلام)۔

یہاں گفتگو رحمانی خوابوں کے بارے میں ہے، اور نفسانی ہے یا رحمانی یا شیطانی؟ اس کا امتیاز کرنا

ہر ایک آدمی کا کام نہیں، اس لئے شریعت نے خواب پر مدار ہی نہیں رکھا، خواب سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا۔ لوگ مجھ سے خوابوں کی تعبیر پوچھتے ہیں، میں کہتا ہوں: میں نہیں جانتا، مولوی منیر سے پوچھ لو، (حضرت مولانا مفتی منیر احمد اخون صاحب) میں نہ خواب دیکھوں اور نہ کسی کے خواب کی تعبیر بتاؤں، خوابوں والا پتا ہی کاٹا ہوا ہے میں نے، اس لئے کہ مجھے اُمید نہیں، لوگ رات بھر ٹی وی دیکھتے ہیں پھر سمجھتے ہیں کہ سچے خواب بھی آئیں گے، حلال حرام کی تمیز نہیں، سنّت کی اتباع کا اہتمام نہیں اور توقع یہ رکھیں کہ مجھے رحمانی خواب آئیں گے، یہ بہت مشکل ہے۔ تاہم گفتگو میں اس پر کر رہا تھا کہ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ مرنے والوں کا پیغام بذریعہ خواب پہنچادیتے ہیں اور وہ صحیح رحمانی خواب ہوتے ہیں، اس کی بہت سی تفصیلات ہیں وہ چھوڑتا ہوں۔

غزوۂ تبوک سے واپسی کا ایک قصہ

[حدیث:۱۲۱۷] ”عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ ......، إِنَّ اللهَ قَدْ صَدَّقَكَ يَا زَيْدُ (قَالَهُ لَهُ حِينَ نَزَلَتْ سُورَةُ الْمُنَافِقِينَ، وَقَدْ كَانَ أَخْبَرَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ عَبْدُ اللهِ بْنُ أُبَيٍّ: ”لَا تُنْفِقُوا عَلَى مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللهِ حَتَّى يَنْفَضُّوا۔“ وَقَوْلُهُ: ”لَئِنْ رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ۔“ ﴿المنافقون:۸،۷﴾۔“

(صحیح بخاری ج:۱۵، ص:۱۸۱، حدیث نمبر:۴۵۲۰، باب قَوْلُهُ: إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ...)

ترجمہ: ”حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک تجھ کو اللہ تعالیٰ نے سچا کر دیا، یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اس وقت فرمائی تھی جبکہ سورۂ منافقین نازل ہوئی، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا تھا کہ عبداللہ بن اُبیّ کہتا ہے کہ: نہ خرچ کرو ان لوگوں پر جو رسول اللہ کے پاس ہیں یہاں تک کہ وہ تتر بتر ہو جائیں۔ اور یہ بھی کہتا ہے: اگر ہم مدینہ واپس گئے تو جو زیادہ عزّت والا ہے وہ مدینہ سے ذلیل لوگوں کو نکال دے گا۔“

تشریح: اس حدیث میں ایک اور واقعہ ہے، یہ واقعہ جنگِ تبوک کا ہے، واقعہ تو بہت لمبا ہے، خلاصہ اس کا یہ ہے:

جنگِ تبوک سے واپسی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غلام اور ایک انصاری کا غلام پانی لیتے لیتے لڑ پڑے، غلام تو بے چارے ایسے ہی ہوتے ہیں، بلند اخلاق کا مظاہرہ مشکل ہی سے ہو پاتا ہے ان سے، تو لڑتے لڑتے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام نے دُوسرے کے تھپڑ مار دیا، بات فوجداری تک پہنچ گئی، اس نے کہا: ”یا

لَلْأَنْصَار!" اے انصار! کی دہائی دی، اور اس نے کہا: "یَالَلْمُهَاجِرِین!" اومہاجرو! اچھی خاصی لوکل اور مہاجر جنگ شروع ہوگئی، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی، وہاں پہنچے، آپ نے ناگواری کا اظہار فرمایا اور فرمایا: ابھی تو میں زندہ ہوں، ابھی سے تم نے جاہلیت کے نعرے لگانا شروع کر دیئے؟ اور اسی موقع پر فرمایا تھا: "دَعُوْهَا فَإِنَّهَا مُنْتِنَةٌ" چھوڑ دو اس بات کو، یہ بہت بدبودار بات ہے۔ "جئے مہاجر" کا نعرہ اور "جئے انصار" کا نعرہ بہت بدبودار بات ہے، قریب تھا کہ مہاجر اور انصار میں ٹھن جاتی لیکن آپ ﷺ کی بات سے ایسا ہوگیا جیسے آگ پر پانی ڈال دیا۔

عبداللہ بن اُبیّ منافق بلکہ منافقوں کا اَبا رئیس المنافقین، ان منافقوں کو ذرا سی بات مل جائے تو موقع مل جاتا ہے، اس نے وہ کلمات کہے جو سورۂ منافقون میں اللہ تعالیٰ نے نقل کئے:

﴿لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا﴾ (المنافقون:۷)

ترجمہ: "یہی وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ مت خرچ کرو ان پر جو اللہ کے رسول کے پاس ہیں، یہاں تک کہ وہ تتر بتر ہو جائیں۔"

وہ عبداللہ منافق، انصار اور منافقوں سے کہنے لگا کہ تم لوگوں نے ان کا دماغ خراب کر دیا ہے کھلا کھلا کے، یہ تمہاری روٹیاں کھاتے ہیں پھر تمہیں لاتیں مارتے ہیں، تم نے ان کا دماغ خراب کیا ہے، نہ خرچ کرو ان پر، بھوکے مریں گے خود چلے جائیں گے یہاں سے۔ ایک بات تو اس نے یہ کہی، دُوسری بات اس نے یہ کہی:

﴿لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ﴾ (المنافقون:۸)

ترجمہ: "اگر ہم مدینہ لوٹ گئے تو جو عزّت والا ہے وہ ذلیل کو مدینہ سے نکال دے گا۔"

عزّت والے سے اس کی مراد تھی وہ خود، اور ذلیل سے نعوذ باللہ! رسول اللہ، ان کے صحابہ اور دُوسرے لوگ۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ جو اس وقت نوجوان صحابی تھے، چھوکرے سے تھے، انہوں نے آکر یہ ساری کارروائی رسول اللہ ﷺ کے گوش گزار کردی، اور ادھر اس منافق کو بھی پتا لگ گیا، یہ منافق مرزائیوں سے بھی زیادہ دھوکے باز تھے، فوراً آیا آپ کی خدمت میں اور کہا: اس لونڈے کو چغلی کرنے کی عادت ہے، لگائی بجھائی کرنے کی اور اپنی قوم کے شرفاء کو بھی ساتھ لے گیا، انہوں نے بھی کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں، وہ بھی منافق ہوں گے۔ آنحضرت ﷺ نے اتنا فرمایا کہ: لڑکے تجھ سے غلطی تو نہ ہوئی سننے میں؟ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: مجھے میرے چچا نے الگ لے جا کر ڈانٹا اور کہا کہ تجھے ایک ایسی بات کرنے کی ضرورت کیا تھی جس کا تو ثبوت پیش نہ کر سکے اور رسول اللہ ﷺ تیری تکذیب کر دیں۔

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: مجھ پر جو گزری میں جانتا ہوں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کیا حال ہوا

ہوگا؟ اس پر سورۂ منافقین نازل ہوئی، پوری سورت اللہ تعالیٰ نے نازل فرمادی زید بن ارقم کی تصدیق کے لئے، جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ارقم کو بلایا اور فرمایا: "إِنَّ اللّٰهَ قَدْ صَدَّقَکَ" اللہ تعالیٰ نے تیری تصدیق فرمادی، اور تو کوئی گواہ نہیں تھا اللہ تعالیٰ نے تیری گواہی دے دی، وہی بعینہٖ الفاظ جو زید بن ارقم نے نقل کئے تھے اللہ تعالیٰ نے بھی ذکر فرمائے۔

اور اس کے آگے قصہ اتنا اور بھی ہے کہ اسی عبد اللہ کا بیٹا، ان کا نام بھی عبد اللہ، عبد اللہ بن عبد اللہ بن اُبیّ وہ سچا مسلمان تھا، جب یہ سورۂ منافقین نازل ہوئی تو آنحضرت ﷺ سے فرمایا: یارسول اللہ! اگر اجازت ہو تو اپنے باپ کا سر اُتار کر لے آؤں؟ فرمایا: نہیں! اس کی اجازت نہیں دُوں گا دو وجہ سے:

ایک تو یہ کہ لوگ کہیں گے کہ یہ ڈکٹیٹر ہے، اسٹالن کی طرح جو ذرا مخالف ہوتے ہیں ان کو مروا دیتے ہیں، سیدھا کردیتے ہیں، یہ شہرت ہوگی کہ: "إِنَّ مُحَمَّداً يَقْتُلُ أَصْحَابَهُ" محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرادیتا ہے، جس نے آواز اُٹھائی اس کا پتا کٹوادیا، یہ شہرت بُری ہے۔

اور دُوسری وجہ یہ کہ اخلاق اور مروّت کے خلاف ہے کہ بیٹا باپ کو قتل کرے، خواہ کافر ہی کیوں نہ ہو، اخلاق مروّت اور انسانی شرافت اور اخلاقِ عامہ کے خلاف ہے، وہ بھی ایسے فرمانبردار کہ اس کے بعد کچھ نہیں کہا، البتہ جب وہ مدینہ کے قریب پہنچے تو ایک درّہ ایسا تھا کہ اس میں سے سب کو گزرنا پڑتا تھا، وہاں کھڑے ہوگئے اور جب باپ گزرنے لگا تو اس کے گھوڑے کی لگام یا اُونٹ کی مہار پکڑ لی اور کہا کہ مدینہ نہیں جانے دُوں گا جب تک یہ نہ کہو کہ میں ذلیل اور محمد ﷺ عزّت والے، میں رذیل اور کمینہ اور محمد عزّت والے، جب تک یہ نہیں کہوگے مدینہ نہیں جانے دُوں گا۔ چنانچہ اپنے باپ سے یہ الفاظ کہلوائے کہ میں ذلیل اور محمد ﷺ اور ان کے ساتھ عزّت والے، یہ اسی طرح گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے تھے کہ اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے، فرمایا کہ: کیا ہورہا ہے؟ کہنے لگا: میرا بیٹا مجھے جانے نہیں دیتا، فرمایا: اس کا راستہ چھوڑ دو۔

تبوک سے واپسی

[حدیث:۱۲۱۸] "عَنْ أَبِي حُمَيْدٍ...... إِنِّي مُسْرِعٌ فَمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ فَلْيُسْرِعْ مَعِي وَمَنْ شَاءَ فَلْيَمْكُثْ (قَالَهُ مُنْصَرِفاً مِنْ تَبُوكَ)۔"

(صحیح مسلم ج:۷، ص:۱۴۸، حدیث نمبر: ۲۴۲۶، باب أحد جبل یحبنا ونحبه)

ترجمہ: "حضرت ابوحمید الساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جنگ تبوک کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا: میں تو جلدی جانے والا ہوں، تو تم میں سے جو چاہے میرے ساتھ جلدی چلے اور جو چاہے ٹھہرے۔"

تشریح: اس حدیث میں یہ قصہ ذکر فرمایا ہے کہ آنحضرت ﷺ جب جنگ تبوک سے واپس ہوئے تو کسی مقام پر ٹھہرنا ہوا، تو وہاں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: بھئی! مجھے تو جلدی مدینہ جانا ہے، تم میں سے جو میرے ساتھ جلدی جا سکتا ہے وہ چلے اور جو آہستہ آہستہ آنا چاہتا ہے پیچھے وہ بھی خوشی سے آئے۔

عام طور پر آنحضرت ﷺ کا مبارک معمول یہ تھا کہ آپ ہمیشہ لشکر کے پیچھے پیچھے رہتے تھے تاکہ کسی کی کوئی چیز رہ گئی ہو تو اس کو اُٹھوالیں، کوئی پیچھے کمزور رہ گیا ہو اس کی مدد فرمائیں، کسی کو کوئی عارضہ پیش آ گیا ہو اس کی خبر گیری فرمائیں، کسی کی سواری بیمار ہوگئی ہو یا تھک گئی ہو تو اس کا بندوبست فرمائیں، عام طور پر معمول پیچھے رہنے کا تھا، اس خاص موقع پر کسی خاص کام کی وجہ سے کوئی جلدی ہوگی، اس لئے فرمایا کہ مجھے جلدی جانا ہے کیونکہ اس سفر میں ایک مہینہ لگا تھا، تو مدینہ طیبہ سے غیر حاضری کو کافی دن ہو گئے تھے۔

فتحِ مکہ کے دن کا ایک واقعہ

[حدیث: ۱۲۱۹] ''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ....، إِنَّ اللهَ وَرَسُولَهُ يُصَدِّقَانِكُمْ وَيَعْذِرَانِكُمْ، (قَالَهُ لِلْأَنْصَارِ)۔''

(صحیح مسلم ج: ۹، ص: ۲۴۹، حدیث نمبر: ۳۳۳۱، باب فَتْحِ مَكَّةَ)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انصار سے فرمایا کہ: بے شک اللہ اور اس کا رسول تمہیں سچا جانتے ہیں اور تمہارا عذر قبول فرماتے ہیں۔''

تشریح: اس حدیث میں قصہ ہے: مکہ مکرمہ فتح ہوا تو اس سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمادیا تھا کہ: ''مَنْ دَخَلَ دَارَ أَبِي سُفْيَانَ فَهُوَ اٰمِنٌ'' جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اس کو امن ہے، ''وَمَنْ دَخَلَ الْبَيْتَ فَهُوَ اٰمِنٌ'' جو مسجد حرام میں داخل ہو جائے اس کو بھی امن ہے، ''وَمَنْ دَخَلَ بَيْتَهُ وَأَغْلَقَ الْبَابَ دُوْنَهُ فَهُوَ اٰمِنٌ'' جو اپنے گھر میں داخل ہو جائے اور دروازہ بند کر لے اس کو بھی امن ہے، تو بعض انصار کی زبان سے یہ بات نکل گئی کہ ان صاحب پر تو اپنی قوم کی محبت غالب ہے، آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع پہنچی، انصار سے پوچھا کیا تم نے یہ بات کہی ہے؟ انہوں نے کہا کہ: ہاں! کہی ہے لیکن ہمارا اس بات کے کہنے کا منشا محبت تھی، ہمیں دھڑکا لگا کہ آنحضرت ﷺ نے قریش کے ساتھ جتنی نرمی اور حسنِ سلوک کیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اب یہ لوگ آپ کو مکہ مکرمہ رہنے پر مجبور کریں، جبکہ ہم دیکھ رہے تھے کہ آپ کو بھی اپنی قوم سے محبت ہے تو ہمیں اندیشہ ہوا کہ ہمارا شہر آپ کے وجودِ بابرکت سے محروم نہ ہو۔

آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر فرمایا: ''إِنَّ اللهَ وَرَسُولَهُ يُصَدِّقَانِكُمْ وَيَعْذِرَانِكُمْ'' بے شک

اللہ اور اس کا رسول تمہیں سچا جانتے ہیں اور تمہارا عذر قبول فرماتے ہیں، چلو کوئی بات نہیں۔

انصار کو آپ ﷺ سے وہ محبت تھی جو کسی مجنوں کو کسی لیلیٰ سے کبھی نہیں ہوئی، کسی فرہاد کو کسی شیریں سے نہیں ہوئی، ان اصحاب کو اور پورے کے پورے قبیلے کو ایک آدھ آدمی کو نہیں، آنحضرت ﷺ سے بڑی شدید محبت تھی، وہ تو حدودِ شریعت میں پوری طرح جکڑے ہوئے تھے، بے وقوف نہیں تھے، اس محبت میں اگر ذرا بھی وہم ہو جائے کہ ہمارا محبوب ہم کو چھوڑ کر چلا جائے گا تو پھر کیا حال ہوگا؟ اس لئے فرمایا کہ اللہ اور اس کا رسول اس منشائے محبت کی وجہ سے تمہیں معذور سمجھتے ہیں۔

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ محبت میں حدود کو پھلانگنے کی اجازت نہیں، ہمارے محبین حضرات محبت میں سب کچھ کر جاتے ہیں، کسی نے کہا ہے: ''تیرے روضے کی جالی چومنا چاہتا ہوں، گر اجازت دیدے'' پہرے دار اجازت دے دیں گے لیکن تمہیں ادب مانع ہونا چاہئے، تمہیں تمیز رکھنی چاہئے کہ کیا چیز محبوب کی بارگاہ کے ادب کے خلاف ہے، روضے کی جالیوں کو چومنا تمہارے دِل کا تقاضا ہے، میرا جی بھی چاہتا ہے چومنے کو، کون سنگ دِل ایسا ہوگا جس کا دِل نہ چاہے، آپ کے قدموں سے لپٹنے کو، حدِ ادب مانع ہے، ادب کی حد مانع ہے، جہاں محبوبیت ہے وہاں عظمت بھی ہے، یہ مجنونانہ حرکتیں وہاں مناسب نہیں، تمہیں معلوم نہیں وہ سلطانوں کا سلطان ہے، بادشاہوں کا بادشاہ ہے، آقائے کونین ہے، سید کائنات ہے، کس کے دربار میں کھڑے ہو؟ ادب ہو، جذبۂ محبت اپنی جگہ ہے لیکن محبوب کی عظمت وقدر کے آداب اپنی جگہ ہیں، ان کے ادب کی رعایت رکھنا لازم ہے، یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوجاتی ہے کہ جذبۂ محبت میں کوئی بات کہہ دی گئی، اگرچہ چشم پوشی کر لی جاتی ہے لیکن ہے خلافِ ادب۔

قصۂ حنین

[حدیث:۱۲۲۰] ''عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ.....، إِنَّ قُرَيْشًا حَدِيثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ وَمُصِيبَةٍ وَإِنِّي أَرَدْتُ أَنْ أَجْبُرَهُمْ وَأَتَأَلَّفَهُمْ أَمَا تَرْضَوْنَ أَنْ يَرْجِعَ النَّاسُ بِالدُّنْيَا، وَتَرْجِعُونَ بِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى بُيُوتِكُمْ، قَالُوا بَلٰى، قَالَ لَوْ سَلَكَ النَّاسُ وَادِيًا وَسَلَكَتِ الْأَنْصَارُ شِعْبًا لَسَلَكْتُ وَادِيَ الْأَنْصَارِ أَوْ شِعْبَ الْأَنْصَارِ۔''

(صحیح بخاری ج:۳ص:۲۲۸،حدیث نمبر:۳۹۸۹،باب غَزْوَةِ الطَّائِفِ فِي شَوَّالٍ سَنَةَ ثَمَانٍ قَالَهُ مُوسَى بْنُ عُقْبَةَ،صحیح مسلم ج:۵ص:۲۸۷،حدیث نمبر:۱۷۵۴،باب إِعْطَاءِ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ عَلَى الْإِسْلَامِ وَتَصَبُّرِ مَنْ قَوِيَ إِيمَانُهُ)

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: قریش

کی قوم نئی نئی کفر سے نکلی ہے اور ان پر نئی نئی مصیبت پڑی ہے اور میں نے ارادہ کیا کہ ان کو کچھ انعام دُوں اور ان کی دل جوئی کروں۔ کیا تم لوگ یہ نہیں چاہتے کہ یہ لوگ دُنیا کو لے کر لوٹیں اور تم لوگ اپنے گھروں کو رسول اللہ ﷺ کو لے کر لوٹو، اگر لوگ ایک وادی میں چلیں اور انصار دوسری گھاٹی میں چلیں، تو میں انصار کی گھاٹی میں چلوں گا۔''

تشریح: اس حدیث کا وہ مشہور قصہ ہے کہ جنگ حنین کے موقع پر بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا تھا، اور آنحضرت ﷺ نے بڑی فیاضی کے ساتھ تقسیم فرمایا تھا، لیکن لطف کی بات یہ کہ ان انصار کو کچھ نہیں دیا، سب کچھ ان مکہ والوں کو دے دیا، نوجوانوں کی سمجھ ذرا نوجوان ہوتی ہے، کسی کے دل میں شیطان نے وسوسہ ڈال دیا اور بات کہلوا بھی دی کسی نوجوان کے منہ سے کہ آنحضرت ﷺ پر اپنی قوم کی محبت غالب آ گئی، آپ ان کو دے رہے ہیں اور ہماری تلواروں سے خون ٹپک رہا ہے، ہمیں محروم کر رہے ہیں، بہت لمبا قصہ ہے، صحیح بخاری کے پورے دو ورقوں میں یہ آیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو یہ اطلاع ملی تو انصار کو پیغام بھیجا کہ سارے کے سارے انصار ایک خیمے میں جمع ہو جائیں، ہم ان سے کچھ بات کریں گے، انصار جمع ہو گئے، آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور دریافت فرمایا: انصار کے علاوہ کوئی اور آدمی تو یہاں نہیں ہے؟ مجھے انصار سے بات کرنی ہے کسی اور سے نہیں، کوئی دوسرا غیر نہیں ہونا چاہئے۔ عرض کیا گیا: یہاں اور تو کوئی نہیں البتہ یہاں ہمارا ایک بھانجا ہے، ہے تو دوسری قوم کا لیکن ہمارا بھانجا ہے۔ فرمایا کہ: اس کو رہنے دو۔ ''فَإِنَّ ابْنَ أُخْتِ الْقَوْمِ مِنْهُمْ'' کسی قوم کا بھانجا ان ہی میں سے شمار ہوتا ہے کیونکہ وہ ماں کی قوم ہے۔

اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے پوچھا: اے انصار کی جماعت! یہ کیسی بات ہے جو مجھے تمہاری طرف سے پہنچتی ہے؟ حضرات انصار نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! ہم میں جو معمر، سنجیدہ اور پختہ عمر کے لوگ ہیں انہوں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی، کچھ نوجوانوں نے چھوکروں نے یہ بات کہہ دی ہے، اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے انصار پر جو احسانات تھے وہ ان کو یاد دلائے کہ کیا تم جاہلیت میں نہیں تھے؟ میری وجہ سے اللہ نے تمہیں اس سے نکالا، کیا تم ایسے نہیں تھے؟ کیا تم ایسے نہیں تھے؟ انصار رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے: اللہ اور اللہ کے رسول کا ہم پر احسان ہے، آپ نے فرمایا: تم مجھے جواب کیوں نہیں دیتے؟ کہنے لگے: یا رسول اللہ! آپ کو کیا جواب دیں۔ فرمایا: تم کہو کہ تیری قوم نے دھکے دے کر نکال دیا تھا تو ہم نے پناہ دی تھی، بس پھر کیا تھا کہرام مچ گیا، لوگ تجھے ٹھکانہ نہیں دیتے تھے ہم نے تجھے ٹھکانہ دیا، اپنی بیوی بچّوں کو تجھ پر قربان کیا، اپنی تلواروں کے ساتھ تیری حفاظت کی، تم کہہ سکتے ہو کہو۔ لیکن یہ کون کہتا؟

اس کے بعد ارشاد فرمایا: یہ جو میں قریش کو دے رہا ہوں اس سے تم نے یہ سمجھ لیا کہ مجھے ان سے

زیادہ تعلق ہے، میں ان کو دو وجہ سے دے رہا ہوں، ایک تو یہ کہ ابھی ابھی کفر سے نکل کر آئے ہیں تو ان کی تالیفِ قلب ہوگی اور دوسری بات یہ کہ ابھی ابھی ان پر تازہ مصیبت پڑی ہے مکہ فتح ہوا سارے مفتوح ہوئے، یہ "حَدِيثُ الْعَهْدِ بِالْكُفْرِ" بھی ہیں، جاہلیت سے نکل کر آئے ہیں، اور ابھی ان پر تازہ مصیبت اور افتاد بھی پڑی ہے تو ان کی دل جوئی کے لئے میں ان کو دے رہا ہوں، اس لئے نہیں دے رہا کہ مجھے ان سے زیادہ تعلق ہے۔

اور پھر فرمایا: کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ شام کو یہ لوگ اُونٹ اور بکریاں گھروں کو لے کر جائیں اور تم لوگ رسول اللہ ﷺ کو ساتھ لے کر جاؤ؟ کیا تم اس پر راضی نہیں؟ سب نے بیک آواز کہا: یا رسول اللہ! ہم اس پر راضی ہیں۔ پھر فرمایا: تمہارے ساتھ تو وہ تعلق خاطر ہے، تم سمجھتے ہو کہ مجھے اپنی قوم کی محبت نے مجبور کر دیا، توبہ کرو! تم لوگوں سے تو ایسا تعلق ہے کہ زندگی تمہارے ساتھ گزرے گی اور موت تم میں آئے گی: "لَوْ لَا الْهِجْرَةُ لَكُنْتُ امْرَأً مِنَ الْأَنْصَارِ" (صحیح بخاری ۱۳/ ۲۲۴، ۳۹۸۵، صحیح مسلم، ترمذی ۱۲/ ۴۰۵، ۳۸۳۴) اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں اپنے آپ کو انصاری کہنے میں فخر محسوس کرتا، پھر ارشاد فرمایا کہ تم سے تو ایسا تعلق ہے کہ لوگ ایک راستے پر چلیں، انصار دُوسرے راستے پر چلیں تو میں انصار کے راستے پر چلوں گا۔

یہ عظیم الشان خطبہ تھا، یہ آنحضرت ﷺ کا کمال تھا کہ جس موقع پر جو خطبہ بھی ارشاد فرمایا کسی سے کوئی گفتگو کہنی چاہئے کہ وہ حرفِ آخر تھی۔

حنین کا ایک واقعہ

[حدیث: ۱۲۲۱] "أَنَّ مَرْوَانَ وَالْمِسْوَرَ بْنَ مَخْرَمَةَ أَخْبَرَاهُ......، إِنَّا لَا نَدْرِي مَنْ أَذِنَ مِنْكُمْ مِمَّنْ لَمْ يَأْذَنْ فَارْجِعُوا حَتَّى يَرْفَعَ إِلَيْنَا عُرَفَاؤُكُمْ أَمْرَكُمْ۔"

(صحیح بخاری ج:۸، ص:۱۷۴، حدیث نمبر: ۲۳۵۴، بَاب مَنْ مَلَكَ مِنَ الْعَرَبِ رَقِيقًا فَوَهَبَ وَبَاعَ وَجَامَعَ...)

ترجمہ: "حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ اور مروان بن حکم سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہم نہیں جانتے کہ اس معاملے میں تم لوگوں میں سے کس نے اجازت دی ہے اور کس نے نہیں دی، سو تم واپس لوٹو یہاں تک کہ تمہارے بڑے تمہارا معاملہ پیش کر دیں۔"

تشریح: اس حدیث شریف کا قصہ یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد کفار جمع ہو گئے تھے حنین میں، یہ بنو ہوازن کے کفار تھے، جب ان کو اطلاع پہنچی کہ مکہ مکرمہ محمد ﷺ نے فتح کر لیا ہے تو مکہ چونکہ صدر مقام اور

دارالخلافہ ہے پورے عرب کا، مکہ کے فتح ہو جانے کا معنی تھا کہ پورا عرب فتح ہو گیا، لیکن یہ بنو ہوازن کا قبیلہ یہ لوگ بڑے شدید جنگجو تھے، بلا کے تیر انداز تھے، اور پورے عرب میں ان کی دُھوم تھی، انہوں نے جب یہ جان لیا کہ مکہ فتح ہو گیا تو کہنے لگے کہ یہ مکہ کے چوہدری کیا لڑنا جانیں؟ آنحضرت ﷺ کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ جمع ہو گئے مقام حنین میں، جو طائف کے قریب میں ایک جگہ ہے، قرآن کریم میں بھی اس کا تذکرہ ہے: "وَيَوْمَ حُنَيْنٍ" آنحضرت ﷺ کے ساتھ دس ہزار کا لشکر تو مدینہ سے آیا تھا، اور دو ہزار کے قریب مکہ والے ساتھ ہو گئے، اس سے پہلے کبھی اتنی جمعیت جمع نہیں ہوئی تھی، پھر یہ بنی ہوازن صرف لڑنے والے آدمی نہیں تھے بلکہ انہوں نے اپنا سارا گھر بار جھونک دیا تھا لڑائی میں، اپنی عورتوں کو بچیوں کو حتی کہ اپنی بھیڑ بکریوں کو بھی لے کر آئے تھے، اور جو آنحضرت ﷺ کے آنے کا راستہ تھا وہاں درّوں کے اندر اپنے تیر انداز بٹھا دیئے تھے، جو راستہ آنے کا تھا پہاڑوں کے بیچ میں سے ہو کر گزرتا تھا، اب یہ لشکر جا رہا تھا اور انہوں نے اپنے تیر انداز بٹھائے ہوئے تھے، انہوں نے تیروں کی بارش کر دی اور مسلمانوں کے اس موقع پر قدم اُکھڑ گئے، یہ لمبا قصہ ہے۔

بعد میں حق تعالیٰ شانہٗ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی، وہ لوگ پسپا ہو گئے ان کی عورتیں اور بچے قید ہو گئے اور پورے کا پورا مال مال غنیمت بن گیا، صفوان بن اُمیہ کہتے ہیں یہ مکہ کے تھے اور اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، یہ حضور ﷺ کے ساتھ ہو گئے تھے کفر کی حالت میں۔ کہتے ہیں: اتنا بڑا میدان بکریوں سے بھرا ہوا، اللہ کی شان میں نے اتنی بکریوں کو کبھی دیکھا بھی نہیں تھا، اور اُونٹ اور دوسرے اموال وہ علاوہ ہیں اس کے۔ میں نے حیرت سے کہا تھا کہ اتنا مال اتنے مویشی، فرمانے لگے: تم چاہتے ہو کہ تمہیں مل جائیں؟ چلو یہ تمہاری ہو گئیں، وہ وہیں کہنے لگے: "أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ" یہ فیاضی اور سخاوت کسی بادشاہت کا کام نہیں، نبی کا کام ہے۔ یہ مال غنیمت جمع ہو گیا، بنو ہوازن کے لوگ بھاگ گئے تھے، اپنے مال مویشی اور عورتوں کو چھوڑ کر، بعد میں انہوں نے کہا کہ: ہم نے غلطی کی۔

عربی کا شعر ہے جس کا ترجمہ ہے: جو بکرا چٹان سے سینگ مارتا ہے، چٹان کا تو کچھ نقصان نہیں ہوگا اسی کا سینگ اُکھڑے گا۔ یہ مسکین نبوت سے ٹکرانے لگے اور یہ بنو ہوازن سمجھتے تھے کہ مکہ والوں کو لڑنا نہیں آتا ہم کسر پوری کریں گے، لیکن جب جنگ ہوئی تو وہ شروع میں تو دھوکا دے گئے مسلمانوں کو بے خبری میں، جب ایک چیز پیش آئی تو قدم اُکھڑ گئے، لیکن جب جم کر لڑے تو عقل آئی کہ یہ نبی سے لڑائی کر رہے ہیں، ان کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتے۔

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا ....
ثُمَّ أَنْزَلَ اللهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَأَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ

تَرَوْهَا﴾ (التوبة:۲۶)

ترجمہ: ''جب حنین کے دن تم اُلٹے پاؤں بھاگے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور تمہارے اُوپر سکینہ نازل فرمایا اور ایسے لشکر بھیجے جو تمہیں نظر نہیں آرہے تھے۔''

پھر وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے، میدان صاف تھا، آنحضرت ﷺ نے غنیمتوں کو جمع کرنے کا حکم فرمایا اور مال ودولت کو چھوڑ کر آگے چل پڑے، تقسیم بھی نہیں کیا بلکہ آگے جا کر طائف کا محاصرہ کرلیا، تقریباً چودہ دن تک محاصرہ رہا، وہ بنوثقیف تھے وہ بھی بڑے مضبوط نکلے، طائف کا قلعہ فتح نہیں ہوسکا، آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا: میرا خیال ہے کہ ہم واپس چلے جائیں محاصرہ اُٹھالیں، جوشیلے جوانوں نے کہا کہ: حضور! بڑی بے عزتی کی بات ہے، ہم مکہ فتح کرآئے، ہوازن کو فتح کرآئے، اب اہل طائف کیا کہیں گے؟ فرمایا: ٹھیک ہے، اچھی بات ہے تمہاری خوشی۔

اگلے دن انہوں نے مسلمانوں پر اتنے تیر پھینکے کہ مسلمانوں کا کافی نقصان ہوا، تو جمع ہوکر کہنے لگے: حضور! واپس چلنا چاہئے۔ آپ ﷺ مسکرائے اور فرمایا: بہت اچھا! محاصرہ اُٹھالیا اور واپس چل پڑے، واپس آکر جعرانہ میں بنوہوازن کا مال غنیمت تقسیم کیا اور ابھی مدینہ پہنچے تو طائف کا وفد مسلمان ہوکر حاضر ہوگیا، وہی لوگ جن کا محاصرہ اُٹھایا تھا وہ خود مدینہ آگئے اور مسلمان ہوگے، یہ نبوت ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جنگل میں مال غنیمت کو جمع کرکے رکھ دیا اور تقسیم نہیں کیا، آگے چل پڑے، واپس آئے تو ان بنوہوازن کو عقل آگئی تھی وہ آکر مسلمان ہوگئے، وہی جو ابھی لڑمر رہے تھے آکر مسلمان ہوگئے، اور ساتھ یہ کہنے لگے: یارسول اللہ! اب ہم مسلمان ہوگئے ہیں، اب ہماری بیوی بچے اور ہمارا مال واپس کردیا جائے۔ ارشاد فرمایا: دو چیزیں تو واپس نہیں ہوں گی اُصولی طور پر تو اب واپس ہونے کا سوال ہی نہیں، اگر تم پہلے مسلمان ہوجاتے تو تمہارے جان ومال کا تحفظ ہوتا اب تو وہ مسلمانوں کی ملک ہوچکے ہیں مال تقسیم کیا جاچکا ہے، البتہ تمہارے ساتھ رعایت کرتا ہوں اور اختیار دیتا ہوں کہ دو چیزوں میں سے ایک لے لو، یا اپنے اموال لے لو یا اپنے بیوی بچے واپس لے لو۔ انہوں نے کہا کہ: بیوی بچے واپس کردیجئے۔ فرمایا کہ: اچھا! میرا اور بنوعبدالمطلب کا حصہ تو ابھی سے معاف لیکن چونکہ میں سب کچھ مسلمانوں میں تقسیم کرچکا ہوں اور مالک ہوچکے ہیں اس لئے جب تک ان کی رضامندی معلوم نہ کرلوں اس وقت تک تم سے وعدہ نہیں کرتا۔ کہا: بہت اچھا!

چنانچہ اس حدیث میں اب یہ قصہ ذکر کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور یہ فرمایا: یہ تمہارے بھائی بنوہوازن مسلمان ہوکر آئے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ان کا مال اور ان کے بیوی بچے ان کو واپس کردیئے جائیں، اور میں نے دو میں سے ایک چیز دینے کا ان سے وعدہ کرلیا ہے، ان کی درخواست

یہ ہے کہ ان کے بیوی بچے واپس کر دیئے جائیں تو میں نے اپنا حصہ اور اپنے خاندان کا حصہ تو ان کو دے دیا ہے، تم لوگوں سے درخواست کروں گا کہ یہ تمہارے بھائی بن گئے ہیں، ان کے بیوی بچے ان کو واپس کر دو۔ سب نے بیک زبان کہا: جیسے حضور ارشاد فرماتے ہیں ہم خوش ہیں۔

اس موقع پر یہ بات ارشاد فرمائی جو اس حدیث میں نقل کی ہے: ہمیں معلوم نہیں کہ کس نے خوشی سے اجازت دی ہے اور کس نے یونہی رواروی میں یوں ہی کہہ دیا کہ چلو ہم بھی راضی ہیں، چونکہ یہ ہر شخص کی ملکیت کا معاملہ ہے اس لئے ہم اس پورے مجمع میں ہاتھ کھڑے کرنے کو تسلیم نہیں کرتے، جاؤ اپنے اپنے خیموں میں واپس جاؤ اور ہر ایک قبیلے کا بڑا آ کر ہمیں خبر دے کہ میرے قبیلے کے تمام افراد نے اس کو خوشی سے قبول کرلیا ہے۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا تھا: میں تو ان کے بیوی بچے ان کو واپس کر چکا ہوں، تم میں سے جو ویسے ہی چھوڑنا چاہے چھوڑ دے اور جو مجھ سے معاوضہ لینا چاہے میں معاوضہ دُوں گا، اب معاملہ میرا اور تمہارا ہے، ان کے بیوی بچے واپس ہوں گے، تو تمام صحابہؓ نے فرمایا: ہم بغیر معاوضے کے چھوڑتے ہیں، فرمایا: یوں نہیں، تمہارے ہر قبیلے کے رئیس ہمیں آ کر بتائیں تب ہم مانیں گے۔ چنانچہ تمام قبائل کے رُوساء نے آ کر بتایا کہ سب نے بغیر معاوضے کے حسبۃً للہ (یعنی اللہ تعالیٰ سے ثواب کی اُمید رکھتے ہوئے) چھوڑ رہے ہیں، ایک آدمی بھی معاوضہ لینے والا نہیں۔

مشرکین سے مدد لینا

[حدیث:۱۲۲۲] "عَنْ عَائِشَةَ......، فَلَنْ أَسْتَعِينَ بِمُشْرِكٍ۔"

(صحیح مسلم ج:۹،ص:۳۲۶، حدیث نمبر:۳۳۸۸، باب كَرَاهَةِ الِاسْتِعَانَةِ فِي الْغَزْوِ بِكَافِرٍ)

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہم ہرگز مدد نہیں لیا کرتے کسی مشرک سے۔"

تشریح: اس حدیث میں بھی ایک قصہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ بدر میں تشریف لے جارہے تھے، ایک شخص آ کر کہنے لگا: مجھے بھی اجازت دیں میں بھی آپ کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں جہاد میں! فرمایا: تم مسلمان ہو؟ کہنے لگا: میں مسلمان نہیں ہوں لیکن آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ اس پر فرمایا: "إِنَّا لَا نَسْتَعِينُ، وَفِي رِوَايَةٍ: إِنَّا لَنْ نَسْتَعِينَ بِمُشْرِكٍ" ہم مشرکوں سے مدد نہیں لیا کرتے جاؤ۔

یہاں یہ بات رکھنی چاہئے کہ مشرک یا کافر سے مدد لینے کی مثالیں موجود ہیں، صحابہ کرام نے رُوم، شام، عراق، فارس اور دوسرے علاقے جو فتح کئے تو اس میں وہاں کے لوگوں سے مدد لی ہے، ان سے راستے پوچھے اور ان کو اپنے ساتھ ملایا، اس کی اور بھی مثالیں ہیں۔ اور اسی طرح جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوازن سے

جنگ کرنے کے لئے تشریف لے گئے تھے تو صفوان بن اُمیہ سے ہتھیار لئے تھے، یہ مکہ کے سردار اور سیٹھ تھے، ان سے فرمایا: ہمیں ہتھیار دے دو! یہ ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، کہنے لگے: مکہ کے حاکم ہو گئے ہو، ہم سے زبردستی ہتھیار لینا چاہتے ہو؟ فرمایا: نہیں، زبردستی نہیں لینا چاہتا، عاریت کے طور پر لینا چاہتا ہوں، مانگنے کے طور پر لینا چاہتا ہوں، یہ واپس کئے جائیں گے، اور اگر کوئی نقصان ہو گا تو وہ بھی بھر دیں گے، کہنے لگے: ٹھیک ہے! تو علماء فرماتے ہیں کہ مشرک کی ذات سے تو فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، یہ مکروہ ہے لیکن اگر کبھی مصلحت کے طور پر ایک لشکر قوم کو ملا کر دوسری مشرک قوم سے لڑنا ہو تو اس کی اجازت ہے۔ اور اسی طرح کبھی ضرورت پیش آئے تو مشرکوں سے اسلحہ لیا جا سکتا ہے، مثلاً امریکہ بہادر سے۔

اور اگر مشرک ایسا ہے کہ وہ راستہ جانتا ہے تو اس سے رہنمائی کا کام لیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ لائق اعتماد ہو، اور لائق اعتماد وہ اس لئے ہو جاتے تھے کہ وہ کہتے تھے: تم میرے بیوی بچوں کی حفاظت کرو، میں تمہیں پتا بتا دیتا ہوں۔ ان کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کا سیلاب آرہا ہے سب کچھ بہا کر لے جائے گا، تو اپنے بیوی بچوں کی امان حاصل کرنے کے لئے وہ صحابہ کو راستے بتاتے تھے اور صحابہ ان پر اعتماد کرتے تھے۔

صلح حدیبیہ

[حدیث:۱۲۲۳] ”عَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ وَمَرْوَانَ......، إِنَّا لَمْ نَجِئْ لِقِتَالِ أَحَدٍ وَلٰكِنَّا جِئْنَا مُعْتَمِرِينَ، وَإِنَّ قُرَيْشًا قَدْ نَهِكَتْهُمُ الْحَرْبُ وَأَضَرَّتْ بِهِمْ، فَإِنْ شَاءُوا مَادَدْتُهُمْ مُدَّةً وَيُخَلُّوا بَيْنِي وَبَيْنَ النَّاسِ، فَإِنْ أَظْهَرْ فَإِنْ شَاءُوا أَنْ يَدْخُلُوا فِيمَا دَخَلَ فِيهِ النَّاسُ فَعَلُوا وَإِلَّا فَقَدْ جَمُّوا، وَإِنْ هُمْ أَبَوْا فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَأُقَاتِلَنَّهُمْ عَلٰى أَمْرِي هٰذَا حَتّٰى تَنْفَرِدَ سَالِفَتِي وَلَيُنْفِذَنَّ اللّٰهُ أَمْرَهُ۔“

(صحیح بخاری ج:۹،ص:۲۵۶، حدیث نمبر:۲۵۲۹، باب الشُّرُوطِ فِي الْجِهَادِ وَالْمُصَالَحَةِ مَعَ أَهْلِ......)

ترجمہ: ”حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ اور حضرت مروان بن الحکم سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک ہم نہیں آئے کسی سے لڑنے کے لئے بلکہ ہم آئے ہیں عمرہ کرنے کے لئے، قریش کو لڑائی نے چور چور کر دیا اور ان کو نقصان پہنچایا ہے، اگر وہ چاہیں تو ایک مدت تک کے لئے ہم سے صلح کر لیں اور مجھے بیت اللہ شریف جانے دیں، پھر اگر میں غالب آ گیا تو اگر وہ چاہیں تو وہ بھی اس میں داخل ہو جائیں جس میں لوگ داخل ہوئے ہیں، ورنہ کم از کم وہ سستا لیں گے اور اگر ان کو انکار ہے تو قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے! میں ان سے اس معاملے میں لڑتا رہوں

گا یہاں تک کہ میری گردن تن سے جدا ہو جائے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو نافذ کر کے چھوڑے۔“

تشریح: آنحضرت ﷺ ہجرت کے چھٹے سال ذی القعدہ میں عمرے کے ارادے سے تشریف لے گئے تھے اور پھر وہاں سے حدیبیہ پہنچے، جو کہ مکہ مکرمہ سے کچھ فاصلے پر ایک جگہ ہے، وہاں معلوم ہوا کہ کافر مقابلے کے لئے آئے ہوئے ہیں اور وہ روکنا چاہتے ہیں، اس سلسلے میں سفارتیں چلتی رہیں، گفتگو ہوتی رہی، بالآخر صلح ہوگئی، تو اس حدیث میں جو الفاظ مذکور ہیں یہ بدیل بن ورقہ کے جواب میں ہیں، یہ قبیلہ بنو خزاعہ کا سردار تھا، یہ آنحضرت ﷺ کا حلیف تھا اور پہلے بھی آپ کا خیر خواہ تھا، یہ کفار قریش کا پیغام لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ اور اس نے آ کر کہا: قریش نے بہت سے آدمی جمع کر رکھے ہیں اور قبائل کو دعوت دے دی تو ان سے لڑائی کرنا بڑا اخطرناک ہوگا۔

اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہم کسی سے لڑنے بھڑنے نہیں آئے، ہمیں اللہ کا گھر کا راستہ چاہئے، ہم جائیں، عمرہ کریں اور واپس چلے جائیں لیکن قریش کے سر پر لڑائی کا سودا سوار ہے، آنحضرت ﷺ نے بطور نصیحت بدیل سے کہا کہ ان کو جا کر پیغام دے دو، ”وَإِنَّ قُرَيْشًا قَدْ نَهِكَتْهُمُ الْحَرْبُ وَأَضَرَّتْ بِهِمْ“ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۹/۲۱۹، درمنثور ۹/۲۲۵، طبرانی ۱۴/۳۹۴، ۱۶۴۴۵) قریش کو لڑائی نے چور چور کر دیا ہے اور نقصان پہنچا دیا ہے یہ بے چارے لڑ لڑ کر عاجز آ چکے ہیں تو کیا بہتر نہیں ہوگا کہ وہ میرے ساتھ صلح کر لیں؟ میں ان کے لئے ایک مدت مقرر کر دیتا ہوں کہ اس مدت میں وہ ہم سے اور ہم ان سے نہیں لڑیں گے، اس مدت کے دوران اگر میں دیگر لوگوں پر غالب آ جاؤں تو میرے اور ان کے درمیان وہ تخلیہ کر دیں، قریش راستے سے ہٹ جائیں، اگر میں عرب پر غالب آ جاؤں تو جس دین میں دوسرے لوگ داخل ہوئے اگر ان کا جی چاہے تو یہ بھی داخل ہو جائیں اور خدانخواستہ دوسری شکل ہوئی کہ میں مغلوب ہو گیا اور دوسرے لوگ غالب آ گئے یا یہ کہ کچھ بھی نہ ہوا نہ میں غالب نہ وہ غالب تو تب بھی اتنی مدت میں قریش آرام کر لیں گے، اس کے بعد ان کا جی چاہے تو پھر لڑ لیں، تو میں ان کے اور اپنے درمیان ایک مدت مقرر کر لیتا ہوں لوگ جانیں اور ہم جانیں، اور یہ اپنے گھر آرام سے بیٹھیں، ستائیں، قوت اچھی طرح جمع کر لیں، اب تو بے چارے لڑ لڑ کر چور ہو گئے ہیں۔

اور میں انہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! میں اپنے اس دین کی خاطر ان سے لڑوں گا یہاں تک کہ میری گردن میرے تن سے جدا ہو جائے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کو غالب کرے، جب تک میرا دین غالب نہیں آ جاتا میں اپنے لڑنے سے باز نہیں رہوں گا، اب میں انہی کے فائدے کے لئے کہہ رہا ہوں کہ ذرا ستا لیں، مجھے لڑنے سے انکار نہیں لیکن اس وقت ہماری آمد لڑائی

بھڑائی کے لئے نہیں ہے، ہم صرف عمرے کے لئے آئے ہیں، وہ بلا وجہ بیچ میں حائل ہوتے ہیں، بدیل بن ورقہ نے جا کر یہ بات قریش کے سامنے نقل کی اور پہلے یہ کہا: اگر آپ لوگ چاہیں تو میں آپ کو ان کا پیغام دُوں، اور اگر نہ چاہیں تو آپ کی خوشی ہے، تو ان کے نوجوان چھوکرے کہنے لگے: ہمیں سننے کی ضرورت نہیں، آپ اپنے پاس رکھیں لیکن بڑی عمر کے سمجھ دار کہنے لگے کہ: بھائی ان کا پیغام سن تو لو، کیا کہتے ہیں؟ یہ کیا عقل کی بات ہے کہ ہم اس کا پیغام ہی نہیں سننا چاہتے، پیغام تو سن لو، پھر جی چاہے تو قبول کرنا جی نہ چاہے تو قبول نہ کرنا، جواب دینا تمہارا کام۔

پھر کہا: بتاؤ وہ کیا کہتے ہیں؟ اس پر بدیل نے کہا: وہ کہتے ہیں کہ ہم عمرے کے لئے آئے ہیں لڑائی کے لئے نہیں آئے ہیں، ہمیں بیت اللہ جانے دو، اور یہ تو ایک فوری بات ہے اور طویل المیعاد منصوبہ یہ ہے کہ ہم ایک مدت تک کے لئے صلح کرلیں کہ آپس میں جنگ بندی کا معاہدہ کرلیں، لڑائی نہیں کریں گے اور مجھے اپنا کام کرنے دیں، دوسرے لوگوں سے مقابلے کرنے دیں، اگر میں ان پر غالب آگیا اور لوگ دین میں داخل ہوگئے تو پھر ان کا جی چاہے تو یہ بھی داخل ہوجائیں، نہ چاہے تو جتنی مدت طے کی جائے اتنی مدت میں یہ اپنی قوت مجتمع کرلیں اور تازہ دم ہوجائیں پھر خوب شوق سے لڑیں اور میں کبھی ان سے لڑائی میں نہیں کتراؤں گا، بخدا جس کے قبضے میں میری جان ہے! میں ان سے برابر لڑتا رہوں گا یہاں تک کہ میری گردن بدن سے جدا ہوجائے، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس دین کو نافذ کردے۔ انہوں نے یہ پیغام دیا۔

یہ پیغام سن کر قریش پر سناٹا چھا گیا، عجیب وغریب پیغام تھا، عروہ بن مسعود ثقفی جو طائف کے رئیس تھے وہ کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے: کیا یہ بات نہیں کہ میری حیثیت والد کی طرح ہے اور تمہاری حیثیت بچوں کی سی ہے؟ کہا: ٹھیک کہتے ہیں! تو کہنے لگے: کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں ان سے بات چیت کرکے آؤں؟ کہنے لگے: ضرور شوق سے جاؤ! اب یہ چلے گئے اور آکر آنحضرت ﷺ سے کہنے لگے، یہ بعد میں مسلمان ہوگئے تھے اور قوم نے ان کو شہید کردیا تھا، کہنے لگے: محمد! ایک بات کرتا ہوں، تمہارا اور قریش کا مقابلہ ہوجائے اور ہم فرض کرلیں کہ آپ ان پر غالب آجائیں اور آپ ان کو تہس نہس کرڈالیں تو دُنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا آدمی ہے جس نے اپنی قوم کو تباہ کردیا ہو؟ اور اگر دُوسری شکل ہوگئی یعنی مقابلہ ہوا اور قریش مقابلے میں ڈٹ گئے تو وہ تو تم جانتے ہو کہ تمہاری قوم ہے، یہ جو تم نے بھانت بھانت کی لکڑیاں جمع کی ہوئی ہیں یہ تو مجھے لگتا ہے کہ بھاگ کھڑے ہوں گے اور تم اکیلے رہ جاؤ گے یعنی وہ عروہ چال بازی سے کام لے رہا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب یہ اس کا یہ فقرہ سنا تو اس کو برا بھلا کہا: تو لات کی شرمگاہ کو چاٹ! کیا ہم رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں، تجھے ایسی بات کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ عروہ نے کہا: یہ کون صاحب ہیں؟ کہا گیا: یہ ابوبکر ہیں! کہنے لگے: ابوبکر تمہارے میرے اُوپر احسانات ہیں جن کا میں

بدلہ نہیں دے سکا، ورنہ میں بھی اس گالی کا جواب گالی کے ساتھ دیتا۔ اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے پاس تلوار لئے کھڑے تھے پہرہ دے رہے تھے، یہ عروہ عرب کے دستور کے موافق بار بار آپ ﷺ کی ریش مبارک کو بات کرتے ہوئے ہاتھ لگاتا تھا، انہوں نے تلوار کا دستہ مارا اور کہا کہ اپنے ناپاک ہاتھوں کو ایک طرف کرو، گندے آدمی! عروہ بہت دانا آدمی تھا، بڑی متانت سے کہنے لگے: یہ کون صاحب ہیں؟ کہا: یہ مغیرہ بن شعبہ ہیں، کہنے لگے: او غدار! ابھی تیری دیت بھر رہا ہوں یہ کسی کو قتل کر کے بھاگ آئے تھے اور عروہ نے اس کی دِیت اپنے ذمے لی تھی۔

بہر کیف! یہ واپس آگئے اور قریش کے سامنے تقریر کی، ان کی مشہور تقریر ہے اور کہا کہ: اے میری قوم! میں قیصر کے دربار میں گیا ہوں، کسریٰ کے دربار میں گیا ہوں، شاہِ مصر کے دربار میں گیا، شاہ حبشہ کے دربار میں گیا ہوں، میں نے کسی بادشاہ کے درباریوں کو اس کی ایسی عزت کرتے ہوئے نہیں دیکھا جیسا کہ محمد ﷺ کے صحابی ان کی عزت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی قسم! جب وہ تھوکتے تھے تو کسی کے ہاتھ پر گرتا ہے تو وہ اس کو اپنے منہ پر مل لیتا ہے، بلغم بھی نیچے گرنے نہیں دیتے اور جب وہ وضو کرتے ہیں تو لوگ ان کے وضو کے پانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں، جو ان کے بدن پر پانی لگے وہ اس کو زمین پر نہیں گرنے دیتے، اور جب محمد ﷺ بات کرتے ہیں تو ایسا سناٹا ہوتا ہے کہ گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں، ذرا بھی حرکت نہیں کرتے، لگتا ہے کہ یہ انسان نہیں پتھر کی مورتیاں ہیں اور وہ عمرہ کرنے آئے ہیں تم سے لڑنے کے لئے نہیں آئے ہیں، اگر میری مانو تو ان کو آنے دو تمہیں کچھ نہیں کہیں گے اور اگر یہ نہیں تو ان سے صلح کر لو ورنہ ان کے ساتھ جو لوگ ہیں وہ کٹ کے مر تو جائیں گے مگر اپنی جگہ سے ہٹیں گے نہیں اور یہاں آکر تمہارے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔

ان کی تقریر سن کر قریش ڈھیلے ہو گئے اور حضرت سہیل بن عمرو کو کافروں نے بھیجا اپنا نمائندہ بنا کر۔ جب آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا کہ سہیل آرہے ہیں تو فرمایا: تمہارا معاملہ سہل ہو گیا، انہوں نے صلح کی پیش کش کی، آپ ﷺ نے منظور فرمائی، مشہور شرائط ہیں، دس سال جنگ بندی کی صلح ہوئی تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ مکہ والوں کا کوئی آدمی آنحضرت ﷺ کے پاس جائے گا تو آپ کو واپس کرنا ہوگا اور مدینہ والوں کا کوئی آدمی مکہ آنا چاہے تو ہم اس کو واپس نہیں کریں گے اور اس سال مسلمان واپس چلے جائیں اگلے سال واپس آکر عمرہ کریں، مکہ میں تین دن ٹھہریں اور ہتھیار بند رکھیں، مسلح ہو کر نہ آئیں وغیرہ۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! آج تم جو شرطیں بھی لگاؤ گے مان لوں گا۔

معاملات طے ہو گئے، صحابہ بہت غضب میں تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، صلح نامے لکھنے لگے، حضرت علی رضی اللہ عنہ لکھ رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا لکھو: "هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ وَسُهَيْلُ بْنُ عَمْرٍو" یہ وہ تحریر ہے جس پر محمد ﷺ اور سہیل بن عمرو نے اتفاق کیا ہے، وہ کہنے لگے: "یہ محمد رسول اللہ"

آپ کیا لکھوار ہے ہیں؟ صلح نامہ، اس کی تحریر اور اس کے تمام الفاظ متفق علیہ ہونے چاہئیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان متفق ہوں، یہ لکھو: "هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ" (متفق علیہ، بخاری ۹/ ۲۰۴، ۲۵۰۱، مسند احمد بن حنبل ۸ ۳/ ۷۹، ۱۷۸۹۲) اگر آپ کو رسول اللہ ﷺ مانتے تو لڑائی کیوں کرتے اور صلح کی ضرورت کیوں پیش آتی؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میں اللہ کا رسول بھی ہوں اور ابن عبد اللہ بھی ہوں اگرچہ تم انکار کرو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ جو لکھ رہے تھے ان سے فرمایا: چلو لکھو! انہوں نے کہا: میں تو اللہ کی قسم! یہ نہیں مٹاؤں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے بتاؤں کہاں ہے؟ پھر خود اپنے دست مبارک سے اس کو مٹا دیا، اور فرمایا: یہاں محمد بن عبد اللہ لکھو۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ہمیں سہیل بن عمرو کے معاملے پر بہت غصہ آرہا تھا، فرماتے ہیں: ہم لوگ جلدی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ جلدی نہیں کرتے۔ انہی سہیل بن عمرو کو میں نے حجۃ الوداع کے موقع پر دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی رکاب پکڑ کر چل رہے ہیں۔

اور یہی سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ تھے جو شام میں جا کر لڑے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے انہوں نے درخواست کی تھی کہ ہمیں جہاد کے لئے بھیجا جائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان کو نہ بھیجئے! وہ تو شمشیر برہنہ تھے، فرمانے لگے: یہ لوگ قابل اعتماد نہیں ہیں، یہ ابوسفیان مکہ کا چوہدری اور سہیل بن عمرو مکہ سے چل کر مدینہ آئے ہیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ درخواست لے کر کہ ہمیں جہاد میں بھیجئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اڑ گئے کہ یہ لوگ کہاں قابل اعتماد ہیں؟ فتح مکہ کے دن تو یہ مسلمان ہوئے ہیں، تو اس موقع پر ابوسفیان اور سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اے عمر! ہم اپنی غلطی تسلیم کرتے ہیں، ہم بہت بعد میں آئے، ساری عمر لڑتے رہے اور بہت دیر کر کے آئے، یہ ہماری کوتاہی ہے اور ہمیں اپنی اس کوتاہی کا اعتراف ہے، تم لوگوں کو اللہ نے فضیلت عطا فرمائی ہے، تم لوگ سابقین اوّلین میں داخل ہو گئے، ہمیں اس کا اقرار ہے لیکن اب اگر ہم اپنے بعد میں آنے کی تلافی کرنا چاہیں تو خدا کے لئے ہمیں اس سے تو محروم نہ کرو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے جو بات کہی میں اس سے شرمندہ ہوں معذرت چاہتا ہوں، ان کو بھیجئے۔ پھر ان کو شام بھیجا گیا۔

واقعہ حدیبیہ

[حدیث: ۱۲۲۴] "عَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ ......، إِنَّ خَالِدَ بْنَ الْوَلِيدِ بِالْغَمِيمِ فِي خَيْلٍ لِقُرَيْشٍ طَلِيعَةً فَخُذُوا ذَاتَ الْيَمِينِ (قَالَهُ زَمَنَ الْحُدَيْبِيَةِ)۔"

(صحیح بخاری ج: ۹، ص: ۲۵۶، حدیث نمبر: ۲۵۲۹، بَابُ الشُّرُوطِ فِي الْجِهَادِ وَالْمُصَالَحَةِ مَعَ أَهْلِ ......)

ترجمہ: "حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد

فرمایا: خالد بن ولید غمیم میں ہے، قریش کے ایک چھوٹے سے دستے میں جو بطور تفتیش کے آیا ہوا ہے، سوتم دائیں جانب کا راستہ لو، یہ بات آنحضرت ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر ارشاد فرمائی تھی۔''

تشریح: اس حدیث میں حدیبیہ کا واقعہ ذکر کیا ہے، سن ۶ھ ذیقعدہ کے مہینے میں آنحضرت ﷺ عمرے کے ارادے سے تشریف لے گئے تھے اور یہ خیال تھا کہ چپکے سے مکہ مکرمہ میں داخل ہو جائیں ان کو پتا ہی نہ چلنے دیں لیکن قریش کو اس کی اطلاع ہو گئی تھی اور انہوں نے ایک تفتیشی دستہ حضرت خالد بن ولید کی قیادت میں جو کہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے آگے بھیج دیا، اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: خالد بن ولید قریش کے ایک دستے کے امیر ہو کر تمہارے حالات کا جائزہ لینے کے لئے آیا ہوا ہے، اس لئے تم مکہ میں داخل نہ ہو بلکہ دائیں جانب کا راستہ اختیار کرو اور حدیبیہ میں پڑاؤ کرو۔

چنانچہ حدیبیہ میں پڑاؤ ہوا، آنحضرت ﷺ کا اس فوجی دستے کے ساتھ مقابلہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن آپ نہیں چاہتے تھے، اس لئے آپ نے ان کے مقابلے میں آنے کے بجائے ارشاد فرمایا: دائیں ہاتھ کا راستہ لو اور حدیبیہ میں اُتر جاؤ۔ چنانچہ پھر صلح حدیبیہ کا مشہور قصہ پیش آیا اور جانبین سے شرائط طے کی گئیں، لمبا قصہ ہے صحیح بخاری کے تین صفحوں میں آیا ہے، صلح ہو گئی تو اسی کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝﴾ (الفتح) ہم نے آپ کو فتح مبین عطا فرمائی ہے۔

یہ حدیبیہ کا واقعہ ذیقعدہ سن ۶ھ کا ہے، اگلے سال آپ ﷺ نے ذیقعدہ سن ۷ھ میں عمرۃ القضاء کیا، یعنی یہ عمرہ جو یہاں توڑ دیا تھا اس کی قضاء اگلے سال کی، اور اس سے اگلے سال رمضان میں سن ۸ھ میں مکہ فتح ہو گیا، وہی قریش جو آنحضرت ﷺ کو عمرے کے لئے بھی نہیں آنے دیتے تھے سارے کے سارے بے بس کھڑے تھے آپ کے سامنے، اور یہ خالد بن ولید جو قریش کا طلیعہ (جاسوس) بن کے آئے تھے، اسی صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہوئے۔

حضرت خالد بن ولید اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما یہ اسلام کے دونوں جرنیل اسی موقع پر آ کر مسلمان ہوئے تھے، ایک دن دونوں تنہائی میں ایک دوسرے سے ملے، دونوں سورما بہادر تھے، ایک نے دوسرے سے کہا: یار ایک بات کرنا چاہتا ہوں اگر تم برا نہ مناؤ! کہا کہ: کرو، یہاں بس ہم دونوں ہیں۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ محمد ﷺ کا مقابلہ کر کے ہم تھک گئے، لیکن ہم سے مٹ نہیں سکے نہ مٹائے جا سکتے ہیں، اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہ سچے ہیں اور میرا جی چاہتا ہے کہ جا کر ان کی بیعت کر لوں، دوسرے نے کہا: قسم کھا کر کہتے ہو یہ بات؟ دُوسرے نے کہا: ہاں اللہ کی قسم! بالکل یہی خیالات میرے بھی ہیں۔

چنانچہ دونوں اکٹھے ہی گئے اور جا کر مسلمان ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ کو ان دونوں کے آنے کی

بہت خوشی ہوئی، خالد تو خالد ہیں، عمرو بن عاص زیادہ مشہور نہیں ہیں، یہ فاتح مصر ہیں، یہ اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ جس دن میں مسلمان ہوا اسی دن ایک دستے کا امیر بنا کر مجھے بھیجا اور اس دن کے بعد کوئی فوجی دستہ آپ نے نہیں بھیجا جس میں مجھے امیر نہ بنایا ہو، بسا اوقات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما بھی ان کی قیادت میں ہوتے تھے، فرماتے ہیں کہ ایک دن مجھے کیا وہم ہوا کہ ابوبکر اور عمر میری جماعت میں ہیں اور میں ان کا امیر ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ: "مَنْ أَحَبُّ النَّاسِ إِلَيْکَ؟" اے اللہ کے رسول! آپ کو سب سے زیادہ محبوب کون آدمی ہے؟ فرمایا: ابوبکر! اُمیر ان کو بنا رہے ہیں اس لئے کہ اسلام کے جرنیل تیار کرنے تھے، اور ان کو ان کے ماتحت کر رہے ہیں تاکہ معلوم کیا جاسکے کہ ماتحتوں کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جاتا ہے، جب ان کا اتنا اکرام فرمایا کہ ان کو یہ وہم ہونے لگا کہ شاید ساری دنیا میں سب سے قریب شاید میں ہوں، سب سے زیادہ محبوب میں ہوں۔ اور خالد تو خالد تھے، ان کو "سیف اللہ" کا لقب دیا تھا، اللہ کی تلوار، اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بدن مبارک پر ایک انچ جگہ بھی ایسی نہ تھی جہاں تلوار یا نیزے کا زخم نہ ہو، لیکن میدان معرکہ میں شہید نہ ہوئے بلکہ اپنے بستر پر انتقال فرمایا۔

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "سیف اللہ" کا لقب دیا تھا، اگر شہید ہو جاتے تو اللہ کی تلوار ٹوٹ جاتی، یہ شہید ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ اَسّی جنگیں لڑیں، اَسّی معرکوں میں شریک ہوئے، اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ صرف پانچ آدمی لے کر گئے، مقابلے میں پوری فوج۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر پابندی لگا دی تھی ان کو اُمیر نہ بنایا جائے، یہ مسلمانوں کو مصیبت میں مبتلا کر دیں گے، حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ جو پہلے ان کے ماتحت تھے، حضرت عمر نے ان کو اُمیر بنا دیا تھا اور ان کو ماتحت کر دیا تھا، مقابلے میں پانچ لاکھ فوج تھی، خالد نے ابوعبیدہ کو بلایا اور فرمایا: بس دس آدمی دے دیجئے! فرمایا کہ بس دس آدمی دے دیجئے پانچ لاکھ کی فوج کے مقابلے میں۔

حضرت ابوعبیدہ بہت نرم مزاج تھے لیکن اس موقع پر بہت ناراض ہوئے، کہنے لگے: خالد! تم مسلمانوں کو مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتے ہو؟ پانچ لاکھ کے مقابلے میں صرف دس آدمی!۔ فرمایا کہ: حضور! پھر جتنے آپ مناسب سمجھیں اتنے دے دیں، فرمایا: تم بتاؤ کتنے دیں؟ تو کہا: اگر آپ بہت دینا ہی چاہتے ہیں تو ساٹھ آدمی دے دیجئے، کہا: چن لو جن کو چننا ہے، صرف ساٹھ آدمی پانچ لاکھ کے مقابلے میں گئے اور اللہ کے فضل سے ان کو شکست دی، یہ اللہ کی تلوار تھی۔

اہلِ بدر کا مقام

[حدیث: ۱۲۲۵] "سَمِعْتُ عَلِيًّا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ......، إِنَّهُ قَدْ شَهِدَ بَدْرًا وَمَا

يُدْرِيكَ لَعَلَّ اللهَ أَنْ يَكُونَ قَدْ اطَّلَعَ عَلٰى أَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ، يَعْنِي حَاطِبَ بْنَ أَبِي بَلْتَعَةَ۔"

(صحیح بخاری ج:۱۰، ص:۱۹۴، حدیث نمبر:۲۷۸۵، باب الْجَاسُوسِ وَقَوْلِ اللهِ تَعَالٰى {لَا تَتَّخِذُوا......)

ترجمہ: "حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ شخص جنگ بدر میں حاضر ہوا ہے اور تجھ کو کیا خبر کہ شاید اللہ تعالیٰ نے جھانک کر دیکھ لیا ہے اہل بدر کو، پس ان سے فرما ہی دیا ہے کہ: تم کرو جو کچھ چاہو، میں نے تمہاری بخشش کر دی۔ یعنی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ۔"

تشریح: اس حدیث میں مشہور قصہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب فتح مکہ کیلئے تشریف لے جا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بتایا نہیں، عام طور پر لوگوں میں چرچا نہیں کیا، کیونکہ ارادہ مبارک یہ تھا کہ اچانک مکہ پہنچ جائیں، مکہ والوں کو تیاری کا موقع نہ دیں، مقصد یہ تھا کہ خونریزی نہ ہو کیونکہ اگر وہ مقابلے پر آئیں گے تو جب یہ لشکر سیلاب کی طرح جائے گا سب کچھ بہا کر لے جائے گا، جتنے آدمی سامنے آئیں گے سب مارے جائیں گے، شفقت کے طور پر چاہتے تھے کہ اہل مکہ تیاری نہ کر پائیں تا کہ ان کو مقابلے کی جرأت نہ ہو اور مارے نہ جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تو فتح مکہ کا فیصلہ کر چکے تھے، حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے اہل مکہ کے نام ایک خط لکھا، اس میں لکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے اُوپر چڑھائی کرنا چاہتے ہیں اپنا بندوبست کرلو۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے اس کی اطلاع ہوئی، آپ نے حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما ان دونوں بزرگوں کو کہا کہ جاؤ! ایک گھاٹی ہے 'خوخ'، وہاں تمہیں ایک اُونٹ پر سوار عورت ملے گی، ادھر اُدھر پانی کے مشکیزے لٹکائے ہوئے ہیں اور اُوپر خود بیٹھی ہے، اس کے پاس ایک خط ہے، جاؤ! اس سے وہ لے کر آؤ۔

یہ دونوں چلے گئے اور ٹھیک وہ جگہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا وہاں عورت جا رہی تھی، مدینہ سے دو تین منزل کا سفر طے کر چکی تھی، انہوں نے کہا: بی بی! تمہارے پاس ایک خط ہے وہ ہمیں دے دو! کہنے لگی: کوئی خط وط میرے پاس نہیں، ان حضرات نے بہت نرمی سے کہا: خط دے دو، ہم وہ خط لینے کے لئے آئے ہیں! لیکن وہ نہ مانی۔ آخر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "وَاللهِ! مَا كَذَبْنَا وَلَا كُذِّبْنَا" اللہ کی قسم! نہ ہم غلط کہتے ہیں نہ ہم سے غلط کہا گیا ہے، خط تیرے پاس ہے تو شرافت سے خط دیدے ورنہ ہم تیرے کپڑے اُتار کر تلاشی لیں گے۔ جب یہ دھمکی دی تو وہ اکیلی عورت اس نے اپنے جوڑے کے اندر سے وہ خط نکال کر دے دیا اور خط کا مضمون یہی تھا۔

جب وہ خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پڑھا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: حاطب! یہ کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال کا تو ابھی جواب آیا نہیں تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور فرمایا: "دَعْنِيْ

يَارَسُوْلَ اللهِ! أَضْرِبْ عُنُقَ هٰذَا الْمُنَافِقِ" یارسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن اُڑادوں۔ اس موقعہ پر یہ حدیث ارشاد فرمائی تھی: عمر! تمہیں معلوم نہیں ہے کہ یہ بدر میں شریک ہوئے ہیں اور تمہیں معلوم ہے کہ شاید کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر میں شریک ہونے والے صحابہ کے دلوں کو ٹھوک کر دیکھ لیا ہے، جھانک کر دیکھ لیا ہے اور ان سے فرمادیا ہے کہ تم جو چاہو کرو میں نے تمہیں بخش دیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ منافق نہیں، منافق جنگ بدر میں شریک ہوتے؟ اس کو تو اللہ تعالیٰ نے ''یوم الفرقان'' فرمایا وہ تو فیصلے کا دن تھا حق اور باطل کے درمیان، ایک طرف حق کا گروہ تھا دُوسری طرف باطل کا، اس حق کے گروہ میں بھی کوئی منافق ہوسکتا تھا۔ اس پر حضرت حاطب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یارسول اللہ! آپ جلدی نہ کیجئے میری بات سن لیجئے، بات یہ ہوئی کہ میرے جتنے بھی مہاجر بھائی ہیں سب کے وہاں مکہ میں اپنے عزیز واقارب ہیں، یہ سب قریشی ہیں، میں مکہ میں باہر کا آدمی تھا، وہاں میرے رشتہ دار نہیں اور میرے اہل وعیال مکہ میں ہیں تو مجھے خیال ہوا کہ میں اہلِ مکہ پر ایک احسان کردوں کہ اس احسان کی رعایت کرتے ہوئے یہ میری بیوی بچوں کی حفاظت کریں، باقی اللہ تعالیٰ جو اپنے نبی کی زبان پر فیصلہ کرچکا وہ تو ہوکر ہی رہے گا، تو نہ میرا خط اس کو ٹال سکتا ہے اور نہ اہل مکہ کو ٹال سکتے ہیں۔ فرمایا: یہ ٹھیک کہتا ہے، ان سے غلطی ہوئی لیکن نیت ان کی صحیح تھی، چونکہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راز وہاں پہنچایا تھا یہ چھوٹی غلطی نہیں تھی، بعد میں اپنے آپ کو خود باندھ دیا ستون کے ساتھ اور جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کھولا اس وقت تک کھلے نہیں۔

اس موقع پر یہ ارشاد فرمایا تھا: اہل بدر کو شاید کہ اللہ تعالیٰ نے جھانک کر دیکھ لیا ہے اور یہ فرمایا ہے: جو چاہے کرو میں نے تمہاری بخشش کردی ہے۔ اہل سنّت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ خلفائے راشدین بالترتیب تمام صحابہ سے افضل ہیں، ان کے بعد عشرہ مبشرہ، ان کے بعد شرکائے بدر، ان کے بعد شرکائے اُحد جو کہ اُحد میں شریک ہوئے، ان کے بعد اصحابِ بیعتِ رضوان، جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (الفتح: ۱۸)

ترجمہ: ''اور بے شک اللہ تعالیٰ راضی ہوگئے ان مؤمنوں سے اے نبی! جب وہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کررہے تھے درخت کے نیچے۔''

ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی تھی۔

لیلۃ التعریس

[حدیث: ۱۲۲۶] ''عَنْ أَبِي قَتَادَةَ ..... إِنَّكُمْ تَسِيْرُوْنَ عَشِيَّتَكُمْ وَلَيْلَتَكُمْ

وَتَأْتُونَ الْمَاءَ إِنْ شَاءَ اللهُ غَدًا (قَالَهُ قَبْلَ لَيْلَةِ التَّعْرِيسِ بِيَوْمٍ)........"

(صحیح مسلم ج:۳،ص:۴۵۱،حدیث نمبر:۱۰۹۹،بَاب قَضَاءِ الصَّلَاةِ الْفَائِتَةِ وَاسْتِحْبَابِ تَعْجِيلِ قَضَائِهَا)

ترجمہ: ''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم چلو گے شام کو اور رات بھر اور کل ان شاء اللہ پانی پر پہنچو گے۔ یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ التعریس سے ایک دن پہلے فرمائی۔''

[حدیث:۱۲۲۷] ''....أَخْبَرَهُ أَنَّ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ ....، إِنَّكُمْ سَتَأْتُونَ غَدًا إِنْ شَاءَ اللهُ عَيْنَ تَبُوكَ وَإِنَّكُمْ لَنْ تَأْتُوهَا حَتَّى يُضْحِيَ النَّهَارُ فَمَنْ جَاءَهَا مِنْكُمْ فَلَا يَمَسَّ مِنْ مَائِهَا شَيْئًا حَتَّى آتِيَ۔''

(صحیح مسلم ج:۱۱،ص:۳۹۰،حدیث نمبر:۴۲۲۹،بَاب فِي مُعْجِزَاتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عنقریب تم پہنچو گے وہاں تک یہاں تک کہ دن چڑھ جائے گا، چاشت کا وقت ہو جائے گا، سو جو شخص کہ تم میں سے اس چشمے پر پہنچے تو اس کے پانی کو ہاتھ نہ لگائے یہاں تک کہ میں نہ آجاؤں۔''

تشریح: ان دونوں حدیثوں میں ہے کہ تبوک سے واپسی پر یا خیبر سے واپسی پر یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے آخری حصے میں ذرا ستانے کے لئے قیام فرمایا پڑاؤ ڈالا، ساری رات چلتے رہے تھے اور ارشاد فرمایا: نماز کا ذمہ کون لیتا ہے؟ صبح میں تھوڑا وقت تھا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: میں جاگتا رہوں گا! فرمایا: ٹھیک ہے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ بھی سفر میں تھے تھکے ہوئے تھے، وہ مشرق کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے، اپنے کجاوے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ اسی میں نیند آگئی، اور آنکھ اس وقت کھلی جب سورج چڑھ آیا تھا، اس واقعے کو لیلۃ التعریس کا واقعہ کہتے ہیں۔

اس سے ایک دن پہلے اس میں یہ ارشاد فرمایا تھا: تم آج ساری رات چلو گے اور اگلے دن پانی پر پہنچو گے ان شاء اللہ، مطلب یہ کہ راستے میں کہیں پانی نہیں ملے گا۔ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ یہ ارشاد سن کر جتنا جس سے ممکن ہو سکا اتنی تیزی سے چلا، کوئی ایک دوسرے کو مڑ کے بھی نہیں دیکھتا تھا تاکہ جلدی سے پہنچ جائیں، خدانخواستہ پیاس سے بے حال ہو گئے تو مشکل پیش آئے گی۔

اسی قسم کا قصہ سفر تبوک میں بھی پیش آیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: راستے میں کہیں پانی نہیں ملے گا، کل تم ان شاء اللہ تبوک کے چشمے پر پہنچ جاؤ گے، اور پہنچو گے چاشت کے وقت دن چڑھے، تو تم میں سے کوئی صاحب مجھ سے پہلے پہنچ جائیں تو پانی کو ہاتھ نہ لگائیں، ہاتھ بھی گیلا نہ کرے جب تک کہ میں نہ

پہنچ جاؤں۔ چنانچہ دو آدمی انہوں نے ایسا کیا کہ یا تو کچھ ایمان کچا ہوگا یا ان کو بات ٹھیک پہنچی نہ ہوگی، آنحضرت ﷺ وہاں پہنچے تو پوچھا: کس نے پانی کو ہاتھ لگایا؟ دو آدمیوں نے کہا: ہم نے ہاتھ لگایا تھا، بہت ناراض ہوئے، وہ چشمہ تھا لیکن اتنا کم پانی کہ بڑی مشکل سے آنحضرت ﷺ نے اس سے وضو فرمایا، اور آنحضرت ﷺ کے اعضائے شریفہ سے جو پانی ٹپکا اس کو ایک برتن میں جمع کیا گیا اس پانی کو دوبارہ چشمے کے اندر ڈال دیا، پھر تو کہنا چاہئے کہ ٹیوب ویل لگ گیا، پھر جتنا لشکر تھا سب سیراب ہوا، نہائے بھی، مویشیوں کو بھی پلایا کیونکہ مویشی بھی کئی دن کے پیاسے تھے اور بعضوں کو سفر میں غسل جنابت کی ضرورت تھی، انہوں نے تیمم کیا ہوا تھا، اب انہوں نے غسل کیا، ویسے بھی نہائے، جتنے قافلے میں پانی کے برتن تھے وہ بھی بھر لئے۔

فتح مکہ

[حدیث:۱۲۲۸] "..... أَتَيْتُ أَبَا سَعِيدِ الْخُدْرِيَّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ......، إِنَّكُمْ قَدْ دَنَوْتُمْ مِنْ عَدُوِّكُمْ وَالْفِطْرُ أَقْوَى لَكُمْ (قَالَهُ حِينَ دَنَى مِنْ مَكَّةَ، قَالَ أَبُو سَعِيدٍ:) ثُمَّ نَزَلْنَا مَنْزِلًا آخَرَ فَقَالَ إِنَّكُمْ مُصَبِّحُو عَدُوِّكُمْ وَالْفِطْرُ أَقْوَى لَكُمْ فَأَفْطِرُوا، وَكَانَتْ عَزْمَةً فَأَفْطَرْنَا، ثُمَّ قَالَ لَقَدْ رَأَيْتُنَا نَصُومُ مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي السَّفَرِ۔"

(صحیح مسلم ج:۵،ص:۷۴۴، حدیث نمبر:۱۸۸۸، باب أجر المفطر في السفر إذا تولى العمل)

ترجمہ: "حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے سفر میں ارشاد فرمایا: بے شک تم اب قریب آگئے ہو اپنے دشمن کے اور روزے کا نہ رکھنا تمہارے لئے زیادہ قوت کا باعث ہوگا، یہ بات آنحضرت ﷺ نے اس وقت ارشاد فرمائی جبکہ مکہ کے قریب پہنچ گئے تھے، حضرت ابوسعید فرماتے ہیں کہ: ہم ایک اور منزل پر اُترے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: بے شک تم صبح کو اپنے دشمن کے سر پر پہنچو گے اور روزے کا افطار کرنا یعنی نہ رکھنا تمہارے واسطے زیادہ طاقت کا باعث ہے، سو تم روزہ چھوڑ دو۔ تو یہ حکم عزم کے طور پر تھا لہٰذا ہم نے روزہ افطار کرلیا، پھر ہم نے اپنے آپ کو دیکھا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ روزہ رکھتے ہیں اس کے بعد سفر میں۔"

تشریح: اس حدیث میں فتح مکہ کا واقعہ ذکر کیا ہے، رمضان المبارک کا مہینہ تھا، تقریباً ۱۰ رمضان کو فتح مکہ کے لئے چلے تھے، اب جہاد بھی کرنا ہے اور شدید گرمی کا موسم ہے اور روزہ بھی ہے، تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: تم دشمن کے مقابلے میں جا رہے ہو، روزہ نہ رکھنا تمہارے لئے زیادہ قوت کا باعث ہوگا اس

لئے روزہ نہ رکھوتو مناسب ہے۔تو بہت سے حضرات نے آپ ﷺ کے اس ارشاد کی تعمیل کی کہ روزے پھر رکھ لیں گے، سفر اور جہاد کی وجہ سے روزے چھوڑ دیئے، اور کچھ حضرات طاقت محسوس کرتے تے تو روزہ رکھتے رہے یہاں تک کہ جب مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ گئے تو وہاں اعلان فرمایا: تم لوگ صبح دُشمن کے سر پر پہنچنے والے ہو لہٰذا افطار کرو، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ حضور ﷺ کا حتمی حکم تھا، اب روزہ رکھنے کی گنجائش نہیں رہی، پہلے تو بطور مشورہ اور شفقت کے فرما رہے تھے لیکن اب حکم دے دیا کہ افطار کرو لہٰذا ہم نے افطار کرلیا۔

جہاں تک یہ بات کہ سفر میں روزہ رکھنا چاہئے یا نہیں؟ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ہم سفر میں حضور اکرم ﷺ کی معیت میں بھی روزہ رکھتے رہے ہیں، یہ افطار کا حکم خاص اسی موقع کے لئے تھا، اور اس مسئلے میں ائمہ کا اختلاف ہوا ہے، بعض حضرات نے فرمایا کہ روزہ رکھنا جائز ہی نہیں افطار کرے کیونکہ اس موقع پر فرمایا تھا کہ: ''لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي السَّفَرِ'' سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں ہے۔ (صحیح مسلم ۵/۷ ۴۳، ۱۸۷۹، ابوداؤد ۶/۷ ۳۴، ۲۰۵۵، نسائی ۷/۱ ۴۴، ۲۲۲۳، ترمذی ۳/۶ ۱۴، ۶۴۴، ابن ماجہ ۵/۱۶۹، ۱۶۵۴)۔

ایک سفر میں کچھ لوگوں کا روزہ تھا کچھ نے روزہ نہیں رکھا تھا، جب شام کو پڑاؤ ڈالا روزے دار بے چارے بے حال ہو گئے، عرب کی گرمی اللہ کی پناہ! اور جن کا روزہ نہیں تھا انہوں نے سواریاں بٹھائیں، کجاوے اُتارے خیمے نصب کئے، پانی پلایا، خدمت کی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: آج تو سارے کا سارا اجر یہ بے روزے دار لے گئے۔تو غرضیکہ بعض حضرات نے تو یوں فرمایا سفر میں روزہ رکھنا جائز ہی نہیں رہے گا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا میلان بھی اسی طرف ہے، وہ کہتے ہیں کہ روزہ رکھے گا تو گناہگار ہوگا۔بعض حضرات نے فرمایا کہ روزہ رکھے یا نہ رکھے دونوں برابر ہے، کسی کو کسی پر فضیلت نہیں، لیکن ہمارے امام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سفر کے اندر روزہ چھوڑ دے اس کی اجازت ہے، رکھ لے تو افضل ہے ہمت وطاقت ہو اور اپنے رُفقاء کے لئے بوجھ اور مسئلہ نہ بنے تو روزہ رکھ لینا بہتر ہے۔

جہاد میں فتح تعداد سے نہیں اللہ کی مدد سے ہوتی ہے

[حدیث: ۱۲۲۹] ''عَنْ حذيفة ....، إِنَّكُمْ لَا تَدْرُونَ لَعَلَّكُمْ أَنْ تُبتلوا......''

(صحیح مسلم ج: ۱، ص: ۷۵ ۳، حدیث نمبر: ۲۱۳، بَابُ الِاسْتِسْرَارِ بِالْإِيمَانِ لِلْخَائِفِ)

ترجمہ: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بے شک تم لوگ نہیں جانتے ہو شاید تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالا جائے۔“

تشریح: اس حدیث کا ایک قصہ ہے کہ ایک دفعہ جہاد میں صحابہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے، تو ارشاد فرمایا: ذرا اندازہ کرو کہ کتنے آدمی ہیں؟ صحابہ کرام نے پوچھا: یارسول اللہ! کیا آپ ہمارے حق میں کوئی اندیشہ رکھتے ہیں؟ چھ سات سو کے قریب ہماری تعداد ہے، چھ سات سو کا لشکر کافروں سے لڑنے چلا تھا، تو کیا آپ ہمارے بارے میں کچھ اندیشہ رکھتے ہیں؟ اللہ کے فضل سے ہماری اتنی بڑی نفری سے اندیشے کی کیا بات ہے؟ اس موقع پر فرمایا: تمہیں کیا خبر ہے شاید کہ تم مبتلا کئے جاؤ۔ چنانچہ یہی ہوا کفار سے مقابلہ ہوا اور اس موقع پر مسلمانوں کو ہزیمت اُٹھانا پڑی، پسپا ہونا پڑا۔

آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے جو بات نکل جاتی تھی وہ تیر قضا بن جاتی تھی، ایک دفعہ چند آدمیوں کو بھیجا جہاد کے لئے، آنحضرت ﷺ نے کچھ ایسے الفاظ فرمائے جن سے ٹپکتا تھا کہ یہ حضرات شہید ہو جائیں گے صریح الفاظ نہیں تھے، ان الفاظ کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یارسول اللہ! کاش! آپ ان سے ہمیں اور نفع اُٹھانے دیتے۔

جنگ موتہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے ملک شام کی نصرانی حکومت کے مقابلے میں لشکر روانہ کیا تھا اس وقت فرمایا: زید بن حارثہ کو اس لشکر کا امیر مقرر کرتا ہوں، اگر وہ شہید ہو جائیں تو جعفر طیار اس کے امیر ہوں گے، اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ اس کے امیر ہوں گے، اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان جس کو چاہیں اپنا امیر مقرر کرلیں، اس موقع پر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: کاش! ہمیں ان صاحبوں سے نفع اُٹھانے کا اور موقع ملتا۔

اگر شہید ہو جائیں، اس کا مطلب یہ کہ یہ تو شہید ہو جائیں گے، یہ بڑی شدت کی جنگ تھی لیکن اس میں رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس شریک نہیں تھے، یہ تین افراد بھیجے تھے، یکے بعد دیگرے امیر بنا کر، اور اسی وجہ سے اس غزوہ کا نام غزوۃ الامراء بھی ہے، امیروں کا غزوہ، جہاد میں امیر ایک ہوتا ہے لیکن یہاں یکے بعد دیگرے تین امیر تھے، وہاں جنگ ہو رہی تھی اور یہاں مدینہ میں آنحضرت ﷺ مسجد نبوی میں جنگ کا نقشہ بتا رہے تھے، اور فرما رہے تھے: زید بن حارثہ بے جگری کے ساتھ لڑے یہاں تک کہ شہید ہو گئے، اس کے بعد جعفر طیار نے لپک کر جھنڈا اُٹھا لیا، انہوں نے جھنڈا اُٹھایا ہوا ہے اور دائیں ہاتھ سے جنگ کر رہے ہیں، دُشمنوں نے ایک ہاتھ کاٹ دیا، جلدی سے دوسرے ہاتھ میں جھنڈا لے لیا، انہوں نے وہ بھی کاٹ دیا تو منہ سے پکڑ لیا، پیچھے سے ایک کافر نے آکر ان کے دو ٹکڑے کر دیئے، ان کا شہید ہونا تھا کہ عبداللہ بن رواحہ آئے اور جھنڈا لے لیا، وہ بھی شہید کر دیئے گئے، لشکر بغیر امیر کے رہ گیا۔

ان کے شہید ہونے پر حضرت خالد بن ولید لپکے اور جھنڈا پکڑ لیا، کہنے لگے جس کو امیر بنانا چاہتے ہو بنالو جھنڈا میرے ہاتھ میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا ان کے بعد مسلمان جس کو چاہیں اپنا امیر بنالیں، سب نے کہا کہ آپ سے بہتر کون ہوگا؟ آنحضرت ﷺ مسجد نبوی میں بیٹھے لوگوں کو بتارہے تھے کہ ان تینوں کے شہید ہونے کے بعد پھر جنڈا اُٹھایا اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے۔ اس دن سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ''سیف اللہ'' کا لقب مل گیا، اب اللہ کی تلوار کیسے ٹوٹتی؟ رسول اللہ ﷺ نے جس کو ''سیف اللہ'' فرمایا ہو وہ اللہ کی تلوار نہیں ٹوٹ سکتی، اسی (۸۰) لڑائیوں میں شرکت کی اور ایک انچ جگہ بھی بدن پر ایسی نہ تھی جہاں زخم کے نشان نہ ہوں لیکن جہاد میں شہید نہیں ہوئے، اپنے بستر پر انتقال ہوا، انتقال کے وقت رو رہے تھے کہ شہادت کی طلب میں اتنے جہادوں میں شریک ہوا اور ایک انچ جگہ بدن میں ایسی نہیں جہاں زخم کا نشان نہ ہو لیکن آج بستر پر مر رہا ہوں۔ علماء فرماتے ہیں کہ یہ شہید ہو ہی نہیں سکتے تھے اس لئے کہ اگر یہ شہید ہو جاتے تو اللہ کی تلوار ٹوٹ جاتی اور اللہ کی تلوار ٹوٹ نہیں سکتی۔

بہرکیف! کہنا یہ چاہتا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی زبان سے جو نکل جاتا تھا پتھر کی لکیر بن جاتا تھا، بطور احتمال کے بھی فرمادیتے تو وہ بھی واقعہ بن کر سامنے آجاتا، یہ نبوت تھی۔ متنبیؔ کہتا ہے کہ: ''وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْأَشْيَاءُ'' کسی چیز کی پہچان ضد سے ہوتی ہے، یہ نبوت تھی کہ جو منہ سے نکل گیا وہ پورا ہوگیا۔

اور غلام احمد قادیانی نے آتھم کے مقابلے میں یہ کہا تھا کہ آتھم پندرہ مہینے کے اندر مرجائے گا، خدا کی قسم! زمین و آسمان ٹل جائیں گے لیکن یہ بات نہیں ٹلے گی۔ اور یہ اس کی کتاب ''جنگ مقدس'' کے آخری صفحے کی عبارت ہے: ہنسنے کی جگہ، اگر میں جھوٹا ہوں تو میرے لئے سولی تیار رکھو اور تمام شیطانوں اور بدکاروں اور لعنتیوں سے بڑھ کر لعنتی سمجھو یعنی پندرہ مہینے میں نہ مرا تو اس سے بڑھ کر کوئی لعنتی نہیں۔

اب اس سے بڑھ کر قسم کے الفاظ ہو سکتے ہیں؟ ''خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ'' اللہ نے مرزائیوں کے دلوں پر مہر لگادی ہے، اتنی بات بھی ان کی عقل میں نہیں آتی، اس کی بھی تاویل کرتے ہیں کہ آتھم ڈر گیا تھا، وہ کہتا ہے کہ میں نہیں ڈرا، یہ کہتا ہے نہیں تو ڈرا تھا۔ پھر کہا: اچھا قسم کھا کہ تو نہیں ڈرا تھا۔ ان عیسائیوں کے نزدیک قسم کھانا گناہ ہے، ایسا ہی جیسے مسلمان سے کہا جائے کہ خنزیر کھا۔ چلو قسم بھی کھالیتا، تو کہنے لگا: قسم کھا اگر تو قسم میں جھوٹا نکلا تو ایک سال کے اندر اندر تو مرجائے گا۔ ایک سال بھی مزید گزر گیا، ایسا فریبی تھا، یہ تو خالص فراڈ ہے، اس کو نبوت کہتے ہیں۔؟

اساریٰ بدر کا مشورہ

[حدیث:۱۲۳۰] ''حَدَّثَنَا أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ......، وَاللّٰهِ لَا تَذَرُوْنَ مِنْهُ

دِرْهَمًا (يَعْنِي مِنْ فِدَاءِ الْعَبَّاسِ)۔"

(صحيح بخاری ج: ۱۲، ص: ۴۰۹، حدیث نمبر: ۳۷۱۴، باب شُهُودِ الْمَلَائِكَةِ بَدْرًا)

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں، اللہ کی قسم! ایک درہم بھی اس میں سے نہ چھوڑو، یعنی حضرت عباس کے فدیے میں سے۔''

تشریح: اس حدیث شریف میں بھی ایک قصہ ہے، جنگ بدر میں کافر مارے گئے تھے ابوجہل وغیرہ، اور ستر کافر پکڑے گئے تھے، ان پکڑے جانے والوں میں حضرت عباس بھی تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سگے چچا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ ان سب لوگوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، پہلے مناظرہ اور بحث ہوئی تھی کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ دیا تھا کہ یا رسول اللہ! یہ کفر کی پوری طاقت ہے، ان ستر کے ستر کو قتل کر دیجئے، کفر کی پوری طاقت ختم ہو جائے گی، کچلی جائے گی، آئندہ یہ سر اُٹھانے کے قابل نہیں رہیں گے، ستر مارے گئے ہیں اور ستر کو اور مار دیجئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو فرمایا: یا رسول اللہ! یہ آپ کا ہی قبیلہ ہے اور کیا بعید ہے یہ مسلمان ہو جائیں اور دین کے خادم بن جائیں، اس لئے میں تو یہ چاہتا ہوں کہ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آسمان میں دو فرشتے ہیں ایک سختی کا حکم دیتا ہے ایک نرمی کا، اور وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر تھے، جبرئیل اور میکائیل۔ جبرئیل سختی کا حکم دیتے ہیں اور میکائیل نرمی کا حکم دیتے ہیں، اور دو نبی تھے ایک نوح علیہ السلام جو سختی کا حکم کرتے تھے: ﴿رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝﴾ (نوح) اے اللہ! رُوئے زمین پر ان کافروں میں ایک آدمی کا گھر بھی نہ چھوڑنا، اپنی زمین کو ان کافروں سے بالکل پاک کر دے۔ اور دُوسرے نرمی کا حکم دیتے ہیں یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام، باپ دھکے دے کر گھر سے نکال رہا ہے اس کو فرما رہے ہیں: ﴿سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝﴾ (مریم) میں اپنے رب سے تیرے لئے بخشش مانگوں گا وہ مجھ پر بڑا شفیق ہے۔

اللہ کے فرشتے لوط علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت کا پروانہ لے کر اللہ تعالیٰ کے پاس سے آ رہے ہیں اور ابراہیم علیہ السلام ان سے جھگڑا کر رہے ہیں: ﴿يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ﴾ ان سے جھگڑنے لگے لوط کی قوم کے بارے میں، یہ تو قرآن کریم کے الفاظ ہیں: ﴿وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ۝﴾ (هود) ہم سے جھگڑنے لگے، ہم نے کہا: ﴿يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ﴾ (هود: ۷۶) فرشتوں نے کہا: اے ابراہیم! جانے دو ان پر ایک عذاب آنے والا ہے اور اس کا فیصلہ ہو چکا ہے اور یہ لوٹے گا نہیں اب۔ تو فرمایا: اچھی بات پھر تمہاری خوشی۔

تو نبیوں میں سے ایک حضرت نوح علیہ السلام ہیں جو سختی کا حکم دیتے ہیں اور ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام جو نرمی کا حکم دیتے ہیں۔ فرمایا: عمر تمہاری مثال نوح کی طرح ہے اور ابو بکر کی مثال حضرت ابراہیم کی طرح ہے، اور آنحضرت ﷺ کی رائے مبارک بھی اسی طرح ہوئی اور ایسی پر فیصلہ ہوا۔

فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں

[حدیث: ۱۲۳۱] ”عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا ..... ، لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ۔“

(صحیح بخاری ج: ۹، ص: ۳۴۵، حدیث نمبر: ۲۵۷۵، بَاب فَضْلِ الْجِهَادِ وَ السِّيَرِ وَ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى...، صحیح مسلم ج: ۹، ص: ۴۲۷، ۳۴۶۸، بَاب الْمُبَايَعَةِ بَعْدَ فَتْحِ مَكَّةَ عَلَى الْإِسْلَامِ وَ الْجِهَادِ وَ الْخَيْرِ وَ بَيَانِ...)

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں۔“

تشریح: اس حدیث میں فرمایا: فتح کے بعد ہجرت نہیں۔ فتح سے مراد ہے فتح مکہ، جب تک کہ مکہ مکرمہ فتح نہیں ہوا تھا، مسلمانوں کو لازم تھا کہ وہ کافروں کے علاقے سے ہجرت کر کے کسی ایسے علاقے میں جا بسیں جہاں مسلمانوں کا غلبہ ہوتا کہ وہ اپنے دین پر ٹھیک سے عمل کر سکیں اور جب مکہ فتح ہو گیا تو مکہ گویا دار الحکومت تھا پورے عرب کا اور یہ عرب کی فتوحات کا خاتمہ تھا، یعنی عرب مکمل فتح ہو گیا، عرب کی فتوحات کا خاتمہ اور عجم کی فتوحات کا آغاز۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اب فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں۔

اور دوسری حدیث میں ہے: اب فتح مکہ کے بعد ہجرت تو نہیں رہی سارا ملک دارِ اسلام بن گیا لیکن ثواب اور نیت باقی ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص یہ ارادہ رکھتا تھا کہ اگر مجھے ہجرت کی ضرورت پیش آئی تو میں ہجرت کر کے چلا جاؤں گا اپنا وطن چھوڑ کر تو اللہ تعالیٰ اس نیت پر اس کو ثواب عطا فرمائیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس حدیث کے راوی ہیں، ان کے والد حضرت عباس رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ ہی میں ٹھہرے رہے اور ہجرت نہیں کی، مسلمان تھے لیکن اپنے اسلام کو چھپا کر رکھتے تھے، فتح مکہ کے بعد کہنے لگے کہ: یا رسول اللہ! میں تو ہجرت نہیں کر سکا، ہجرت کے ثواب سے محروم رہ گیا، فرمایا: ”أَنْتَ خَاتَمُ الْمُهَاجِرِيْنَ“ تمہارا ارادہ ہجرت کا تھا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ہجرت کا ثواب لکھ دیا، اور تم کو خاتم المہاجرین بنا دیا، جیسا کہ مجھے خاتم النبیین بنایا ہے میں آخری نبی اور تو آخری مہاجر۔

آخری مہاجر سے مراد یہ کہ اب عرب میں ہجرت کرنے کی نوبت نہیں آئے گی، جب تک کہ مکہ مکرمہ فتح نہیں ہوا تھا ہجرت کا حکم تھا۔ جس طرح جہاد کے بہت سے فضائل ہیں اسی طرح ہجرت کے بہت

سے سارے فضائل ہیں، قرآن مجید میں ہے:﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا﴾(الانفال: ۷۲) کئی جگہ آتا ہے، وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا۔ ہجرت کا معنی ہے ترک وطن، اپنے دین کی خاطر وطن چھوڑ دینا اور ایک حدیث شریف میں فرمایا: ''وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللهُ عَنْهُ'' (صحیح بخاری ۱/۱۵، ۹، السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۰/۱۸۷) أَوْ كَمَا قَالَ، مہاجر وہ ہے جو اللہ کی روکی ہوئی چیزوں کو چھوڑ دے، اگر اللہ کی خاطر اپنے وطن، گھر بار کو چھوڑ سکتا ہے تو دوسری ممنوعات کو بھی چھوڑ دے اصل مہاجر وہ ہے۔

ہم لوگ بھی مہاجر ہیں، پاکستان کی طرف دوڑے تھے اس لئے نہیں کہ وہاں ہمیں کوئی دین پر عمل کرنے نہیں دیتا تھا، اس وقت یہی حالات تھے اس میں کوئی شک نہیں، اس وقت ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ وہاں رہنا خصوصاً پنجاب کے علاقے میں دلّی سے اس طرف ممکن ہی نہیں رہا تھا، باقی ہندوستان کے دوسرے علاقے کے لوگوں نے اچھے مستقبل کی خاطر ہجرت کی کہ وہاں ترقی کے مواقع زیادہ ہوں گے بہ نسبت ہندوستان کے، اور ''إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَاتِ'' (متفق علیہ) صحیح بخاری شریف کی پہلی حدیث ہے اعمال کا مدار نیتوں پر ہے، ''وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى'' اور ہر آدمی کو وہی ملتا ہے جس کی وہ نیت کرے، ''فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ'' جو شخص کہ اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہجرت کرتا ہے اس کی ہجرت تو اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہوگی، ''فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ إِلَى امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ'' اور جس کی دُنیا کی طرف ہے جس کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کرتا ہے تو اس کی ہجرت ان چیزوں کے لئے جس کے لئے اس نے ہجرت کی۔

صحابہؓ فرماتے ہیں: مدینہ طیبہ کی ایک خاتون تھی اُمِّ قیس، مکہ کے ایک شخص نے ان کو نکاح کا پیغام دیا، انہوں نے کہا کہ: ہجرت کر کے یہاں مدینہ آ جاؤ، نکاح کر لیں گے۔ نکاح کے لئے ہجرت کی شرط ٹھہرائی، وہ ہجرت کر کے آ گئے، اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ان صاحب کی ہجرت اُمِّ قیس کے لئے ہے اللہ اور اس کے رسول کے لئے نہیں ہے، یہ نکاح کرنے کے لئے آیا ہے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر نہیں آیا ہے۔

صحابہ فرماتے ہیں کہ ہم ان کو مہاجر اُمِّ قیس کہا کرتے تھے، اُمِّ قیس کا مہاجر۔ ہم لوگوں نے بھی کس لیلیٰ کے لئے ہجرت کی ہوئی ہے، لیلیٰ دُنیا کے لئے کی ہوگی، یہی وجہ ہے کہ ہماری ہجرت پر وہ نتائج مرتب نہیں ہوئے جو کسی مہاجر کی ہجرت پر ہوتے ہیں، ہم اللہ اور اس کے رسول کے لئے آئے ہی نہیں، اللہ اور اس کے رسول کو تو بالکل بھول ہی گئے وہ پیچھے ہندوستان میں ہی ہیں، اس کو چھوڑ آئے، اِلّا ماشاء اللہ، پانچوں اُنگلیاں برابر تو نہیں۔

یہاں یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ یہاں جو فرمایا: ''لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ'' یہ عرب کے بارے میں

ہے، لیکن شریعت کا قانون تو پوری دنیا کے لئے ہے اگر خدانخواستہ کسی جگہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ وہاں پر رہتے ہوئے اپنے دین پر عمل کرنا ممکن نہ رہے اور آدمی ہجرت کر سکتا ہو تو اس کو ہجرت کرنا پڑے گی، پھر اس پر ہجرت فرض ہے اور اگر ہجرت کر نہیں سکتا تو مستضعفین میں سے ہے، کمزور ہے تو اللہ معاف کرے گا۔

قرآن کریم میں ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولٰٓئِكَ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيرًا ﴿٩٧﴾﴾ (النساء)

ترجمہ: ''بے شک وہ جن کو فرشتے قبض کرتے ہیں ان کو قبض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم لوگ کس چیز پر تھے دین کے معاملے میں؟ وہ کہیں گے: ہم زمین میں کمزور تھے دین پر عمل نہیں کر سکتے تھے، (فرشتے) کہیں گے کہ کیا زمین کشادہ نہیں تھی کہ تم ہجرت کرتے؟ پس ان کا ٹھکانہ جہنّم ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔''

اس کے باوجود کہ مسلمان تھے لیکن اپنے دین پر عمل نہیں کر سکتے تھے ان پر لازم تھا کہ کسی ایسی جگہ چلے جاتے جہاں وہ دین پر عمل کر سکتے، اگر نہیں کریں گے تو گناہگار ہوں گے۔

﴿إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَّلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿٩٨﴾ فَأُولٰٓئِكَ عَسَى اللهُ أَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللهُ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٩٩﴾﴾

ترجمہ: ''مگر کمزور قسم کے مرد، عورتیں اور بچّے، جو بے چارے ان کو کوئی تدبیر نہیں سوجھتی اور نہ کوئی راستہ معلوم کہ کدھر جائیں، یہی لوگ ہیں کہ توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمادیں، (یہ بے چارے معذور ہیں)۔''

لیلۃ التعریس

[حدیث: ۱۲۳۲] ''عَنْ أَبِي قَتَادَةَ............، لَا هُلْكَ عَلَيْكُمْ ثُمَّ قَالَ أَطْلِقُوا لِي غُمَرِي، (قَالَهُ ظُهَيْرَةَ لَيْلَةَ التَّعْرِيسِ۔''

(صحیح مسلم ج: ۳، ص: ۱۵۴، حدیث نمبر: ۱۰۹۹، بَابُ قَضَاءِ الصَّلَاةِ الْفَائِتَةِ وَاسْتِحْبَابِ تَعْجِيلِ قَضَائِهَا)

ترجمہ: ''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم پر ہلاکت نہیں ہوگی، کھول لاؤ میرے پاس میرا پیالہ، یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ

التعریس کے اگلے دن دوپہر کے وقت دن ڈھلتے فرمائی تھی۔''

تشریح: اس حدیث میں ایک قصہ ذکر کیا ہے غزوہ تبوک سے واپسی پر آنحضرت ﷺ نے ساری رات سفر کیا آخر شب میں نزول فرمایا تھا اور اس رات فجر کی نماز قضا ہوئی تھی اس کو لیلۃ التعریس کہتے ہیں، لیلۃ التعریس کے اگلے دن لمبا سفر تھا، گرمیوں کا موسم تھا، راستے میں پانی کا کوئی نام ونشان نہیں۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ راستے میں پانی کہیں نہیں ملے گا اس لئے تیزی سے سفر کرلو، صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ کوئی ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا سب سرپٹ دوڑ رہے تھے یہاں تک کہ دن ڈھل گیا اور پانی نہیں ملا، آنحضرت ﷺ آرام کے لئے اُترے، صحابہ کرام جمع ہوگئے اور فرمایا: "هَلَكْنَا وَعَطِشْنَا" پیاس سے مرگئے جان نکلنے کو آئی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: "لَاهُلْكَ عَلَيْكُمْ" مرتے نہیں فکر نہ کرو، میری لٹیا لاؤ، ایک چھوٹا سا برتن تھا اُونٹ کے ساتھ باندھا ہوا تھا، مشکیزہ اس میں اتنا سا پانی، وہ لے آئے، آنحضرت ﷺ اس کو ملتے رہے اور کچھ پڑھتے رہے، پھر فرمایا: کوئی کھلا برتن لاؤ، وہ پانی اس میں انڈیل دیا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب میں نے صبح کو رسول اللہ ﷺ کو وضو کروایا تھا تو تھوڑا سا پانی مشکیزے میں بچ رہا تھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس کو سنبھال کے رکھنا اس کا قصہ ظاہر ہوگا۔ وہی منگوایا اور وہ بہت ہی تھوڑا تھا، میرا خیال تھا کہ جب اس کو اُلٹیں گے تو چلتے چلتے وہ چمڑا ہی اس کو پی لے گا، منہ تک پانی پہنچے گا ہی نہیں، اتنا کم پانی تھا، بہرحال آنحضرت ﷺ نے اس کو ملا اور کچھ اس پر پڑھا اور اس کو اُنڈیل دیا تو کچھ پانی تسلے میں آگیا اور آنحضرت ﷺ نے اپنا دست مبارک اس میں رکھ دیا، اُنگلیوں کے بیچ میں سے چشمے پھوٹ پڑے، یہ ہزاروں کا لشکر تھا سب نے سیر ہوکر پیا اور جس کو غسل کی ضرورت تھی غسل کیا، مویشیوں کو پلایا اور جتنے برتن تھے وہ بھی بھر لئے، جب سارے لوگ سیراب ہوگئے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: سب سیراب ہوگئے ہو؟ کہا: جی! تو پھر آپ ﷺ نے ہاتھ اُٹھالئے، پانی اتنا ہی تھا۔

غزوہ احزاب کا ایک واقعہ

[حدیث:۱۲۳۳] "عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللهِ......، لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الظُّهْرَ (وَيُرْوٰى: الْعَصْرَ) إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ، (قَالَهُ مُنْصَرِفًا مِنَ الْأَحْزَابِ)۔"

(صحیح مسلم ج:۹ ص:۲۲۷، حدیث نمبر:۳۳۱۷، باب الْمُبَادَرَةِ بِالْغَزْوِ وَتَقْدِيمِ أَهَمِّ الْأَمْرَيْنِ الْمُتَعَارِضَيْنِ)

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص ظہر کی اور ایک روایت میں ہے کہ عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنی قریظہ

میں، یہ بات آپ ﷺ نے جنگ احزاب سے واپسی پر فرمائی تھی۔''

تشریح: اس حدیث میں ایک واقعہ ہے اس کی تفصیل طویل ہے، آنحضرت ﷺ کا یہاں صرف ایک جملہ نقل کیا گیا ہے، جنگ احزاب جو سن ۵ ہجری میں ہوئی تھی، بارہ ہزار کا لشکر مدینہ کے گرد جمع ہو گیا تھا اور قریش مکہ نے تمام قبائل عرب کو جمع کر لیا تھا، آنحضرت ﷺ کا یہودیوں سے جو کہ مدینہ میں رہتے تھے اور اطراف کی بستیوں میں رہتے تھے ان سے معاہدہ تھا اور معاہدہ یہ تھا کہ آپس میں نہیں لڑیں گے اور اگر ہم میں سے کسی پر کوئی باہر سے حملہ کرے گا تو اس باہر والے کی مدد نہیں کریں گے، مدینہ پر کوئی حملہ کرے گا تو یہودی اس کی مدد نہیں کریں گے اور ان پر کوئی حملہ کرے تو رسول اللہ ﷺ ان حملہ آوروں کی مدد نہیں کریں گے۔

جنگِ احزاب میں جب قریش نے سب لوگوں کو جمع کیا تو ان لوگوں کو بھی دعوت دی، انہوں نے کہا: محمد ﷺ کے ساتھ ہمارا معاہدہ ہے، ہمارے لئے مشکل ہے لیکن انہوں نے ان کو ورغلایا اور کہا: کہاں محمد اور کہاں تمہارے معاہدے؟ اس وقت تو پورے عرب ان کے خلاف جمع ہو گئے ہیں، تمہاری اینٹ سے اینٹ بجادیں گے اور تمہاری عورتوں کو لونڈیاں بنائیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے ان یہودیوں کو کہلا بھی بھیجا کہ تمہیں اپنے معاہدے کی پاسداری کرنی چاہئے، کسی کے بہکانے میں نہ آنا، اپنا معاہدہ نہ توڑنا ورنہ پھر مشکل ہو جائے گی ہمیں یہاں اکٹھے رہنا ہے۔

خلاصہ یہ کہ انہوں نے خفیہ طور پر معاہدہ توڑ دیا اور کفار قریش کی مدد کی، آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کہ ان جتھوں کو توڑنے کے لئے کسی کو اپنے ساتھ ملائیں تو کچھ حرج تو نہیں؟ سیّد الانصار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یارسول اللہ! اگر یہ کام آپ وحی سے کر رہے ہیں تو ہمیں اعتراض نہیں۔ اللہ کا حکم یہی ہے تو کریں اور اگر یہ حضرت کی اپنی رائے ہے تو اس پر نظر ثانی فرمالی جائے، ہم نے تو جاہلیت میں بھی کسی کو ٹیکس کا ایک دانہ بھی نہیں دیا تھا، اب ہم مسلمان ہو کر ان کو دیں گے، آنحضرت ﷺ ان کی اس بات سے بہت خوش ہوئے۔

ایک صاحب تھے، اللہ کی شان وہ عین لڑائی کے دن آکر مسلمان ہوئے اور کہنے لگے کہ: یارسول اللہ! میں مسلمان تو ہو گیا ہوں لیکن میرے مسلمان ہونے کا ابھی تک کسی کو بھی معلوم نہیں، میں نے اپنے اسلام کا اظہار ابھی تک نہیں کیا، یہ یہودی بھی مجھے اپنا سمجھتے ہیں اور یہ قریش بھی مجھے اپنے پہلے مذہب پر سمجھتے ہیں کفر پر، تو اگر آپ اجازت دیں تو ان کے درمیان پھوٹ ڈالوں کیونکہ میں ابھی ان سے مل سکتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: تمہاری خوشی، کفر کے درمیان تو پھوٹ ڈالنی چاہئے۔

یہ سب سے پہلے یہودیوں کے پاس گئے، کہنے لگے: تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارا محمد ﷺ کے ساتھ معاہدہ تھا اور یہ قریش کل نہیں تو پرسوں چلے جائیں گے یہ یہاں کتنے دن ٹکیں گے؟ وہ مسلمان محاصرے میں ہیں لیکن ڈٹے ہوئے ہیں ان کا کچھ نہیں بگڑا، یہ تھک ہار کر چلے جائیں گے کوئی کہیں سے آیا ہے کوئی کہیں

سے، یہ یہاں کتنے دن ٹھہریں گے یہ تو چلے جائیں گے اور محمد ﷺ کو پتا چل گیا کہ تم نے معاہدہ توڑا ہے تو تمہاری شامت آجائے گی اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ قریش ابھی تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ تم محمد ﷺ کے ساتھ ہو، نہ تم ادھر کے رہو گے نہ اُدھر کے۔ کہنے لگے: بات تو تمہاری معقول ہے! اس پر یہ نعیم کہنے لگے: میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں وہ یہ کہ ان سے کہو کہ اگر ہماری مدد لینی ہے تو اپنے ستر آدمی ہمارے پاس یرغمال اور تحویل میں دو، اپنے ستر آدمی بطور ضمانت ہمیں دو ورنہ ہم تم پر اعتماد نہیں کرتے۔ وہاں سے یہ قریش کے پاس گئے جو محاصرہ کئے ہوئے تھے، ان سے جا کر کہا کہ تم نے ان یہودیوں پر اعتماد کیا ہے کبھی تم نے ان کو قابل اعتماد پایا؟ میں تمہارا خیر خواہ اور بھائی ہوں، تم مجھے جانتے ہی ہو، یہ یہود قابل اعتماد نہیں، یہ تم سے کل یہ مطالبہ کریں گے کہ اپنے ستر آدمی ہمیں دو۔

چنانچہ انہوں نے جب ستر آدمیوں کا مطالبہ کیا تو قریش سمجھ گئے کہ نعیم بن عبداللہ بالکل سچ کہتے تھے، اور ادھر یہود سے یہ کہا تھا کہ وہ تمہیں ستر آدمی نہیں دیں گے وہ تم پر اعتماد ہی نہیں کرتے، اس طرح یہودیوں کو ان سے توڑ دیا اور اسی طرح اور بھی قبائل جو باہر سے آئے ہوئے تھے ان سے مل کر ان کو بھی بھگا دیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر سخت شدید ہوا بھیج دی، انتہی۔

جب محاصرہ ختم ہو گیا تو آنحضرت ﷺ نے بنو قریظہ کی طرف صحابہ کرام کو بھیجا اور اس وقت جبکہ ان حضرات کو وہاں روانہ فرمایا چلتے وقت ان حضرات کو تاکیداً فرمایا کہ اتنی تیز رفتاری سے وہاں جاؤ کہ عصر وہاں پہنچ کر پڑھنا، راستے میں تم میں سے کوئی بھی عصر نہ پڑھے، اور مراد اس ارشاد مبارک سے یہ تھی کہ اتنی تیز رفتاری سے وہاں پہنچو کہ عصر سے پہلے ہی وہاں پہنچ جاؤ اور عصر وہاں جا کر ادا کرو۔

واجب القتل

[حدیث:۱۲۳۴] "أَخْبَرَنِي عَبْدُ اللهِ بْنُ مُطِيعٍ عَنْ أَبِيهِ ......، لَا يُقْتَلُ قُرَشِيٌّ صَبْرًا بَعْدَ هٰذَا الْيَوْمِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (قَالَهُ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ)۔"

(صحیح مسلم ج:۹، ص:۲۵۴، حدیث نمبر:۳۳۳۴، باب لَا يُقْتَلُ قُرَشِيٌّ صَبْرًا بَعْدَ الْفَتْحِ)

ترجمہ: "حضرت مطیع بن الاسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: قتل نہیں کیا جائے گا کسی قریشی کو باندھ کر آج کے بعد، یہ بات آپ نے فتح مکہ کے دن فرمائی تھی۔"

تشریح: اس حدیث شریف میں ایک قصہ ذکر کیا ہے کہ پندرہ آدمی تھے کہ آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر ان کے قتل کا حکم فرمایا تھا، تمام اہل مکہ کو عام معافی دے دی تھی لیکن پندرہ آدمی جن میں دس

مرد اور پانچ عورتیں تھیں ان کے قتل کا حکم فرمایا تھا کہ یہ جہاں بھی ملیں قتل کر دو، ان میں سے ایک ابوجہل کے لڑکے عکرمہ بن ابوجہل بھی تھے، ان کی بیوی آ کر مسلمان ہو گئیں اور کہا: عکرمہ بھاگ گئے ہیں، اگر آپ اجازت دیں تو میں ان کو لاؤں؟ آنحضرت ﷺ کا مزاج ایسا ہی تھا کہ جو بھی امن مانگے اس کو امن۔ فرمایا اس کو امن ہے! حکم واپس لے لیا، کہنے لگیں: حضور! اگر وہ میری بات پر اعتبار نہ کرے تو کوئی نشانی ہونی چاہئے، کوئی چیز عطا فرمائی جو اس بات کی نشانی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو امن دیا، وہ لے کر آئیں اور عکرمہ مسلمان ہو گئے۔

ایک حدیث کا مفہوم ہے: میں نے جنّت میں ایک انگور دیکھا تو کسی نے کہا کہ یہ ابوجہل کا حصہ ہے، بیٹا پھل ہوتا ہے، ابوجہل جہنّم میں اور اس کا بیٹا جنّت میں، حضرت عکرمہ بن ابی جہل۔ ﴿تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ ①﴾ ہم پڑھتے ہیں لیکن درّہ بنت ابی لہب، ابولہب کی صاحبزادی حضرت درّہ صحابیہ ہیں، تو من جملہ ان لوگوں کے ایک ابن خطل تھا، آپ ﷺ نے دس پندرہ آدمی کہے تھے لیکن صرف دو تین ہی مارے گئے باقی سب کو معافی مل گئی، مسلمان ہو گئے تو اب کیا کریں؟

ان میں سے ایک عبداللہ بن ابی سرح بھی تھے، ان کا قصہ پہلے گزر چکا ہے لیکن بدبخت ابن خطل یہ مسلمان نہیں ہوا، رسول اللہ ﷺ سے کسی نے کہا: ابن خطل غلاف کعبہ سے لپٹا ہوا ہے، فرمایا: اس کو وہیں قتل کر دو، اس کو پکڑا اور وہیں اس کو قتل کر دیا گیا، اس کے بعد فرمایا: آج کے بعد کسی قریشی کو باندھ کر نہیں مارا جائے گا یعنی سارے مسلمان ہو گئے، باقی اگر کوئی ظلماً مارتا ہے تو دوسری بات ہے شرعی طور پر مارنا ممکن نہیں ہو گا۔

جنگِ موتہ کا ایک واقعہ

[حدیث:۱۲۳۵] "عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ......، فَقَالَ لَا تُعْطِهِ يَا خَالِدُ لَا تُعْطِهِ يَا خَالِدُ! هَلْ أَنْتُمْ تَارِكُونَ لِي أُمَرَائِي، إِنَّمَا مَثَلُكُمْ وَمَثَلُهُمْ كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتُرْعِيَ إِبِلًا أَوْ غَنَمًا فَرَعَاهَا ثُمَّ تَحَيَّنَ سَقْيَهَا فَأَوْرَدَهَا حَوْضًا ... إِلَى اٰخِرِ الْحَدِيْثِ۔"

(صحیح مسلم ج:۹،ص:۱۹۷،حدیث نمبر:۳۲۹۷،باب اسْتِحْقَاقِ الْقَاتِلِ سَلَبَ الْقَتِيلِ)

ترجمہ: "حضرت مالک بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: خالد! اس کو نہ دو، کیا تم چھوڑ دو گے نہیں میرے لئے میرے اُمراء کو، تمہاری مثال اور ان کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو کسی اُونٹوں یا بکریوں کے ریوڑ کے چرانے پر مامور ہے اور وہ ان کو چراتا رہا پھر ان کے پانی پلانے کا وقت آیا وہ ان کو کسی حوض پر لے گیا وہ

اس میں داخل ہو گئے، پس ان بکریوں نے صاف پانی پی لیا اور گدلا پانی چھوڑ دیا، پس اس کا صاف تو تمہارے لئے ہے اور اس کا گدلا ان کے لئے ہے، یہ بات آپ نے اس وقت فرمائی تھی کہ حمیر کے ایک آدمی نے غزوہ موتہ میں دشمن کے ایک آدمی کو قتل کر دیا، لیکن اس کا چھینا ہوا سامان حضرت خالد نے اس کو نہیں دیا کیونکہ وہ زیادہ تھا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اس کو دے دو، جب خالد عوف کے پاس سے گزرے تو انہوں نے ان سے غصے کی بات کہی اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو سن لیا، تب یہ بات ارشاد فرمائی۔"

تشریح: اس حدیث میں ایک قصہ ذکر کیا گیا ہے، خلاصہ اس قصے کا یہ ہے کہ جنگ موتہ میں حمیر کے ایک مسلمان نے ایک کافر کو قتل کیا اور قاعدہ یہ ہے کہ ایک لگا بندھا اُصول یہ ہے کہ جو مسلمان کسی کافر کو قتل کر دے اس کا سامان اسی کو دلوا دیا جاتا ہے۔ "مَنْ قَتَلَ قَتِيلًا فَلَهُ سَلَبُهُ" (طبرانی ۶/ ۳۹۲، ۶۸۵۰، موطا امام مالک ۳/ ۷ ۳۳، ۸۶۳) آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے جو کسی کو مار ڈالے یعنی مسلمان کسی کافر کو مار ڈالے اس کا سامان اسی کو دلوا دو۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تو اس کو قاعدہ سمجھتے ہیں لیکن ہمارے امام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ اُصول آنحضرت ﷺ نے امام کے لئے مقرر کیا ہے، یہ امام کو ہدایت کی ہے، جب تک مسلمانوں کا جرنیل یہ حکم نہ کرے اس وقت تک اس کو نہیں ملے گا، امام شافعی اور دُوسرے ائمہ فرماتے ہیں کہ جرنیل صاحب کے فیصلے کی کیا ضرورت ہے؟ رسول اللہ ﷺ فیصلہ دے چکے لیکن حدیث سے ہمارے امام کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ جو بہت اُونچے درجے کے صحابی ہیں، اس قصے کو بیان کرتے ہیں کہ میں نے خالد بن ولید سے کہا: تم اس کا سامان کیوں نہیں دیتے؟ خالد امیر تھے، میں ان سے لڑ پڑا۔ حضرت خالد نے کہا: بہت سامان ہے، ایک ہی آدمی کو دینا مناسب نہیں، اس لئے خالد نے نہیں دیا اور غنیمت میں داخل کر دیا تو حضرت عوف فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تیری شکایت لگاؤں گا، چنانچہ جب مدینہ آئے تو حضرت عوف فرماتے ہیں: میں نے شکایت کی، میں نے کہا کہ: اس بے چارے نے کافر کو قتل کیا تھا، خالد نے اس کا سامان اس کو نہیں دیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: اے خالد! تم نے کیوں اس کا سامان اس کو نہیں دیا؟ کہا: یا رسول اللہ! سامان بہت زیادہ تھا، میں نے کہا کہ ایک ہی مجاہد کو اتنا سامان دے دیا جائے تو باقیوں کو شکایت ہو سکتی ہے، میں نے اس کو مال غنیمت میں جمع کر دیا۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ دے دو! مجلس برخاست ہوئی تو عوف بن مالک حضرت خالد کے پاس سے گزرے تو طنز کے طور پر ان سے کہا: دیکھو! دلوا دیا کہ نہیں دلوایا؟ دیکھ لیا مزا! حضور ﷺ کے

کان میں یہ بات آ گئی، آپ ﷺ نے وہیں سے فرمایا: خالد! ہرگز نہ دینا، ہرگز نہ دینا۔ تم میرے اُمراء پر تنقید کرتے ہو، تمہاری اور میرے اُمراء کی مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی اُونٹ یا بکریاں چرانے پر مقرر ہوا، سارا دن چراتا رہا، شام کو پانی کے گھاٹ پر لے گیا، جب ان کو پانی پلا چکا تو اب خود گدلا پانی پیتا ہے (کیونکہ بکریاں تو اس کا انتظار نہیں کر سکتیں کہ حضرت پہلے پی لیں تو پھر ہم پیئیں گے) فرمایا: صاف پانی ان کا اور گدلا پانی غریب چرواہے کا، اسی طرح تم ماتحت لوگ ہوتے ہو، غنیمت اور صاف صاف چیزیں تمہارے لئے اور ذمہ داریاں ساری کی ساری بے چارے امیر پر؟ اور پھر اُوپر سے امیر پر تنقید بھی کرتے ہو؟

ظاہر بات ہے کہ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد سن کر توبہ کی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ خالد نے اپنے اجتہاد سے نہیں دیا یہ سمجھ کر کہ زیادہ سامان ہے، باقی تمام مسلمانوں کو اس میں سے حصہ ملنا چاہئے تو ان کے فیصلے پر کسی کو اعتراض کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟

جنگِ موتہ کا حال

[حدیث:۱۲۳۶] ”عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ....، أَخَذَ الرَّايَةَ زَيْدٌ فَأُصِيبَ ثُمَّ أَخَذَهَا جَعْفَرٌ فَأُصِيبَ ثُمَّ أَخَذَهَا عَبْدُ اللهِ بْنُ رَوَاحَةَ فَأُصِيبَ ثُمَّ أَخَذَهَا خَالِدُ بْنُ الْوَلِيدِ عَنْ غَيْرِ إِمْرَةٍ فَفُتِحَ لَهُ۔“

(صحیح بخاری ج:۹، ص:۳۶۵، حدیث نمبر: ۲۵۸۹، بَاب تَمَنِّي الشَّهَادَةِ)

ترجمہ: ”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا جھنڈا لیا حضرت زید رضی اللہ عنہ نے پس وہ شہید ہو گئے پھر جھنڈا لیا حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے وہ بھی شہید ہو گئے پھر جھنڈا لیا حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے وہ بھی شہید ہو گئے پھر جھنڈا لیا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بغیر امیر مقرر کئے جانے کے پس ان کو فتح ہو گئی۔“

تشریح: جنگِ موتہ ۹ھ میں ہوئی اور یہ حجاز اور شام کی سرحد پر ہوئی تھی، آنحضرت ﷺ کو یہ اطلاع ملی تھی کہ شاہ روم حملہ کرنا چاہتا ہے، آنحضرت ﷺ نے لشکر بھیجا کہ نصرانیوں کو یہاں نہ آنے دیا جائے بلکہ وہیں نمٹا جائے ان سے، رسول اللہ ﷺ نے اس کے تین سپہ سالار مقرر کئے، سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، دوسرے نمبر پر اگر وہ شہید ہو جائیں تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بن ابی طالب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھائی اور وہ بھی شہید ہو جائیں تو حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ، وہ بھی شہید ہو جائیں تو پھر مسلمان اپنے میں سے کسی کو خود امیر بنائیں، جب آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ شہید ہو جائیں یہ شہید ہو جائیں یہ شہید ہو جائیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بے ساختہ فرمایا لَوْ مَتَّعْتَنَا بِهِمْ يَا رَسُوْلَ اللهِ، یا رسول اللہ! کاش آپ ان

حضرات کے ساتھ ہمیں فائدہ اُٹھانے کی مہلت دیتے، مطلب یہ کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ شہید ہو جائیں گے وہ تو ہو جائیں گے چنانچہ یہی ہوا۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو جعفر رضی اللہ عنہ نے دوڑ کر جھنڈا اُٹھالیا نیچے نہیں گرنے دیا، وہ بھی شہید ہو گئے تو حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے دوڑ کر جھنڈا اُٹھالیا، علم اسلام کو سرنگوں نہیں ہونے دیا، وہ بھی شہید ہو گئے تو پاس حضرت خالد بن ولید کھڑے تھے وہ شہید ہوئے تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے لپک کر جھنڈا اُٹھالیا اور ساتھ ہی فرمایا مسلمانو! رسول اللہ ﷺ کے تینوں امیر شہید ہو چکے ہیں، اب اپنے میں سے کسی کو امیر بنالو، سب نے کہا کہ آپ ہی امیر ہیں۔

یہاں تو یہ فرمایا کہ حضرت خالد بن ولید نے جھنڈا لیا اور اللہ نے ان کے ہاتھ پر فتح عطا فرمادی، یہ صحیح بخاری کی روایت ہے اور ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ پھر یہ جھنڈا لیا اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ پر فتح عطا فرمائی، اس دن سے لقب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا نام سیف اللہ بنا اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار، اس مقام پر حضرت کے ہاتھ پر اللہ نے فتح عطا فرمائی، اس کے بعد اَسّی (۸۰) جنگوں میں شریک ہوئے اور ان کے جسم میں ایک انچ جگہ ایسی نہیں تھی جس میں زخم کا نشان نہ ہو لیکن جس دن فوت ہوئے تو بستر پر فوت ہوئے، فرمارہے تھے کہ شہادت کی تمنا میں ۸۰ جہادوں میں شریک ہوا ہوں اور میرے بدن پر ایک انچ بھی جگہ ایسی نہیں جس پر زخم کا نشان نہ ہو لیکن آج بستر پر مر رہا ہوں۔

حضرات اکابر فرماتے ہیں کہ حضرت خالد بن ولید شہید ہو ہی نہیں سکتے تھے اس لئے کہ یہ شہید ہو جاتے تو پھر اللہ کی تلوار ٹوٹ جاتی، جب ان کو رسول اللہ ﷺ نے سَیف مِنْ سُیُوفِ اللّٰہ فرمایا تھا اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار تو یہ مغلوب ہو ہی نہیں سکتے تھے، کوئی موقع ایسا نہیں ہوا کہ کسی جہاد میں حضرت خالد بن ولید شریک ہوئے ہوں اور وہاں مسلمانوں کو فتح نہ ہوئی ہو تو یہ موت تو بہر حال آنی ہے لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ شہید نہیں ہو سکتے تھے یہ سیف اللہ ہیں۔

کتابُ الفِتَن والملاحم

فتنہ یہاں (خراسان) سے اُٹھے گا

[حدیث: ۱۲۳۷] ”عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا......، إِنَّ الْفِتْنَةَ هَا هُنَا إِنَّ الْفِتْنَةَ هَاهُنَا مِنْ حَيْثُ يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ۔“

(صحیح بخاری ج:۱۱، ص:۵۷، حدیث نمبر: ۳۰۳۷، بَاب صِفَةِ إِبْلِيسَ وَ جُنُودِهِ وَقَالَ مُجَاهِدٌ، صحیح مسلم ج: ۱۴، ص: ۱۰۲، حدیث نمبر: ۵۱۶۷، بَاب الْفِتْنَةُ مِنْ الْمَشْرِقِ مِنْ حَيْثُ يَطْلُعُ قَرْنَا الشَّيْطَانِ)

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: فتنہ یہاں سے اُٹھے گا جہاں شیطان کا سینگ نکلتا ہے۔“

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرق کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: فتنہ یہاں سے اُٹھے گا، ”حسن صغانی“ بہت بڑے محدث ہیں اور یہ چوتھی صدی کے ہیں، بہت بعد کے ہیں لیکن فرماتے ہیں کہ یہ حدیث میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنی ہے، آپ مشرق کی طرف اشارہ کر کے فرمارہے تھے کہ فتنے یہاں سے اُٹھیں گے، سارے فتنے یہیں سے اُٹھے، یہاں تک کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا فتنہ بھی یہاں قادیان، ہندوستان سے اُٹھا جو کہ مشرق میں ہے، بالکل صحیح فرمایا، یاجوج ماجوج کا فتنہ بھی یہاں سے اُٹھے گا، دجال کا فتنہ بھی ادھر خراسان سے اُٹھے گا، جو کہ مدینہ شریف سے مشرق کی جانب واقع ہے، اور دُوسرے تمام فتنے اِدھر ہی سے اُٹھیں گے۔ (فتنوں کے بارے میں روایات کی کثرت خراسان کی طرف اشارہ کرتی ہے، اللہ اپنے حفظ واَمان میں رکھے، آمین)۔

میری طالب علمی کا زمانہ تھا، ایک شیعہ کی کتاب مجھے ملی، اس نے لکھا کہ حضرت، حجرۂ عائشہ کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہے تھے کہ فتنے یہاں سے اُٹھیں گے، حجرۂ عائشہ معلوم ہے کیا ہے؟ وہ روضۂ اقدس ہی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا روضۂ اقدس ہی حجرۂ عائشہ ہے؛ یہاں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اِن بدبختوں کو کس قدر عداوت ہے

رسول اللہ ﷺ سے؟ یعنی آنحضرت ﷺ جس پاک سرزمین میں آرام فرما ہیں، اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ فتنے کا مرکز وہ ہے، لاحول ولاقوۃ! یہ کہہ نہیں سکتے مگر وہ جگہ جہاں شیخین موجود ہوں وہ اس کو پاک جگہ کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ اسی سے حق اور ناحق کا پتا چل جاتا ہے، گویا اس حدیث کو وہ بھی تسلیم کرتے ہیں، نعوذ باللہ!

قیامت کی ایک علامت، نیک لوگ اُٹھا لئے جائیں گے

[حدیث:۱۲۳۸] ”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ......، إِنَّ اللهَ يَبْعَثُ رِيحًا مِنَ الْيَمَنِ أَلْيَنَ مِنَ الْحَرِيرِ فَلَا تَدَعُ أَحَدًا فِي قَلْبِهِ (قَالَ أَبُو عَلْقَمَةَ) مِثْقَالُ حَبَّةٍ (وَقَالَ عَبْدُ الْعَزِيزِ) مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ إِيمَانٍ إِلَّا قَبَضَتْهُ۔“

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۲۹۵، حدیث نمبر:۱۶۸، بَابٌ فِي الرِّيحِ الَّتِي تَكُونُ قُرْبَ الْقِيَامَةِ تَقْبِضُ مَنْ فِي قَلْبِهِ...)

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک بھیجیں گے اللہ تعالیٰ ایک ہوا یمن کی طرف سے جو ریشم سے زیادہ نرم ہوگی، پس نہیں چھوڑے گی کسی آدمی کو جس کے دل میں ایک دانے برابر یا ایک ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا مگر اس کو قبض کرلے گی۔“

تشریح: اس حدیث میں بھی قیامت کی ایک علامت ذکر فرمائی ہے، ابھی ذکر کیا کہ قیامت کی علامات میں سے ہے سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، اس کے بعد ایمان کا راستہ بند، اور توبہ کا دروازہ بند، اب فائدہ کیا ہوگا؟ جو مؤمن ہیں کافر نہ ہوں گے، جو کافر ہیں مؤمن نہ ہوں گے، چنانچہ سورج کے مغرب سے نکلنے کے بعد ہی دابۃ الارض زمین سے نکلے گا جو مؤمن اور کافر کی پیشانی پر الگ الگ نشان لگادے گا، مؤمن کا چہرہ اس مہر سے قطعاً سفید اور کافر کا چہرہ اس مہر سے قطعاً کالا سیاہ ہوجائے گا۔ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: دو آدمی سودا خرید و فروخت کررہے ہوں گے، ایک کہے گا: یا مؤمن! دُوسرا کہے گا: یا کافر! یعنی مؤمن اور کافر بالکل الگ الگ پہچانے جائیں گے گویا کہ ماتھے پر لکھ دیا گیا ہو، تو اَب اس کے بعد کیا باقی رہ جاتا ہے؟

چنانچہ اس کے بعد فرمایا: پھر یمن کی جانب سے ایک ہوا چلے گی جو ریشم سے زیادہ نرم ہوگی، اتنی خوشگوار اور اتنی عمدہ ہوا کہ سبحان اللہ! جیسے کہ انتہائی خوشگوار صبح ہو جس سے خواہ مخواہ تھکے ہوئے مسافر کو نیند آتی ہے، اسی طرح اس ہوا کے چلتے ہی سب مسلمانوں کو نیند آجائے گی، اللہ تعالیٰ ہر مؤمن کی رُوح کو قبض کرلیں گے، اس کے بعد زمین نیک اور نیکی، پاک اور پاکیزگی سے یکسر خالی ہوجائے گی، اسی دن کعبہ اُٹھالیا جائے گا، یہ پتھر اس دن ویسے ہی رہ جائیں گے لیکن اس کعبہ کا کعبہ پن، اس کا مرکزِ تجلیاتِ الٰہیہ یا دُوسرے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ ایک انسان کی رُوح ہوتی ہے اور ایک جسم ہوتا ہے، رُوح نکال لی جاتی ہے دھڑ وہیں پڑا رہ جاتا

ہے، لیکن تم جانتے ہو کہ اس وقت یوں نہیں کہتے کہ فلاں آدمی پڑا ہے بلکہ کہا جاتا ہے کہ لاش پڑی ہے، فلانے کا جنازہ پڑا ہے، فلانے کی میت ہے، محاورہ بدل جاتا ہے۔ ہمارے ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: اہلِ دُنیا کی یہ رسم چلی آتی ہے کہ اِدھر آنکھیں بند ہوئیں اُدھر عنوان بدل گیا۔

آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا

[حدیث:۱۲۳۹] "عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو ......، إِنَّ أَوَّلَ الْآيَاتِ خُرُوجًا طُلُوعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَخُرُوجُ الدَّابَّةِ عَلَى النَّاسِ ضُحًى وَأَيُّهُمَا مَا كَانَتْ قَبْلَ صَاحِبَتِهَا فَالْأُخْرَى عَلَى إِثْرِهَا قَرِيبًا۔"

(صحیح مسلم ج:۱۴، ص:۱۷۶، حدیث نمبر:۵۲۳۴، بَابٌ فِي خُرُوجِ الدَّجَّالِ وَمُكْثِهِ فِي الْأَرْضِ وَنُزُولِ....)

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: البتہ ظاہر ہونے کے اعتبار سے قیامت کی نشانیوں میں سب سے پہلے ہے آفتاب کا مغرب کی طرف سے اور دن چڑھے لوگوں کے رُوبرو ایک جانور کا نکلنا، ان دونوں میں جو پہلی ہوگی تو دُوسری اس کے پیچھے جلدی ظاہر ہوجائے گی۔"

فتنہ وفساد اور قتل وغارتگری آثار قیامت میں سے ہے

[حدیث:۱۲۴۰] "قَالَ كُنْتُ مَعَ عَبْدِ اللهِ .....، إِنَّ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ لَأَيَّامًا يَنْزِلُ فِيهَا الْجَهْلُ وَيُرْفَعُ فِيهَا الْعِلْمُ وَيَكْثُرُ فِيهَا الْهَرْجُ وَالْهَرْجُ الْقَتْلُ۔"

(صحیح بخاری ج:۲۱، ص:۴۵۳، حدیث نمبر:۶۵۳۸، بَابُ ظُهُورِ الْفِتَنِ، صحیح مسلم ج:۱۳، ص:۱۵۸، حدیث نمبر:۴۸۲۶، بَابُ رَفْعِ الْعِلْمِ وَقَبْضِهِ وَظُهُورِ الْجَهْلِ وَالْفِتَنِ فِي آخِرِ الزَّمَانِ)

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک قیامت سے پہلے کچھ ایسے دن ہوں گے کہ ان میں جہالت اور تیرگی پھیلے گی اور علم اُٹھ جائے گا اور قتل بہت ہوگا۔"

تشریح: اس حدیث میں ارشاد فرمایا: قیامت سے پہلے کچھ دن ایسے آئیں گے کہ اس میں فتنہ فساد، افراتفری نازل ہوں گے، اور ان میں علم اُٹھالیا جائے گا اور ان میں قتل بہت ہوگا۔

قیامت کی علامتیں دو قسم کی ہیں، ایک علاماتِ صغریٰ یعنی چھوٹی علامتیں، اور ایک علاماتِ کبریٰ یعنی بڑی علامتیں، علاماتِ صغریٰ کا دور تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے شروع ہوگیا کیونکہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہونا آثارِ قیامت کی علامت ہے۔ میرے رسالے "ختم نبوت" میں میں نے ایک رسالہ نقل کیا ہے، اس میں تقریباً

پندرہ روایات نقل کی ہیں اس مضمون کی کہ آنحضرت ﷺ نبی الساعۃ ہیں، قیامت کے نبی ہیں، یعنی آپ کے اور قیامت کے درمیان کوئی نبی نہیں، یوں فرمایا: ’’أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ‘‘ (بخاری ۲۰/۱۶۱، ۶۰۲۳ کنزالعمال ۱۴/۱۹۰، ۳۸۳۳۰) میں اور قیامت اس طرح ہیں ان دو انگلیوں کی طرح، ایک ذرا آگے ہے دُوسرا ذرا پیچھے ہے، میں آگے آگیا ہوں اور قیامت پیچھے آرہی ہے۔ اور جوں جوں زمانہ نبی کریم ﷺ کے بابرکت دُور سے دُور ہوتا گیا اسی رفتار سے فتنے بڑھتے چلے گئے، اور اب ہمارا جو حال ہے وہ آپ کے سامنے ہے، اس کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں، اور ابھی یہ آخری حد نہیں، اللہ پناہ میں رکھے، مصیبت، تکالیف بڑھتی چلی جائے گی۔

ایک اور حدیث میں فرمایا: یہاں تک کہ ایک آدمی اپنے مسلمان بھائی کی قبر پر سے گزرے گا تو کہے گا: کاش! اس قبر میں میں ہوتا۔ مرنے کی تمناء کرے گا، اور یہ علامت اب ظاہر ہو رہی ہے، یوں تو پہلے بھی ظاہر ہو رہی تھی لیکن اب شدت کے ساتھ ظاہر ہو رہی ہے، اسلامی نظام لوگ قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن کیسے کریں؟ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کی خدمت میں ایک دفعہ تذکرہ آیا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: سیّد احمد شہید کے وقت سے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے کچھ کم کوششیں نہیں کی گئیں، لیکن اللہ کی مشیت نہیں ہے۔

ہمارے حکیم الاُمّت قدس سرہٗ ارشاد فرماتے تھے: جہاں تک اصلاح کی کوشش ہے کرتے رہنا چاہئے، لیکن عالم کا نظام اب بغیر امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ کے دُرست نہیں ہوگا، ان کی تشریف آوری ہوگی تو نظام دُرست ہوگا، باقی دُوسرے مصلحین کی کوششوں سے پوری کامیابی نہیں ہوگی، انفرادی طور پر کامیابی ہوگی جیسے دعوت وتبلیغ کا کام ہے، الحمدللہ! اللہ تعالیٰ نے بڑی قبولیت عطا فرمائی ہے، سینکڑوں نہیں ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کی زندگیاں تبدیل ہوگئی ہیں، لیکن جس نسبت سے یہ کام بڑھ رہا ہے، اس سے سوگنا نسبت سے شر بڑھ رہا ہے، جب ایک کا مقابلہ سو سے ہو تو خیر شر کا مقابلہ کیسے کرسکتی ہے۔

اور دُوسری علامت بتائی کہ ان میں سے علم اُٹھالیا جائے گا، آج اوراق ونقوش تو بہت ہیں، ابھی میں ایک کتاب لایا ہوں حضرت امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہے، اس کی چار جلدیں کسی زمانے میں چھپی تھیں، میرے پاس موجود تھیں، اب سولہ جلدوں میں مکمل کتاب چھپی ہے، وہ وہ کتابیں چھپ کر آرہی ہیں کہ ہمارے بزرگوں کو ان کی زیارت بھی نصیب نہیں ہوئی۔ طبرانی کی معجم کبیر تیس جلدوں میں ہے اور اسی طرح دُوسری کتابوں کا ڈھیر لگ گیا ہے، لیکن علم نہیں جہل ہے، ان کتابوں کو سمجھنے والا اور ان سے استفادہ کرنے والا کوئی نہیں رہا، امامِ ربانی مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ’’سوانح قاسمی‘‘ کے نام سے مولانا مناظر حسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے، اس میں یہ دلچسپ لطیفہ لکھا ہے کہ جس دن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا صرف دو

کتابیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ملکیت میں حضرت کے پاس تھیں اور کوئی کتاب نہیں تھی، ایک صحیح بخاری اور دُوسرے قرآن کریم کا نسخہ۔ یہ بس حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا کتب خانہ تھا، کتب خانہ کیا کھو گئے اس کو، اس پر مرزا غالب کا شعر نقل کیا ہے مولانا مناظر حسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے:

چند تصویرِ بتاں اور چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا

لیکن علم اللہ تعالیٰ نے ایسا عطا فرمایا تھا کہ عقل حیران، ان کا لقب ''حجۃ الاسلام'' ہے، یعنی اسلام کی حقانیت کی حجت اور برہان ہے حضرت کا وجود۔ اب لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ شاید علم زیادہ ہو رہا ہے، علم کہاں زیادہ ہو رہا ہے، اب حرمِ کعبہ میں دو تین غیر مقلد لڑکے میرے ساتھ بعض مسائل میں اُلجھنے لگے، میں نے کہا: کوئی بات تو تھی کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید پر اللہ تعالیٰ نے پوری اُمّت کو جمع کر دیا۔ ایک بزرگ فرماتے تھے: دو چیزوں کے بارے میں مجھے یہ توقع بھی نہیں تھی کہ یہ کوفہ کے پل سے آگے نکل جائیں گے، ابوحنیفہ کی فقہ اور امام عاصم کی قراءت، لیکن انہوں نے تو دُنیا کے کناروں تک کو بھر دیا۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر کہہ رہے تھے، آج دُنیا میں جتنے قرآن پڑھے جا رہے ہیں، یہ امام حفص رحمۃ اللہ علیہ کی قراءت ہے، حفص عن عاصم، امام حفص شاگرد ہیں امام عاصم کوفی کے، ان کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا تھا، کتابوں سے علم نہیں آتا، علم تو دل میں ڈالا جاتا ہے، اوراق رہ جائیں گے علم اُٹھ جائے گا۔

میرا ایک رسالہ ہے ''عصرِ حاضر حدیثِ نبوی کے آئینے میں'' اس میں اس قسم کی احادیث کو جمع کیا، اس میں ایک روایت ہے: ''وَيَكْثُرُ الْعِلْمُ'' اور علم پھیل جائے گا، اور دُوسری روایت میں ہے: ''وَيَكْثُرُ الْقَلَمُ'' قلم کا چرچا ہوگا، ہر وہ آدمی جس کو ہاتھ منہ دھونا نہیں آتا قلم اس کے ہاتھ میں ہے، اس لئے کہ اب تو قلم تراشنے کی ضرورت نہیں، قلم بنے بنائے ملتے ہیں، روشنائی بنانے کی ضرورت نہیں، وہ بھی بنی بنائی ملتی ہے، اسباب علم زیادہ ہو گئے لیکن علم اُٹھ گیا۔

قیامت سے پہلے جھوٹے نبی

[حدیث:۱۲۴۱] ''عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ ......، إِنَّ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ كَذَّابِينَ......فَاحْذَرُوهُمْ۔''

(صحیح مسلم ج:۱۴ ص:۱۴۱، حدیث نمبر:۵۲۰۴، باب لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَمُرَّ الرَّجُلُ بِقَبْرِ الرَّجُلِ......)

ترجمہ: ''حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک قیامت سے پہلے کچھ جھوٹے لوگ پیدا ہوں گے، ان سے بچتے رہنا۔''

تشریح: اس حدیث میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ قیامت سے پہلے کچھ جھوٹے ہوں گے کذاب ان سے بچ کر رہنا، ان جھوٹوں میں جھوٹے مدعیانِ نبوت بھی ہوئے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اور آپ کے بعد مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کیا، اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کیا، ایک سجاح نامی خاتون تھی اس نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا، ایک طلیحہ بن اسد خویلدی تھے انہوں نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا، لیکن یہ آخری طلیحہ بعد میں مسلمان ہو گئے تھے، اور معرکۂ جہاد میں شہید ہوئے، سچے پکے مسلمان ہو گئے، انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں شکست کھائی تھی لیکن بھاگ گئے تھے، راہِ فرار اختیار کر لی تھی بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو توبہ کی توفیق دے دی۔ اور یہ سلسلہ قریب قریب ہر صدی میں جھوٹے مدعیانِ نبوت کا چلتا رہا ہے، گزشتہ صدی میں مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور قادیانی جماعت بنائی، جو بڑی تیزی سے اپنا کام کر رہی ہے۔

طریف نامی ایک شخص گزرا ہے، اس کی اولاد میں تین سو سال تک سلطنت رہی، باقاعدہ حاکم رہے ایک علاقے کے، لیکن مرکھپ گئے، اب کوئی نام بھی نہیں جانتا اس کا، ایک صدی تو مرزائیوں کو گزر چکی ہے مارے مارے پھر رہے ہیں، پہلے ہندوستان میں قادیان میں ہوتے تھے، وہاں سے بھاگے ربوہ میں آئے، اور یہاں سے بھاگے اور اپنی جنم بھومی میں جا کے پناہ لی یعنی لندن میں، مکہ مدینہ میں اب تک نہیں جا سکے، وہ کیسے مسلمان ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے آج تک مکہ مدینہ جانے کی توفیق نہ دی، دجال پوری زمین میں پھرے گا لیکن مکہ اور مدینہ نہیں جا سکے گا، تو مسیلمہ کذّاب کا چھوٹا بھائی ہے غلام احمد قادیانی اور اس کے ماننے والے۔

اسی طرح جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے نام پر جھوٹی حدیثیں گھڑی ہیں، وہ بھی کذاب تھے، ان سے بھی بچنے کا حکم فرمایا۔

قومِ ثقیف کا ہلاکو

[حدیث: ۱۲۴۲] ".....ثُمَّ أَرْسَلَ إِلَى أُمِّهِ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ .....أَنَّ فِي ثَقِيفٍ كَذَّابًا وَمُبِيرًا..."

(صحیح مسلم ج:۱۲، ص:۳۸۰، حدیث نمبر:۴۶۱۷، باب ذِكْرِ كَذَّابِ ثَقِيفٍ وَمُبِيرِهَا)

ترجمہ: "حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک قوم ثقیف میں ایک ہلاکو ہوگا اور ایک جھوٹا کذاب۔"

تشریح: اس حدیث میں بھی ایک پیشین گوئی کی گئی ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو یزید ان کا جانشین ہوا، ان کی حکومت ملک شام میں تھی یعنی پایہ تخت ان کا ملک شام تھا ورنہ حکومت تو ساری اسلامی مملکت میں تھی، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال اور یزید کے ان

کے جانشین بننے کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے مکہ میں اپنی حکومت قائم کرلی اور حجاز کا علاقہ ان کے زیر نگیں ہو گیا۔ ادھر کوفہ والوں نے بھی بغاوت کر دی تھی، ادھر مدینہ والوں نے بھی یزید کے خلاف بغاوت کر دی تھی، مکہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر نے باقاعدہ خلافت قائم کرلی۔ یہ یزید کی بدبختی ہے کہ اس نے تینوں جگہ فوج کشی کی، کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا، مدینہ طیبہ پر لشکر کشی کی تو تین دن تک مدینہ میں لڑائی ہوتی رہی، بہت سے حضرات اس لڑائی میں شہید ہوئے، مسلم بن عقبہ اس کا جرنیل تھا، جس نے مدینہ پر چڑھائی کی تھی اور مدینہ کو لوٹا تھا، تین دن تک مسجد نبوی میں جماعت نہیں ہو سکی، یزید نے اس کو کہا تھا کہ مدینہ فتح کرنے کے بعد پھر مکہ جانا، یہاں سے فارغ ہو کر پھر اس نے مکہ کا رُخ کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو اتنی مہلت نہیں دی راستے ہی میں مر گیا، اس نے اپنا ایک جانشین مقرر کر دیا، اس نے جا کر مکہ پر حملہ کیا، لڑائی جاری تھی، ایک دن حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اس سے بلند آواز سے کہا: تم جس کی خاطر لڑ رہے ہو وہ تمہارا طاغیہ یعنی یزید مر گیا، وہ تمہارا طاغوت، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو پہلے اطلاع مل چکی تھی اور ان لوگوں کو بعد میں ملی، انہوں نے فوجیں ہٹالیں اور واپس چلے گئے۔

یزید کا کام تمام ہوا، صرف تین سال اور چند مہینے اس کی حکومت رہی، اور یہ تین داغ اس کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکا بن گئے، کربلا کا حادثہ، مدینہ کا حادثہ اور مکہ مکرمہ پر چڑھائی اور بیت اللہ پر سنگ باری۔

یزید کے بعد اس کے بیٹے معاویہ کو، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پوتے کا نام بھی معاویہ ہے، یہ بیس سال کا نوجوان تھا، اس کو خلیفہ مقرر کیا گیا، یہ پہلے دن سے جا کر اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گیا، اور چالیس دن تک باہر ہی نہیں نکلا، چالیس دن کے بعد باہر آیا اور مجمع عام میں مسجد میں لوگوں سے کہا: ہمارے خاندان کے لئے میرے باپ یزید کے گناہ کافی ہیں، اس بوجھ کو میں مزید نہیں بڑھانا چاہتا، جو چاہے اپنا خلیفہ مقرر کرو، اور تھوڑی عمر پائی اور ایسا خوف رکھنے والا انسان، اب میدان خالی تھا، ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ ذرا عقل مندی سے کام لیتے، سارے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی اطاعت پر آجاتے، وہ صحابی رسول ہیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نواسے ہیں، سب سے پہلا بچہ جو مدینہ میں ہجرت کے بعد پیدا ہوا وہ حضرت عبداللہ بن زبیر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل اسلام کو ان کی پیدائش پر بہت خوشی ہوئی تھی کیونکہ یہودیوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ یہ جو باہر سے پناہ گیر آرہے ہیں یعنی مہاجرین ہم نے ان پر جادو کر دیا ہے ان کی اب کوئی نسل نہیں چلے گی، ہم نے ان کی پیدائش بند کر دی ہے تو جب ان کی پیدائش ہوئی تو ظاہر ہے کہ وہ جادو ٹوٹ گیا۔

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما ایک صحابی ہیں، ان کا بھی ایک خاص قصہ ہے اور ایک نہیں بہت سے قصے ہیں، وہ انصار میں سب سے پہلے بچے پیدا ہوئے، مہاجرین میں حضرت عبداللہ بن زبیر اور انصار میں حضرت

نعمان بن بشیر، وہ بھی صحابی بن صحابی ہیں اور یہ بھی صحابی بن صحابی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ہر اعتبار سے خلافت کے اہل تھے، اور انہوں نے اپنی خلافت حجاز میں قائم کر رکھی تھی، لیکن حکومت ایسی چیز ہے ادھر ملک شام میں مروان نے خلافت کا دعویٰ کر دیا، خلافت کا دعویٰ کر دیا تو ظاہر بات ہے کہ خلافت ایسے ہی تو حاصل نہیں ہوتی، اس غریب کو اس کے لئے تلوار استعمال کرنا پڑی اور چند دن کے بعد قتل ہو گیا، اس نے حکومت کی بنیاد تو رکھ دی تھی مروان کے بعد ان کا لڑکا عبدالملک بن مروان خلیفہ بنا اور یہاں سے بنوامیہ کی یعنی اُموی خاندان کی حکومت قائم ہوئی، عبدالملک بن مروان دُنیا کے لحاظ سے خوش قسمت انسان نکلا کہ اس کے چار لڑکے اور اس کا داماد گویا بیٹی یہ پانچ خلیفہ ہوئے، ولید بن عبدالملک، ہشام بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز یہ ان کے داماد ہیں، فاطمہ بنت عبدالملک کے شوہر۔

عبدالملک بن مروان نے حکومت قائم اور مستحکم کر لینے کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے مقابلے میں لشکر کشی کی اور اس کے لئے حجاج بن یوسف کا انتخاب کیا، یہ بڑا لمبا قصہ ہے، بڑے المناک واقعات ہیں، بالآخر حضرت عبداللہ بن زبیر شہید کر دیئے گئے، عین حرم کے اندر، شہید کر کے حجاج کے انتقام کی آگ نہیں بجھی، بلکہ ان کو سولی پر لٹکا دیا، مردہ لاش کو لٹکا رکھا ہے، تین دن اسی طرح گزر گئے، ان کی والدہ ماجدہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما یہ تین دن گزر جانے کے بعد وہاں سے گزریں، تو صرف اتنا فرمایا: کیا اس شہسوار کے اُترنے کا وقت ابھی نہیں آیا؟ حجاج نے بڑا خطرہ محسوس کیا کہ یہ تو سیاسی حالات خراب ہو جائیں گے، اس نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے پاس سپاہی بھیجے کہ تمہیں امیر بلاتے ہیں گورنر صاحب، وہ فرمانے لگیں: میں وہاں نہیں جاتی اس کو جا کر کہہ دو، اس نے کہا: تم خود آؤ گی یا میں کوئی آدمی بھیجوں جو تمہیں سر کی چوٹی سے گھسیٹ کر یہاں لائے؟ یہ بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں، فرمانے لگیں: میں نہیں آتی! بھیج دو جو مجھے چوٹی سے گھسیٹ کر لے جائے، تم میں ہمت وجرأت ہے تو بھیج دو، یہ اتنی دلیر ماں تھیں، جس دن حضرت عبداللہ بن زبیرؓ شہید ہوئے ہیں اس دن اپنی والدہ کو سلام کرنے کے لئے گئے اور کہنے لگے: امّی! حالات بہت نزاکت اختیار کر چکے ہیں، یا تو مسلمانوں کی جان بچانے کے لئے ہتھیار ڈال دُوں، بلا وجہ مسلمانوں کو قتل کروا رہا ہوں، کیا فائدہ اس کا؟ حالات قابو میں نہیں آتے اور یا پھر مر جاؤں اور شہید ہو جاؤں، فرمانے لگیں: اگر تم اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہو تو ہتھیار ڈالنے کی ضرورت نہیں، ہاں! اگر اپنے آپ کو غلط سمجھتے ہو تو ہتھیار ڈال دو۔

بہر حال جب حجاج کو حضرت اسماء نے یہ پیغام بھیجا کہ مجھے خوشی ہوگی کہ تم کسی ایسے آدمی کو بھیجو جو میرے سر کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ کر تمہارے پاس لے جائے، میں بھی دیکھتی ہوں کہ کون آئے گا مائی کا لال؟ تو حجاج نے اپنے جوتے پہنے اور خود وہاں چلا گیا، حضرت اسماء کے مکان پر، اس کو گورنری اور فتح کا نشہ

تھا، کہنے لگا: تم نے دیکھ لیا کہ اللہ کے دشمن کے ساتھ میں نے کیا کیا؟ عبد اللہ بن زبیر کو اللہ کا دشمن کہہ رہا ہے، خود اللہ کا دوست بنا ہوا ہے، غالباً یہ جو آج کل کے ہمارے حکمران ہیں یہ بھی یہی سمجھتے ہوں گے، جو بھی اقتدار پر آجاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ میں اللہ کا ولی ہوں اور باقی سب اللہ کے دشمن ہیں، کہنے لگا: تم نے دیکھ لیا کہ میں نے اللہ کے دشمن کے ساتھ کیا کیا؟ کہنے لگیں: میرا خیال یہ ہے کہ تم نے اس کی دنیا خراب کردی اور اپنی آخرت خراب کرلی، اس کے بعد ارشاد فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ قبیلہ بنوثقیف میں ایک مبیر ہوگا ہلاکو خان اور ایک کذّاب ہوگا، کذّاب تو ہم نے دیکھ لیا، وہ تھا مختار ثقفی جس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا، اور میرا خیال یہ ہے کہ وہ مبیر جو کہا تھا حضور ﷺ نے وہ تو ہے، آنحضرت ﷺ کی یہ پیش گوئی تم دونوں کے بارے میں پوری ہوگئی، ایک مختار ثقفی اور دوسرا حجاج بن یوسف ثقفی، کھسیانہ ہوکر چپ ہوکر واپس چلا آیا اور ساتھ حضرت اسماء نے یہ بھی فرمایا کہ: تجھے عورتوں سے بحث کرتے ہوئے شرم تو آنی چاہئے تھی، اب تو اس نوبت تک پہنچ گئے کہ عورتوں سے بھی بحث کرنے لگے۔

جنگِ جمل میں جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہودج گرا دیا گیا تو امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بصرہ کے سب سے بڑے مکان جو طلحہ کا مکان تھا، حضرت عائشہ کو وہاں ٹھہرایا، حکم دیا کہ وہاں ٹھہرایا جائے گا اور تین دن تک حضرت علیؓ وہاں ان کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لاتے رہے، کبھی کبھی بات تلخ بھی ہوجاتی، ایک موقع پر فرمایا: "يَابْنَ أَبِي طَالِبٍ! قَدْ مَلَكْتَ فَاسْجِحْ" ابوطالب کے بیٹے! تو مالک ہوگیا ہے، تجھے فتح ہوگئی ہے، لہٰذا مزاج میں نرمی پیدا کرو۔

جس خاتون کا کوفہ میں یہ مکان تھا، ان کے چار بیٹے تھے، دو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف تھے، دو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اور چاروں شہید، حضرت امیر المومنین جب حضرت عائشہ کی زیارت کے لئے تشریف لاتے تھے تو وہ خاتون جس کا مکان کوفہ میں سب سے بڑا تھا سوچ سکتے ہو کہ کتنی معزز ہوگی، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عورتوں کی طرح کوسنے سناتی تھی، اللہ تیرے بچوں کو مارے جس طرح تو نے ہمارے بچوں کو مارا، نہ معلوم کیا کیا کہتی تھی اور حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ ایک حرف بھی جواب نہ دیتے تھے، ایک لفظ نہ بولتے، سیدھے وہاں سے گزرتے ہوئے اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس چلے جاتے اور مزاج پرسی کرنے کے بعد وہاں سے واپس آجاتے، اس خاتون کو کچھ نہ کہتے، وہ نہ جانے کیا کچھ کہتی جو عورتوں کے کوسنے ہوتے ہیں، ایک دن ایک مصاحب ورفیق نے کہا: حضرت! یہ عورت بک بک کرتی ہے آپ اس کا جواب نہیں دیتے؟ علامہ حافظ ابن کثیر دمشقی نے "البدایہ والنہایہ" میں یہ واقعہ نقل فرمایا ہے: فرمایا: "تیرا ناس ہوجائے، ہمیں تو عورتوں کا احترام کرنے کا حکم دیا گیا ہے جبکہ وہ کافرات ہوں، یہ تو مومنات میں سے ہے اور مہاجرات میں سے ہے۔" یہ ہے عالی حوصلہ جو خلافت راشدہ کو دیکھنا چاہتا ہے، ایک خلیفہ راشد کو اتنا اُونچا ہونا چاہئے۔

اُمّ المؤمنین سے بات کرتے وقت کوئی بات ہو جاتی کہ آپ نے ایسا کیا، اتنے آدمی مر گئے دونوں طرف کے، وہ تو شکوہ شکایات ہے لیکن اس خاتون کا جو گالیاں اور کوسنے دے رہی ہے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، اور اس ٹوکنے والے کو کہا کہ ہمیں تو کافرات کا احترام کرنے کو کہا گیا ہے، یہ تو مؤمنات اور مہاجرات میں سے ہے، تو عورتوں سے بحث نہیں کی جاتی۔

بہر حال حدیث میں فرمایا: قبیلہ ثقیف میں ایک مبیر ہوگا یعنی ہلاکو اور وہ حجاج بن یوسف تھا، اور ایک کذّاب ہوگا جو مختار ثقفی تھا، اب ان دونوں کے حالات ذکر کئے جائیں تو پوری ایک کتاب بنتی ہے۔

ایک لاکھ آدمی اپنے سامنے کھڑے کر کے مروائے تھے، جو جنگوں میں مارے گئے وہ مزید برآں ہیں، اس سے سمجھ لو کہ اس سے بڑا ہلاکو کون ہوگا؟ آخری آدمی جن کو اس نے شہید کیا تھا حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جو ایک جلیل القدر تابعی ہیں۔

حضرت نے فرمایا: مجھے آخری دو رکعتیں پڑھنے دو، کہا پڑھ لو، نماز پڑھنے کے بعد قبلے کی طرف رُخ کیا تو کہا کہ: ان کا رُخ پھیر دو، حضرت نے ادھر ہی منہ کر لیا اور فرمایا: ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ﴾ (البقرۃ:۱۱۵) اللہ اکبر! جدھر منہ کر لو ادھر ہی اللہ ہے۔ بڑے اطمینان سے نماز پڑھی اور فرمایا کہ: جی تو چاہتا تھا کہ نماز اور لمبی کروں لیکن تم کہو گے کہ موت کے ڈر سے نماز لمبی کر رہا ہے اس لئے میں نے مختصر کر دی اور پھر دُعا کی کہ: اے اللہ! میرے بعد اس کو کسی پر مسلط نہ کرنا۔ شہید کر دیا، چند دِن کے بعد یہاں معدہ کے اندر ناسور ہو گیا، آج کل کہتے ہیں کہ کینسر ہو گیا، ایک طبیب کو بلوایا گیا، اس نے اتنی سی بوٹی رسّی کے ذریعے گلے میں اُتار دی اور اس کو کھینچا تو ساری کیڑوں سے بھری ہوئی تھی، اندازہ کر سکتے ہیں کہ کیا حال ہوگا؟ حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کے قتل کرنے کے دو ڈھائی ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا، ان کے بعد اس نے کوئی زیادہ وقت نہیں گزارا، اس کے مرنے کے بعد کسی نے اس کو خواب میں دیکھا، اس سے پوچھا: کیسی گزری؟ کہنے لگا کہ: جتنے آدمی مروائے تھے ہر ایک کے بدلے میں مجھے قتل کیا گیا اور سعید بن جبیر کے بدلے میں ستر دفعہ قتل کیا گیا، اس خواب کی تعبیر کسی عالم کی خدمت میں طلب کی گئی، پوچھا گیا کہ اس نے تو حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے اُونچے اُونچے لوگوں کو شہید کیا، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو شہید کیا اور صحابہ کو شہید کیا، یہ تو تابعی تھے، یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد تھے، تو ان عالم نے فرمایا کہ: تمہارا خواب بالکل صحیح ہے، یہاں بات بزرگی کی نہیں نفع کی ہے، جب اس نے دوسرے لوگوں کو مارا ہے تو ان کا بدل موجود تھا، اس جس دن حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کو شہید کیا اس وقت پوری دنیا میں ان کا بدل موجود نہیں تھا، اس ظالم نے اس نافع ترین وجود سے پوری دُنیا کو محروم کر دیا، اتنا بڑا عالم، اس کے وجود سے اُمّت کو محروم کر دیا تو یہ ہلاکو خان تھا جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی۔

حدیث دجال

[حدیث:۱۲۴۳] ”عَنْ حُذَیْفَةَ.......، إِنَّ مَعَهُ مَاءً وَنَارًا فَنَارُهُ مَاءٌ بَارِدٌ وَمَاؤُهُ نَارٌ۔“

(صحیح بخاری ج:۲۲،ص:۱۰۳، حدیث نمبر:۶۵۹۷، باب ذِکْرِ الدَّجَّالِ، صحیح مسلم ج:۱۴،ص:۱۶۳، حدیث نمبر: ۵۲۲۴، باب ذِکْرِ الدَّجَّالِ وَصِفَتِهِ وَمَامَعَهُ)

ترجمہ: ”حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک دجال کے ساتھ ایک پانی کی نہر ہوگی اور ایک آگ ہوگی، پس اس کی آگ حقیقت میں پانی ہے اور اس کا پانی حقیقت میں آگ ہے۔“

تشریح: اس حدیث شریف میں دجال کے متعلق ہے کہ اس کے ساتھ ایک نہر ہوگی اور ایک آگ ہوگی، حقیقت میں اس کی نہر آگ ہے اور اس کی آگ نہر۔ آخری زمانے میں ایک یہودی کافر نکلے گا، فتح الباری شرح بخاری میں ہے کہ سب سے پہلے وہ نیکی اور پارسائی کا مرزا قادیانی کی طرح دعویٰ کرے گا، بڑا نیک وپاک، بڑا صوفی صافی، پھر جب لوگ اس کے معتقد ہو جائیں گے تو پھر نبوت کا دعویٰ کرے گا کہ میں نبی ہوں، اور کچھ احمق لوگ مرزائیوں کی طرح اس کو مان لیں گے، پھر وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا اور اللہ تعالیٰ بھی اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرمائیں گے استدراج کا۔ ”استدراج“ ڈھیل کو کہا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ خزانے اس کے ساتھ چلیں گے، اس کے حکم سے بارش بھی ہوگی اور صرف اس کے ماننے والوں پر ہوگی اور اس کے نہ ماننے والوں پر نہ ہوگی، صبح کے وقت لوگوں کے مویشی چرنے جائیں گے جیسا کہ دیہاتوں میں ہوتا ہے تو جو اس کے ماننے والے ہوں گے ان کے مویشیوں کے پیٹ بھرے ہوئے ہوں گے، اور جو اس کے ماننے والے نہیں ہوں گے ان کے پیٹ کمر سے لگے ہوں گے بھوکے آئیں گے، ان کے تھنوں میں دودھ نہیں ہوگا، ان کی ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ نہیں رہے گا، بچے بلبلائیں گے، خوراک کے تمام کے اسباب اور ذرائع دجال کے قبضے میں ہوں گے۔

حضرت اسماء بن عمیس رضی اللہ عنہا کی صحیح مسلم میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا بہت لمبا اور طویل تذکرہ فرمایا، اور اس کا تذکرہ سن کر ایسا لگ رہا تھا کہ بس کل دجال آجائے گا، صحابہ کرام بہت پریشان تھے، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم لوگ آٹا گوندھ کر رکھتے ہیں روٹی پکنے میں دیر ہو جاتی ہے تو بھوک سے بے تاب ہو جاتے ہیں، آپ نے جو یہ حالات کا نقشہ بیان کیا ہے اس نے ہماری کمر توڑ دی، اس وقت کے مسلمان کیا کریں گے؟ کہاں سے کھائیں گے کیا کریں گے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”یَکْفِیهِمْ مَا

يَكْفِي الْمَلَائِكَةَ مِنَ التَّسْبِيحِ وَالتَّهْلِيلِ“ جو تسبیح اور تہلیل فرشتوں کی خوراک ہے وہ اہل ایمان کی خوراک بن جائے گی۔ صرف ”سبحان اللہ“ کہنے اور ”لا الہ الا اللہ“ کہنے سے پیٹ بھر جائے گا، کھانے کی حاجت نہیں رہے گی، لیکن اتنا یقین بھی تو ہو کہ ”سبحان اللہ“ کہنے سے پیٹ بھر سکتا ہے، حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات عالی پر اتنا یقین ہو کہ جو مالک فرشتوں کو بغیر کھانے اور پینے کے زندہ رکھ سکتا ہے وہ ہمیں بھی رکھ سکتا ہے، کھانے اور پینے سے مقصود تو زندگی ہے۔

بہر حال اس کا فتنہ شدید اتنا شدید ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جب سے اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو پیدا کیا تب سے لے کر ایسا شدید کوئی فتنہ نہیں اُٹھا، اور اسی میں یہ جملہ بھی ارشاد فرمایا: ”أَلَا يَا عِبَادَ اللّٰهِ! فَاثْبُتُوا“ سنو اے اللہ کے بندو! ثابت قدم رہنا، یہ اصل میں کھرے اور کھوٹے ایمان کی آزمائش ہوگی۔

فتح الباری شرح البخاری میں علامہ حافظ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تابعی کا قول نقل کیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس تابعی تک اس کی سند صحیح ہے، اور اس تابعی نے یہ بات غالباً سنی ہوگی کیونکہ عقل سے نہیں کہی جاسکتی کہ دجال کے فتنے سے آٹھ ہزار مرد اور چار ہزار عورتیں محفوظ رہیں گی، پوری دُنیا میں صرف آٹھ ہزار مرد بچیں گے جو کہ اس کے فتنے سے محفوظ رہیں گے اور صرف چار ہزار عورتیں۔

آنحضرت ﷺ نصیحت فرماتے تھے کہ جب کوئی سنے کہ دجال نکل آیا ہے اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ جائے، اس کے پاس نہ جائے کیونکہ ایک آدمی اس کے پاس مناظرہ کرنے کے لئے جائے گا اور اپنا ایمان بیچ کر آئے گا، صرف ایک آدمی کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دجال کے کارندے اس کو بلائیں گے اور دجال کے پاس اس کو لائیں گے، دجال پوچھے گا کہ: تو مجھے خدا نہیں مانتا؟ وہ کہے گا: تو دجال ہے تجھے خدا کیسے مان لوں؟ تیرے بارے میں تو رسول اللہ ﷺ نے ہر چیز بتادی تھی، تیرے ماتھے پر کافر لکھا ہوا ہے۔ دجال حکم کرے گا کہ اس کو ذبح کردو، لٹا کر اس کو دو حصوں میں چیر دے گا، دو ٹکڑے کردے گا، اور اس کے بعد کہے گا: اُٹھ زندہ ہو! وہ زندہ ہو کر کھڑا ہو جائے گا، وہ کہے گا: اب مانتے ہو کہ میں خدا ہوں؟ وہ کہے گا: اب اس سے بھی زیادہ پکا یقین ہوگیا ہے کہ تو ہی دجال ہے اور اس کے بعد وہ اہل ایمان سے کہے گا کہ پروا نہ کرو، میرے بعد اب اس کو کسی کو مارنے کی طاقت نہ ہوگی۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے، وہ کہے گا: لٹاؤ اس کو ذبح کردو لیکن اللہ تعالیٰ گلے کو تانبے کا کردیں گے، وہ ذبح نہیں کرسکے گا۔

یہ ساری چشم بندیاں ہوں گی اس کی اور اللہ تعالیٰ اس کو استدراج دیں گے، اتنی ڈھیل کہ اس سے بڑا فتنہ کوئی ہوا ہی نہیں ہے، اور فرمایا: ”لَمْ يُبْعَثْ نَبِيٌّ قَبْلِي إِلَّا حَذَّرَ قَوْمَهُ مِنَ الدَّجَّالِ الْكَذَّابِ“ (مسند احمد ۲/۲۷، ۱۲۹۵۷) کوئی نبی ایسا نہیں ہوا کہ جس نے اپنی قوم کو دجال سے نہ ڈرایا ہو، نوح علیہ السلام نے بھی اپنی

قوم کو دجال سے ڈرایا۔

ایک موقع پر فرمایا: میں نے تمہیں اتنی باتیں دجال کے متعلق بتادی ہیں کہ مجھے یہ خیال ہونے لگا ہے کہ پتا نہیں تم کیا یاد رکھو گے کیا یاد نہیں رکھو گے؟ تمہیں ایک موٹی بات بتاتا ہوں وہ آنکھوں سے کانا ہوگا، ہمارا خدا کانا نہیں ہے، اور ایک آنکھ تو بالکل ہی سپاٹ ہوگی یعنی آنکھ کی جگہ ہی نہیں ہوگی، اور دوسری آنکھ ہوگی لیکن اُوپر کو اُبھری ہوئی ہوگی، ایسا بد شکل ہوگا، وہ یہودی کانا دجال اور اس کے ماتھے پر ''ک ف ر'' لکھا ہوا ہوگا اور ہر پڑھا لکھا اور اَن پڑھ اس کو پڑھ سکے گا، اس کا وجود خود اس کی خدائی کی تکذیب کرتا ہے، لیکن جن لوگوں نے غلام احمد قادیانی کانے کو نبی مان لیا ان لوگوں سے کیا بعید ہے کہ وہ دجال کو بھی خدا مان لیں؟

تو جو لوگ کہ اس کی آگ میں چھلانگ لگائیں گے حقیقت میں وہ آبِ حیات میں چھلانگ لگا رہے ہیں، وہ اس سے ڈریں نہیں، جل جائیں گے اور کیا ہوگا؟ سیدھے جنّت میں پہنچ جائیں، اور جو اس کی نہر میں اُتریں گے وہ دوزخ کے گڑھے میں اُتریں گے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ہر نماز میں دجال کے فتنے سے پناہ مانگتے تھے:

''اَللّٰھُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِکَ مِنْ عَذَابِ جَھَنَّمَ وَأَعُوذُبِکَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَأَعُوذُ بِکَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ وَأَعُوذُبِکَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْیَا وَالْمَمَاتِ (ابوداؤد ۳/۱۶۶، ۸۳۴) اَللّٰھُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِکَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ۔'' (ابوداؤد ۳/۷، ۲۴۶،۷۴)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ہر نماز میں رسول اللہ ﷺ ان پانچ چیزوں سے پناہ مانگا کرتے تھے اور تلقین فرماتے تھے کہ ان پانچ چیزوں سے پناہ مانگا کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے، آمین۔

فتنۂ دجال سے حفاظت کا عمل

[حدیث: ۱۲۴۴] ''عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ......، مَنْ حَفِظَ عَشْرَ آیَاتٍ مِنْ أَوَّلِ سُورَةِ الْکَھْفِ عُصِمَ مِنَ الدَّجَّالِ۔''

(صحیح مسلم ج:۴،ص:۲۳۸، حدیث نمبر:۱۳۴۲، باب فَضْلِ سُورَةِ الْکَھْفِ وَآیَةِ الْکُرْسِيِّ)

ترجمہ: ''حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص سورۂ کہف کے سرے کی دس آیات یاد کرلے وہ دجال کے فتنے سے بچا۔''

تشریح: اس حدیث میں ہے جس شخص نے دس آیتیں سورۂ کہف کے سرے کی، اوّل کی یاد کرلیں وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔ ایک روایت میں اوّل کہف آتا ہے، ایک روایت میں آخرِ کہف آتا ہے، اور ایک روایت میں یوں آتا ہے کہ جس شخص نے یاد کیا سورۂ کہف کو، اور ایک روایت میں یوں آتا ہے کہ جو

شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھا کرے، وہ فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا۔

اس لئے اکابر کا ہمیشہ اہتمام رہا جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھنے کا۔ آپ حضرات بھی اس کو پلے باندھ لیں، سورۂ کہف جمعہ کے دن لازماً پڑھا کریں، میں جمعہ کی سنتوں میں سورۂ کہف پڑھتا ہوں، جمعہ سے پہلے اور بعد کی سنتوں میں صرف سورۂ کہف پڑھتا ہوں، اس طرح مجھے یاد رہتا ہے بھولتا نہیں کہ مجھے یہ پڑھنی ہے اور پڑھی ہے یا نہیں پڑھی؟ ورنہ بھول ہو جاتی ہے، یہ کافی عرصے سے معمول بنا رکھا ہے۔ تو سورۂ کہف لازماً پڑھو، اور اپنے گھر میں بچیوں کو بھی بتاؤ، وہ بھی سب کی سب یہ پڑھا کریں، اللہ تعالیٰ دجال کے فتنے سے محفوظ فرمائے۔

دجال کے نکلنے کی خبر

[حدیث:۱۲۴۵] ”......، يَا عَبْدَ اللهِ بْنَ مَسْعُودٍ......، إِنِّي لَأَعْرِفُ أَسْمَاءَهُمْ وَأَسْمَاءَ آبَائِهِمْ وَأَلْوَانَ خُيُولِهِمْ هُمْ خَيْرُ فَوَارِسَ عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ يَوْمَئِذٍ أَوْ مِنْ خَيْرِ فَوَارِسَ عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ يَوْمَئِذٍ، (يعنى عَشَرَةَ فَوَارِسَ يَبْعَثُونَ طَلِيعَةً بَعْدَ فَتْحِ قُسْطُنْطِينِيَّةَ حِينَ يُقَالُ إِنَّ الدَّجَّالَ قَدْ خَلَفَهُمْ فِي ذَرَارِيهِمْ)۔“

(صحیح مسلم ج:۱۴، ص:۹۰، حدیث نمبر:۵۱۶۰، باب إِقْبَالِ الرُّومِ فِي كَثْرَةِ الْقَتْلِ عِنْدَ خُرُوجِ الدَّجَّالِ)

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک میں پہچانتا ہوں ان کے ناموں کو اور ان کے باپوں کے ناموں کو اور ان کے گھوڑے کے رنگ کو، وہ بہترین شہسوار ہوں گے روئے زمین پر اس دن، یا یہ فرمایا کہ: من جملہ بہترین شہسواروں کے ہوں گے اس دن رُوئے زمین پر، یعنی دس آدمی جن کو بھیجا جائے گا اطلاع پانے کے لئے دجال کے نکلنے کی خبر پر قسطنطنیہ کی فتح کے بعد، جب یہ کہا جائے گا کہ دجال ان کے پیچھے آگیا ہے ان کے بال بچوں میں۔“

تشریح: اس حدیث میں حضرت امام مہدی کے زمانے کا ایک واقعہ ذکر فرمایا ہے، یہ روایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے، ان کے زمانے میں ایک مرتبہ تیز ہوا چلی، آندھی آئی تو لوگ گھبرا گئے کہ کہیں قیامت تو نہیں آگئی، اسی خیال کا اظہار لوگوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی کیا، فرمایا: ابھی کہاں قیامت آگئی، قیامت سے پہلے کچھ واقعات رونما ہوں گے، ان میں سے ایک واقعہ یہ ہوگا کہ مسلمان مالِ غنیمت حاصل کریں گے لیکن ان کو اس کی خوشی نہیں ہوگی اور فرمایا کہ اس کا واقعہ یہ ہوگا کہ رُومیوں کے

ساتھ لڑائی ہوگی یعنی عیسائیوں کے ساتھ، پہلے دن مسلمانوں کے ایک تہائی لشکر کو شکست ہوجائے گی، قتل ہوجائیں گے۔ دوسرے دن لڑائی ہوگی پھر قتل ہوجائیں گے، اور تیسرے دن مسلمانوں کا لشکر شرط باندھ کر جائے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کو فتح فرمادیں گے۔ بے شمار سونے چاندی کے ڈھیر اور مال غنیمت ان کو حاصل ہوگا لیکن کسی کو خوشی نہیں ہوگی اس لئے کہ ایک خاندان میں سو آدمی تھے تو ایک بچے گا، ننانوے آدمی اسی جہاد میں شہید ہوجائیں گے، پھر خوشی کس غنیمت پر؟ قسطنطنیہ کے محاذ پر لڑائی ہورہی ہوگی اتنے میں خبر آئے گی کہ دجال تمہارے پیچھے گھروں میں آگیا ہے، دجال نکل آیا ہے۔

تو حضرت مہدی علیہ الرضوان دس آدمیوں کو اس خبر کی اطلاع کے لئے تحقیق کے لئے بھیجیں گے، آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ: میں ان کے ناموں کو جانتا ہوں، ان کے باپوں کے نام جانتا ہوں اور ان کے گھوڑوں کے رنگ جانتا ہوں، اور وہ اس وقت رُوئے زمین کے سب سے بہترین شہسوار ہوں گے، یہ تحقیق کرنے کے لئے جائیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ خبر غلط ہے، دجال نہیں آیا، یہ واپس آجائیں گے اتنے میں پھر خبر آئے گی کہ دجال آگیا، پھر تحقیق حال کے لئے بھیجا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ واقعی یہ خبر صحیح ہے، قسطنطنیہ کے محاذ کو چھوڑ کر حضرت مہدی علیہ الرضوان دجال کے مقابلے کے لئے آجائیں گے اور بیت المقدس کے علاقے میں ان کا دجال کی فوجوں سے مقابلہ ہوگا، یہاں تک کہ دجال کی فوج ان کی فوج کا محاصرہ کرلے گی اور ان کے نکلنے کا راستہ بند ہوجائے گا، مسلمان اس وقت بہت شدت اور پریشانی کے حال میں ہوں گے، اتنے میں صبح صادق کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان دنیا سے نزول ہوگا اور ایک آواز آئے گی: "قَدْ أَتَاكُمُ الْغَوْثُ" غوث یعنی فریاد کو پہنچنے والا تمہارے پاس آگیا، تمہاری مشکل آسان ہوگئی، تو یہ آواز سن کر مسلمان کہیں گے: یہ کسی پیٹ بھرے کی آواز ہے، کوئی توقع ہی نہیں کہ کسی طرف سے کوئی ہماری مدد کو آجائے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام دمشق کی جامع مسجد کے شرقی مینارے پر اُتریں گے، وہاں سے سیڑھی لگا کر ان کو اُتارا جائے گا، اور سیدھے لشکر کو چیرتے ہوئے یہ ان کا معجزہ ہوگا کہ کوئی ان کو روک نہیں سکے گا، دجال کے لشکر کو چیرتے ہوئے حضرت مہدی کے لشکر میں پہنچ جائیں گے اور عین اس وقت آئیں گے جب فجر کی نماز ہونے والی ہوگی، اقامت ہوچکی ہوگی اور امام مصلیٰ پر ہوگا، اللہ اکبر کہنے کی دیر تھی اتنے میں پہنچ جائیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری سے مسلمانوں کی خوشی کا کیا پوچھنا کہ کیا حال ہوگا، حضرت مہدی پیچھے ہٹ جائیں گے کہ آپ امامت فرمائیں، اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے: "صَلِّ أَنْتَ فَإِنَّهَا أُقِيمَتْ لَكَ" آپ ہی نماز پڑھائیں اس لئے کہ یہ اقامت آپ کے لئے ہوئی ہے۔ "إِنَّ بَعْضَكُمْ أُمَرَاءُ بَعْضٍ تَكْرِمَةَ اللهِ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ" تم میں سے بعض بعض کے امیر اور امام ہیں، یہ حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے

اس اُمت کا اعزاز ہے، ایک جلیل القدر اُولوالعزم نبی آ کر ایک اُمتی کی اقتدا کرتا ہے، یہ حق تعالیٰ شانہٗ کی جانب سے ایک اعزاز ہے، چنانچہ وہ نماز پڑھائیں گے نماز سے فارغ ہو کر وہ فرمائیں گے کہ راستہ دے دو۔ مسلمان راستہ دیں گے جب دجال کو معلوم ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لے آئے ہیں تو بھاگ کھڑا ہوگا، ان کا رئیس ہی بھاگ گیا تو پیچھے یہودی بھی کیا کریں گے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے تو جتنا چاہے بھاگ اللہ تعالیٰ نے میری ایک ضرب تیرے لئے مقدر کر رکھی ہے۔

چنانچہ باب ’لُد‘ پر جو اس وقت اسرائیل کا ایئرپورٹ ہے اس کے دروازے پر جالیں گے اور اس کو اپنے نیزے کے ساتھ ہلاک کریں گے، اور مسلمانوں کو اس کا خون نیزے پر لگا ہوا دکھائیں گے، اس کے بعد یہودیوں کا مقابلہ ہوگا اور یہود میں افراتفری پھیل جائے گی، حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ ان کو شجر و حجر بھی پناہ نہیں دیں گے، بلکہ شجر و حجر بھی پکاریں گے: ’’اے مسلمان! یہاں یہودی چھپا ہوا ہے اس کو قتل کر دو‘‘ یہ واقعہ اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

فتنے کا علاج

[حدیث: ۱۲۴۶] ’’سَمِعتُ عَرفَجَةَ ......، إِنَّهُ سَتَكُونُ هَنَاتٌ وَهَنَاتٌ فَمَنْ أَرَادَ أَنْ يُفَرِّقَ أَمْرَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ وَهِيَ جَمِيعٌ فَاضْرِبُوهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَنْ كَانَ۔‘‘

(صحیح مسلم ج:۹ ص:۳۹۵، حدیث نمبر: ۳۴۴۲، باب حُكْمِ مَنْ فَرَّقَ أَمْرَ الْمُسْلِمِينَ وَهُوَ مُجْتَمِعٌ)

ترجمہ: ’’حضرت عرفجہ بن شریح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عنقریب بہت سے نامناسب کام ہوں گے، یعنی فتنہ اور فساد، پس جو شخص کہ اُمت کی امامت اور ریاست کی جمی جمائی میں پھوٹ ڈالنا چاہے تو اس کو تلوار سے قتل کر دو، چاہے کوئی بھی ہو۔‘‘

تشریح: ’’اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پیش گوئی فرمائی ہے کہ اس اُمت میں بہت سے ناشائستہ اور نامناسب اُمور ظاہر ہوں گے، فتنہ اور فساد ہوں گے، لڑائی جھگڑے ہوں گے، اب جبکہ اُمت ایک شخص پر مجتمع ہو چکی ہے، جمع ہو چکی ہے اس کے خلاف اگر کوئی شخص بغاوت کرے تو تم اس کو قتل کر ڈالو چاہے کوئی شخص ہو، اپنا ہو پرایا ہو۔

ایک تو ہے فتنوں اور فساد کی پیش گئی، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم میں فتنے نہیں ہوئے، ذرا معمولی سا فتنے کا اندیشہ ہوا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے موقع پر یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مہاجر تھے مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے اور اہل

مدینہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دی تھی، تو عرب کے دستور کے مطابق جو باہر سے آنے والا ہے اس کا حق حکومت کا نہیں، بلکہ حکومت قائم کرنا مقامی لوگوں کا کام ہے، اس لئے انصار آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ کس کو امیر بنایا جائے، اتنے میں وہاں کچھ مہاجر بھی پہنچ گئے، تو کچھ ناخوشگوار سی صورت پیش آنے لگی، حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ جو انصار کے سردار تھے ان کو بطور خلیفہ کے نامزد کیا جا رہا تھا، حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظامات میں مصروف تھے ان سے کسی نے آکر یہ کہا کہ انصار یہ مشورہ کر رہے ہیں، اگر انہوں نے کسی آدمی کو مقرر کرلیا تو پھر ایک فتنہ کھڑا ہو جائے گا، اس لئے آپ حضرات کو وہاں پہنچنا چاہئے اور اس معاملے میں مداخلت کرنی چاہئے تاکہ فتنہ نہ اُٹھے، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "أَمِينُ هَذِهِ الْأُمَّةِ" (صحیح البخاری ۱۳/ ۲۸۴، ۴۰۲۹، مسند احمد بن حنبل ۱/ ۲۳۱، ۲۲۷، کنز العمال ۵/ ۵۹۰، ۱۴۰۵۲) کا لقب دیا تھا یہ تینوں چلے گئے۔

وہاں انصار کی بڑی گرما گرم تقریریں ہو رہی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں راستے میں ایک تقریر سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ جا کر یہ تقریر کروں گا، تو میں نے ارادہ کیا کہ میں یہ تقریر کروں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بٹھا دیا اور خود کھڑے ہو گئے، ان کا کھڑا ہونا تھا کہ سارے خاموش ہو گئے، ان کی وجاہت و احترام تھا، انہوں نے اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: آپ حضرات انصار مدینہ ہیں، آپ کے فضل و کمال اور آپ کے احسانات کو ہم بھولے نہیں ہیں، لیکن یہ معاملہ ایک شہر کی سرداری کا نہیں بلکہ پوری اُمت کی سربراہی کا ہے، تو پہلی بات تو یہ ہے کہ پوری کی پوری اُمت اور خصوصاً عرب یہ قریش کے سوا کسی کو خلیفہ تسلیم نہیں کریں گے، دوسری بات یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی ہے: "أَلْأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْش" (کذا فی کنز العمال ۱/ ۹۷، ۳۰۹، ۱۶۴۹) کہ امام قریش میں سے ہوا کریں گے۔ آپ حضرات کو معلوم ہوگا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ کہنے لگے کہ: ہاں! بہر کیف پھر یہ فرمایا کہ: یہ قریش کے دو بزرگ آپ کے پاس ہیں، ایک عمر اور ابوعبیدہ ان میں سے جس کے ہاتھ پر تم چاہو بیعت کرلو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت ابوبکر نے جب یہ باتیں کیں، ان کی تمام باتیں جو میں سوچتا ہوا جا رہا تھا وہ ساری کہہ دیں، اور بڑے اچھے اُسلوب سے ساری باتیں کہہ دیں، ان کی کوئی بات مجھے ناپسند نہیں آئی سوائے ان کی آخری بات کے، میں نے اُٹھ کر کہا کہ اس قوم کو شرم آنی چاہئے جس میں ابوبکر جیسے موجود ہوں اور وہ کسی اور کو خلیفہ بنائے، وہ تو کھلی تلوار تھے، اور کہا کہ: لایئے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ میں نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ بشیر بن سعد نے مجھ سے پہلے اپنا ہاتھ ابوبکر کے ہاتھ میں دے دیا اور پھر تو لوگ ٹوٹ پڑے اور اس کے بعد ایک آدمی نے بھی اختلاف نہیں کیا، کسی نے بھی نہیں کہا کہ مجھے تھوڑا کچھ سوچنے دو۔

یہ شروع میں تھوڑی سی کچھ مشکل بن گئی تھی، اسی لئے صحیح بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد منقول

ہے کہ: ابوبکر کی بیعت اچانک ہوئی تھی، پہلے سے اس کا کوئی مشورہ نہیں کیا گیا تھا، اور اچانک جو کام کیا جائے اس میں سوچنے کا موقع نہیں ملتا، تو عموماً شر کا پہلو آ جاتا ہے لیکن اس اچانک بیعت کرنے سے جو اچانک شر پیدا ہو سکتا تھا اس سے اللہ تعالیٰ نے بچا لیا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وجہ سے۔

اور شیعوں کا جو اختلاف ہے وہ اسی بناء پر ہے کہ پہلے دن ہی ان مسلمانوں میں پھوٹ پڑ جاتی اور اپنے اپنے گھر چلے جاتے سارے، تو اس کے بعد ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانے میں ایک آدمی نے بھی اختلاف نہیں کیا، اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری دور خلافت میں شریر لوگ کھڑے ہو گئے، انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا اور جب شہید کر دیا تو فتنے کا دروازہ توڑ دیا، کھول نہیں دیا، توڑ دیا۔

صحیح بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ صحابہ سے فرمایا: تم میں سے کون ہے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فتنے کے بارے میں ارشاد فرماتے سنا ہو؟ کسی نے کہا کہ یہ بات، کسی نے کہا یہ بات۔ فرمایا: ان فتنوں کی بات نہیں کر رہا، ان فتنوں کا تو روزے اور نماز ہی کفارہ بن جاتے ہیں، میں اس فتنے کی بات کر رہا ہوں جو دریا کی طرح ٹھاٹھیں مارے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار کے نام سے معروف تھے وہ مسکرا کر فرمانے لگے: امیر المومنین! آپ کو اس فتنے سے کیا واسطہ؟ آپ کے اور اس کے درمیان تو ایک بند دروازہ ہے، جب تک آپ ہیں اس وقت تک فتنہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ: پھر اس دروازے کو کھول دیا جائے گا یا توڑ دیا جائے گا؟ کہا کہ: توڑا جائے گا۔

اسی لئے میں کہہ رہا ہوں کہ ان کے بعد فتنوں کا دروازہ کھولا نہیں گیا بلکہ توڑا گیا ہے، یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا وجود فتنوں کے درمیان سد سکندری تھا، یہ تو عام علماء کی رائے ہے، لیکن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اس دروازے سے مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وجود ہے، جب تک عمر ہیں اس وقت تک فتنہ نہیں ہو سکتا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی شہید کیا گیا تھا، یہ دروازہ توڑا ہی گیا تھا۔

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ فتنے ہوں گے اور فتنے ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ: مجھے قتل نہ کرو، اگر مجھے قتل کر دو گے تو قیامت تک تمہاری تلوار نیام میں واپس نہیں جائے گی اور یہی ہوا پھر کبھی اُمت کی تلوار نیام میں واپس نہیں گئی۔

تو فرمایا: فتنے ہوں گے ہر آدمی چاہے گا کہ مجھے امیر بنا دیا جائے، تو جب اُمت کسی ایک آدمی پر متفق ہو جائے اور خلیفہ بنا لے اور اُمت کا شیرازہ مجتمع ہو جائے اب اگر کوئی شخص اس میں آ کر پھوٹ ڈالنا چاہے یعنی اس خلیفہ کے خلاف بغاوت کرنا چاہتا ہے اس کو قتل کر ڈالو، چاہے کوئی شخص ہو۔

اہلِ مصر کے بارے میں وصیت

[حدیث:۱۲۴۷] "سَمِعْتُ أَبَا ذَرٍّ......، إِنَّكُمْ سَتَفْتَحُونَ أَرْضًا يُذْكَرُ فِيهَا الْقِيرَاطُ (وَيُرْوٰى: سَتَفْتَحُوْنَ مِصْرَ وَهِيَ أَرْض يُسَمّٰى فِيهَا الْقِيرَاطُ) فَاسْتَوْصُوا بِأَهْلِهَا خَيْرًا فَإِنَّ لَهُمْ ذِمَّةً وَرَحِمًا......"

(صحیح مسلم ج:۱۲ص:۳۷۵،حدیث نمبر:۴۶۱۴،۴۶۱۵،باب وَصِيَّةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِأَهْلِ مِصْرَ)

ترجمہ: "حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک تم لوگ فتح کرو گے ایک زمین کو جس میں قیراط کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور ایک روایت میں یوں آتا ہے کہ: تم فتح کرو گے مصر کو اور یہ ایسی زمین ہے جس میں قیراط کا نام لیا جاتا ہے، تو وہاں کے رہنے والوں کے بارے میں بھلائی کی وصیت قبول کرو، اس لئے کہ ان کے لئے امان ہے اور رشتہ ہے۔"

تشریح: اس حدیث شریف میں اہل مصر کے بارے میں وصیت فرمائی اور فرمایا کہ: تم ایسے ملک اور سرزمین کو فتح کرو گے جس میں قیراط کا تذکرہ کیا جاتا ہے، یعنی وہاں سب سے چھوٹا سکہ قیراط کہلاتا ہے، لوگ اس کا بھی تذکرہ کرتے ہیں تو جب تم اس ملک کو فتح کرو تو میں تمہیں وہاں کے رہنے والوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی وصیت کرتا ہوں، یعنی وہاں کے لوگوں کے ساتھ خیر اور بھلائی کا معاملہ کرنا اس لئے کہ ان لوگوں کے لئے امان ہے اور پھر ان لوگوں کے ساتھ رشتہ داری بھی ہے، یہ حدیث چند فوائد پر مشتمل ہے:

پہلی بات یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملک مصر کے فتح ہونے کی پیش گوئی فرمائی، جیسا کہ قیصر اور کسریٰ کے ملکوں کے فتح ہونے کی پیش گوئی فرمائی اور یہ معجزہ نبوت ہے کہ جس طرح آپ نے ارشاد فرمایا ویسا ظہور میں آیا، کسریٰ کا ملک بھی فتح ہوا، قیصر کا ملک بھی فتح ہوا اور مصر بھی فتح ہوا، جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات ارشاد فرمارہے تھے اس وقت عقل وقیاس کی میزان سے کوئی شخص اس کا اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ ایسا ہوسکتا ہے، کوئی نجومی، کاہن، قیافہ شناس، مستقبل بین، اس وقت یہ پیش گوئی نہیں کرسکتا تھا کہ یہ مٹھی بھر مسلمان مصر، فارس اور رُوم کو فتح کرلیں گے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور وہ ہوا۔

علمائے اُمّت فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک کے لئے جو پیش گوئیاں فرمائیں ہیں اسی طرح ہو بہو ظاہر ہوئیں، ان میں سے ایک ایک پیش گوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا معجزہ ہے۔

دوسری بات یہ کہ صحابہ سے یوں فرمایا: تم فتح کرو گے، اور سرزمین مصر فتح ہوئی ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مصر کے فاتح ہیں، تو اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی

کہ جن اکابر کے دور میں آنحضرت ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق فتح ہوئی، یہ خلیفہ برحق تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کو ہدایات جاری فرمائیں، اور اگر خدانخواستہ ان کی خلافت ہی صحیح نہیں تھی تو ان کو ہدایات جاری فرمانے کا کیا مطلب؟

اور تیسری بات یہ ارشاد فرمائی: وہ سرزمین ایسی ہے جس میں قیراط کا تذکرہ کیا جاتا ہے، قیراط: پانچ جو کا ہوتا ہے، پانچ جو کا سکہ۔ عام طور پر غریب ملکوں میں چھوٹے سکے چلتے ہیں اور لوگ اس میں بھی مناقشہ کرتے ہیں جیسے کہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو ایک ٹیڈی پیسہ چھوڑنے کے لئے بھی تیار نہیں، چھوٹے سے چھوٹا سکہ ہوتا تھا یہ کسی زمانے میں۔ اب تو روپیہ چھوٹے سے چھوٹا سکہ رہ گیا ہے فقیر بھی نہیں لیتا، آٹھ آنے، چار آنے، پچیس پیسے، وہ تو ختم ہی ہوتے جا رہے ہیں، اور جب یہ چلائے تھے ایک پیسہ۔ دو پیسہ، پانچ پیسہ، دس پیسہ، وہ تو اب ختم ہی ہوگئے، سرکار نے بھی بند کر دیئے۔

تو غرض یہ کہ کسی چھوٹے سکے پر مناقشہ ہونا یہ علامت ہے اس ملک کے مفلوک الحال ہونے کی اور معاشی اعتبار سے کمزور ہونے کی اور اللہ کی شان یہ کہ مصر آج تک اسی حال میں چلا آرہا ہے، یہ فرعونوں کا ملک معاشی اعتبار سے کمزور ہی ہے، اگرچہ بڑے لوگوں کے پاس دولت ہوتی ہے لیکن ملک کی معیشت دیکھی جاتی ہے عوام کے لحاظ سے، چند افراد کے پاس اگر سرمایہ ضرورت سے زیادہ ہے اور ان کو پیسے کی بدہضمی ہے تو یہ کسی ملک کے آسودہ حال ہونے کا معیار نہیں ہے، دیکھنے کی چیز عام لوگوں کا معیار زندگی ہے اور یہ جو مال دار قسم کے لوگ ہوتے ہیں کہ ان کو عام لوگوں کو کھاتے پیتے دیکھنا اچھا نہیں لگتا ہے اسی لئے کوشش کرتے ہیں کہ نوالہ ان کے منہ سے چھین لیا جائے، لوگ اس قابل نہ رہیں کہ وہ امن وعافیت کی زندگی بسر کرسکیں۔

تو چھوٹے چھوٹے سکوں پر مناقشہ ہونا یہ غربت کی علامت ہے اور آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ اس ملک میں قیراط کا ذکر کیا جاتا ہے جبکہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں عربوں کا چھوٹے سے چھوٹا سکہ درہم تھا، یہ ساڑھے تین ماشے چاندی کا سکہ ہے، اس کے بعد اس کی بھی ریزگاری بنتی تھی لیکن حساب درہم ہی کا چلتا تھا، نصف درہم، رُبع درہم بھی کہہ دیتے تھے۔

اور چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ آنحضرت ﷺ نے ان کے ساتھ بھلائی کی وصیت فرمائی کہ ان کے ساتھ بھلا سلوک کرنا، اس لئے کہ ان کے لئے ذمہ اور امان ہے اور رشتہ۔ یہ ذمہ تو یوں کہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا جو آنحضرت ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی والدہ ماجدہ ہیں، وہ مصر سے آئی ہوئی تھیں اور آنحضرت ﷺ کے حرم میں شامل تھیں، تو اس اعتبار سے ان کے لئے ذمہ ہوا، یعنی سسرالی رشتہ داری ہوگئی، گویا اہل مصر آنحضرت ﷺ کا سسرال ہے اور رشتہ یوں ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے جدِ امجد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ماجدہ بھی وہیں سے آئی ہوئی تھیں، شاہِ مصر نے بطور خادمہ کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا کی،

انہوں نے ان کو اپنی بیوی بنالیا، ان سے اولاد ہوئی، تمام کے تمام عرب انہی کی اولاد ہیں، تو اہلِ مصر سے سسرالی رشتہ بھی ہے اور ننھیالی رشتہ بھی ہے، اور حضرت اسماعیل کی والدہ شریفہ کا میکا ہے۔

فتح بحرین

[حدیث:۱۲۴۸] ''سَمِعْتُ أَنَسًا رَضِيَ اللهُ عَنْهُ......، فَإِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ بَعْدِي أَثَرَةً فَاصْبِرُوا حَتَّى تَلْقَوْنِي عَلَى الْحَوْضِ۔''

(صحیح بخاری ج: ۱۰، ص: ۴۲۰، حدیث نمبر: ۲۹۲۸، باب مَا أَقْطَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْبَحْرَيْنِ......، صحیح مسلم ج: ۹، ص: ۳۸۲، حدیث نمبر: ۳۴۳۲، باب الْأَمْرِ بِالصَّبْرِ عِنْدَ ظُلْمِ الْوُلَاةِ وَاسْتِئْثَارِهِمْ)

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات انصار سے فرمایا: بے شک تم لوگ میرے بعد دیکھو گے کہ بعض لوگوں کو ترجیح دی جاتی ہے، سو تم صبر کرنا یہاں تک کہ تم مجھ سے آملو حوض پر۔''

تشریح: اس حدیث شریف میں ایک قصہ ہے، جب بحرین فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات انصار کو بلوایا اور ان سے فرمایا کہ: بات یہ ہے کہ یہ مہاجرین مکہ سے آئے تھے تو تم نے اپنی زمینیں آدھی آدھی کر کے ان کو تقسیم کر دی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخات جب قائم کی تھی تو حضرات انصار نے اپنی آدھی زمینیں ان کو دے دیں، مگر حضرات مہاجرین نے لی نہیں، تو اب انصار سے فرمایا کہ تم نے مہاجرین کو وہ زمینیں دی تھیں چنانچہ زمین کی پیداوار کا آدھا حصہ وہ انصار مہاجر بھائیوں کو دیا کرتے تھے، زمین انہی کے پاس رہی مگر انصار اس زمین پر اپنے آپ کو کارندہ سمجھا کرتے تھے مہاجرین کا۔ تو اس وقت انصار سے فرمایا کہ: یہ تمہارا بڑا احسان تھا، اب بحرین کا ملک فتح ہوا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ تمہیں اس کا بدلہ وہاں کی زمینوں سے دیں، تمہیں وہاں جاگیریں دیں۔ انہوں نے کہا کہ: یہ نہیں ہوگا جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو نہ دی جائیں گی ہم بھی نہیں لیں گے، مہاجرین کو دیجئے، پھر حضور کا عطیہ ہے ہم بھی لیں گے، لیکن یہ نہیں ہوگا کہ ان کو نہ دی جائے اور ہمیں دی جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ایسا کر لیتے ہیں کہ یا تو تم لے لو اور آدھی زمین جو ان کو دی ہے ان کے پاس رہنے دو۔ انصار کہنے لگے کہ: مدینہ کی زمین بھی ان کے پاس رہنے دی جائے اور بحرین کی زمین بھی ان کو دیجئے۔

ایسی بے نفسی اور ایسا اخلاص انسانی تاریخ نے بہت کم دیکھا ہوگا، صحابہ نے جو ایثار کر کے دکھایا اس کی مثال کہیں انسانی تاریخ میں نہیں ملے گی، الا ماشاء اللہ! اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تھا: تمہارا جذبہ تو لائق قدر ہے، لیکن میرے بعد ہوگا یہ کہ حکومت کے مناصب پر دوسرے لوگ آئیں گے یعنی

مہاجرین تو تم صبر و استقامت سے کام لینا جس طرح میری زندگی میں لالچ نہیں کیا اس وقت بھی لالچ نہ کرنا، یہاں تک کہ تم حوض کوثر پر مجھ سے آ کر ملاقات کرلو، یہ بھی ایک مستقل معجزہ نبوت تھا کیونکہ یہ حکومت کے عہدے اور منصب حضرات انصار کو کم ملے، اگرچہ صحابہ کرام یہ تفریق نہیں کرتے تھے وہاں مہاجر اور انصار کا کوئی سوال نہیں تھا، حضرات خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی کبھی مہاجرین و انصار کا قصہ پیدا نہیں ہوا، لیکن بعد میں پھر شخصی حکومتیں آگئیں اور اس میں پھر ترجیح اپنے تعلق والوں کو دی جاتی ہے، اس طرح یہ بھی آنحضرت ﷺ کا معجزہ نبوت ہے کہ جس طرح آپ ﷺ نے فرمایا تھا ویسا ہی ظہور میں آیا۔

دوسری بات یہ کہ حضرات انصار کو فرمایا کہ: تم دیکھو کہ لوگوں کو ترجیح دیتے ہیں تمہیں چھوڑتے ہیں تو اس کی پروا نہ کرنا، تمہیں اللہ اس کا اجر دیں گے، یہاں تک کہ تم میرے پاس حوض پر آ کر مجھ سے مل لو، حضرات انصار نے اسی وصیت پر عمل کیا۔

اور تیسری بات یہ کہ: تم آ کر مجھ سے حوض پر ملو، یہ ملاقات کا وعدہ ہوگیا، بہت ہی خوش قسمت ہیں وہ حضرات جن سے وعدہ ہوگیا اور حضور ﷺ سے بڑھ کر وعدہ وفائی کرنے والا اور کون ہوگا؟

ایک دن صحابی کہنے لگے: یا رسول اللہ! خادم ہوں آپ کا قیامت کے دن کچھ خادم کا بھی خیال رکھیں گے؟ فرمایا: ضرور۔ کہا کہ: حضور پھر آپ سے کہاں ملوں؟ فرمایا: یا میزان پر ہوں گا یا پل صراط پر کھڑا ہوں گا یا پھر حوض پر آ کر ملنا، ان میں سے کسی جگہ آ کر مجھ سے ملو۔ (ترمذی، کذا فی مسند احمد بن حنبل، فتح القدیر)۔

بڑے سعادت مند ہیں وہ حضرات جن سے آنحضرت ﷺ نے وعدہ فرمالیا، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نصیب فرمائیں۔

قصہ ابن صیاد

[حدیث: ۱۲۴۹] " فَدَخَلَ ابْنُ عُمَرَ عَلٰى حَفْصَةَ.....، إِنَّمَا يَخْرُجُ مِنْ غَضْبَةٍ يَغْضَبُهَا (يَعْنِي الدَّجَّالَ)۔"

(صحیح مسلم ج: ۱۴، ص: ۱۵۴، حدیث نمبر: ۵۲۱۶، باب ذِكْرِ ابْنِ صَيَّادٍ)

ترجمہ: "حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: دجال جو نکلے گا تو قہر سے غصہ کیا کرے گا۔"

تشریح: مدینہ طیبہ میں ایک لڑکا تھا، اس کو ابن صیاد کہتے تھے، شروع شروع میں آنحضرت ﷺ کو بھی شبہ تھا کہ یہی دجال نہ ہو، اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اس کا خیال تھا یہی دجال ہے، اس کے عجیب و غریب قسم کے حالات تھے، ماں باپ اس کے یہودی تھے اور ایک عرصے تک ان کے یہاں اولاد

نہیں ہوئی تھی، اس کے بعد یہ لڑکا پیدا ہوا، یہ عجیب وغریب باتیں کرتا تھا، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ چند صحابہ کے ساتھ اس کے حالات کی تحقیق کے لئے تشریف لے گئے، وہ سر پر کپڑا اوڑھے ہوئے لیٹا ہوا تھا، تو اس کی ماں نے اس کو بتایا کہ: "یَاصَافِ! هٰذَا مُحَمَّدٌ" اس کی ماں ابن صیاد کو صافی کہتی تھی، یہ محمد ﷺ کھڑے تمہیں دیکھ رہے ہیں، وہ لیٹا ہوا کچھ گنگنا رہا تھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: اس عورت کا ناس ہو جائے اگر یہ نہ بتاتی تو اس کی باتوں سے ہمیں کچھ نہ کچھ اندازہ ہوتا کہ یہ کیسا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے اس سے پوچھا کہ: تمہاری کیفیت کیا ہے؟ کہنے لگا: "تَنَامُ عَیْنَایَ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ" میری آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتا، فرمایا: کچھ اور، کہنے لگا: پانی پر تخت دیکھتا ہوں، فرمایا کہ: یہ شیطان کا تخت دیکھتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا کہ: بتاؤ ہم نے اس وقت کیا چیز سوچی ہے؟ اور آنحضرت ﷺ نے اس وقت دل میں سورۃ دخان کی آیت: "یَوْمَ تَأْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ ⑩" (الدخان) سوچی تھی، جس دن لائے گا آسمان کھلا دھواں، تو کہنے لگا: آپ نے سوچا ہے "دخ" (دھواں) آپ ﷺ نے فرمایا: "اخسأ فَلَنْ تَعْدُوَ قَدْرَکَ" دفع ہو جا تو اپنی قدر سے زیادہ نہیں بڑھ سکے گا۔ (صحیح بخاری ۵/۱۴۰، ۱۲۶۷، صحیح مسلم ۱۴/۱۴۵، ۵۲۰۷، ابوداؤد ۱۱/۴۰۵، ۳۷۶۸)۔

تو اس کے عجیب وغریب قسم کے حالات تھے، ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ جا رہا تھا، تو بڑی لجاجت کے ساتھ کہنے لگا کہ: لوگ میرے پیچھے کیوں پڑے ہوتے ہیں؟ مجھے دجال کہتے ہیں، (مسلمان ہو گیا تھا) تم نے سنا نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ دجال مکہ اور مدینہ داخل نہیں ہو سکے گا، جبکہ میں مدینہ میں رہتا ہوں اور مکہ جا رہا ہوں (یہ حج کے لئے جا رہا تھا) تو لوگ مجھے خواہ مخواہ دجال کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اس نے ایسی باتیں کہیں کہ مجھے اس پر ترس آنے لگا کہ بے چارے کو واقعی خواہ مخواہ بدنام کرتے ہیں، لیکن آخر میں کہنے لگا کہ: مجھے معلوم ہے کہ دجال کب ہوگا؟ کون ہے؟ اور کہاں ہے؟ کہنے لگے کہ: تیرا ناس ہو، تو نے پھر میرے اُوپر معاملہ مشتبہ کر دیا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ اس کی کوئی بات ہو گئی، حضرت نے کوئی ایسا لفظ کہہ دیا ہوگا جس سے وہ غصہ ہو گیا، تو اتنا پھول گیا کہ پھول کر پوری سڑک بھر دی، ان کی بہن حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو معلوم ہوا تو اپنے بھائی عبداللہ بن عمر کو ڈانٹا کہ تو نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ جب وہ دجال نکلے گا تو کوئی آدمی کسی بات پر اس کو بھڑکا دے گا، بھڑک کر نکلے گا، تو نے اس کو کیوں بھڑکایا؟

یہاں اس حدیث میں اتنا فرمایا کہ دجال جو نکلے گا وہ بھڑک کر نکلے گا اور دُنیا میں فساد مچانا شروع کر دے گا، اللہ تعالیٰ کی پناہ ہو! لیکن اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ ابن صیاد دجال نہیں تھا، دجال کا تذکرہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ آخری زمانے میں نکلے گا اور جس کو قتل کرنے کے لئے حضرت سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام

آسمان سے نازل ہوں گے وہ اور دجال ہوگا۔

اس قسم کی بعض چیزیں کسی اور دُوسرے میں بھی ظاہر ہوجاتی ہیں تو یہ دجالِ موعود نہیں ہے۔ ابن صیاد کے بارے میں کچھ معلوم نہیں چلتا کہ پھر اس کا کیا ہوا؟ یعنی وہ مدینہ میں رہتا تھا، شادی بھی کر لی تھی اس کے بال بچے تھے، لیکن بعد میں کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کہاں چلا گیا؟

ایک پیشین گوئی

[حدیث: ۱۲۵۰] ”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ......، لَا تَذْهَبُ الْأَيَّامُ وَاللَّيَالِي حَتّٰى يَمْلِكَ رَجُلٌ يُقَالُ لَهُ الْجَهْجَاهُ۔“

(صحیح مسلم ج:۱۴، ص:۱۲۰، حدیث نمبر:۵۱۸۳، بَاب لَاتَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَمُرَّ الرَّجُلُ بِقَبْرِ الرَّجُلِ فَيَتَمَنّٰى...)

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رات اور دن ختم نہیں ہوں گے یعنی قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ بادشاہ بنے ایک آدمی جس کو جہجاہ کہا جاتا ہے۔“

تشریح: اس حدیث میں ایک پیش گوئی فرمائی ہے کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ ایک جہجاہ نامی شخص بادشاہ نہیں بنے گا، اب یہ نہیں معلوم کہ کب بنے گا اور کس علاقے میں بنے گا، بہر حال بنے گا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی ہے۔

نزولِ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام

[حدیث: ۱۲۵۱] ”سَمِعَ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ ......، لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي يُقَاتِلُونَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ قَالَ فَيَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَقُولُ أَمِيرُهُمْ: تَعَالَ صَلِّ لَنَا، فَيَقُولُ: لَا! إِنَّ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ أُمَرَاءُ تَكْرِمَةَ اللّٰهِ هٰذِهِ الْأُمَّةَ۔“

(صحیح مسلم ج:۱، ص:۳۷۳، حدیث نمبر:۲۲۵، بَاب نُزُولِ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ حَاكِمًا بِشَرِيعَةِ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ..)

ترجمہ: ”حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری اُمّت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر لڑتا رہے گا اور وہ قیامت تک غالب رہیں گے، پھر حضرت عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے تو ان کا امیر کہے گا: آیئے ہمیں نماز پڑھایئے! وہ فرمائیں گے کہ: نہیں! تم ہی نماز پڑھاؤ، اس لئے کہ تم میں سے بعض بعض کے امیر ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس اُمّت کا اعزاز ہے۔“

تشریح: اس حدیث شریف میں پیش گوئی فرمائی ہے کہ میری اُمّت میں ایک جماعت حق کی خاطر لڑتی رہے گی اور وہ اللہ کے فضل سے پسپا نہیں ہوں گے، غالب رہیں گے، اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے تو اس وقت ان کا امیر جو کہ امام مہدی ہوں گے حضرت عیسیٰ سے فرمائیں گے: تشریف لائیے نماز پڑھائیے! وہ انکار کردیں گے کہ: نہیں! یہ اقامت تمہارے لئے ہوئی ہے تم ہی نماز پڑھاؤ اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب اس اُمّت کا اعزاز ہوگا۔ یہ مضمون پہلے تفصیل سے آچکا ہے۔

ایک تو دین کی خاطر ایک جماعت کا ہمیشہ لڑتے رہنا، جہاد باللسان بھی مراد ہوسکتا ہے، جہاد بالسیف بھی یعنی تلوار کے ساتھ اسلحے کے ساتھ یا زبان کے ساتھ، قلم کے ساتھ، ایسا نہیں ہوگا کہ پوری کی پوری اُمّت بہک جائے اور کوئی غلط بات کہی جائے اور کوئی ٹوکنے والا نہ ہو۔

شیخ سعدی نے ایک لطیفہ لکھا ہے: ایک خلیفہ کو جب سلطنت مصر ملی اور اس کے قلمرو میں مصر بھی داخل ہوگیا تو کہنے لگے: اس مصر کے تخت پر بیٹھنے والا "أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى" (میں تمہارا سب سے بڑا ربّ ہوں) کا دعویٰ کرتا رہا ہے (یعنی فرعون) یہ کرسی کچھ ایسی ہے تو میں اس کا توڑ کرنے کے لئے مصر کی کرسی پر ایک ایسے آدمی کو مقرر کروں گا جو سب سے زیادہ بے علم آدمی ہوتا کہ معلوم ہوجائے کہ مصر کی سلطنت کے بل بوتے پر خدائی کا دعویٰ زیب نہیں دیتا اور نعوذ باللہ فرعون ایسے ہی خدا بن گیا۔ چنانچہ ایک حبشی غلام کو مصر کا گورنر بنا دیا اور یہ حضرت یہاں تک پہنچے ہوئے تھے کہ ایک دفعہ دریائے نیل میں سیلاب آیا، کپاس کی فصل تباہ ہوگئی، لوگ گورنر صاحب کے پاس شکایت لے کر آئے، سیلاب کی وجہ سے فصلیں تباہ ہوگئی ہیں تو گورنر صاحب فرمانے لگے: غلطی تو تمہاری ہے تم نے کپاس کی کاشت کی اس کی جگہ صوف (بکریوں کے بال) کاشت کرتے! پشم کاشت کرتے تو فصل کیوں تباہ ہوتی؟

گورنر تو ایسے بھی ہوتے ہیں، قضاء وقدر نے ہمارے گناہوں کی سزا دینے کے لئے بینظیر کو وزیر اعظم بنا دیا اور کمال اظفر کو گورنر، وزیر اعظم کا معنی ہے بڑا وزیر، یہ تو بڑی وزیر ہے، بڑا وزیر تو نہیں۔ یہ ہماری بدبختی کی علامت ہے کہ عورت کے لئے مذکر کے الفاظ استعمال ہونے لگے، انسانیت تو تبدیل ہوئی تھی لغت بھی تبدیل ہوگئی، کبھی عورت بادشاہ بن جائے تو اس کو ملکہ کہتے ہیں، ملک نہیں کہتے، ملکہ وکٹوریہ اور ملک فہد کہتے ہیں، "ملک" مرد کے لئے ہے "ملکہ" عورت کے لئے، اب جس ملک میں وزیر اعظم کا مذکر لفظ عورت کے لئے استعمال کیا جاتا ہو، وہ اگر حلالے کے بارے میں ایسی بات کریں تو تعجب کی کیا بات؟ ہماری شامت اعمال اور قضاوقدر کے فیصلے۔ حلالہ قرآن کا لفظ ہے، اب چونکہ گورنر ہیں کوئی آدمی ایسا نہیں جو زبان پکڑ کر گدی سے کھینچ لے، اس لئے جو چاہیں کہیں، ان کا عہدہ مانع ہے، کوئی دھوپ میں سفید ہوئے تھے عقل صرف اس کو

آئی ہے، تو یہ حکومت کا نشہ اور اقتدار کی بدہضمی ہے ورنہ ان کو اپنی چادر سے باہر پاؤں نہیں پھیلانا چاہئے، ان کو بھی معلوم ہے کہ قوم ان کو کیا سمجھتی ہے، حکومت کرنی نہیں آتی فتوے دیتے ہیں، تمہیں حکومت کرنے کا ڈھنگ ہوتا تو یہ میتیں نہ ہوتیں، تمہیں حکومت کرنا آتی تو ایک باغی کو سڑک پر لٹکاتے، کسی کو آئندہ ہمت نہ ہوتی، ایک سزا بھی تم نے قرآن کی دی ہے؟ تم نے قرآن کی مخالفت پر تو بیان دیئے لیکن تمہیں یہ توفیق نہ ہوئی کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو، ایک زانی کو سنگسار کردو۔

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيۡنَ يُحَارِبُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَيَسۡعَوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ يُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ يُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَاَرۡجُلُهُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ يُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ‌ؕ ذٰ لِكَ لَهُمۡ خِزۡىٌ فِى الدُّنۡيَا وَلَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ۝﴾ (المائدۃ)

قرآن نے تو یہ کہا تھا، تم پولیس مقابلے تو دکھاتے ہو، اگر اس آیت پر عمل کیا جاتا تو امن ہو جاتا۔

میں نے کہا تم فتوے کیا دو گے؟ تم سے حکومت نہیں ہوتی! اگر کوئی ذمہ دار حکومت ہوتی آج تک کب کی مستعفی ہوگئی ہوتی، ان حالات کو دیکھ کر وہ حکومت خود اقرار کرلیتی کہ میں نااہل ہوں، مگر یہ حکومت مستعفی نہیں ہوتی بلکہ قرآنی احکام کا مذاق اُڑاتی ہے اس لئے کہ جانتی ہے کہ پاکستان میں بسنے والے ہم سے بھی زیادہ نااہل ہیں۔ خیر یہ بات درمیان میں آگئی۔

فرمایا: میری اُمت کا ایک گروہ حق پر لڑتا رہے گا اور یہ سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے تک جاری رہے گا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو عین اس وقت لشکر اسلام میں پہنچیں گے جبکہ اقامت ہو چکی ہوگی اور ان کا امام جو اس وقت امام مہدی ہوں گے وہ مصلّٰی پر جا چکے ہوں گے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جب نزول ہوگا تو امام مہدی پیچھے ہٹ جائیں گے اور ان سے کہیں گے کہ: "تَعَالَ یَا رُوْحَ اللّٰہِ صَلِّ بِنَا!" اے رُوح اللہ! آگے آیئے اور نماز پڑھایئے، فرمائیں گے کہ: نہیں! میں یہ نماز نہیں پڑھاؤں گا۔

اور دُوسری روایت میں ہے: "فَاِنَّھَا قَدْ اُقِیْمَتْ لَکَ" اس کی اقامت آپ کے لئے ہوئی ہے، اور پھر اس کے بعد اس کی حکمت بیان فرمائیں گے کہ یہ اللہ کی جانب سے اس اُمت کا اعزاز ہے کہ ایک اُولوالعزم نبی کو ایک اُمتی کے پیچھے نماز پڑھوائی جارہی ہے، چنانچہ وہ نماز تو حضرت مہدی پڑھائیں گے اس کے بعد مستقل طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی امام ہوں گے اور مسلمانوں کی امارت حکومت بھی حضرت مہدی ان کے سپرد کردیں گے اور خود ان کے وزیر بن جائیں گے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی ملک کا صدر باہر جاتا ہے تو پیچھے ایک شخص کو نائب بنادیا جاتا ہے اور اس کے آتے ہی وہ معزول ہو جاتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی ہیں اور حضرت مہدی امتی ہیں، نبی کی موجودگی

میں اُمتی امام نہیں ہوا کرتا وہ خود بخود امامت سے معزول ہو جاتا ہے لیکن اگر وہی کہہ دے نماز پڑھاؤ تو دوسری بات ہے، بعض لوگوں کو یہ اشکال پیش آتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے تو انہوں نے قرآن اور حدیث کہاں پڑھا ہوگا؟ یہ مرزائی لوگ سوال کیا کرتے ہیں، اگر ان کو نبوت کے معنی معلوم ہوتے تو یہ سوال نہ کرتے، نبی اس کو کہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ براہ راست بتاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے: ﴿وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ﴾ (آل عمران:۴۸) کہہ کر پہلے سے ان کی کتاب وحکمت کی تعلیم کو ذکر کر دیا ہے، اللہ نے کتاب وحکمت کی تعلیم ان کو الگ دی اور تورات وانجیل کی تعلیم الگ دی، معلوم ہوا کہ جس طرح تورات اور انجیل اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو سکھائی گئی اسی طرح قرآن وحدیث کی تعلیم دی گئی اور یہ بے چارے کہتے ہیں: کہاں پڑھی تھی؟ میں کہتا ہوں جہاں آدم علیہ السلام نے تمام کے تمام اسماء پڑھے تھے اسی یونیورسٹی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسلامی شریعت کا درس دیا، تم آج اپنی سطح کو سامنے رکھ کر سوال کرتے ہو، تمہیں معلوم نہیں کہ نبی پڑھنے والا ہے اور اللہ اس کو پڑھانے والا ہے اور اس کے لئے نہ یونیورسٹی میں جانے کی ضرورت ہے اور نہ کورس کی ضرورت ہے نہ مدت کی، بلکہ جس طرح اللہ تعالیٰ چیزوں کی تخلیق فرماتے ہیں نبی کے قلب میں اللہ تعالیٰ علوم پیدا فرما دیتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب تشریف لائیں گے تو کتاب وسنّت کے بھی ماہر ہوں گے، موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تورات کے بھی ماہر تھے، اسی طرح جب آسمان سے نازل ہوں گے تو وہ کتاب وسنّت کے ماہر ہوں گے۔

اہلِ عرب میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی

[حدیث:۱۲۵۲] "عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ......، لَا يَزَالُ أَهْلُ الْغَرْبِ ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ حَتّٰى تَقُومَ السَّاعَةُ۔"

(صحیح مسلم ج:۱۰، ص:۴۳، حدیث نمبر:۳۵۵۱، باب قَوْلِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي....)

ترجمہ: "حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اہل غرب ہمیشہ حق پر قائم رہیں گے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے۔"

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ اہل غرب ہمیشہ دین پر قائم رہیں گے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے۔ اہل غرب کون ہیں؟ اس کی تفصیل میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: یہ اہل عرب ہیں، اہل غرب حقیقت میں اہل عرب ہیں اور غرب عربی میں مغرب کو بھی کہتے ہیں اور بڑے ڈول کو بھی کہتے ہیں جس کے ساتھ کنویں سے پانی نکال کر کھیتی کو سینچا جاتا ہے۔

ہمارے یہاں پکے کے علاقے میں کنویں کا پانی بہت نیچے ہوتا تھا، اس لئے وہاں رہٹ کام نہیں دیتا تھا، وہاں یہ غرب کام دیتا تھا اور ہمارے یہاں اس کو ''چرس'' کہتے تھے، بڑا ڈول تقریباً دو من پانی اس میں آتا تھا اور اس کو بیل کھینچتے تھے، جب اُوپر آجاتا تو ایک آدمی پکڑ کر اُنڈیل دیتا تھا، تو چونکہ اہل عرب کے یہاں نہریں نہیں بلکہ ان کے یہاں جہاں کاشت ہوتی ہے وہ ڈول کے ذریعے پانی کھینچ کر ہوتی ہے اور وہ اُونٹوں کے ذریعے پانی کھینچتے تھے اس لئے یہاں ان کو اہل غرب فرمایا، یعنی ڈولوں کے ساتھ پانی کھینچ کر کاشت کرنے والے۔ غرضیکہ اس سے اہل عرب مراد ہیں کہ اہل عرب ان شاء اللہ قیامت تک دین پر قائم رہیں گے اور دوسری حدیث میں ہے کہ میری اُمت کی ایک جماعت ہمیشہ دین پر قائم رہے گی، وہ حدیث آگے آرہی ہے اور یہ حدیث تقریباً پندرہ صحابہ کرام سے مروی ہے۔

قیامت شریروں پر آئے گی

[حدیث:۱۲۵۳] ''عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ...... لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ إِلَّا عَلٰى شِرَارِ النَّاسِ۔'' (صحیح مسلم ج:۱۴، ص:۱۸۹، حدیث نمبر:۵۲۴۳، بَاب قُرْبِ السَّاعَةِ)

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت قائم نہیں ہوگی مگر بدترین قسم کے لوگوں پر۔''

تشریح: یہ اور اس کے بعد والی دونوں حدیثیں ''لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ'' سے شروع ہوتی ہیں یعنی قیامت قائم نہ ہوگی جب تک یہ تینوں کام نہیں ہوجاتے۔ قیامت سے پہلے جن کاموں کا ہونا ضروری ہے ان کو یہاں ذکر فرمایا اور اس سلسلے کی چند احادیث اور بھی ہیں۔ یہ اعلام نبوت میں سے ہے یعنی آئندہ مستقبل کی خبریں دینا، دلائل نبوت میں سے ہے کیونکہ تاریخ تو آپ پڑھتے نہیں تھے اور کسی تواریخ میں آئندہ کے واقعات لکھے ہوتے بھی نہیں ہیں، نجومی اور پنڈت آپ تھے نہیں بلکہ نجومیوں کے بارے میں فرماتے تھے کہ جو شخص کسی کاہن کے پاس جائے اور جو کچھ وہ کہتا ہے اس کی تصدیق کرے وہ بری ہوگیا اس سے جو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا، یعنی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین ہی سے بری ہے۔ جنوں یا ستاروں کے ذریعے خبریں معلوم کرنا اور ایسی ہی اور کسی طریقے سے جو رائج ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کی جڑ کاٹ ڈالی، یہ لچر اور بیہودہ طریقے ہیں مستقبل بینی کے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک ہی طریقہ تھا، اِخبار من اللہ، یعنی اللہ کی جانب سے خبر دیا جانا اور یہ دلیل نبوت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں اُمت کے اولیاء اللہ کو بطور کرامت کے دل میں بعض چیزیں القاء کردی جاتی ہیں، وہ بھی پیش گوئی کرتے ہیں کہ ایسا ہوگا، کبھی وہ واقعہ مکشوف ہوکر سامنے آجاتا ہے اور کشف کی مثال ایسی سمجھ لیجئے جیسے ہمارے سامنے دیوار یا کوئی پردہ حائل ہے

اس کو ہٹا دیا جائے تو آگے کی چیز نظر آئے گی، اس وقت جو ہم موجود ہیں اس کے پچھلی جانب ماضی کا پردہ حائل ہے اور آگے کی جانب مستقبل کا پردہ حائل ہے جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں اس پردے کو سرکا دیتے ہیں کہ دیکھ لو، وہ دیکھ کر بتا دیتے ہیں۔

صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ معراج سے تشریف لائے تو قریش مکہ سے فرمایا کہ میں رات بیت المقدس گیا تھا، آگے کی بات تو آگے کی رہی، ان کی عقل میں یہ بات ہی نہیں آتی تھی کہ یہ کیسے چلے گئے؟ تو وہ آنحضرت ﷺ سے بیت المقدس کی علامتیں پوچھنے لگے، میں اٹھارہ سال سے یہاں ہوں میں تمہیں نہیں بتا سکتا کہ اس کے کتنے دروازے کتنی کھڑکیاں ہیں، کبھی گنی ہی نہیں، مجھے کیا معلوم؟ تو ایک مہمان تھوڑی دیر کے لئے کہیں جائے تو کیا وہ کھڑکیاں دروازے گنا کرتا ہے؟ لیکن قریش نے پوچھا کہ اس کے کتنے دروازے کتنی کھڑکیاں ہیں؟ اور ہوسکتا ہے کہ وہ پوچھنے لگتے کہ چھت پر لکڑیاں کتنی ہیں؟ شہیتر کتنے ہیں؟ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو جبل ابوقبیس کے پاس لا کر رکھ دیا اور مجھے نظر آنے لگا، میں دیکھ دیکھ کر بتا رہا تھا، تمہیں اس پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے، بیت المقدس وہیں تھا لیکن نبوت کی دوربین لگا دی گئی تھی، اور دوربین لگا کر دیکھو تو دس میل کی چیز ایسی لگتی ہے جیسے دس گز پر ہے اور جتنی زیادہ دُوربین طاقت ور ہوتی ہے اتنی دور کی چیز کو نزدیک دکھاتی ہے، جیسے خوردبین چھوٹی چیز کو بڑی کر کے دکھاتی ہے دُوربین سے دُور کی چیز پاس نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے ایسا کر دیا تھا، اور وہ جو کہتے ہیں کہ دیوار قبلہ میں جنّت اور دوزخ متمثل ہوگئے تھے اور سامنے نظر آنے لگے تھے وہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ جنّت اور دوزخ وہیں ہیں جہاں اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے لیکن اتنی نظر تیز کر دی تھی کہ گویا وہ بالکل پاس آگئے ہیں، اِس کو صوفیہ کی اصطلاح میں ''طی الارض'' زمین کا لپیٹ دیا جانا اور ''طی زمان'' زمانے کا لپیٹ دیا جانا کہتے ہیں۔

میں نے ابھی تک ایک غیر مقلد کی کتاب دیکھی، عرب میں چھپی ہے، وہ بے چارے یہی کام کرتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ نے اسی لئے پیدا کیا ہے، ''وَلِذٰلِکَ خَلَقَھُمْ'' اولیاء اللہ کا مذاق اُڑانا اور اس کی نسبت سے چونکہ حضرات علماء دیوبند ان اکابر کے نقش قدم پر ہیں، ان کا مذاق اُڑانا۔

''دیوبندیت'' کے نام سے کتاب چھپی ہے، یہاں پہلے کسی نے اُردو میں چھاپی تھی وہاں اس کا ترجمہ کسی نے کیا ہے، اس میں اس قسم کے واقعات لکھ کر مذاق اُڑایا ہے، میں اس کو پڑھ کر ہنسا، میں نے کہا: ابھی بے چارے نیچے ہیں، ترقی کریں گے تو اُوپر چلے جائیں گے، یہ ابھی منکر کرامات ہیں، آگے جا کے منکرِ معجزات ہوں گے، ابھی بزرگوں کی روایات کے منکر ہیں آگے جا کر حدیث کی روایتوں کے منکر ہو جائیں گے، فرق کیا ہے؟ جو شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جھوٹ بولا ہے، نعوذ باللہ! وہ تھوڑی سے ترقی کر جائے تو آگے چل کر کہے گا کہ: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جھوٹ بولا ہے، فرق کیا ہے؟

اور جو کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو گمراہ کہہ سکتے ہیں ان کے لئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کو سب کو گمراہ کہہ دینا کیا مشکل ہے؟ تھوڑی سی ترقی کی ضرورت ہے، ابھی نیچے کا نمبر ہے، اور اولیاء اللہ کی توہین ایک ایسی چیز ہے جو آدمی کو لے ڈوبتی ہے، صحیح بخاری کی حدیث ہے: "مَنْ عَادَى لِي وَلِيًا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ" (۲۰/۱۵۸، ۶۰۲۱) جو میرے کسی ولی سے دُشمنی رکھتا ہے میں اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں۔ کرلو لڑائی اللہ میاں سے! لوگوں کو ان باتوں پر تعجب ہوتا ہے، اتنی سی بے چارے کی عقل ہے، اتنی عقل ہے کہ چیونٹی کے انڈے کے خول میں آسکے، اور یہ اس عقل کے فیتے سے پیمائش کرنے جارہا ہے زمین و آسمان کے خول کی۔

خیر! میں یہ عرض کررہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقبل کے بارے میں خبریں دینا یہ معجزہ نبوت ہے اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہوا، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ مبارک سے کوئی لفظ نکل گیا ہو اور اللہ نے اس کو پورا نہ کیا ہو، یہ ممکن ہی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"رُبَّ أَشْعَثَ مَدْفُوعٍ بِالْأَبْوَابِ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ"۔ وَفِي الْكَنْزِ: "أَغْبَرَ مُغْبَرٍ۔" (مسلم ۱۴/۶، ۵۰۹۴، کنز العمال ۱/۱۶۱، ۸۰۷، اتحاف)

ترجمہ: "بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے بال بکھرے ہوئے، بدن غبار آلود، کوئی دروازے پر کھڑا نہ ہونے دے، لیکن اللہ کے یہاں کا اتنا مقام اور حرمت ہے کہ اگر وہ قسم کھا کر کہہ دیں کہ آج اللہ تعالیٰ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ایسا ہی کر دیں گے۔"

اور فرمایا: "وَمِنْهُمْ بَرَاءُ بْنُ عَازِبٍ" اور ان میں سے ایک براء بن عازب بھی ہیں۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادموں کا درجہ یہ ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو کیا بات ہے!

یہاں تین باتیں ذکر کی ہیں: قیامت بدترین قسم کے لوگوں پر قائم ہوگی، آخر زمانے میں جب قیامت کو قائم ہونا ہے تو سب سے پہلے دابۃ الارض نکلے گا، پھر سورج مغرب کی جانب سے طلوع ہوگا، یا اس کے اُلٹ، یہ دونوں باتیں آگے پیچھے ہوں گی، یوں فرمایا تھا کہ جب ایک ہوگی تو دُوسری اس کے بعد ہوگی لازمی۔ وہ دابۃ الارض ہر کافر اور مومن کے چہرے پر نشان کرتا جائے گا، کافر کا چہرہ نشان کرنے کی وجہ سے کفر سے کالا ہوجائے گا، کفر چہرے پر آجائے گا اور مسلمان کے چہرے پر نشان کرنے کی وجہ سے دل کی ساری نورانیت چہرے پر آجائے گی۔ اس طرح چند دن گزریں گے کہ ایک ہوا چلے گی اور ہوا بڑی خوشگوار اور نفیس ہوگی، خوشبودار ہوگی، اس ہوا کے چلنے سے تمام اہل ایمان کو زکام ہوجائے گا اور انتقال کر جائیں گے، پیچھے یہ گدھے رہ جائیں گے، کتوں اور گدھوں کی طرح سڑکوں پر شہوت رانی کریں گے، ان پر قیامت قائم ہوگی۔

ارضِ حجاز سے آگ کا نکلنا

[حدیث:۱۲۵۴] "أَبو هُرَيْرَةَ......، لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَخْرُجَ نَارٌ مِنْ أَرْضِ الْحِجَازِ تُضِيءُ أَعْنَاقَ الْإِبِلِ بِبُصْرَى"

(صحیح بخاری ج:۲۲ص:۱۸،حدیث نمبر:۶۵۸۵،بَاب خُرُوجِ النَّارِ وَقَالَ أَنَسٌ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ......،

صحیح مسلم ج:۱۴ص:۹۷،حدیث نمبر:۵۱۶۴،بَاب لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَخْرُجَ نَارٌ مِنْ أَرْضِ الْحِجَازِ)

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ نکلے ایک آگ سرزمین حجاز سے جو کہ روشن کردے اُونٹوں کی گردنوں کو بصریٰ میں۔"

تشریح: اس حدیث میں آتا ہے کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک سرزمین حجاز سے ایک آگ نہ نکلے جس کی روشنی اتنی ہوگی کہ بصریٰ جو ملک شام کا آخری شہر ہے، وہاں اُونٹ چر رہے ہوں گے تو یہاں روشنی اتنی اُونچی ہوگی کہ بصریٰ کے اُونٹوں کی گردنیں نظر آئیں گی، یہ واقعہ رُونما ہو چکا ہے، تواریخ میں لکھا ہوا ہے جیسا فرمایا تھا ہو بہو ویسا ہوا۔

اور ہمارے حضرت امام العصر قدس سرہٗ کی کتاب ہے: "**التصریح بما تواتر فی نزول المسیح**" حضرت مفتی شفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مرتب کیا تھا، اور ان کے صاحبزادے حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے "علامات قیامت اور نزول مسیح" کے نام سے، اس میں ان کا باقاعدہ مفصل تذکرہ ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی مدینہ کے قریب سے ایک آگ نکلی تھی اجارزید سے، حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جاؤ بجھا کر آؤ، کہنے لگے: امیر المومنین! میں کیسے بجھاؤں؟ پورے پہاڑ سے آگ نکل رہی ہے، کہنے لگے: میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں، چادر مونڈھے پر تھی، اس چادر سے آگ کو اس طرح دھکیل رہے تھے یہ دونوں حضرات، اور جہاں جس سوراخ سے نکلی تھی اسی میں داخل ہوگئی اور پھر ظاہر نہیں ہوئی، اس کے بعد پھر تقریباً چھ صدی بعد تقریباً چھٹی یا آٹھویں صدی میں وہ آگ دوبارہ ظاہر ہوئی، اتنی بلند وبالا تھی، اتنی زیادہ روشنی تھی کہ رات کو دن کردیا تھا، وہ صاحب کہتے ہیں کہ میں نے خود سرزمین حجاز میں بیٹھ کر بصریٰ کے اُونٹوں کی گردنیں دیکھیں، اُونٹ نہیں بلکہ اس کی گردن۔

گذشتہ قوموں کی نقالی

[حدیث:۱۲۵۵] "عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ......، لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَأْخُذَ أُمَّتِي بِأَخْذِ الْقُرُونِ قَبْلَهَا شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ، فَقِيلَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ!

كَفَارِسَ وَالرُّومِ؟فَقَالَ:وَمَنِ النَّاسُ إِلَّا أُولَئِكَ!"

(صحیح بخاری ج:۲۲،ص:۲۹۷،حدیث نمبر:۶۷۷۴،بَاب قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ.)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ نہ کرے میری اُمت جو پہلی امتوں نے کیا بالشت در بالشت، ہاتھ در ہاتھ۔ عرض کیا: یارسول اللہ! فارس اور رُوم مراد ہیں؟ فرمایا: ان کے سوا لوگ اور ہیں کون!''۔

تشریح: اس حدیث میں ہے: تم پہلی قوموں کی نقالی کروگے بالشت در بالشت، ہاتھ در ہاتھ۔ جیسے ہمارے محاورے میں کہا کرتے ہیں کہ ایک انچ اس سے آگے پیچھے نہیں، یہ ایسا ہی محاورہ ہے، صحابہ کرام نے پوچھا: کیا فارس کے لوگ اور نصرانی و یہودی رُومی مراد ہیں؟ فرمایا: اور لوگ کون ہیں؟ یہی تو ہیں! یہ ہندوؤں کو تو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا، خلاصہ یہ کہ پہلے کے تمام لوگوں کی تم تقلید کروگے، چنانچہ کوئی شک نہیں کہ یہ پیش گوئی پوری ہوئی اور اُمت نے کوئی غلطی ایسی نہیں چھوڑی جو پہلی اُمتوں نے کی ہو اور انہوں نے اس سے پرہیز کیا ہو۔

قیامت کی ایک علامت

[حدیث:۱۲۵۶] "أَبُو هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ..... لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَضْطَرِبَ أَلَيَاتُ نِسَاءِ دَوْسٍ عَلَى ذِي الْخَلَصَةِ."

(صحیح بخاری ج:۲۲،ص:۱۵،حدیث نمبر:۶۵۸۳،بَاب تَغْيِيرِ الزَّمَانِ حَتَّى تُعْبَدَ الْأَوْثَانُ،صحیح مسلم ج:۱۴، ص:۱۰۹،حدیث نمبر:۵۱۷۳،بَاب لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَعْبُدَ دَوْسٌ ذَا الْخَلَصَةِ)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ سرین مٹکاتی پھریں گی قوم دوس کی عورتیں ایک بت کے گرد جس کا نام ذوالخلصہ ہے۔''

تشریح: میں نے ذکر کیا تھا کہ یہ چند احادیث ہیں جو قیامت سے پہلے پیش آنے والے واقعات پر مشتمل ہیں کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک یہ نہ ہو، یہ نہ ہو، یہ نہ ہو، ان میں سے دو تین واقعات اُوپر آچکے ہیں۔ ان میں سے ایک حجاز کی آگ کا تھا جو واقع ہوچکا۔ یہ آگ نکلی تھی اور میلوں تک اس کی روشنی بلند ہورہی تھی اور پتھر کی طرح کے انگارے پھینک رہی تھی، ظاہر بات ہے کہ کسی معمولی آگ لگنے کا واقعہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذکر نہیں فرمائیں گے، اس قسم کے تو ہزاروں واقعات ہوتے ہیں۔

تین واقعات ان احادیث میں ذکر فرمائے گئے ہیں، ایک یہ کہ لوگ جاہلیت کی طرف لوٹ آئیں گے حتی کہ یمن کا دوس قبیلہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قبیلہ ہے، اور یہ وہ قبائل ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "الْإِيمَانُ يَمَانٍ وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَةٌ" (صحیح بخاری ۱۳/۲۹۴، ۷۰۳، ۴، صحیح مسلم ۱/۵۱، ۷۷، کنز العمال ۱۲/۷، ۴، ۹۳۹، ۳۳) ۔ ایمان تو یمنی ہے اور حکمت بھی یمنی ہے، یعنی ایمان لانے اور حکمت اختیار کرنے میں ان یمن کے لوگوں کا اتنا بڑا حصہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایمان یمنی ہے اور حکمت بھی یمنی ہے۔ ان قبیلہ دوس کی عورتیں ان کے سرین ان کے بت کے اردگرد حرکت کریں گے طواف کرتے ہوئے، ایمان دِلوں سے رُخصت ہو جائے گا اور یہ تمیز ہی نہیں رہے گی کہ یہ بے چارہ بت جس کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا:

﴿ أَفَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ ﴿٦٦﴾ أُفٍّ لَكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴾ (الأنبياء)

ترجمہ: "کیا تم عبادت کرتے ہو ایسی چیزوں کی جو نہ تمہیں نفع پہنچائیں نہ نقصان پہنچائیں، تف ہے تم پر بھی اور ان پر جن کی تم عبادت کرتے ہو۔"

پتھر بے چارہ نفع نہیں پہنچا سکتا، اور اگر اس کا جی چاہے کہ کسی کو نقصان پہنچاؤں تو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ﴿وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ﴾ (الحج: ۷۳) اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھڑا کر چھین کر لے جانا چاہے تو وہ اس سے واپس نہیں لے سکتے۔

وہ ایسے بیہودہ لوگ تھے کہ اللہ معاف فرمائے جاہلیت کے زمانے میں ان بتوں کے سامنے نذر و نیاز پیش کرتے تھے، کبھی چوری بنا کر، کبھی حلوہ بنا کر، کبھی کوئی اور کھانا پکا کر ان بتوں کے سامنے نذر و نیاز پیش کرتے تھے، یہ تو میں نے بھی دیکھا ہے کہ گوگا جو چوہڑوں کا پیر ہوا ہے، اس کی مڑی پر سویاں چڑھایا کرتے تھے ہمارے سیدھے مسلمان، تو کتے آ کر اس کو کھاتے تھے، اور جیسا کہ کتوں کی عادت ہے کھا کر وہیں ان کے اُوپر پیشاب بھی کر کے جاتا، یہ کتا ان کے اُوپر پیشاب کر کے جاتا ہے، دیکھنے والے کو بھی شرم نہیں آتی کہ تم اس نجس کو خدا مانتے ہو! کتا اس کے سامنے سے چیز اُٹھا کر لے جاتا ہے آگے جا کر کھاتا ہے اس پر موت کے جاتا ہے، اتنی عقل ماری گئی تھی۔ تو آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ: یمن کے قبیلہ دوس کی عورتیں پھر جاہلیت کی طرف لوٹ جائیں گی اور بتوں کے گرد ذوالخلصہ نامی ایک بت ہے اس کے گرد چوتڑ مٹکاتی پھریں گی۔ یہ بت جاہلیت کے زمانے میں تھا، یہ دوبارہ اس کو ایجاد کر لیں گی اور اس کی نذر و نیاز کریں گے اور اس کا طواف کیا کریں گے۔ نعوذ باللہ!

مغرب سے سورج کے طلوع ہونے سے توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا

[حدیث:۱۲۵۷] ”أَبُو هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ ......، لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا فَإِذَا رَآهَا النَّاسُ آمَنَ مَنْ عَلَيْهَا فَذَاكَ حِينَ {لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ}۔“

(صحیح بخاری ج:۱۴،ص:۱۷۴، حدیث نمبر:۴۲۶۹، باب {لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا}، صحیح مسلم ج:۱،ص:۳۷۵، حدیث نمبر:۲۲۶، باب بَيَانِ الزَّمَنِ الَّذِي لَا يُقْبَلُ فِيهِ الْإِيمَانُ)

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہ قائم ہوگی قیامت یہاں تک کہ نکلے گا سورج اپنی غروب ہونے کی جگہ سے، پھر جب لوگ اس کو دیکھیں گے ایمان لائیں گے وہ تمام لوگ جو رُوئے زمین پر موجود ہیں لیکن (یہ وقت ہوگا کہ نفع نہیں دے گا کسی شخص کو اس کا ایمان لانا جو اس سے پہلے ایمان نہیں لایا)۔“

تشریح: اس حدیث میں فرمایا ہے: قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ سورج مغرب کی جانب سے نہ نکلے۔ مغرب کی جانب سے سورج نکلنے کی دُوسری احادیث میں تفصیل آئی ہے کہ ایک رات ایسی آئے گی کہ صبح ہونے کا نام ہی نہ لے گی رات اتنی لمبی ہوگی کہ صبح ہی نہ ہوگی خدا جانے سورج کو کیا ہوگیا؟ لوگ کئی کئی بار سوئیں گے اور سو کر اُٹھیں گے لیکن رات ختم نہیں ہوگی۔ بالآخر لوگ گھبرا جائیں گے یہ کیا ہوگیا؟ بچے چلانے لگیں گے اور لوگ سراسیمہ اور پریشان ہوجائیں گے کہ اتنی لمبی رات! پھر سورج مغرب کی طرف سے نکلے گا اور تقریباً کچھ بلند ہوکر پھر پیچھے چلا جائے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: جب لوگ اس کو دیکھیں گے تو رُوئے زمین پر توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا، اب لوگ توبہ تائب ہوں گے لیکن اب وقت گزر چکا:

﴿لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا﴾ (الأنعام:۱۵۸)

”جو شخص اس سے پہلے ایمان نہیں لایا تھا اور جس نے اس سے پہلے نیکی نہیں کی تھی اس کی اب نہ نیکی قبول ہوگی نہ توبہ قبول ہوگی (اس کو کہتے ہیں توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا)۔“

علماء فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان کے معتبر ہونے کے لئے شرط ہے ایمان بالغیب،

بن دیکھے ماننے، اس لئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس نے اپنی عقل سے سوچ کر مانا وہ اپنی عقل پر ایمان لایا، محمد ﷺ پر ایمان نہیں لایا، محمد ﷺ کے کہنے پر مانو تو ایمان ہے۔ اگر تم نے دیکھ کر مانا تو ایمان نہیں یہ تو تمہارا چشم دید مشاہدہ ہے، روزانہ سورج کو نکلتا ہوا دیکھتے ہو، کوئی کہتا ہے کہ میں ایمان لاتا ہوں اس بات پر؟ وہ تو سب کی آنکھوں کے سامنے ہے، میں ایمان لاتا ہوں اس بات پر کہ جنّت برحق ہے، جہنّم برحق ہے، عذاب برحق ہے، میزان برحق ہے، پل صراط برحق ہے، یہ وہ چیزیں ہیں جو نہ تمہاری عقل نے سوچیں نہ تمہاری آنکھوں نے دیکھیں، نہ وہم وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ محمد ﷺ کے کہنے پر مانو گے تو یہ ایمان کہلائے گا۔

ایمان کے لئے بالغیب شرط ہے اور جب پردہ ہٹا دیا تو ایمان بالغیب کہاں رہا؟ میت پر جب سکراتِ موت طاری ہوجاتے ہیں موت کی بے ہوشی اور غنودگی تو درحقیقت اس کے سامنے سے غیب کا پردہ سرکا دیا جاتا ہے، ہمیں فرشتے چلتے پھرتے نظر نہیں آتے، اس کو نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ ہمیں جنّت دوزخ نظر نہیں آتی، اس کے سامنے کردی جاتی ہے تو اس وقت کا ایمان معتبر نہیں۔ اسی طرح سورج کا مغرب سے طلوع ہونا گویا کہ اس عالم کی نبض کے بے قاعدہ ہوجانا ہے، نبضیں ڈوب رہی ہیں اور اس عالم پر جیسے کہ وہاں میت پر سکرات کا عالم طاری ہورہا ہے ایسے ہی سورج کا مغرب کی جانب سے طلوع ہونا یہ اس کی نبض کے بے قاعدہ ہونے کی علامت ہے، کیونکہ جب سے آدمی پیدا ہوتا ہے نبض باقاعدہ چل رہی ہے، سورہا ہو جاگ رہا ہو، نبض کے چلنے میں فرق نہیں آتا، اور نبض کی حرکت نام ہے دل کی دھڑکن کا۔ اس کو اللہ نے ڈیوٹی پر لگا دیا کہ تمہیں دھڑکتے رہنا ہے تسلسل کے ساتھ۔ اس کی بھی اللہ تعالیٰ نے ایک رفتار مقرر کردی، ٹھیک اسی طرح اس عالم کے لئے اس کا طلوع غروب اس کی نبض ہے، اور اس کو کہہ دیا کہ تمہیں اپنی حرکت جاری رکھنی ہے، ایک وقت آئے گا یہ نبض بے قاعدہ ہوجائے گی، اور یہ لوگوں کو یقین ہوجائے گا کہ یہ تو قیامت آگئی، جو قیامت کے منکر تھے وہ بھی مان جائیں گے کہ قیامت آگئی، یہ واقعہ ہی ایسا ہے کہ عقل وفکر سے باہر ہے، کوئی سائنس اور حکمت اس معمے کو حل نہیں کرسکتی کہ یہ سورج اُلٹی طرف سے کیوں طلوع ہوا؟ بہت سے عقلیت پسند سورج کے مغرب کی جانب سے نکلنے پر معترض ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ہم نے کہا کہ: جس دن نکلے گا اس دن تمہیں بتادیں گے، ''کیسے'' کا کیا مطلب؟

کسی نے حجام سے کہا کہ میرے سر کے سفید بال چن دو، اس نے سارے بال مونڈ کر نیچے رکھ دیئے، کہنے لگا: مجھے تو اتنی فرصت نہیں تم یہ کام کرتے رہو! تم آج پوچھتے ہو کہ کیسے ہوگا؟ تمہارے سامنے مونڈ کے رکھ دیں گے، تم خدائی معاملات کو اپنی عقل کی میزان سے تولنا چاہتے ہو، پھر گنتے رہنا چنتے رہنا!

لات وعُزّیٰ کی عبادت

[حدیث:۱۲۵۸] ”عَنْ عَائِشَةَ ......، لَا يَذْهَبُ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ حَتّٰى تُعْبَدَ اللَّاتُ وَالْعُزّٰى۔“

(صحیح مسلم ج:۱۴، ص:۱۱۰، حدیث نمبر:۵۱۷۴، باب لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَعْبُدَ دَوْسٌ ذَا الْخَلَصَةِ)

ترجمہ: ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دن رات ختم نہیں ہوں گے (یعنی قیامت قائم نہ ہوگی) یہاں تک کہ عبادت کی جائے گی لات اور عُزّیٰ کی۔“

تشریح: یہ حدیث اسی حدیث کے مطابق ہے، یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ لوگ لات وعزی کی پوجا نہ کرنے لگ جائیں، نعوذ باللہ! جاہلیت کی طرف لوٹ جائیں گے، یہ آخری زمانے میں ہوگا، جب سورج مغرب سے نکلے گا اس کے ایک یا دو دن بعد صفا پہاڑی سے ایک جانور دابۃ الارض نکلے گا جو مومن اور کافر کے درمیان شناخت کرے گا، اسی دن قرآن کریم مصاحف سے اُٹھالیا جائے گا، کاپیاں اور کاغذات رہ جائیں گے، کھولیں تو اس میں ایک حرف نہ ہوگا، قرآن اُٹھالیا جائے گا، اور اسی دن حقیقت کعبہ اُٹھالی جائے گی، جیسے قرآن کاپی کی شکل میں رہ جائے گا اندر سے قرآن نکل جائے گا، کعبہ کا کعبہ پن حقیقت میں تجلیات کعبہ جس کا نام ہے اللہ تعالیٰ اُٹھالے گا، اب تم خود سوچ لو کہ دُنیا میں کتنا اندھیرا ہو جائے گا!

یہ سورج ظاہری روشنی دیتا ہے اور یہ قرآن اور کعبہ اپنی باطنی تجلیات بکھیر رہا ہے پورے عالم پر۔ جب ان کو قبض کرلیں گے تو پیچھے کیا رہ جائے گا؟ تو یک دم لوگ کفر کی طرف لوٹ جائیں گے اور جو مسلمان تھے سب کو زکام سا ہوگا اور ان کا انتقال ہو جائے گا، اب نہ کوئی ہدایت دینے والا، نہ روشنی رہی، نہ قلوب کی استعداد باقی رہی، اسی کو اُوپر کی حدیث میں بیان کیا تھا: ”لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ إِلَّا عَلٰى شِرَارِ الْخَلْقِ“ بدترین قسم کے لوگوں پر قیامت قائم ہوگی، نعوذ باللہ! قیامت کا تو نام ہی قیامت ہے!

عرب میں سبزہ زار

[حدیث:۱۲۵۹] ”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ......، لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ...... وَحَتّٰى تَعُوْدَ أَرْضُ الْعَرَبِ مُرُوْجًا وَأَنْهَارًا۔“

(صحیح مسلم ج:۵، ص:۱۸۶، حدیث نمبر:۱۶۸۱، باب التَّرْغِيبِ فِي الصَّدَقَةِ قَبْلَ أَنْ لَا يُوْجَدَ مَنْ يَقْبَلُهَا)

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ لوٹ جائے عرب کی سرزمین سبزہ زاروں اور نہروں کی شکل میں۔‘‘

تشریح: یہ علامات قیامت میں سے تین پیش گوئیاں ہیں، پہلی پیش گوئی یہ ہے کہ آخر زمانے میں عرب کی سرزمین نہروں اور سبزہ زاروں میں تبدیل ہو جائے گی، جیسا کہ معلوم ہے کہ عرب کی زمین میں سبزہ نہیں ہے یا بہت کم ہے، لیکن اب کوشش کی جارہی ہے کہ مصنوعی بارش کے ذریعے سے ایسے علاقوں کو جہاں سبزہ نہیں ہوتا پانی مہیا کیا جائے اور ان کو باغیچوں میں تبدیل کیا جائے۔

حضرات اہلِ مدینہ کا طرہ امتیاز ان کا زہد تھا، مکہ والے سیٹھ مشہور تھے، اگرچہ کسی زمانے میں مکہ میں بھی بڑی تنگی ہوتی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے: ﴿الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ﴾ خود ہی فرمادیا تھا، آج کا مدینہ دیکھئے تو سبحان اللہ! تقریباً تین میل کے پھیلاؤ پر مدینہ پھیل گیا ہے اور پرانے مدینہ کو تو مسجد شریف نے ہی گھیر لیا ہے، اللہ کے بہت سے بندے اب بھی وہاں ہیں، میں اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا ہوں کہ مسجد نبوی کی صفِ اوّل میں قطب رہتے ہیں، ان سے ملا کرو، صفِ اوّل کا اہتمام کرنے والے بہت سے اللہ کے مقبول بندے وہاں ہیں اور خاص طور پر جو مواجہہ شریف کے سامنے بیٹھتے ہیں ان پر تو ایسا ہے جیسے بجلی کی روشنی براہِ راست کسی پر ڈالی جائے، ان کے چہرے اتنے نورانی ہیں انوارِ نبوّت کے بالمقابل بیٹھے ہیں۔

یہودیوں سے جنگ

[حدیث: ۱۲۶۰] ’’عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ......، لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى تُقَاتِلُوا الْيَهُودَ حَتّٰى يَقُولَ الْحَجَرُ وَرَاءَهُ الْيَهُودِيُّ: يَا مُسْلِمُ! هٰذَا يَهُودِيٌّ وَرَائِي فَاقْتُلْهُ۔‘‘

(صحیح بخاری ج: ۱۰، ص: ۱۷، حدیث نمبر: ۲۷۰۹، باب قِتَالِ الْيَهُودِ)

ترجمہ: ’’حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں قائم ہوگی قیامت یہاں تک کہ تم قتال کروگے یہود سے، یہاں تک کہ کہے گا ہر وہ پتھر جس کے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہوگا: اے مسلمان! یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے اس کو قتل کر۔‘‘

تشریح: اس حدیث میں ارشاد فرمایا: تم آخری زمانے میں یہودیوں سے قتال کروگے یعنی قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم یہودیوں سے قتال نہ کرو، یہاں تک کہ اگر کسی درخت کے پیچھے کوئی یہودی چھپا ہوا ہوگا تو وہ درخت آواز دے کر کہے گا کہ: اے مسلم! یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے

اس کو قتل کر۔ یہ ہوگا دجال کے زمانے میں۔

شرح اس کی یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے ایک مسیحا کے آنے کا وعدہ ہوا تھا اور وہ اس پر ایمان رکھتے تھے، وہ مسیحا آئے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام لیکن یہودیوں نے اپنی حماقت کی وجہ سے ان کو نہیں مانا، مختلف قسم کے شبہات ان کے بارے میں اُٹھائے، مسیح آئے اور آسمان پر چلے گئے، یہ بے چارے ابھی تک مسیحا کی تلاش میں ہیں تو غلام احمد کی طرح وہ دجال بھی مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کرے گا، غلام احمد قادیانی کو یہ مرزائی مل گئے اور اس دجال کو یہودی مل جائیں گے، چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ اصفہان کے ستر ہزار یہودی اس کے ساتھ ہوں گے اور وہ یہودیوں کو ساتھ لے کر جیسا کہ یہودیوں کا منصوبہ ہے اور ان کی کتابیں بھی چھپ چکی ہیں وہ پوری دُنیا کو تہہ تیغ کر دیں گے کہ پوری دُنیا کو فتح کرنا ہے، پوری دنیا کو مارو۔

چنانچہ وہ ساری دُنیا میں اُدھم مچاتا پھرے گا مکہ اور مدینہ بھی جائے گا لیکن فرشتوں کی حفاظت کے باعث اندر داخل نہ ہو سکے گا، بالآخر ملک شام میں بھی پہنچے گا وہاں مسلمانوں کا محاصرہ کرے گا اور وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل کریں گے تو یہودیوں کا سپہ سالار تو مارا گیا اب یہودی اتنے بزدل ہو جائیں گے کہ چلو یا تو مسلمان ہو جاؤ یا جنگ کے میدان میں لڑو، اپنی ازلی بدبختی کی وجہ سے وہ مسلمان نہیں ہوں گے۔

میں کہا کرتا ہوں کہ مرزائی باپ بھی بن سکتا ہے، بہائی بھی بن سکتا ہے، ملحد بن سکتا ہے، دہریہ بن سکتا ہے، لیکن مسلمان ہو جائے بڑا مشکل! مرزائی کو مسلمان کرنا مشکل ہے، کسی اور گمراہ ٹولے کی طرف کرنا مشکل نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت ہوتی ہے۔

اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان سے نازل ہوتا ہوا دیکھیں گے اور ان کے دجال کا جھوٹا مسیح ہونا ان کی آنکھوں سے ثابت ہو جائے گا، ساری دُنیا سمجھ جائے گی کہ یہ سچا مسیح ہے، یہ جھوٹا مسیح ہے، ایک مسیح دوسرے مسیح کے پیچھے لگا ہوا ہے، ایک آگے بھاگ رہا ہے اور ایک پیچھے حربہ لئے ہوئے اس کو قتل کرنے جا رہا ہے، سچے مسیح اور جھوٹے مسیح کا مقابلہ ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کو قتل کر دیں گے، اب بھی کیا کسی کو کوئی اشکال رہ گیا؟ یہ بھی مسیح ہے وہ بھی مسیح ہے، یہ سچا مسیح ہے وہ جھوٹا مسیح ہے، لیکن مسلمان ہونے کی توفیق پھر بھی نہ ہوگی، یہ ان کی بدبختی ہے اور جب ان کا دجال مارا گیا تو اب وہ میدان میں کھڑے ہو کر مقابلہ کیسے کریں؟ اس لئے کبھی پتھروں، چٹانوں کے پیچھے، کبھی درختوں کے پیچھے چھپتے پھریں گے، اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان کو شجر و حجر پناہ دینے سے انکار کر دے گا سوائے ایک درخت کے جس کو ''شجر الیہود'' یہود کا درخت کہتے ہیں کہ وہ ان کو پناہ دے گا۔ دُوسرے کسی درخت یا پتھر کے پیچھے یہودی چھپا ہو گا وہ شجر و حجر پکاریں گے کہ: ''یَا مُسْلِمُ! هٰذَا يَهُوْدِيٌّ وَرَائِي تَعَالَ فَاقْتُلْهُ'' اے مسلمان! میرے پیچھے یہودی چھپا

ہوا ہے آؤ اور اس کو قتل کر دو۔

اس طرح سارے کے سارے یہودی قتل ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی سرزمین یہودیوں کے نجس بیج سے پاک ہو جائے گی۔ عیسائی مسلمان ہو جائیں گے اور ان کے علاوہ جتنی قومیں اس وقت موجود ہوں گی سب مسلمان ہو جائیں گی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول آسمان سے دیکھ کر اور دجال کے مقابلے میں آپ کی فتح دیکھ کر جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ساری ملتیں اور مذاہب ختم ہو جائیں گے سوائے اسلام کے، اس کی پیش گوئی فرمائی رسول اللہ ﷺ نے۔

یہاں ایک نکتہ ذکر کرتا ہوں، غلام احمد کہا کرتا ہے کہ میں مسیح کا دعویٰ کرنے والا موجود ہوں، میرے مقابلے میں تم اپنے اس سچے مسیح کو لے آؤ۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے چھوٹے چھوٹے دجالوں کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ نہیں آئیں گے، اس کا مقابلہ کرنے کے لئے میرے جیسے چھوٹے مولوی کافی ہیں اللہ کے فضل سے، یہ غلام احمد قادیانی اور اس کی ذُرّیت یہ چھوٹا دجال ہے، اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اللہ کے فضل سے میں کافی ہوں، اللہ کے نبی کا حقیر سا اُمتی اور میں نے چیلنج کیا تھا اور آج تک اس نے جواب نہیں دیا مرزا طاہر نے اور نہ دے گا، تو تیرے مقابلے میں حضرت عیسیٰ کیوں آئیں گے، تیرا بڑا بھائی ابھی پیچھے باقی ہے، وہ بھی کہے گا کہ لاؤ میرے مقابلے میں سچے مسیح کو اس کا بھی نعرہ یہی ہوگا، اور تیرے جیسے چھوٹے موٹے تو پانچ سو مسیح آچکے ہیں چودہ صدیوں میں، عیسیٰ کس کس کے مقابلے میں آئیں گے؟ وہ تو اپنے وقت پر آئیں گے۔

اور ایک نکتہ یہاں یہ ہے کہ پہلے زمانے میں جب لوگ اس حدیث کو پڑھا کرتے تھے تو جو لوگ کہ معجزات کے منکر ہیں یا جن کی عقل کی ڈبیا میں یہ ہیرا نہیں رکھا جا سکتا، یعنی معجزات کا اقرار، وہ کہتے تھے سب درخت کیسے بولیں گے؟ اور اب تمہاری مشینیں جگہ جگہ بول رہی ہیں، پتھر بول رہے ہیں، لکڑیاں بول رہی ہیں، وہ درخت بھی اسی طرح بول لیں گے اور عجیب بات یہ کہ درخت صرف بولے گا نہیں بلکہ مسلم کافر کے درمیان فرق بھی کرے گا وہ مسلمان کو کہے گا کہ: یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے آؤ اس کو قتل کر دو۔

خوزستان اور کرمان والوں سے جنگ

[حدیث: ۱۲۶۱] ''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ......، لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى تُقَاتِلُوا خُوزًا وَكَرْمَانَ مِنَ الْأَعَاجِمِ حُمْرَ الْوُجُوهِ فُطْسَ الْأُنُوفِ صِغَارَ الْأَعْيُنِ وُجُوهُهُمُ الْمَجَانُّ الْمُطْرَقَةُ نِعَالُهُمُ الشَّعَرُ۔''

(صحیح بخاری ج:۱۱، ص:۴۲۴، حدیث نمبر: ۳۳۲۳، باب عَلَامَاتِ النُّبُوَّةِ فِي الْإِسْلَامِ)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ تم لڑائی کرو خوز اور کرمان عجمیوں سے جن کے منہ سرخ، ناک چپٹی، آنکھیں چپٹی، آنکھیں چھوٹی ہوں گی، ایسا لگے گا کہ گویا ان کے چہرے ڈھالیں ہیں تہہ بہ تہہ چمڑا چڑھی ہوئی، ان کے جوتے بالوں کے ہوں گے۔"

تشریح: اس حدیث شریف میں فرمایا: قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ تم خوز اور کرمان کے رہنے والے لوگوں سے یعنی ترکوں سے لڑائی کرو، ان کی نشانی یہ ہے کہ چہرے سرخ، ناک چپٹی، آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چہرے ایسے گول مٹول گویا ڈھال ہے تہہ بہ تہہ، جوتے بالوں کے پہنے ہوئے ہوں گے۔

یہاں اس حدیث کے ضمن میں بعضوں نے ذکر کیا ہے کہ صحابہ کرام نے ترکوں سے جنگ کی تھی، صحابہ کرام نے تو تقریباً ساری ہی اقوام سے جنگ کی ہے، لیکن بعید نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی یہ پیش گوئی فتنہ تاتار کی طرف اشارہ ہو، ان تاتاریوں کا حلیہ بھی آپ علیہ السلام نے بیان فرمایا لیکن مسلمان پر اِدبار تھا، ﴿وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۴۰) جیسے آج مسلمان پر اِدبار (پستی) ہے، ایک ارب کے قریب مسلمان ہیں، لیکن ذلیل ترین قوموں سے دبے ہوئے ہیں، یہ نصرانی جنہوں نے کبھی استنجا نہیں کیا ایسی گندی قوم جنہوں نے کبھی غسل جنابت نہیں کیا آج یہ ان کے مقتداء ہیں اور مسلمان ان کے سامنے ہاتھ جوڑ رہے ہیں کہ حضور! ہمیں بھیک چاہئے، مالی امداد چاہئے اور ان کو جال میں پھانسنے کے لئے کبھی کوئی ادارہ بنایا کبھی کوئی ادارہ بنایا، اور ان میں اتنی جرأت بھی نہیں ہے اور نہ رہنے دی گئی ہے کہ اپنے وسائل کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں یا یہ کہ ایک دوسرے کی مدد کریں، ان کے درمیان اتنی غلط فہمیاں پھیلا دی گئی ہیں اور شکوک وشبہات کے اتنے کانٹے چبھو دیئے گئے ہیں کہ وہ سارے کبھی اکٹھے ہو ہی نہیں سکتے، وہ بھی بڑا شاطر ہے، شیطان کی سب سے بڑی خلافت آج کل اس کے پاس ہے، تو جس طرح آج مسلمان پر اِدبار ہے اسی طرح تاتاریوں کے زمانے میں بھی مسلمانوں پر اِدبار تھا، لیکن پھر بھی کچھ اللہ کے بندے کھڑے ہوئے، انہوں نے تاتاریوں سے جہاد کیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کیا کہ اب مسلمان تو کمزور ہو چکے ہیں اب ان تاتاریوں کو ہی پکڑ کر لاؤ، اللہ کی شان یہی تاتاری جو عالم اسلام کو ختم کرنے کے لئے آئے تھے منگول، تین مہینے تک دجلہ کا پانی سرخ ہو کر بہتا رہا مسلمانوں کے خون سے، اور ہماری اتنی کتابیں دریا بُرد کی گئیں اور جلا دی گئیں ان علاقوں کی جن کو آج کل ہم شمالی ریاستیں کہتے ہیں، یہ ہمارے علوم کے مراکز تھے، جگہ جگہ علوم کے اور کتب خانوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے لیکن سب جلا دیئے گئے، جب مسلمانوں پر یہ قیامت بیت گئی تو اللہ تعالیٰ نے انہی تاتاریوں کو کان سے پکڑ کر حرم کا پاسبان بنا دیا، ان سے پھر اپنے دین کی خدمت لی، یہ آل عثمان خلافت ترکیا یہ بھی تو وہی تھے اور بعد میں پھر یہی اسلام کے محافظ ہوئے، اللہ کی شان۔

فتنوں کی کثرت

[حدیث: ۱۲۶۲] "عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ......، لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَمُرَّ الرَّجُلُ بِقَبْرِ الرَّجُلِ فَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي مَكَانَهُ۔"

(صحیح بخاری ج: ۲۲، ص: ۱۳۱، حدیث نمبر: ۶۵۸۲، باب لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يُغْبَطَ أَهْلُ الْقُبُورِ، صحیح مسلم ج: ۱۴، ص: ۱۱۲، حدیث نمبر: ۵۱۷۵، باب لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَمُرَّ الرَّجُلُ بِقَبْرِ الرَّجُلِ......)

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ گزرے گا ایک آدمی ایک آدمی کی قبر پر سے پس کہے گا کہ: اس کی جگہ میں ہوتا۔"

تشریح: یہ حدیث علامات قیامت سے متعلق ہے کہ لوگوں پر تنگی اور سختی کا ایسا وقت آئے گا کہ ایک آدمی اپنے کسی عزیز سے یا بھائی کی قبر کے پاس سے گزرے گا تو کہے گا: اے کاش! میں اس کی جگہ ہوتا، یعنی میں مر گیا ہوتا۔

فتنے دو قسم کے ہیں: ایک وہ فتنے ہیں جن کا تعلق دین سے ہے، یعنی ان فتنوں کی وجہ سے اندیشہ ہوتا ہے کہ خدانخواستہ دین ضائع نہ ہوجائے، اور ایک فتنے دُنیا کی زندگی سے متعلق ہیں اور دنیا کی زندگی سے متعلق بھی بالآخر دین ہی کی طرف لوٹتے ہیں کیونکہ آدمی تنگی میں آ کر اللہ میاں سے شکایت کر بیٹھے گا اور کوئی نہ کوئی کلمہ کفر بک دے گا اور تیسری قسم فتنوں کی وہ ہے جو عام ہوں یعنی ایک فرد سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا تھا: تم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فتنوں کے بارے میں کچھ سنا ہے؟ کچھ حضرات نے بیان کیا: میں نے یہ سنا ہے، میں نے یہ سنا ہے، فرمایا: یہ تو معمولی فتنے ہیں کہ گھر میں لڑائی ہوگئی کسی بچے کے ساتھ کوئی بات ہوگئی، آدمی اپنے گھر میں کبھی فتنے میں مبتلا ہوگیا، کبھی مال کی وجہ سے فتنے میں مبتلا ہوگیا، ایسی چیزیں تو پیش آتی رہتی ہیں اور نماز روزہ اس کا کفارہ بن جاتا ہے، میں تو اس فتنے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں "تَمُوْجُ كَمَوْجِ الْبَحْرِ" جو سمندر کی موجوں کی طرح ٹھاٹھیں مارے گا یعنی عام ہو جائے گا اور ایک آدمی کے ساتھ اس کا تعلق نہ ہوگا بلکہ کہنا چاہئے پوری اُمت کے ساتھ اس کا تعلق ہوگا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اس مجلس میں موجود تھے، فرمانے لگے: امیر المؤمنین! آپ کو اس فتنے سے کیا واسطہ؟ "فَإِنَّهَا دُوْنَكَ وَ دُوْنَهَا حِجَابٌ بَابٌ مُغْلَقٌ" آپ کے اور اس فتنے کے درمیان حجاب اور بند دروازہ ہے آپ کے ہوتے ہوئے فتنہ آ ہی نہیں سکتا۔ حضرت نے فرمایا: وہ دروازہ توڑ دیا جائے گا یا کھول دیا جائے گا؟ کہا: توڑ دیا جائے گا، فرمایا: افسوس! ٹوٹے ہونے کا کوئی علاج نہیں کیا جاسکتا، اگر اس کو کھول دیا

جا تا تو بند کر دیتے، لیکن جو ٹوٹ گیا اس کو دوبارہ کیسے بنائیں؟

عام علماء کے نزدیک یہ دروازہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا وجود ہے، جب تک کہ ان کی ذات عالی دُنیا میں موجود رہی اُمّت پر فتنوں کا طوفان نہیں آیا اور جب ان کو شہید کر دیا گیا تو فتنوں کا سیلاب بہہ پڑا، اور اُمّت کی اُمّت کو بہا کر لے گیا، لیکن امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حضرت عمرؓ اس کا مصداق ہیں، وہ لوہے کا دروازہ حضرت عمر تھے، خود حضرت عثمان کے خلاف جو شورش ہوئی وہ بھی فتنے کا اثر تھا، اگر وہ دروازہ بند ہوتا تو ممکن ہی نہیں تھا کہ یہ فتنہ آتا۔

تو میں نے کہا کہ کچھ فتنے خالص دین سے تعلق رکھتے ہیں، کچھ دُنیا کے واسطے سے ہو کر دین سے تعلق رکھتے ہیں، کچھ فتنے عام ہیں کچھ فتنے خاص ہیں، بظاہر یہاں جو فرمایا گیا ہے کہ ایک آدمی اپنے بھائی کی قبر کے پاس سے گزرے گا اور کہے گا: کاش! کہ اس کی جگہ میں ہوتا، اس سے دُنیاوی فتنے مراد ہیں، اتنی تنگی، اتنی دُشواریاں پیش آئیں گی کہ لوگ جو لوگ مر گئے وہ اچھے رہے، بعض حالات ایسے پیش آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ تمام ظاہری و باطنی فتنوں سے حفاظت فرمائے۔

یاجوج ماجوج کی کثرت

[حدیث:۱۲۶۳] "عَنْ أَبِي سَعِيدٍ..... يَقُولُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ يَا آدَمُ! فَيَقُولُ: لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِي يَدَيْكَ، قَالَ: يَقُولُ: أَخْرِجْ بَعْثَ النَّارِ، قَالَ: وَمَا بَعْثُ النَّارِ؟ قَالَ: مِنْ كُلِّ أَلْفٍ تِسْعَ مِائَةٍ وَتِسْعَةً وَتِسْعِينَ، قَالَ: فَذَاكَ حِينَ يَشِيبُ الصَّغِيرُ {وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَارَى وَمَاهُمْ بِسُكَارَى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللهِ شَدِيدٌ} قَالَ: فَاشْتَدَّ عَلَيْهِمْ، قَالُوا: يَارَسُولَ اللهِ! أَيُّنَا ذٰلِكَ الرَّجُلُ؟ فَقَالَ: أَبْشِرُوا فَإِنَّ مِنْ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ أَلْفًا وَمِنْكُمْ رَجُلٌ، قَالَ: ثُمَّ قَالَ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنِّي لَأَطْمَعُ أَنْ تَكُونُوا رُبُعَ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَحَمِدْنَا اللهَ وَكَبَّرْنَا، ثُمَّ قَالَ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنِّي لَأَطْمَعُ أَنْ تَكُونُوا ثُلُثَ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَحَمِدْنَا اللهَ وَكَبَّرْنَا، ثُمَّ قَالَ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنِّي لَأَطْمَعُ أَنْ تَكُونُوا شَطْرَ أَهْلِ الْجَنَّةِ، إِنَّ مَثَلَكُمْ فِي الْأُمَمِ كَمَثَلِ الشَّعْرَةِ الْبَيْضَاءِ فِي جِلْدِ الثَّوْرِ الْأَسْوَدِ أَوْ كَالرَّقْمَةِ فِي ذِرَاعِ الْحِمَارِ۔"

(صحیح مسلم ج:۱، ص:۵۰۰، حدیث نمبر:۳۲۷، باب قَوْلِهِ يَقُولُ اللهُ لِآدَمَ أَخْرِجْ بَعْثَ النَّارِ مِنْ كُلِّ أَلْفٍ تِسْعَ)

ترجمہ: "حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے قیامت کے دن اے آدم! وہ عرض کریں گے لَبَّیکَ وَ سَعْدَیکَ وَ الْخَیرُ فِي یَدَیکَ اور اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ دوزخ کا حصہ نکال لو اپنی اولاد میں سے دوزخ کا حصہ نکال لو، وہ کہیں گے کہ دوزخ کی بھرتی کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے فی ہزار نو سو ننانوے (۹۹۹)، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ وقت ہوگا کہ بچے بوڑھے ہوجائیں گے اور ہر حمل والی اپنا حمل گرادے گی اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب سخت ہوگا، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ بات سن کر صحابہ کرام کو بہت شاق گزرا، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہزارواں آدمی ہزار میں سے ہم میں سے کون ہوگا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: خوش ہوجاؤ یاجوج اور ماجوج میں سے ایک ہزار اور تم میں سے ایک آدمی، پھر ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے میں اُمید رکھتا ہوں کہ تم اہلِ جنّت میں سے چوتھائی ہو یعنی جنّت میں جتنے آدمی ہیں ان میں سے چوتھا حصہ، ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اللہ کی حمد کی اور اللہ کی تکبیر بیان کی یعنی اللہ اکبر کہا، پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے میں اُمید رکھتا ہوں کہ تم تہائی اہل جنّت میں سے ہو، ہم نے اللہ کی حمد بیان کی اور تکبیر کہی، آنحضرت ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے بے شک میں اُمید رکھتا ہوں کہ تم آدھے اہل جنّت میں سے ہو، آدھی تمام امتیں ہیں اور آدھے تم ہو اور پھر یہ ارشاد فرمایا کہ امتوں کے مقابلے میں تمہاری مثال ایسی ہے جیسے سیاہ بیل ہو اس میں ایک بال سفید ہو یا گدھے کی ٹانگ میں ایک لکیر سفید بالوں کی ہو۔''

تشریح: اس حدیث کا مضمون بالکل واضح ہے یعنی آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ شانہٗ آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ آدم اپنی اولاد میں سے دوزخ کا حصہ الگ کردے، وہ کہیں گے کہ لَبَّیکَ وَ سَعْدَیکَ وَ الْخَیرُ فِي یَدَیکَ یہ دوزخ کا حصہ کیا ہے؟ فرمایا: ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے (۹۹۹)، ایک آدمی جنتی اور نو سو ننانوے فی ہزار دوزخی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ بات سن کر قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ دن ہوگا جس دن بچے بوڑھے ہوجائیں گے یعنی یک لخت ان کے بال سفید ہوجائیں گے۔

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ وقت ہوگا کہ تمام بچوں کے یک لخت بال سفید ہوجائیں

گے، جب اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ آدم دوزخ کا حصہ اپنی اولاد میں سے الگ کردیں وہ عرض کریں گے کتنا حصہ ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ایک ہزار میں سے نوسوننانوے (۹۹۹) دوزخ کا حصہ ہے تو رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ وہ وقت ہوگا کہ چھوٹے بچے بوڑھے ہوجائیں گے بال سفید ہوجائیں گے اور جس عورت کے پیٹ میں بچہ ہو وہ حمل ساقط کردے گی اور یہ بات سن کر لوگ مدہوش ہوجائیں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى﴾ (الحج:۲) وہ مدہوش نہیں ہوں گے ﴿وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ﴾ لیکن اللہ کے عذاب کا خوف اتنا سخت ہوگا۔

اس حدیث کے راوی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے جب یہ بات ارشاد فرمائی تو اس حدیث کو سن کر ہمارا تو پتہ پانی ہوگیا، ہم نے کہا یا رسول اللہ! ایک ہزار میں نوسوننانوے تو دوزخی ہوں گے ایک بتاؤ کہ جنتی کون ہوگا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یاجوج وماجوج تمہارے مقابلے میں اتنے ہیں کہ ان کا ایک ہزار آدمی ہو اور تمہارا ایک آدمی ہو، اللہ نے ان کی تعداد ہی اتنی بنائی ہے اور یاجوج ماجوج جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں نکلیں گے تو یوں فرمایا کہ بحیرہ طبریہ کے اوپر سے گزر ہوگا تو اگلا حصہ سمندر ہے پی کر ختم کردیں گے اور پچھلوں کے لئے خشک ہوجائے گا اب تم دیکھو کہ کتنی تعداد ہوگی ان لوگوں کی اور پچھلے لوگ یہ کہیں گے کہ یہاں غالباً کوئی پانی ہوتا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے رُفقاء کے ساتھ کوہِ طور پر چلے جائیں گے اور یہ اودھم مچاتے ہوئے پھریں گے یاجوج وماجوج، حدیث میں فرمایا کہ آخر میں وہ کہیں گے کہ زمین والوں کو تو ہم نے ختم کردیا اب آسمان والوں کو ختم کریں تو اوپر کو تیر پھینکنا شروع کریں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایٹمی اسلحہ جو ہے وہ بھی ختم ہوجائے گا تو تیر کمان پر آجائیں گے پھر تو اوپر کو پتھر پھینکیں گے اور اللہ کی شان کہ اللہ تعالیٰ ان کے تیروں کو خون آلود بھیجے گا، وہ نیچے گریں گے تو خون لگا ہوا ہوگا اور وہ بڑے خوش ہوں گے کہ ہم نے آسمان والوں کو ماردیا، اس پر حدیث میں فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رُفقاء اللہ کی بارگاہ میں دُعا کریں گے کہ یا اللہ! ان کو ہلاک کر، اللہ تعالیٰ ان کی گردن میں ایک کیڑا پیدا کردے گا، ایک آدمی کی طرح سارے کے سارے مرجائیں گے، پوری کی پوری زمین ان کی بدبو سے ان کی چربی سے آلودہ ہوجائے گی، اللہ تعالیٰ پرندوں کو بھیجیں گے وہ ان کی لاشوں کو اُٹھا اُٹھا کر سمندر میں پھینکیں گے۔

بہرکیف تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تمہارا ایک آدمی اور یاجوج وماجوج کے ایک ہزار، پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے توقع رکھتا ہوں اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھتا ہوں کہ تم چوتھائی اہل جنت ہو،

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سن کر نعرہ تکبیر بلند کیا اللہ تعالیٰ کی حمد بھی کی اور تکبیر بھی کہی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ مجھے اللہ سے امید ہے کہ تم اہل جنّت میں سے تہائی ہو، دو حصے ان کے ایک حصہ تمہارا، ہم نے پھر تکبیر کہی اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ارشاد فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے مجھے اپنے اللہ سے توقع ہے کہ تم اہل جنّت میں سے نصف ہو اور پھر فرمایا کہ تمہاری مثال دوسری امتوں کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے سیاہ بیل کی پشت پر ایک بال ہو سفید۔

اللہ ہم سب کو اپنی رحمت سے جنّت عطا فرمائیں.....آمین۔

ہر زمانے میں ایک جماعت کا حق پر ہونا

[حدیث:۱۲۶۴] "عَنْ ثَوْبَانَ........ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ يَخْذُلُهُمْ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللهِ۔"

(سنن الترمذی ج:۸،ص:۱۷۲، حدیث نمبر:۲۱۵۵، بَاب مَا جَاءَ فِي الْأَئِمَّةِ الْمُضِلِّينَ)

ترجمہ: "حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمیشہ رہے گی ایک جماعت میری اُمت کی کہ ان کی اللہ کی جانب سے مدد ہوگی، نقصان نہیں دے گا ان کو وہ شخص جو ان کی مدد کو چھوڑ دے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے۔"

تشریح: اس حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ جب اہل شام میں فساد پیدا ہو جائے بگاڑ پیدا ہو جائے تو پھر مجموعی طور پر کہنا چاہئے کہ تم میں کوئی خیر نہیں ہے اگرچہ افراد باقی رہیں گے لیکن مجموعی طور پر اُمّت پر خیر غالب نہیں رہے گا اور اہل شام میں بگاڑ پیدا ہوا ہے تبع تابعین کے دور میں تو گویا تین زمانوں میں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے وقت میں اُمّت پر خیر غالب تھی اور شر مغلوب تھا، اس کے بعد رفتہ رفتہ شر غالب آنے لگا اور خیر مغلوب ہونے لگی مجموعی طور پر اُمّت کے لحاظ سے، جہاں تک افراد کا تعلق ہے اس کے بارے میں فرمایا کہ ہمیشہ رہے گی ایک جماعت میری اُمّت کی جن کی اللہ کی جانب سے مدد ہوگی اور جو شخص ان کی مدد چھوڑ دے ان کو نقصان نہیں دے گا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے۔

یہ مضمون پہلے گزر چکا ہے اور ان کے بارے میں فرمایا کہ اُمّت کا یہ گروہ اہل فتنہ کے ساتھ لڑائی کرے گا، ہمیشہ جہاد مسلسل ہوتا رہے گا گمراہ لوگوں کے مقابلے میں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہو جائے، یعنی قیامت کے بارے میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہو جائے، امام ابن مدینی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جس گروہ کا ذکر ہے اس سے مراد اصحاب حدیث ہیں یعنی اہل سنّت والجماعت جو آنحضرت

ﷺ کی حدیث پر اور صحابہ کرام کی سنّت پر عمل کرنے والے ہیں۔

کعبہ کی طرف آنے والے لشکر کی تباہی

[حدیث:۱۲۶۵] ”......حَدَّثَتْنِي عَائِشَةُ...., يَغْزُو جَيْش الْكَعْبَةَ فَإِذَا كَانُوا بِبَيْدَاءَ مِنَ الْأَرْضِ يُخْسَفُ بِأَوَّلِهِمْ وَآخِرِهِمْ....., يُخْسَفُ بِأَوَّلِهِمْ وَآخِرِهِمْ ثُمَّ يُبْعَثُونَ عَلَى نِيَاتِهِمْ۔“

(صحیح بخاری ج:۷،ص:۳۱۴، حدیث نمبر:۱۹۷۵، بَاب مَا ذُكِرَ فِي الْأَسْوَاقِ وَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ.)

ترجمہ: ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لڑنے کے لئے آئے گا ایک لشکر کعبہ سے پس جبکہ وہ بیداء مقام پر ہوں گے تو ان کے اول و آخر کو دھنسا دیا جائے گا اس کے بعد لوگ اُٹھیں گے اپنی نیتوں پر۔“

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ ایک لشکر نعوذ باللہ کعبہ پر حملہ کرنے کیلئے آئے گا 'بیداء' مقام پر پہنچے گا تو ان کے اول و آخر سب کو دھنسا دیا جائے گا زمین میں اور اس کے بعد وہ اپنی اپنی نیتوں کے مطابق اُٹھیں گے۔

اپنی نیتوں کے مطابق اُٹھنے کا کیا مطلب؟ اس کی تشریح دوسری حدیث میں موجود ہے کہ لشکر کے ساتھ دوسرے لوگ بھی مل جاتے ہیں چیزیں بیچنے کے لئے خرید و فروخت کے لئے تو اس وقت تو تمام کے تمام لشکر کو بشمول ان کے خادموں کے سب کو دھنسا دیا جائے گا اور قیامت کے دن جو کوئی چیز بیچنے کے لئے آیا تھا شامل ہوا تھا یا کسی اور مقصد کے لئے شامل ہوا تھا ان کو ان کے مطابق اُٹھایا جائے گا۔

کتابُ المناقب

فضائل ومناقب کے بیان میں

میری آنکھیں سوتی ہیں

[حدیث: ۱۲۶۶] ".......قَالَتْ عَائِشَةُ........ ، يَا عَائِشَةُ! إِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَ لَا يَنَامُ قَلْبِي۔"

(صحیح بخاری ج: ۴، ص: ۳۱۹، حدیث نمبر: ۱۰۷۹، باب قِيَامِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاللَّيْلِ فِي رَمَضَانَ وَغَيْرِهِ)

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک میری دونوں آنکھیں سوتی ہیں، میرا دل نہیں سوتا۔"

تشریح: اس حدیث میں ایک واقعہ ذکر کیا گیا ہے: اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ نماز سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آرام فرمایا، نیند فرمائی پھر نماز کا وقت ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بغیر وضو نماز پڑھانے چلے گئے اور آپ اتنی گہری نیند سو جاتے تھے یہاں تک کہ آپ کی سانس کی آواز آجاتی تھی اور پھر اسی طرح اُٹھ کر نماز پڑھنے چلے جاتے وضو بھی نہ کرتے تھے، میں نے کہا: آپ سو گئے تھے پھر ایسے ہی نماز پڑھ لی! فرمایا: إِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَ لَا يَنَامُ قَلْبِي میری آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتا۔ اور اُمّت کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی، آپ کی نیند وضو کو توڑنے والی نہیں تھی کیونکہ دل غافل نہیں ہوتا تھا، نیند بالاجماع ناقضِ وضو ہے یعنی اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ حدیث میں ہے: وِكَاءُ السَّهِ الْعَيْنَانِ (ابوداود، ۱/ ۲۸۴، ۲۰۳، الاستذکار لابن عبدالبر، ۱/ ۱۵۱) آنکھیں آدمی کے ریح خارج ہونے کا بندھن ہیں تو جب آدمی سو جاتا ہے تو بند کھل جاتا ہے، اب اس سونے والے کو پتا نہیں ہوتا کہ کیا نکلا کیا نہیں نکلا؟ اس لئے نیند کو ناقضِ وضو سمجھا جاتا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی کہ آپ کی نیند ناقضِ وضو نہ تھی۔

آنحضرت ﷺ کا تحمل، حلم اور بُردباری

[حدیث: ۱۲۶۷] "عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ......، فَإِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالًا۔"

(صحیح بخاری ج: ۸، ص: ۲۴۰، حدیث نمبر: ۲۲۲۶، بَاب لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالٌ وَيُذْكَرُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى....)

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک صاحبِ حق کو کہنے کا حق پہنچتا ہے۔"

تشریح: اس حدیث میں ایک چھوٹا سا قصہ ہے، وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ کے ذمے کسی یہودی کا قرضہ تھا تو وہ آ کر بُرا بھلا کہنے لگا، صحابہ کرام نے اس کو ڈانٹا کہ تجھے شرافت سے بات کرنا نہیں آتی، آپ نے فرمایا کہ چھوڑ دو: "فَإِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالًا" صاحبِ حق کو بات کرنے کا حق پہنچتا ہے، جب اس بے چارے کو مجھ سے قرضہ لینا ہے تو اس کو بولنے کا حق پہنچتا ہے، بجائے اس کے کہ آنحضرت ﷺ اس کو ڈانٹتے، صحابہ کرام کو منع فرمایا، ان اخلاقِ عالیہ کو دیکھ کر وہ مسلمان ہو گیا۔

ایک اور صحابی کا قصہ ہے، حضور ﷺ سے کہنے لگے: تم لوگ قرض لیتے ہو ضرورت پیش آتی ہے، میرے پاس مال بہت ہے مجھ سے قرض لے لیا کرو، وہ یہودی تھے، ایک دفعہ اس سے قرض منگوالیا، تاریخ مقرر کر لی کہ فلاں وقت ادا کریں گے، تاریخ آنے میں ابھی وقت تھا، وہ صاحب مجلس میں آ گئے سب صحابہ موجود، آ کر بُرا بھلا کہنے لگے: قریشیو! حضور کے خاندان کو کہنے لگا کہ تم لوگ سارے ہی ایسے ہو، کسی کا حق ادا کرنا نہیں جانتے، بہت کچھ بولتا رہا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو شمشیرِ بے نیام تھے، انہوں نے اس کا گریبان پکڑ لیا کہ کیا کہتا ہے؟ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ ہونے لگے تو آنحضرت ﷺ مسکرائے، پہلے آرام سے سنتے رہے، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غصہ کیا تو فرمایا: اے عمر! میں اور یہ صاحب کسی اور چیز کے محتاج تھے، یعنی ہمیں کسی اور چیز کی ضرورت تھی، وہ یہ کہ تم ان سے کہتے کہ اچھے انداز سے چیز مانگا کرتے ہیں، اتنی تلخی نہیں کیا کرتے، اور مجھ سے کہتے کہ کسی کا حق ادا کرنا ہو تو آدمی کو وقت پر ادا کر دینا چاہئے تاکہ دوسرے کو کہنے کا موقع ہی نہ ملے، تم ہمیں یہ نصیحت کرتے تم اس سے لڑنے لگے! اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جاؤ اس کو لے جاؤ! اس کا حق ادا کر دو اور بیس صاع مزید بھی عطا کر دو، کیونکہ اس کو اپنے حق کے لئے لڑنا پڑا، وہ شخص وہیں کھڑا کھڑا کہنے لگا: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا: میں پہلی آسمانی کتابوں کا ماہر ہوں، میں نے نبی آخر الزمان کی صفات پڑھی ہیں اور ایک ایک کو نوٹ کیا ہے اور ان کو رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ عالی پر چسپاں کیا ہے، ایک ایک صفت آپ کے اندر پائی جاتی ہے لیکن ایک بات کا میں تجربہ نہیں کر سکا تھا اور وہ یہ کہ لکھا ہے کہ آپ کا تحمل آپ کے غصے پر غالب رہے گا، آج مجھے اس کا تجربہ ہوا اور میں نے

اس کا تجربہ کرنے کے لئے ہی قرض دیا تھا، حالانکہ ابھی میرے قرضے کا وقت نہیں آیا تھا، میں نے ان کو جان بوجھ کر قرض دیا اور میں جان بوجھ کر وقت سے پہلے مانگنے کے لئے آ گیا، مجھے یہ امتحان کرنا تھا کہ واقعی ان کا حلم ان کے غصّے پر غالب رہتا ہے۔ یہ نبوت تھی، کیا بات تھی! وہ بُرا بھلا کہہ رہا ہے، دوسرے لوگ منع بھی کر رہے ہیں، آپ فرماتے ہیں کہ چھوڑ دو، صاحبِ حق کو بات کہنے کا حق پہنچتا ہے۔

ختمِ نبوّت کی مثال

[حدیث:۱۲۶۸] ''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ.....، إِنَّ مَثَلِي وَمَثَلَ الْأَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِي كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنَى بَيْتًا فَأَحْسَنَهُ وَأَجْمَلَهُ إِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ مِنْ زَاوِيَةٍ فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوفُونَ بِهِ وَيَعْجَبُونَ لَهُ وَيَقُولُونَ هَلَّا وُضِعَتْ هَذِهِ اللَّبِنَةُ؟ قَالَ: فَأَنَا اللَّبِنَةُ وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ۔''

(صحیح بخاری ج:۱۱ ص:۳۶۶، حدیث نمبر:۳۲۷۱، بَاب خَاتِمِ النَّبِيِّينَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے کے انبیائے کرام کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے ایک مکان بنایا بہت ہی خوب صورت اور حسین وجمیل بنایا مگر اس کے کونوں میں سے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی، لوگ اس کے اردگرد گھومتے اور اس کے حسن وجمال پر تعجب کرتے اور کہتے: یہ اینٹ کیوں نہ لگائی؟ سو میں وہ اینٹ ہوں اور میں آخری نبی ہوں، نبیوں کو پورا کرنے والا ہوں۔''

تشریح: اس حدیث شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ختم نبوت کی مثال بیان فرمائی ہے، فرمایا: میرے اور مجھ سے پہلے انبیائے کرام کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے مکان تعمیر کرنا شروع کیا، تکمیل کر دی اس مکان کی، بنیادوں سے لے کر چھت تک پورے مکان کی تعمیر کر دی اور نہایت حسین وجمیل اور خوب صورت مکان بنایا، لوگ اس کی عمدگی کو دیکھ کر اس کے چاروں طرف چکر لگاتے اور دیکھ کر عش عش کرتے لیکن جب غور سے دیکھتے تو معلوم ہوتا کہ ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ رہ گئی ہے، تو لوگ یوں کہتے: محل تو بہت عمدہ بنایا بہت ہی حسین لیکن یہ ایک اینٹ کیوں نہیں رکھ لی گئی؟ یہ بھی لگا دیتے تاکہ محل ہر اعتبار سے مکمل ہو جاتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: وہ کونے کی اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النّبیین ہوں کہ میرے آنے سے نبوت کے محل کی ہر اعتبار سے تکمیل ہو گئی۔

اب غلام احمد قادیانی کے روڑے کی ضرورت نہیں، اس مخمل پر اب ٹاٹ کا پیوند لگانے کی ضرورت

نہیں رہی، تو یہ آنحضرت ﷺ نے ایک محسوس مثال بیان فرمائی کہ نبوت کی ایک عمارت تھی اور انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام گویا کہ اس عمارت کی اینٹیں تھیں، نہایت خوب صورت، منقش، حسن و جمال والی، اپنی اپنی جگہ کاریگران کو چنتا چلا گیا اور بہترین محل تیار ہو گیا لیکن ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ ابھی باقی تھی، وہ تم جانتے ہو کہ کونے پر مدار ہوتا ہے تو وہ آخری کونے کی اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں، میرے آنے کے بعد اس محل کی تکمیل ہو گئی۔

اب ایک محل کو ہر اعتبار سے مکمل کر دیا گیا ہے اور تعمیراتی دفتر بھی اُٹھا لیا گیا ہے، اب پہلی کسی اینٹ کو اُکھاڑ کر ہی کوئی اینٹ لگ سکتی ہے، چنانچہ جتنے جھوٹے مدعیان نبوت ہوئے انہوں نے کسی نہ کسی تاویل سے ان اینٹوں کو اکھاڑ کے ان کی جگہ فٹ ہونے کی کوشش کی مگر ہو نہیں سکا، گزشتہ چودھویں صدی میں مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی کوشش کی تھی نبی بننے کی لیکن بن نہیں پایا۔ بے چارہ۔ اور نبی بننے کی کوشش کیسے کی؟ کبھی تو یوں کہا کہ میں مسیح ہوں، مسیح کے آنے کا وعدہ کیا گیا ہے اس اُمت میں، دجال کو قتل کرنے کے واسطے مسیح آئیں گے، میں ہی مسیح ہوں، میری خدمات اس کے لئے حاضر ہیں، پر ہو نہ سکا، پھر کہنے لگا کہ: چلو ایسا کر لو کہ میں محمد رسول اللہ کا بروز ہوں، بروز کا معنی مرزا جس معنی میں استعمال کرتا ہے وہ اواگون، مطلب یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو دنیا میں دو مرتبہ آنا تھا، ایک مرتبہ تو مکہ مکرمہ میں آئے تھے اور دوسری مرتبہ العیاذ باللہ! قادیان میں آئے ہیں، یہ معنی ہیں بروز کے اور میں چونکہ بعینہٖ رسول اللہ ہوں اس لئے میرے آنے سے ختم نبوت کی مہر نہیں ٹوٹی۔

مسلمان لوگ نبی پاک ﷺ کی مدح اور تعریف میں کوئی قصیدہ بناتے ہیں تو اس کو کہتے ہیں "نعت شریف"، یہ قادیانی مرزا کی تعریف میں کچھ کہتے ہیں تو اس کو کہتے ہیں "نعت شریف"، ایک قادیانی نے نعت شریف لکھی قادیانی نعت:

اے میرے پیارے میرے محبوب رسولِ قدنی

ہم نبی پاک ﷺ کو کہتے ہیں "رسولِ مدنی"، یہ قادیانی کہتے ہیں "رسولِ قدنی"، شکر ہے کہ "پاد" سے "پدنی" نہیں بنا دیا۔ آگے چل کر کہتا ہے:

پہلی بعثت میں محمد تھا تو اب احمد ہے

یہ غلام احمد قادیانی ہے، ہمارے لدھیانہ کے تھے مولانا سعد اللہ صاحب مرحوم، اللہ غریق رحمت کرے، مرزا نے ان کو بڑی گالیاں دی، وہ بھی شاعر تھے فرماتے تھے:

غلامی چھوڑ کر احمد بنا تو

اے بے رونق و نافرجام مرزا

تجھے شرم نہیں آئی، کہتا تھا غلام احمد، بن گیا خود ہی احمد، اپنے آقا کو جس کا غلام تھا ان کو تخت سے ہٹا کر خود اس پر بیٹھ گیا، شرم نہیں آئی۔

پہلی بعثت میں محمد تھا اب احمد ہے — تجھ پر پھر اُترا ہے قرآں رسولِ قدنی
میرے پیارے میری جان رسولِ قدنی — تجھ پر میں قربان رسولِ قدنی

نعوذ باللہ! استغفر اللہ۔

اور ان کا ایک ''اکمل'' ہے، بورے کا قاضی ظہور الدین اکمل، نعوذ باللہ۔ وہ کہتا ہے:

امام اپنا عزیزو اس جہاں میں — غلام احمد ہوا دار الاماں میں
غلام احمد ہے عرش ربّ اکبر — مکاں اس کا ہے گویا لا مکاں میں
غلام احمد رسول اللہ ہے برحق — شرف پایا ہے نوع انس وجاں میں
بھلا اس معجزے سے بڑھ کر کیا ہوا — خدا ایک قوم کا مارا جہاں میں

''قوم کا خدا'' ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کو مار دیا اس نے، ''دار الاماں'' یہ قادیان کو کہتے ہیں۔

اس کے ملفوظات میں ہے کہ ہمارا وجود دو چیزوں کے لئے ہے، ایک شیطان کو مارنے کے لئے اور ایک نبی کو مارنے کے لئے، اور نبی عیسیٰ علیہ السلام اور وہ بھی مرے نہیں، وہ ابھی تک زندہ ہیں اور آخری شعر خالص نجاست کی پوٹلی یہ ہے:

محمد پھر اُتر آئے ہیں ہم میں — اور آگے سے ہیں بڑھ کر اپنی شان میں
محمد جس کو دیکھنے ہیں اکمل — غلام احمد کو دیکھے قادیان میں

ایسے بدبخت، بدذات اور ایسے بے حیاء، میں نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ غلام احمد اگر نبوت کا دعویٰ کرتا تو یہ بھی کفر ہوتا لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ میں محمد رسول اللہ ہوں یہ تو ہزار درجے کفر ہے اور بڑی معصومیت سے بتاتے ہیں کہ مولوی ہمیں کافر کیوں کہتے ہیں؟ نمازیں ہم پڑھتے ہیں، روزے ہم رکھتے ہیں، حج کو کوئی ہمیں جانے نہیں دیتا ورنہ ہم حج کے لئے بھی چلے جایا کریں اور زکوٰۃ ہم خود ہی اپنے اُوپر خرچ کر لیتے ہیں، تم ہمیں مسلمان ہی نہیں سمجھتے تو ہم تمہیں زکوٰۃ کیوں دیں؟ اور مجھے ان مسلمانوں کی غیرت پر تعجب ہوتا ہے جو ان کی شادی بیاہ میں بھی جاتے ہیں، ان کو اپنے یہاں بلاتے ہیں اور ان کے ساتھ میل جول رکھتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کا کوئی راز حکومتِ پاکستان کا راز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ غیر قوموں کے جاسوس ہیں اور یہ کلیدی تمام راز کی جگہوں پر موجود ہیں، پاکستان کی حکومت کے پاس کوئی راز، راز نہیں رہ سکتا اور اس کو راز رکھنے کی ضرورت بھی نہیں، جس ملک کی وزیر اعظم راجیو گاندھی کو اپنی خفیہ فائلیں دے دیتی ہو اس ملک کا کیا راز ہے؟

جب باڑ کھیت کو کھانے لگے تو اس کھیت کا اللہ مالک ہے، اللہ ہی حافظ ہے! لیکن تعجب ہمارے لوگوں پر ہوتا ہے کہ ان کے دماغ ان کی عقل کو کیا ہوگیا؟ خدا کی کیسی مار ہے؟

انگریز کا زمانہ ہوتا تھا، بات کرنے کا مزا بھی ہوتا تھا، ہمارے قاضی احسان احمد شجاع آبادی تقریر کرتے تھے اور کہتے تھے: کنویں میں کتا گر گیا، کتنے ڈول پانی کے نکالیں؟ بیس نکال دیں پاک نہیں ہوگا، سو نکال دیں، دوسو نکال دیں، سارا ہی پانی نکال دیں پاک نہیں ہوگا، پہلے کتا نکالو، یہ احراریوں کی زبان ہوتی تھی، پہلے یہ انگریز کتا نکالو اس کے بعد پانی نکالو۔ اور زیادہ بات تو نہیں کہتا بس یہ کہتا ہوں کہ اس کتے کو پہلے نکالو پھر کنویں کو پاک کر لینا۔

آنحضرت ﷺ کی اُمّت پر شفقت

[حدیث: ۱۲۶۹] ”عَنْ أَبِي مُوسٰی .... إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللهُ بِهٖ كَمَثَلِ رَجُلٍ أَتَى قَوْمًا فَقَالَ: يَا قَوْمِ! إِنِّي رَأَيْتُ الْجَيْشَ بِعَيْنَيَّ وَإِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْعُرْيَانُ فَالنَّجَاءَ، فَأَطَاعَهٗ طَائِفَةٌ مِنْ قَوْمِهٖ فَأَدْلَجُوا فَانْطَلَقُوا عَلٰى مَهَلِهِمْ فَنَجَوْا، وَكَذَّبَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ فَأَصْبَحُوا مَكَانَهُمْ فَصَبَّحَهُمُ الْجَيْشُ فَأَهْلَكَهُمْ وَاجْتَاحَهُمْ، فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ أَطَاعَنِي فَاتَّبَعَ مَا جِئْتُ بِهٖ وَمَثَلُ مَنْ عَصَانِي وَكَذَّبَ بِمَا جِئْتُ بِهٖ مِنَ الْحَقِّ۔“

(صحیح بخاری ج:۲، ص:۱۰۸۱، حدیث نمبر: ۶۷۴۰، باب الِاقْتِدَاءِ بِسُنَنِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ..)

ترجمہ: ”حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: بے شک میری مثال اور اس چیز کی مثال جس کو اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ بھیجا ہے اس شخص کی مثال ہے جو ایک قوم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ: اے میری قوم! میں نے دشمن کے لشکر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور بے شک میں کھلا ڈرانے والا ہوں، سو اپنی نجات کو لازم پکڑو اپنی نجات کی فکر کرو، سو ایک گروہ نے اس کی قوم میں سے اس کی بات مان لی اور وہ راتوں رات چل دیئے اور بڑے اطمینان سے اپنی منزل پر پہنچ گئے اور نجات پالی لیکن دوسرے گروہ نے اس کو جھوٹا جانا، پس اپنی جگہ پر ٹھہرے رہے، صبح کو دشمن اُن پر حملہ آور ہوا، پس ان کو ہلاک کر دیا اور ان کا استیصال کر دیا، پس یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے میری بات مان لی اور جو چیز کہ میں لے کر آیا ہوں اس کی پیروی کی اور اس شخص کی جس نے میری نافرمانی کی، پس اس کو جھٹلایا جو حق کہ میں لے کر آیا ہوں۔“

تشریح: عرب کا دستور یہ تھا کہ اگر کوئی شخص دشمن کو دیکھ لیتا کہ اس قوم پر حملہ کرنے والا ہے تو وہ اپنے کپڑے اُتار دیتا تھا، ستر پوشی کے لئے کچھ تھوڑا بہت رکھ لیتا ورنہ عام کپڑے اُتار لیتا اور کسی ڈنڈے پر بلند کر دیتا، جیسے جھنڈا وغیرہ ہوتا ہے اور اس شخص کا ننگا ہونا اور اپنے کپڑوں کو اس طرح اُونچا کرنا نیزے پر بلند کر دینا یہ علامت ہوتی تھی اس بات کی کہ یہ خطرے کی بو سونگھ کر آیا ہے، یہ ان کا ایک قاعدہ اور دستور تھا۔
آنحضرت ﷺ اس حدیث شریف میں ارشاد فرماتے ہیں کہ میری مثال اور جو حق وہدایت اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ بھیجا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص اپنی قوم کے پاس آیا اور آ کر کہنے لگا کہ اے قوم! میں اپنی آنکھوں سے دشمن کو دیکھ کر آیا ہوں اور میں ننگا ڈرانے والا ہوں، انہی کے دستور کے مطابق، سو تم اپنی نجات کی فکر کرو، بچ سکتے ہو تو بچ جاؤ، اس کی بات سن کر اس کی قوم کے دو گروہ ہو گئے، ایک وہ گروہ تھا جنہوں نے کہا کہ بات تو سچی کرتا ہے اپنی فکر کرنی چاہئے، چنانچہ وہ راتوں رات چل پڑے، کوچ کر گئے اور بڑے اطمینان کے ساتھ انہوں نے سفر طے کیا، صبح ہوئی تو وہ منزل پر پہنچ چکے تھے، اس طرح انہوں نے دشمن کے حملے سے نجات پالی اور دوسرا گروہ وہ تھا جنہوں نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا، کہنے لگے: ایسے ہی بولتا ہے، چنانچہ وہ بڑے اطمینان سے اپنی جگہ رہے، گھوڑے بیچ کر سو گئے، ابھی وہ سب کے سب سو رہے تھے کہ دشمن کا لشکر ان پر حملہ آور ہوا اور نہایت غفلت اور بے خبری میں ان پر حملہ کیا، ان کو ہلاک کر دیا اور ان کی جڑ کاٹ دی۔
آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: جن لوگوں نے میری بات مان لی اور جو ہدایت میں لے کر آیا ہوں اس پر چل پڑے، ایمان اور عمل صالح کا راستہ اختیار کر لیا، وہ نجات پالیں گے کیونکہ ابھی کام کرنے کا موقع ہے اور جن لوگوں نے میری بات کو نہ مانا اور جس ہدایت اور حق کو میں لے کر آیا ہوں اس کو جھٹلایا وہ ہلاک ہو گیا تباہ ہو گیا۔

اس حدیث میں یہ فقرہ استعمال کیا گیا ہے کہ اس ڈرانے والے نے کہا تھا: ''اے میری قوم! میں نے لشکر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے''، تو جن لوگوں نے اس لشکر کو نہیں دیکھا تو وہ اگر اس پر اعتماد کریں گے تو نجات مل جائے گی اور اگر اعتماد نہیں کریں گے تو ہلاک ہوں گے، اسی طرح آنحضرت ﷺ نے عالم غیب کو دیکھا ہے جن سے ہمیں ڈراتے ہیں، قبر، جنّت، جہنّم اور آخرت کے مناظر وہ آنحضرت ﷺ کو دکھائے گئے ہیں، چنانچہ شب معراج میں آنحضرت ﷺ کو یہ سارے مناظر دکھائے گئے اور اس سے پہلے بھی۔
ہمارے لئے تو یہ ساری چیزیں آنکھوں سے بظاہر پوشیدہ ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کو دکھا دی گئی ہیں، حق تعالیٰ شانہٗ کی بات پر رسول اللہ ﷺ کو ایمان تھا ہی اور اگر یہ چیزیں دکھائی نہ بھی جاتیں تب بھی آپ کے ایمان اور یقین میں کوئی فرق نہیں تھا کیونکہ اللہ کی بات ہے، پھر آنحضرت ﷺ کو حق تعالیٰ شانہٗ نے قلبی بصیرت اور دل کی نظر ایسی عطا فرمائی تھی جو حقائق کو دیکھ رہی تھی لیکن حق تعالیٰ شانہٗ کی مشیت یہ ہوئی کہ

آنحضرت ﷺ کو آنکھوں سے بھی ان چیزوں کا نظارہ کرا دیا جائے، احادیث طیبہ میں اس قوم کے بہت سے واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ آنحضرت ﷺ نے دیکھا ہوا ہے اور جو کچھ فرمارہے ہیں پورے یقین کے ساتھ اور بالکل اسی طرح جیسے آگ سامنے جل رہی ہے اور لوگ اس میں گرنے والے ہیں اور آپ ان کو سامنے جلتی ہوئی آگ سے بچانے کی فکر کر رہے ہیں۔

ایک دفعہ سورج کو گہن لگا تھا آنحضرت ﷺ کے زمانے میں، آپ نے اتنی طویل نماز پڑھائی کہ بعض کمزور حضرات کو غشی آگئی، بار بار جھکتے تھے پھر کھڑے ہوتے تھے، کبھی آگے بڑھتے تھے کبھی پیچھے ہٹتے، صحابہ نے بعد میں پوچھا: یارسول اللہ! آج تو آپ نے عجیب نماز پڑھائی؟ فرمایا: عالم غیب کے مشاہدات مجھے کروائے گئے تھے اور میں نے دیوار قبلہ میں جنّت اور دوزخ کو دیکھا، وہ جو میں آگے بڑھا تھا جنّت کے خوشے مجھے نظر آئے، میں نے سوچا کہ ایک خوشہ توڑ لوں اور اگر میں توڑ لیتا تو تم قیامت تک اس کو ختم نہ کر سکتے۔

اب ہماری سمجھ میں تو یہ بات بھی نہ آئے گی کہ ایک خوشہ قیامت تک کیسے ختم نہ کر سکتے؟ بات یہ ہے کہ جنّت کے پھلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ ایک دانہ توڑیں گے تو فوراً اس کی جگہ دوسرا دانہ اُگ جائے گا، آپ کو وہاں کوئی ایسا درخت نہ ملے گا جس کا پھل ٹوٹا ہوا ہو، ایک پھل آپ توڑیں گے فوراً اس کی جگہ نیا پھل پیدا ہو جائے گا، تو ساری دنیا کے لوگ مل کر بھی اس خوشے کو ختم کرنا چاہیں تو ختم نہیں کر سکتے تھے، وہ تو پھر جنّت والی تاثیر ہوتی اور فرمایا کہ جب میں پیچھے ہٹا تو جہنّم کی لپٹ مجھے نظر آرہی تھی میں ڈر گیا کہ کہیں مجھے لپیٹ میں نہ لے لے۔

اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ عام انسانوں کی بیماری غفلت ہے یعنی چونکہ عالم غیب سامنے نہیں اس لئے بے پرواہیں، کچھ لوگوں نے تو ان چیزوں کو نعوذ باللہ! ویسے ہی غلط سمجھ لیا، کہاں کی جنّت؟ کہاں کی دوزخ؟ کہاں کی قبر؟ کہاں کا اُٹھنا؟ کچھ بھی نہیں ہے، نعوذ باللہ! یہ تو آرام سے سو رہے ہیں اور جب موت کا لشکر ان پر حملہ آور ہوگا جب ان کو پتا چلے گا لیکن جو لوگ کہ ماننے والے ہیں یعنی اہل ایمان، فی الجملہ غفلت ان میں بھی پائی جاتی ہے، ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو واقعی آخرت کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں؟ کتنے لوگ ہیں جو آخرت میں ضرر دینے والی چیزوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں؟ اور کتنے لوگ ہیں جن پر دنیا کی بہ نسبت آخرت کی فکر سوار ہے، یہ غفلت ہے اور غفلت کی وجہ اور منشا ہے کہ ہم نے دیکھا نہیں اور رسول اللہ ﷺ کی بات پر کامل وثوق نہیں ہوا، ایمان کمزور ہے۔

اور اس غفلت کا علاج ہے آنحضرت ﷺ کے ان ارشادات پر عمل کرنا، اپنے ایمان کی تجدید کرنا اور پھر رفتہ رفتہ یقین دل میں بھی بیٹھ جائے گا، غفلت والوں کے پاس بیٹھو گے تو غفلت آئے گی اور ذکر والوں

کے پاس بیٹھو گے تو ذکر آئے گا، بازاریوں میں بیٹھو گے تو بازار کی باتیں آئیں گی، کاشت کاروں کے پاس بیٹھو گے تو کاشت کاری کی باتیں آئیں گی، اسی طرح جن لوگوں کو اپنی آخرت کی فکر ہے ان کے پاس بیٹھو گے تو تمہیں بھی فکر پیدا ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ یہ فکر ہم سب کو نصیب فرمائے۔

اور اس حدیث شریف سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ کام چلے گا آپ ﷺ کی اطاعت کرنے سے یعنی آپ کے ارشادات پر عمل کرنے سے، وہ فریق اور گروہ جس نے اس ڈرانے والے کو سچا سمجھا لیکن راتوں رات سفر نہیں کیا، پڑے رہے وہ بھی بچیں گے نہیں، تو ماننے کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ اس پر عمل بھی شروع کر دیا جائے، اگر سچا تو سمجھ لیا مان لیا لیکن عمل شروع نہیں کیا، غفلت وہی رہی نیند وہی رہی تو اس کا نتیجہ صحیح نہیں نکلے گا، اس لئے یہ ارشاد فرمایا: جس شخص نے میری اطاعت کی اور میرا کہا مان لیا اور جو حق کہ میں لے کر آیا ہوں اس کی پیروی شروع کر دی، اس کے مطابق عمل شروع کر دیا تو وہ نجات پا جائے گا۔

آنحضرت ﷺ کے بلند اخلاق

[حدیث: ۱۲۷۰] ”أَنَّ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ....... إِنَّ هٰذَا اخْتَرَطَ عَلَيَّ سَيْفِي وَأَنَا نَائِمٌ فَاسْتَيْقَظْتُ وَهُوَ فِي يَدِهِ صَلْتًا، فَقَالَ: مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّي؟ فَقُلْتُ: اللّٰهُ ثَلَاثًا وَلَمْ يُعَاقِبْهُ وَجَلَسَ۔“

(صحیح بخاری ج:۱۰ ص:۴۶، حدیث نمبر: ۲۶۹۴، باب مَنْ عَلَّقَ سَيْفَهُ بِالشَّجَرِ فِي السَّفَرِ عِنْدَ الْقَائِلَةِ)

ترجمہ: ”حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس آدمی نے مجھ پر میری تلوار کھینچی جبکہ میں سو رہا تھا پھر جاگ پڑا اور وہ اس کے ہاتھ میں سونتی ہوئی تھی، تو وہ کہنے لگا: بتا! اب تجھ کو کون بچائے گا میرے ہاتھ سے؟ میں نے تین بار کہا کہ: اللہ بچائے گا۔“

تشریح: اس حدیث شریف میں ایک واقعہ ذکر کیا ہے، آنحضرت ﷺ نجد کے ایک علاقے میں جہاد کے لئے تشریف لے گئے، دوپہر کا وقت تھا، جنگل میں مختلف قسم کے درخت ہوتے ہیں، صحابہ کرام ان درختوں کے سایوں میں آرام کرنے کے لئے پھیل گئے، ایک درخت کے سائے میں آنحضرت ﷺ بھی آرام فرما رہے تھے، آنحضرت ﷺ سو گئے اور اپنی تلوار مبارک درخت سے لٹکا دی، ایک کافر آیا، اس نے آنحضرت ﷺ کی تلوار اُتاری اور اُتار کر آنحضرت ﷺ کے سر پر سونت لی اور اس طرح تلوار اُوپر اُٹھا کر کہنے لگا: بتا! اب تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟ آنحضرت ﷺ نے تین دفعہ فرمایا: اللہ! یعنی اللہ بچائے گا، یہ کہنا تھا کہ تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی اور اس پر رعشہ اور کپکپی طاری ہوگئی، آنحضرت ﷺ نے وہی تلوار لی اور اس

پر اُٹھالی اور کہا: اب تو بتا کہ تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟ وہ کہنے لگا: آپ بہتر سلوک کرنے والے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو معاف فرمادیا، اس کی اور آنحضرت ﷺ کی گفتگو ہو رہی تھی کہ اتنے میں صحابہ کرام تشریف لے آئے، آواز سن کر کہ آنحضرت ﷺ کس سے گفتگو فرما رہے ہیں جلدی سے تشریف لے آئے، تو اس کی موجودگی میں آنحضرت ﷺ نے یہ قصہ صحابہ کرام کو بتایا، فرمایا: اس شخص نے سوتے ہوئے میری تلوار اُٹھالی اور مجھ پر سونت لی اور میری آنکھ کھل گئی تو یہ مجھ سے کہنے لگا: بتا! تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟ میں نے تین بار اسے کہا: ''اللہ!'' پس تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔

اس حدیث شریف میں آنحضرت ﷺ کے دو اخلاق ذکر کئے گئے ہیں، ایک تو توکل علی اللہ، اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور بھرسہ، کہتے تو ہم بھی ہیں، لیکن کہنا اور ہے دل میں اُترنا اور ہے، اے کاش! ہمارے دل میں بھی یہ یقین اُتر جائے کہ اللہ بچانے والے ہیں۔ اور دوسری چیز آنحضرت ﷺ کا حلم، صبر وعفو، معاف کرنا، یہ دشمن جس نے آنحضرت ﷺ ہی کی تلوار آپ پر سونتی اور سونتی بھی اس حالت میں کہ آپ سو رہے تھے، جب آپ ... قابو اس پر ہوا تو آنحضرت ﷺ نے اس سے انتقام نہیں لیا بلکہ آپ نے اس کو معاف کر دیا، اس کے باوجود کہ وہ غیر مسلح ہو چکا تھا اور آنحضرت ﷺ مسلح تھے اور دوسرے صحابہ کرام بھی پہنچ گئے تھے، اس قدر یقین اور توکل یہ آنحضرت ﷺ ہی کا کام تھا اور یہ معجزہ نبوت ہے اور پھر قدرت پانے کے باوجود معاف کر دینا، یہ بھی آنحضرت ﷺ کا معجزہ ہے اور یہیں سے بادشاہ اور نبی کے درمیان فرق معلوم ہوتا ہے، یہ نبوت ہے بادشاہت نہیں، بادشاہ معاف نہیں کرتے اور آنحضرت ﷺ کے تین دفعہ ''اللہ'' کہنے پر اس پر رُعب طاری ہو جانا، کپکپی طاری ہونا اور ہاتھ سے تلوار گر پڑنا یہ آنحضرت ﷺ کا رُعب ہے۔

میں آخری نبی ہوں

[حدیث: ۱۲۷۱] ''......سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ...... فَإِنِّي آخِرُ الْأَنْبِيَاءِ وَإِنَّ مَسْجِدِي آخِرُ الْمَسَاجِدِ۔''

(صحیح مسلم ج:۷، ص:۱۵۴، حدیث نمبر:۲۴۷۱، باب فَضْلِ الصَّلَاةِ بِمَسْجِدَيْ مَكَّةَ وَالْمَدِينَةِ)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: البتہ میں سب پیغمبروں میں سے آخری اور پچھلا پیغمبر ہوں اور بے شک میری مسجد پیغمبروں کی مسجد میں سب سے آخری مسجد ہے۔''

تشریح: اس حدیث میں ارشاد ہے کہ میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد آخری مسجد ہے، آنحضرت ﷺ کا خاتم النبیین ہونا یعنی آخری نبی ہونا قرآن کریم کی تقریباً ایک سو آیتوں سے اور آنحضرت

ﷺ کی تقریباً دوسو احادیث سے ثابت ہے اور اس پر پوری کی پوری اُمت کا بغیر کسی استثناء کے اجماع اور اتفاق ہے، جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہوں گے یہ قادیانی لوگ مرزا غلام قادیانی کو نبی مانتے ہیں اور خاتم النبیین کے لفظ میں تاویل کرتے ہیں اور ان احادیث کو جھٹلاتے ہیں، تو جو قرآن کریم کے قطعی فیصلے کو، رسول اللہ ﷺ کے متواتر ارشادات کو اور اُمت مسلمہ کے اجماعی فیصلے کو نہ مانے وہ مسلمان نہیں، ہو ہی نہیں سکتا۔

قادیانی اس حدیث شریف میں ایک دھوکا دیا کرتے ہیں، وہ یہ کہ اس حدیث میں فرمایا: فَإِنِّي آخِرُ الْأَنْبِيَاءِ وَإِنَّ مَسْجِدِي آخِرُ الْمَسَاجِدِ میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد آخری مسجد ہے، قادیانی کہتے ہیں کہ کیا حضور ﷺ کے بعد کوئی مسجد نہیں بنی؟ ظاہر ہے کہ بے شمار بنی ہیں اور بن رہی ہیں تو جس طرح اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ کی مسجد کے بعد اور مسجدیں نہیں بنیں گی، اسی طرح آپ کے آخری نبی ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

قادیانی کہتے ہیں کہ مطلب حدیث شریف کا یہ ہے کہ آئندہ جو مسجدیں بنیں گی وہ میری مسجد کے تابع ہو کر بنیں گی، اسی طرح آئندہ جو نبی آئے گا وہ میرے تابع ہو کر آئے گا، یہ تاویل خالص جھوٹ اور تاویل نہیں بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ کی تکذیب ہے، ہر وہ شخص جو یہ لفظ سنے گا وہ یہ سمجھے گا کہ میں آخری نبی ہوں یعنی نبیوں کے سب سے آخر میں آیا ہوں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، کسی بھی معمولی عقل وفہم کے آدمی کے سامنے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرو یہی مطلب سمجھے گا اور یہ جو فرمایا: مسجد آخری مسجد ہے اس کا صاف معنی یہ ہے کہ وہ آخری مسجد ہے جو کسی نبی نے بنائی ہو، آئندہ میرے بعد اب کوئی نبی نہیں بنائے گا مسجد، اب کسی نبی کی مسجد نہیں بنے گی، چنانچہ دوسری حدیث میں: وَمَسْجِدِي آخِرُ مَسَاجِدِ الْأَنْبِيَاءِ (کذا فی الاتحاف ۴:۲۸۴) کا لفظ آتا ہے اور میری مسجد انبیاء کی مسجدوں میں سب سے آخری مسجد ہے، واضح بات ہے، آنحضرت ﷺ کے بعد بہترین مسجدیں بنی ہیں لیکن قیامت تک اب کوئی نبی مسجد نہیں بنائے گا اور غلام احمد نے قادیان میں مسجد بنائی تھی، یہ جھوٹا نبی ہوا، اللہ تعالیٰ کسی کو گمراہ نہ کرے ﴿مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ﴾ (الأعراف: ۱۸۶) جس کو اللہ گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔

آنحضرت ﷺ اُمت کے پیش رو

[حدیث: ۱۲۷۲] ”عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ......، إِنِّي فَرَطٌ لَكُمْ وَأَنَا شَهِيدٌ عَلَيْكُمْ وَإِنِّي وَاللّٰهِ لَأَنْظُرُ إِلَى حَوْضِي الْآنَ وَإِنِّي أُعْطِيتُ مَفَاتِيحَ خَزَائِنِ الْأَرْضِ أَوْ مَفَاتِيحَ الْأَرْضِ وَإِنِّي وَاللّٰهِ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ أَنْ تُشْرِكُوا بَعْدِي وَلٰكِنْ أَخَافُ عَلَيْكُمْ أَنْ تَنَافَسُوا فِيهَا۔“

(صحیح بخاری ج:۵،ص:۱۲۴، حدیث نمبر:۱۲۵۸، بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى الشَّهِيدِ)

ترجمہ: ''حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: البتہ بے شک میں تمہارے لئے پیش رو ہوں اور میں تم پر گواہ ہوں اور بے شک اللہ کی قسم! میں دیکھ رہا ہوں اپنے حوض کی طرف اس وقت اور بے شک مجھے دے دی گئی ہیں کنجیاں زمین کے خزانوں کی یا فرمایا: زمین کی کنجیاں۔ اور بے شک میں تمہارے حق میں اس کا اندیشہ نہیں رکھتا کہ تم میرے بعد مشرک بن جاؤ گے لیکن میں تمہارے بارے میں اس بات کا اندیشہ رکھتا ہوں کہ تم دنیا میں رغبت کرنے لگو گے اور ایک دوسرے پر حسد کرنے لگو گے۔''

تشریح: یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرب وفات منبر پر بیٹھ کر ارشاد فرمائی تھی، پہلا فقرہ یہ ہے: میں تمہارا پیش رو ہوں، إِنِّي فَرَطٌ لَكُمْ۔ پیش رو یا فرط اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی جماعت کا نمائندہ بن کر آگے جائے اور وہاں سامان درست کرے، کسی قافلے کو کسی جگہ جانا ہے تو ایک دو آدمیوں کو پہلے بھیج دیا جاتا ہے اور وہ جا کر وہاں کے انتظامات کرتے ہیں، ان کو فرط کہا جاتا ہے، فرمایا کہ: میں تمہارا پیش رو ہوں، یعنی میں تم سے پہلے جا کر تمہارا سامان درست کروں گا، تمہارے لئے جگہ بناؤں گا۔

دوسری بات یہ ہے: وَأَنَا شَهِيدٌ عَلَيْكُمْ میں تم پر گواہ ہوں، حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھے، ان کا مقدمہ بارگاہ الٰہی میں پیش ہوگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر گواہی دیں گے کہ یہ میرے ہاتھ پر بیعت ہوئے تھے اور میری جماعت کے آدمی تھے اور بعد کے لوگوں کے حق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گواہ ہونا اس معنی میں ہے کہ نامۂ اعمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں اور وہ ایسا ہے جیسا کہ حاکم اعلیٰ کے سامنے ساری فائلیں پیش کی جاتی ہیں اور جو سیکریٹری ہوتے ہیں وہ نوٹس لگا کر دے دیتے ہیں، ان کو ساری فائل پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی نے اس ہفتے کے اندر اتنی نیکیاں کیں اور اتنے گناہ کئے اس کا خلاصہ نکال کر پیش کر دیا جاتا ہے، تو قیامت کے دن اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہی دیں گے۔

اور تیسرا فقرہ یہ ہے: واللہ! میں اس وقت اپنے حوض کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ قیامت کے دن جو حوض کوثر عطا کیا جائے گا وہ اس وقت میں دیکھ رہا ہوں، گویا کہ وہ سامنے ہے اور یہ معجزہ نبوت ہے، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک صرف اس عالم شہادت کی چیزوں کو نہیں دیکھتی بلکہ عالم الغیب کی چیزوں کو بھی دیکھتی ہے لیکن جو اللہ تعالیٰ دکھا دے، جب دکھا دے، کلیہ نہیں۔

ہمارا اور بریلوی بھائیوں کا یہی اختلاف ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہر وقت دیکھتے ہیں، ہر چیز دیکھتے

ہیں دنیا کی اور آخرت کی، ہم کہتے ہیں کہ نہیں! ایسا نہیں! جس چیز کا دکھانا اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے اس کو دیکھ لیتے ہیں اور یہ پہلا جو فقرہ ہے: ''میں تم پر گواہ ہوں'' اس سے بھی وہ حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے بھی حاضر ناظر ہونا ثابت ہوتا ہے، ہم کہتے ہیں: حاضر ناظر ہونا ثابت نہیں ہوتا، حاضر ناظر ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی جگہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تو مکان سے پاک ہیں، کسی جگہ کے بارے میں آپ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ وہاں ہیں، جیسا کہ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ فلاں جگہ نہیں ہیں، وہ مکان کے ساتھ موصوف ہی نہیں ہوتا، جبکہ آنحضرت ﷺ کے متعلق سارے مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ آپ ﷺ روضہ منورہ میں ہیں، آنحضرت ﷺ مکانی ہیں اور اللہ تعالیٰ لامکان ہیں، ہر جگہ حاضر ہونا صرف اسی کی شان ہے، اور آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ جہاں لے جاتے ہیں وہاں چلے جاتے ہیں، جب چاہیں آسمانوں سے اوپر لے جائیں ہمیں کوئی انکار نہیں ہے اور جب چاہیں غار ثور میں پہنچا دیں اس سے بھی انکار نہیں، ہجرت کے دوران غار ثور میں پہنچایا اور تین دن وہاں رکھا تھا، تو ہر چیز کو ہر وقت دیکھنا اس طور پر کہ کسی بھی وقت کسی بھی چیز کا ایک ذرہ بھی اس کی نظر سے غائب نہ ہو، یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، رسول اللہ ﷺ کو اور دیگر انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اور صدیقین و اولیاء اللہ کو جس چیز پر اللہ چاہتے ہیں اطلاع فرما دیتے ہیں۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے گلستان میں حکایت لکھی ہے کہ ایک بہت بڑے شیخ تھے جن کی کرامتیں بہت مشہور تھیں اور ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، ایک دن دمشق میں آئے، وہاں کے چھوٹے سے حوض پر وضو کرنے لگے، پاؤں پھسلا اور شیخ حوض کے اندر، بڑی مشکل سے ڈوبتے ڈوبتے بچے، وہاں سے نکالا گیا، نماز پڑھی، نماز کے بعد مریدوں میں سے ایک شخص کہنے لگے: حضرت! ایک اشکال پیش آرہا ہے، اگر اجازت ہو تو پیش کروں؟ فرمایا: کہو! کہا: میں ایک دن حضرت کے ساتھ تھا، دریا پر سے گزر رہے تھے اور حضور پانی پر چلے پاؤں بھی نہیں بھیگے تھے، آج یہ کیا آفت آپڑی کہ یہ چھوٹا سا حوض تھا اس میں مرتے مرتے بچے؟ شیخ نے سر جھکایا پھر سوچ کر سر اُٹھایا اور فرمانے لگے: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: **''لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَا یَسَعُنِیْ فِیْہِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِیٌّ مُرْسَلٌ''** (کشف الخفاء للعجلونی ۲/ ۱۷۳، ۲۱۵۹، الاسرار المرفوعۃ لعلی القاری) میرے لئے اللہ کے ساتھ ایک خاص وقت ہوتا ہے، اس وقت نہ کوئی مقرب فرشتہ داخل ہوسکتا ہے اور نہ نبی مرسل، پھر شیخ نے فرمایا کہ ایک وقت ہوتا ہے میرا اللہ کے ساتھ خاص راز و نیاز کا کہ دوسرا اس میں نہیں، یہ نہیں فرمایا کہ ہمیشہ یہ حالت ہوتی ہے بلکہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے، کبھی وہ وقت ہوتا ہے کہ جبرئیل و میکائیل درمیان میں دخل انداز نہیں ہوسکتے اور کبھی وہ وقت ہوتا ہے کہ زینب و حفصہ کے ساتھ مشغول۔ یہاں پر شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نظم لکھی ہے:

یکے پرسید از آں کہ گم کردہ فرزند
زمصرش بوئے پیراہن شنیدی
چرا در چاہ کنعانش نہ دیدی

ایک صاحب نے اس بزرگ سے کہ جن کا بیٹا گم ہوگیا تھا یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام سے پوچھا: جب بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کا کرتا لے کر مصر سے چلے ہیں تو یہ یعقوب علیہ السلام جن کو چالیس سال بیٹے کے فراق میں تڑپتے ہوئے ہوگئے تھے اور آنکھیں سفید ہوگئی تھیں، اُدھر سے کرتا چلا اور اِدھر کنعان (فلسطین) میں بیٹھے ہوئے گھر والوں سے کہہ رہے ہیں: ﴿اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ﴾ (یوسف:۹۴) مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے اگر تم یہ نہ کہو کہ بڈھا بہک گیا ہے، مصر سے یوسف علیہ السلام کا کرتا چلا اور آپ کو کنعان میں اس کی خوشبو آئی، جب خود کنعان کے کنویں میں یوسف موجود تھے اس وقت آپ کو پتا نہیں چلا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ بچوں نے کہا: ﴿قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ﴾ گھر والے کہنے لگے: خدا کی قسم! آپ کو وہی پرانے خیال آرہے ہیں، یوسف کی خوشبو جم گئی ہے، وہی آرہی ہے، گھر والے اس کا یقین کرنے پر تیار نہیں:

بگفتہ حال ما برق جہانست دم پیدا و دگر دم نہانست

ہمارے حالات کوندنے والی بجلی ہیں، ایک دم میں روشن اور دوسرے دم میں پوشیدہ، بجلی چمکی تو سب کچھ نظر آنے لگا اور بجلی ختم ہوگئی تو کچھ بھی نہیں:

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

کبھی ہم آسمان کی بلندی پر بیٹھ کر بات کرتے ہیں اور اس وقت سارے جہاں پر ہماری نظر ہوتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خود اپنے پاؤں کے اوپر کیا ہے وہ بھی نظر نہیں آتا۔

یہی ہمارا عقیدہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کھول دیں تو ان کے سامنے عالم ملکوت کھل جاتے ہیں: ﴿وَكَذٰلِكَ نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (الأنعام:۷۵) اور ہم اسی طرح دکھارہے تھے ابراہیم کو ملکوت آسمان اور زمین کی، ہم ابراہیم کو اپنی حکومت کے کارخانوں کی سیر کرارہے تھے، یہ اللہ کا کارخانہ کیسے چل رہا ہے؟ کیا کیا شعبے کیا کیا کام کررہے ہیں؟ آسمان وزمین کے کارخانے دکھائے، جب چاہا سب کچھ کھول دیا اور جب چاہا دروازہ بند کردیا، ہر وقت ہر چیز کو دیکھنا اور کائنات کے ایک ایک ذرے پر نظر ہونا یہ صرف خاصہ خدا ہے، مخلوق کا اس میں حصہ نہیں، اب تم ہمیں گستاخ کہو تو تمہاری خوشی، ہمیں گستاخ رسول کہو تو تمہاری رائے اور اگر اس کو صحیح عقیدہ سمجھو تو بھی تمہاری مرضی ہے، بہر حال ہم اس عقیدے کو لے کر اللہ کی بارگاہ میں جانا چاہتے ہیں، اِن شاءاللہ!

تو یہ بجا فرمایا: واللہ! اس وقت اپنے حوض کو دیکھ رہا ہوں، حوض قیامت کے دن ملے گا لیکن اب دیکھ رہے ہیں، نظر ایک تو عالمِ دنیا سے عالم الغیب تک پہنچتی ہے اور ایک اب سے لے کر قیامت تک پہنچتی ہے، یہ مکان کے اعتبار سے ہے اور یہ زمانے کے اعتبار سے ہے، اتنی تیز نظر ہے نبوت کی لیکن جب اللہ دکھادے۔

اور چوتھا فقرہ یہ ارشاد فرمایا: اللہ کی قسم! زمین کے خزانوں کی کنجیاں میرے ہاتھوں میں دے دی گئی ہیں (کذا فی درمنثور، علل لابن ابی حاتم الرازی)۔

اس حدیث شریف میں یہاں ذکر نہیں ہے دوسری حدیث میں اس کا ذکر ہے: اور میری اُمّت ان کو فتح کرے گی۔ میں نے اپنی کتاب ''شیعہ سنی اختلاف اور صراطِ مستقیم'' میں دونوں فریقوں کی کتابوں سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ صحیح حدیث ہے اور دونوں اس پر متفق ہیں، حضور ﷺ کو دنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا فرمادی گئیں (درمنثور، تفسیر ابن کثیر، مصنف ابی ابی شیبہ، مسند الشافعی)۔ اور وہ کنجیاں حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے ہاتھ آئیں اور انہوں نے فتوحات کے دروازے کھول دیئے، اب بتاؤ کہ حضرات خلفائے راشدین حضور ﷺ کے نائب ہیں یا نہیں؟ حضور ﷺ کے زمانے میں زمین کے خزانے فتح نہیں ہوئے اور اس میں بھی راز تھا، اس لئے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ اس سے بھی بالاتر رکھنا چاہتے تھے کہ زمین کے خزانوں سے آپ ﷺ کا دامن مبارک ملوث نہ ہو، آپ ﷺ کی شان بہت اونچی تھی، یہ کام تو خدام سے لیا جائے گا۔

شہر کی کنجی میئر کے حوالے کی جاتی ہے لیکن وہ خود جا کے تالا نہیں کھولتا، وہ خدام کھولتے ہیں، زمین کے خزانوں کی کنجیاں آنحضرت ﷺ کے حوالے کر دی گئیں لیکن آپ ﷺ کو نہیں کھولنا تھیں، یہ آپ ﷺ کے خدام کا کام تھا اور یہ خدام ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم تھے، ان کے زمانے میں زمین کے خزانوں کے تالے کھول دیئے گئے، قیصر و کسریٰ کے خزانے مسجد نبوی میں لا کر ڈھیر کر دیئے گئے، اب بتاؤ کہ یہ حضور ﷺ کے نائب ہیں یا نہیں؟ وران کی خلافت خلافتِ راشدہ نیابتِ نبوت ہے یا نہیں؟ انصاف تو کرو! اور اگر دنیا سے انصاف ہی اُٹھ جائے تو اس کا کیا علاج؟ کسی کے بقول: ''بھینس کے آگے بین بجانا'' ہوگا پھر تو۔

یہ حدیث دنیا کی کسی عدالت میں پیش کرو اور پوچھو: یہ حدیث دونوں فریقوں کی متفق علیہ ہے اور متواتر حدیث ہے، علّامہ کلبی نے ''کافی'' میں روایت نقل کی ہے صخرہ والی حدیث، غزوہ خندق کے موقع پر خندق کھود رہے تھے تو چٹان نکلی تھی، علّامہ کلبی کی کتاب ''الکافی'' یہ شیعوں کے لئے ایسی ہے جیسے ہمارے لئے صحیح بخاری، اس میں انہوں نے یہ حدیث نقل کی ہے اور اس کے حاشیہ میں علّامہ عبدالغفار ایرانی لکھتے ہیں کہ:

"حديث الصخرة متواتر رواه العامة والخاصة عن طرق صحيحة كثيرة"۔

(مسند احمد بن حنبل، طبقات ابن سعد)

یہ چٹان کی حدیث متواتر ہے، جس کو شیعہ وسنی نے متعدد اسانید اور طرق سے نقل کیا ہے اور اس میں آگے یہ تھا کہ پہلی ضرب لگائی تو "بصریٰ" کے محلات نظر آئے، دوسری ضرب لگائی تو فرمایا: ایران کے محلات نظر آئے کہ میری اُمّت ان کو فتح کرے گی، کس نے یہ فتح کئے تھے؟ حضور ﷺ کی اس پیش گوئی کا مصداق کون ہے؟ یہی ابوبکر، عمر، عثمان، علی، وغیرہ رضی اللہ عنہم۔

اور پانچواں فقرہ اس حدیث میں یہ ارشاد فرمایا: اب مجھے یہ توقع تو نہیں کہ تم جاہلیت کی طرح بت پرستی کرنے لگو گے لیکن مجھے جس چیز کا اندیشہ ہے وہ یہ کہ تم دنیا میں رغبت کرنے لگو گے، اس کی وجہ سے لڑائیاں کرو گے فتنہ وفساد کرو گے اور اس پر ٹوٹ پڑو گے۔ اور یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا، اُمّت دنیا میں لڑ رہی ہے حقوق کے لئے، حقوق کیا ہیں؟ دنیاوی مفادات! میں نے اپنی کتاب "شخصیات وتاثرات" میں حضرت حکیم الاُمّت مولانا تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے، لکھا ہے: یہ دنیا پر فخر کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے کہ دو بھنگی بیٹھ کر فخر کریں، ایک کہے: "میں نے دس ٹوکرے گوبر کے جمع کر لیے، دوسرا کہتا ہے: میں نے بیس کئے ہیں!"

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے گندگی کے اوپر چاندی کے ورق لگا دیئے گئے ہوں، دیکھنے والوں کو بڑی خوش نما حلوے کی پلیٹ نظر آ رہی ہے لیکن ناک بند ہے تو بدبو نہیں آ رہی، دنیا میں اس کے لئے لڑ رہے ہو؟ وہ تمہارے سامنے جنّت کے دروازے کھول کر گئے تھے:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا!

سلام کرنے والا پتھر

[حدیث: ۲۷۳ أ] "عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ......، إِنِّي لَأَعْرِفُ حَجَرًا بِمَكَّةَ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ أُبْعَثَ، إِنِّي لَأَعْرِفُهُ الْآنَ۔"

(صحیح مسلم ج:۱۱ص:۳۸۱، حدیث نمبر: ۴۲۲۲، بَابُ فَضْلِ نَسَبِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَسْلِيمِ...)

ترجمہ: "حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک میں پہچانتا ہوں ایک پتھر کو مکہ مکرمہ میں جو مجھے سلام کیا کرتا تھا میری بعثت سے پہلے، میں اس کو اب بھی پہچانتا ہوں۔"

تشریح: اس حدیثِ شریف میں ارشاد فرمایا: میں اس پتھر کو اب بھی جانتا ہوں جو بعثت سے پہلے

نبی کہہ کر سلام کہا کرتا تھا، "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا نَبِيَّ اللهِ" یہ مضمون حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی نقل کیا گیا ہے کہ نبوت سے پہلے جب آنحضرت ﷺ مکہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے، تو جو شجر اور حجر آپ ﷺ کے سامنے آتا تھا وہ آپ کو "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا نَبِيَّ اللهِ" کہا کرتا تھا اور یہ معجزہ نبوت تھا، باوجود یکہ ابھی تک آپ ﷺ کو ظاہری طور پر نبوت عطا نہیں کی گئی تھی لیکن شجر و حجر آپ ﷺ کو "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا نَبِيَّ اللهِ" کہہ کر پکارتے تھے۔

ایسی خلاف عادت باتیں جو نبی کی بعثت سے پہلے یعنی اس کے نبی بنائے جانے سے پہلے پیش آتی تھیں ان کو "ارہاص" کہتے ہیں، یعنی علامت نبوت اور نبی کی نبوت کی دلیل کے طور پر جو خرق عادت یعنی خلافِ عادت چیزیں جو اس کے ہاتھ پر ظاہر ہوتی ہیں اس کو "معجزہ" کہتے ہیں، آپ ﷺ کے معجزات تو بے شمار ہیں، ان میں سے آپ ﷺ کو اس منصب پر کھڑا کرنے سے پہلے جو واقعات پیش آئے ان کو "ارہاصات" کہا جاتا ہے اور جو آپ کے دعوائے نبوت کے بعد پیش آئے ان کو "معجزہ" کہا جاتا ہے۔

ہر نبی کو وفات سے قبل جنّت میں اپنا ٹھکانا دکھا دیا جاتا ہے

[حدیث: ۱۲۷۴] "....إِنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ......، إِنَّهُ لَمْ يُقْبَضْ نَبِيٌّ قَطُّ حَتّٰى يَرٰى مَقْعَدَهُ مِنَ الْجَنَّةِ ثُمَّ يُحَيَّا أَوْ يُخَيَّرَ......"

(صحیح بخاری ج:۱۳ ص:۳۴۸، حدیث نمبر:۴۰۸۳، باب مَرَضِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوَفَاتِهِ وَقَوْلِ)

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں قبض کیا گیا کسی نبی کو کبھی یہاں تک کہ اس کو دکھا دیا جائے اس کا ٹھکانا جنّت سے پھر اس کو اختیار دیا جائے۔"

تشریح: اس حدیث میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ آخری دنوں میں ارشاد فرماتے تھے: جب کسی نبی کو قبض کیا جاتا ہے یعنی اس کی روح قبض کرتے ہیں دنیا سے لے جاتے ہیں اس کو وفات دیتے ہیں تو قبض کرنے سے پہلے دو باتیں لازمی ہوتی ہیں، ایک بات یہ کہ جنّت میں اس کا ٹھکانا دکھا دیتے ہیں کہ حضور کا یہ مکان ہے، آپ کیلئے تیار کیا ہوا ہے اور یہاں کے خدام اور یہاں کے آپ کے اہل و عیال سب آپ کے لئے چشم براہ ہیں، یہ دکھا دیا جاتا ہے اور بعد اس کے ان کو اختیار دیا جاتا ہے کہ کیا خیال شریف ہے؟ چلنا ہے کہ یہاں رہنا ہے؟ جب وہ کہیں گے کہ چلنا ہے تو فرشتہ ان کی روح قبض کرتا ہے، اس سے پہلے نہیں۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آخری وقت میں آپ ﷺ فرمار ہے تھے کہ: "اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْأَعْلٰى" (کذا فی مسند احمد ابن حنبل، صحیح البخاری، موطا امام مالک)۔

اے اللہ! رفیق اعلیٰ میں جانا چاہتا ہوں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات یاد آ گئی کہ یوں فرمایا کرتے تھے جب یہ بات یاد آ گئی تو میں نے کہا: "إِذاً لَا يَخْتَارُنَا" کہ اب یہ ہمارے پاس نہیں رہیں گے، ہمیں چھوڑ کر جارہے ہیں، اس لئے کہ یہ تو نیچے والے رفیق ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ میں اوپر والا رفیق چاہتا ہوں تو فرمایا: اب یہ ہمیں ترجیح نہیں دیں گے، ان کو اختیار دیا گیا ہے کہ رہنا ہے یا جانا ہے؟ تو فرمادیا ہے: مجھے جانا ہے اور یہی ہوا۔

اور یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام کو موت سے پہلے ان کا ٹھکانا دکھادیا جاتا ہے اور بعض اہل ایمان کو بھی موت کے وقت ان کا ٹھکانا دکھادیا جاتا ہے تاکہ وہ خوش ہو جائیں اور مرنے کے بعد قبر میں تو پھر دِکھایا ہی جاتا ہے بلکہ دونوں ٹھکانے دکھائے جاتے ہیں جنّت کا بھی دوزخ کا بھی۔

حق تعالیٰ شانہٗ ہم لوگوں کا خاتمہ بھی ایمان پر فرمائے اور ہماری آخرت کو دُنیا سے بہتر بنائے۔

ہر نبی کا وظیفہ

[حدیث:۱۲۷۵] "......فَإِذَا عَبْدُ اللهِ بْنُ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ......، فَقَالَ إِنَّهُ لَمْ يَكُنْ نَبِيٌّ قَبْلِي إِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَيْهِ أَنْ يَدُلَّ أُمَّتَهُ عَلَى خَيْرِ مَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ وَيُنْذِرَهُمْ شَرَّ مَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ، وَإِنَّ أُمَّتَكُمْ هٰذِهٖ جُعِلَ عَافِيَتُهَا فِي أَوَّلِهَا وَسَيُصِيبُ آخِرَهَا بَلَاءٌ وَأُمُورٌ تُنْكِرُونَهَا وَتَجِيءُ فِتْنَةٌ فَيُرَقِّقُ بَعْضُهَا بَعْضًا وَتَجِيءُ الْفِتْنَةُ فَيَقُولُ الْمُؤْمِنُ هٰذِهٖ مُهْلِكَتِي ثُمَّ تَنْكَشِفُ وَتَجِيءُ الْفِتْنَةُ فَيَقُولُ الْمُؤْمِنُ هٰذِهٖ هٰذِهٖ، فَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُزَحْزَحَ عَنِ النَّارِ وَيُدْخَلَ الْجَنَّةَ فَلْتَأْتِهِ مَنِيَّتُهُ وَهُوَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلْيَأْتِ إِلَى النَّاسِ الَّذِي يُحِبُّ أَنْ يُؤْتَى إِلَيْهِ، وَمَنْ بَايَعَ إِمَامًا فَأَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهٖ وَثَمَرَةَ قَلْبِهٖ فَلْيُطِعْهُ إِنِ اسْتَطَاعَ فَإِنْ جَاءَ آخَرُ يُنَازِعُهُ فَاضْرِبُوا عُنُقَ الْآخَرِ........"

(صحیح مسلم ج:۹،ص:۳۸۰، حدیث نمبر:۳۴۳۱، باب وجوب الوفاء ببيعة الخلفاء الأول فالأول)

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بات یہ ہے کہ مجھ سے پہلے کوئی نبی نہیں ہوا مگر اس کے ذمے یہ حق تھا کہ اپنی اُمت کو وہ خیر کی باتیں بتائے جن کو وہ ان کے لئے بہتر جانتا ہے اور ان کو ڈرائے ان شر کی باتوں سے جن کو وہ ان کے لئے بُرا جانتا ہے اور بات یہ ہے کہ تمہاری یہ

اُمّت اُس کی عافیت رکھی گئی ہے پہلے حصے میں اور اس اُمت کے آخری حصے میں مصائب اور بہت سے اپنے امور پیش آئیں گے جن کو تم گھناؤنا سمجھو گے اور فتنہ آئے گا، پس ایک دوسرے کو پتلا کردے گا، یعنی ایک دوسرے سے بڑھ کر ہوگا، ایک فتنہ آئے گا مومن کہے گا: یہ مجھے ہلاک کرنے والا ہے! پھر وہ ہٹ جائے گا پھر اور فتنہ آئے گا وہ کہے گا: یہ یہ، سو جو شخص چاہے کہ اس کو دوزخ سے دور کردیا جائے اور جنّت میں داخل کردیا جائے اور اس کی موت اس حالت میں آنی چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اور وہ لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کرے جو وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے اور جو شخص کہ کسی امام سے بیعت کرے پس اس کو دے عہد اپنے ہاتھ کا اور پھل اپنے دِل کا تو اس کی اطاعت کرے جہاں تک ہوسکے، اب اگر دوسرا آدمی آئے جو اس سے منازعت کرتا ہو تو دُوسرے کی گردن ماردو۔‘‘

تشریح: اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مضمون ارشاد فرمائے ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ ہر نبی کے ذمے یہ بات لازم کی گئی تھی کہ اپنی اُمّت کے لوگوں کو خیر کی چیزوں کی رہنمائی کریں اور شر کی چیزیں بتائیں، جن باتوں کو ان کے لئے خیر سمجھتا ہے ان کی ترغیب دے اور جن چیزوں کو ان کے لئے شر سمجھتا ہے ان سے ان کو ڈرائے اور بچانے کی کوشش کرے، یہ ہر نبی کے ذمے گویا ایک فریضہ تھا اور حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اپنے اس فرض کو بخوبی انجام دیا، ہر نبی نے اپنی اُمّت کی خیر خواہی فرمائی، اُمّت کو خیر کے کاموں کی تلقین فرمائی، بُری چیزوں سے ان کو بچنے کی تلقین کی۔

یہ مضمون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور تمہید کے ذکر فرمایا ہے، مطلب یہ ہے کہ سب کے سب انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اسی طرز اور اسی روش پر تھے، تو آپ تو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمّت کی خیر خواہی میں کسر نہیں چھوڑیں گے اور جتنے خیر کے کام ہیں ان کی رہنمائی فرمائیں گے، جتنے شر کے کام ہیں ان سے بچنے کی تلقین فرمائیں گے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ خیر کا کوئی کام ایسا نہیں جو میں نے تم کو نہ بتادیا ہو اور شر کی کوئی بات ایسی نہیں جس سے بچنے کی تمہیں تلقین نہ کردی ہو۔

ابوداؤد شریف کی روایت میں ہے: ’’أَنَا لَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ عَنِ الْوَلَدِ‘‘ میں تو تمہارے لئے ایسا ہوں جیسے کہ باپ بیٹے کے لئے ہوتا ہے کہ میں تم کو سکھاتا ہوں، باپ اپنے بیٹے کو چھوٹی چھوٹی باتیں بھی تلقین کرتا ہے کہ دیکھو بیٹا! ایسا نہیں کرنا چاہئے، فرمایا: میں تمہارے لئے بمنزلہ والد کے ہوں، میں تمہیں سکھاتا ہوں، یہ مضمون اس لئے ارشاد فرمایا تاکہ اگلی بات جو فرمارہے ہیں تم اس کو غور سے سنو، یہ نہیں کہ ایک

کان سے سنو اور دوسرے سے نکال دو اور پلہ جھاڑ کر چلے جاؤ بلکہ بات کو سمجھو، اس پر عمل کرنے کی کوشش کرو، اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگو۔

دوسرا مضمون یہ ارشاد فرمایا کہ یہ جو تمہاری اُمّت ہے یہ آخری اُمّت ہے، اس کے بعد اور کوئی اُمّت نہیں، اس اُمّت کا پہلا زمانہ تو بڑی عافیت سے گزرا اور گزرے گا لیکن اس کے بعد کا زمانہ بڑے فتنوں کا زمانہ ہوگا، مصیبتیں اور ایسی منکر چیزیں پیش آئیں گی جن کو تم کبھی صحت کی حالت میں برداشت نہیں کر سکتے، فتنوں پر فتنوں کی یورش ہوگی اور ایک فتنہ دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہوگا، ایک فتنہ آئے گا تو مومن یہ کہے گا کہ شاید یہ مجھے ہلاک کرنے والا ہے لیکن وہ فتنہ ٹل جائے گا، ابھی اس سے فراغت نہیں ہوگی کہ دوسرا فتنہ شروع ہو جائے گا، مسلمان یہی سمجھے گا کہ کہیں یہ ہی مجھے برباد نہ کر دے، وہ ختم ہوگا تو تیسرا فتنہ شروع ہوگا، اس طرح لگاتار فتنے ہوں گے، فتنوں پر فتنے ظاہر ہوں گے اور رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بالکل برحق ہے، پوری اُمّت کی تاریخ گویا اس ارشاد کی تفصیل ہے، پہلا حصہ کتنا عافیت کا گزرا، خصوصاً خلفائے راشدین کا زمانہ اور بالخصوص حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا زمانہ، ایک مسلمان کھڑا ہو کر ایک بات کہتا تو پوری کی پوری اُمّت اس پر گامزن ہو جاتی، ایک کہتا کہ میں نے فلانے کو پناہ دے دی ہے، خلیفہ سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے مسلمان تک سب کے سب اس پر متفق، ٹھیک ہے تم نے جو کر دیا ٹھیک کر دیا، ایسی یکجہتی، ایسا اتفاق واتحاد کہ عقل اس پر حیران، ان میں کوئی تشتت نہیں تھا، افتراق نہیں تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے چھ سال تک یا یوں کہو کہ آنحضرت ﷺ کے وصال شریف سے لے کر تقریباً بیس سال تک کا زمانہ۔

اور اس کے بعد پھر فتنے شروع ہو گئے اور پھر فتنے بڑھتے بڑھتے یہاں تک مسئلہ پہنچ گیا ہے کہ جہاں تک ہماری حالت ہوگئی ہے لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اپنے زمانے دیکھ کر حیران ہوا کرتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ ایک دن بیٹھے رو رہے تھے، یہ حضور اکرم ﷺ کے مشہور خادم ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی دس سال خدمت کی ہے، کسی نے پوچھا: حضرت! کیا ہوا؟ فرمایا: سب کچھ ہی ضائع ہو گیا، رسول اللہ ﷺ کے زمانے کی مجھے ایک چیز بھی نظر نہیں آ رہی، ایک نماز رہ گئی تھی تم نے وہ بھی ضائع کر دی، یہ اس وقت فرمایا، اگر خدانخواستہ ان کو ہمارا زمانہ دیکھنا نصیب ہوتا تو ان کا کیا حال ہوتا؟ یہ دوسرا مضمون تھا۔

اور تیسرا مضمون یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو تین کام کرنے چاہئیں، پہلی بات یہ ہے کہ عہد کر لے کہ مجھے مسلمان بن کر مرنا ہے، گھر بار اُجڑ جائے، بیوی بچے ہلاک ہو جائیں، میں مارا جاؤں، مجھے دین نہیں چھوڑنا، جو شخص یہ چاہتا ہے کہ قیامت کے دن مجھے دوزخ سے دور رکھا جائے اور جنّت میں داخل کر دیا جائے اسے چاہئے کہ اس کی موت اس حالت میں آئے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو یعنی پکا مومن ہو۔

ہزاروں فتنے آتے ہیں، ہزاروں لوگ بہکانے کی کوشش کررہے ہیں لیکن اس کو باہمی اور بے ہمہ ہونا چاہئے، یہ صوفیہ کی ایک اصطلاح ہے، باہمہ اور بے ہمہ یعنی سب میں رہتے ہوئے بھی کسی سے کوئی تعلق نہیں سوائے اللہ اور اللہ کے رسول کے، اب میرا تو دماغ چکرانے لگتا ہے، گمراہ کرنے والے لوگ اتنے پیدا ہوگئے ہیں کہ آدمی کس کس کی سنے اور عجیب بات یہ ہے کہ نئے نئے خوش نما عنوانوں کے ذریعے سے اور ایسے ایسے شبہات ڈالتے ہیں، یہ جماعت المسلمین، سبحان اللہ! قرآن کی آیتیں پڑھیں گے اور حدیثیں پڑھیں گے، خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ پہلے لوگ سب غلط تھے، ہم صحیح ہیں۔

اور یہ توحیدی کیاڑی والے، ان کا فتنہ پھیل رہا ہے، منکرینِ حدیث کا فتنہ ہے اور نہ معلوم کتنے فتنے ہیں؟ کس کس کا بتائیں، کس کس کے پیچھے لٹھ لے کر پھریں، اُمّت کا شیرازہ ایسا بکھر گیا ہے کہ کوئی ان کا نگران ہی نہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ جب ان کو کوئی زہر کا ٹیکہ اور انجکشن لگاتا ہے تو یہ آخر کسی سے پوچھتے نہیں ہیں، کسی بھلے آدمی سے جا کر پوچھ ہی لو کہ یہ اس طرح جو کہہ رہا ہے صحیح کہہ رہا ہے؟ اور جب زہر پورا سرایت کر جاتا ہے پھر آتے ہیں، مقابلہ کرنے آتے ہیں، پھر بھی طلبِ حق کے لئے نہیں، یہ لوگ مرزائی بن گئے، ذکری بن گئے، بہائی بن گئے، نہ معلوم کیا کیا بن گئے، کس لئے بنے؟ یہ بھیڑیے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی اُمّت میں سے ایک ایک بھیڑ کو چن کر لے جارہے ہیں۔

پہلی نصیحت یہ فرمائی کہ اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کو جنّت میں داخل کیا جائے، جہنّم سے اس کو بچایا جائے تو اس کی موت اس حالت میں آنی چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، کچھ بھی ہوجائے اس کے ایمان میں تزلزل نہیں آنا چاہئے، ہزاروں لوگ فتنے میں ڈالیں، ہزاروں لالچ دیں، دھمکیاں دیں، ہزاروں تاویلیں کریں، آیتیں پڑھیں مگر تمہارے ایمان میں تزلزل نہیں آنا چاہئے اور اگر ایک دفعہ تمہارے قدم اُکھڑ گئے پھر کہیں لگیں گے نہیں۔

دوسری نصیحت یہ ہے: وہ شخص جو یہ چاہتا ہو کہ اس کو جنّت میں داخل کیا جائے اور دوزخ سے بچایا جائے، اس کو لازم ہے کہ دوسروں کے ساتھ وہی معاملہ کرے جس معاملے کو وہ چاہتا ہے کہ لوگ میرے ساتھ کریں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ میری بہو بیٹی کی طرف دیکھیں تو تم بھی دیکھو، اور اگر نہیں چاہتے تو تمہیں بھی دوسروں کی بہو بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ بھی ہمارے گھر پر ڈاکا ڈالیں، تم بھی ڈالو، لیکن یہ اگر تمہیں اپنے لئے گوارا نہیں تو تم دوسروں کے لئے بھی گوارا نہ کرو۔ ایک ایسا نفیس ترین اُصول ہے، تم کسی بھی انسان کے ساتھ جو معاملہ کرنے جارہے ہو، یہ دیکھو کہ تمہارے ساتھ اگر یہی معاملہ کیا جائے تو برداشت کروگے؟ قبول ہے تمہیں؟ اگر نہیں تو دوسروں کے ساتھ یہ معاملہ کیوں کرتے ہو؟

اس ایک اُصول کو اپنالو، لوگوں کی غیبت کرتے ہو، تحقیر کرتے ہو، چغلیاں کھاتے ہو اور بھی کسی قسم

کا معاملہ کرتے ہو، تم چاہتے ہو کہ لوگ بھی تمہارا ساتھ یہی کیا کریں تو پھر تم بھی لوگوں کے ساتھ یہ نہ کرو۔

پہلا معاملہ تھا حقوق اللہ میں، یہ دوسرا معاملہ ہے حقوق العباد میں اور تیسرا معاملہ ہے سیاست میں، جس ایک شخص کے ہاتھ پر بیعت کرلی اب اپنی بیعت پر قائم رہے، پُرانے زمانے میں خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت ہوا کرتی تھی گویا کہ اس کے ساتھ بیعت کر کے اس کے ساتھ معاہدہ کرلیا ہے، عہد باندھ لیا ہے اور اس سے وعدہ کرلیا ہے کہ اب میں تیری اطاعت کروں گا، تو اب اس اطاعت پر قائم رہے اور جس حد تک ممکن ہو اس کی فرمانبرداری کرے، اس کا کہنا مانتے اور اگر کوئی دوسرا مقابلے میں کھڑا ہو بغاوت کے لئے تو اس کو قتل کر ڈالو، فتنہ نہیں ہونا چاہئے۔

خلاصہ یہ کہ یکجہتی ہونی چاہئے، اب سیاسی طور پر مسلمانوں میں جو خلفشار ہے، انتشار ہے وہ آپ کے سامنے ہے، یہ ہمارا تو مذاق اُڑایا کرتے تھے کہ یہ مولوی اکٹھے نہیں ہو سکتے، ہم تو خیر اکٹھے ہوں یا نہ ہوں لیکن لوگوں کو تو نہیں ستایا ہم نے اور اب جو تم تماشا دکھا رہے ہو اس سے تو اللہ کی مخلوق عاجز آ رہی ہے، اس انتشار کی وجہ سے اُمت کی چول اپنی جگہ سے ہل گئی، دیانت گئی، امانت گئی، دین و دنیا دونوں برباد ہو گئے، ایسا لگ رہا ہے کہ ہمارے معاشرے کے سو فیصد لوگ بدعنوان ہیں۔

یہ تین مضمون، تین نصیحتیں ہیں، ان کو پلّے باندھ لو، ایک یہ کہ فتنوں کے سیلاب میں بہنا نہیں بلکہ ایمان کی چٹان پر جمے رہو اور تمہاری موت اسی حالت میں آنی چاہئے۔ دوسری یہ کہ لوگوں کے ساتھ جو سلوک کرتے ہو اس سے پہلے یہ سوچ لو کہ اگر میرے ساتھ یہ سلوک کیا جائے تو میں برداشت کروں گا؟

اور تیسری بات یہ ہے کہ یکجہتی رکھو، سیاسی طور پر اپنی انا کو چھوڑ دو لیکن چھوڑے کون؟ مجھے معاف کریں، ہمارا نبی پر ایمان ہو تو اس کی بات مانیں، آج حضور ﷺ پر ایمان کون رکھتا ہے؟ اپنے مفادات چھوڑ کر حضور ﷺ کی بات مانیں، اس کی پھر سزا بھی بھگت رہے ہیں۔

معجزۂ نبی ﷺ

[حدیث: ۱۲۷۶] "......أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ......، إِنَّهُ لَنْ يَبْسُطَ أَحَدٌ ثَوْبَهُ حَتَّى أَقْضِيَ مَقَالَتِي هٰذِهِ ثُمَّ يَجْمَعَ إِلَيْهِ ثَوْبَهُ إِلَّا وَعَى مَا أَقُولُ......"

(صحیح بخاری ج: ۷، ص: ۱۹۷، حدیث نمبر: ۱۹۰۲، باب مَا جَاءَ فِي قَوْلِ اللهِ تَعَالٰى {فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ.....)

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک جو شخص پھیلا دے اپنے کپڑے کو یہاں تک کہ میں اپنی بات پوری کر چکوں پھر اس کو سمیٹ لے تو وہ یاد رکھے گا جو میں کہتا ہوں۔"

تشریح: اس حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ایک واقعہ ذکر فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص اپنی چادر پھیلا دے میرے سامنے، یہ عجیب وغریب بات ہے کہ کوئی آدمی میرے سامنے اپنی چادر پھیلا دے اور میں بات کر رہا ہوں، اتنی دیر پھیلائے رکھے، جب میری بات ختم ہو جائے تو چادر کو سمیٹے اور سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لے، خدا جانے کیا بات فرما رہے ہوں گے، کوئی دم کر رہے ہوں گے، کوئی دُعا کر رہے ہوں گے یا ویسے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو الفاظ تھے وہ تو نور ہی نور تھے، فرمایا کہ: نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ میری کہی ہوئی بات کبھی بھی بھولے گا نہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: حضور! مجھے اجازت دے دیجئے، میں نے فوراً اپنی چادر بچھالی، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ کلام پورا ہوا تو میں نے اپنی وہ چادر سمیٹی اور سینے سے لگالی، وہ دن اور آج کا دن مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات نہیں بھولی، یہ معجزۂ نبوت ہے، پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) احادیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں جبکہ ان کو صحبت ملی صرف تین سال، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو بیس تیس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے ان سے اتنی حدیثیں منقول نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی کام کے لئے وقف کر دیا تھا، خود ارشاد فرماتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں مجھ سے بڑا احادیث کا کوئی حافظ نہیں ہے سوائے عبداللہ بن عمرو کے، وہ مجھ سے زیادہ حدیث کے حافظ ہوں تو وہ دوسری بات ہے، اس لئے کہ وہ لکھ لیا کرتے تھے، فقیر لکھا نہیں کرتا تھا، ویسے ہی باتیں یاد رہتی تھیں، وہ لکھ کر یاد کرتے تھے میں بے لکھے یاد کرتا تھا اور یہ آنحضرت کا معجزہ نبوت ہے۔

الحمدللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات، طیبات اور ارشادات مبارکہ کا تمام کا تمام ذخیرہ محفوظ ہے، اس وقت نہ ٹیپ ریکارڈ ہوتے تھے اور نہ ضبط کرنے والے دیگر آلات ہوتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد ایسے لوگ جمع کر دیئے تھے جن کے سینے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلماتِ طیبات کے ٹیپ ریکارڈر تھے۔ ابھی گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر کبھی تھوکتے تھے، کبھی بلغم کو تھوکتے تھے تو عروہ بن مسعود ثقفی کا بیان ہے کہ وہ نیچے زمین پر نہیں گرنے پاتا، ان میں سے کسی نہ کسی کے ہاتھ پر گرتا ہے اور وہ اس کو اپنے منہ پر مل لیتا ہے۔

تدبیر جائز ہے

[حدیث: ۱۲۷۷] ".....حَدَّثَنِي رَافِعُ بْنُ خَدِيجٍ......، إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ دِينِكُمْ فَخُذُوا بِهِ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيِي فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ۔"

(صحیح مسلم ج: ۱۲، ص: ۵۳، حدیث نمبر: ۴۳۵۷، بَابُ وُجُوبِ امْتِثَالِ مَا قَالَهُ شَرْعًا دُونَ مَا ذَكَرَهُ مِنْ....)

ترجمہ: ’’حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں بھی آخر انسان ہی ہوں بشر ہوں، جب تم کو حکم کروں کسی چیز کا تمہارے دین میں سے تو تم اس کو لے لو اور جب تم کو حکم کروں کسی چیز کا اپنی رائے سے تو میں بھی بشر ہی ہوں۔‘‘

تشریح: اس حدیث میں ایک قصہ ہے، وہ یہ کہ جب مدینہ آئے تو عربوں کا دستور ہے کہ ایک کھجور کا ایک نر پودا ہوتا ہے اور ایک مادہ، کھجور میں نر اور مادہ ہوتے ہیں، ہوتا یوں ہے کہ جو نر کھجور کا پودا ہے وہ مادہ پودوں پر بکھیرتے ہیں، قدرتی بات ہے کہ پھل زیادہ آتا ہے، اس کو عرب تأبیر نخل کہتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے اور دیکھا کہ یہ لوگ ایسا کرتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر ایسا نہ کرو تو کیا نقصان ہے؟ کہنے لگے: حضور! پھل نہیں آتا اس کے بغیر، فرمایا: اس سال نہ کرو! نہیں کیا اور پھل نہیں آیا، اس موقع پر فرمایا: إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ میں بھی انسان ہوں، میں بھی رائے رکھتا ہوں اور میرے احکام دو قسم کے ہیں، بعض احکام ہیں جو بحیثیت شارع کے دیتا ہوں یہ تو اللہ کی جانب سے ہوتے ہیں اور ان پر عمل کرنا لازم ہے، اس کو لے لیا کرو، جب تم کو تمہارے دین کے بارے میں حکم دوں تو اس کو لے لو مضبوط پکڑ لو اور اگر کوئی دوسری چیزوں کے بارے میں اپنی رائے سے مشورہ دوں تو میں بھی بشر ہوں مطلب یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا ضروری نہیں۔

اور ایک روایت میں یوں آیا ہے: أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ (صحیح مسلم ۷/ ۹۵، ۶۲۷۷، کنز العمال، کشف الاسرار للعجلونی) تم لوگ اپنی دنیا کے کاموں کو بہتر سمجھتے ہو، ہم جیسے لوگوں نے یوں سمجھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دستور چلا آتا تھا اس کے سامنے اپنی رائے کی سپر ڈال دی، پہلے یوں سمجھا تھا کہ شاید یہ کوئی شگون کی بات ہے، جیسے عورتیں ٹوٹکے ٹونے کرتی ہیں، یہ بھی کوئی ٹوٹکا ٹونا ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ نہیں یہ اسباب کے درجے کی چیز ہے کہ نر کا بور مادہ پر ڈالا جاتا ہے تو پھل آتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسباب بنائے ہیں، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے طرزِ عمل کی تصحیح فرمائی اور اپنی رائے مبارک واپس لے لی۔

نبی کی مثال

[حدیث: ۱۲۷۸] ’’عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ......، إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ أُمَّتِي كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَوْقَدَ نَارًا فَجَعَلَتْ الدَّوَابُّ وَالْفَرَاشُ يَقَعْنَ فِيهِ فَأَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ وَأَنْتُمْ تَقَحَّمُونَ فِيهِ۔‘‘

(صحیح مسلم ج:۱۱، ص:۳۹۸، حدیث نمبر:۴۲۳۴، باب شَفَقَتِهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى أُمَّتِهِ وَمُبَالَغَتِهِ....)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری مثال اور میری اُمّت کی مثال تو ایسی ہے کہ ایک آدمی نے آگ جلائی پس اس پر پتنگے آنے لگے اور اس میں گرنے لگے اور میں تم کو پکڑنے والا ہوں تمہاری کمروں سے اور تم اس میں گھسے جاتے ہو۔''

تشریح: اس حدیث میں فرمایا: میری اور میری اُمّت کی مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی نے جنگل میں آگ جلائی، برسات کا موسم جنگل کا سماں، کیڑے پتنگے گرنے لگے، اب وہ جانتا ہے کہ یہ آگ پر جائیں گے تو جل جائیں گے، اس لئے ان کیڑوں اور پتنگوں کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے ہٹا رہا ہے، اب وہ ایک آدمی سے کہیں قابو میں آئیں گے؟ فرمایا: میں تم کو دوزخ سے روک رہا ہوں اور تم میرے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ کر دوزخ میں گھسے جا رہے ہو، دوزخ میں گھسنا اس لئے کہ دوزخ والے اعمال کرتے ہیں۔

ان پتنگوں کے دل میں خدا جانے آگ کا عشق کیوں ڈال دیا گیا ہے؟ جاتے ہیں پھر آتے ہیں، آگ پر جاتے ہیں پھر آنے کا کیا سوال؟ بالکل اسی طرح جس طرح شیرے کا ڈرم ہوتا ہے، چوہا اس میں گر تو جاتا ہے پھر نکل نہیں سکتا، مکھی شیرے پر بیٹھ تو جاتی ہے لیکن پھر اُڑ نہیں سکتی، یہ دوزخ والے اعمال جو تمہیں شیریں اور میٹھے لگتے ہیں تم ان پر گرتے ہو لیکن پھر اُٹھ نہیں سکتے، میں چاہتا ہوں کہ تمہیں پکڑ کر ہٹا دوں۔

ہر نبی کا ایک مقام ہے

[حدیث: ۱۲۷۹] ''عَنْ عَبْدِ اللهِ (ابْنِ مَسْعُوْدٍ) ......، لَا يَقُوْلَنَّ أَحَدُكُمْ إِنِّي خَيْرٌ مِنْ يُوْنُسَ،

وَفِي رِوَايَةٍ: مَا يَنْبَغِي لِعَبْدٍ أَنْ يَقُوْلَ: إِنِّي خَيْرٌ مِنْ يُوْنُسَ بْنِ مَتَّى......۔''

(صحیح بخاری ج:۱۱ ص:۲۲۰، ۲۲۱، حدیث نمبر:۳۱۶۰، ۳۱۶۱، باب قَوْلِ اللهِ تَعَالٰى {وَإِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ......)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ کے نبیوں کے درمیان ایک دوسرے کو بہتر نہ کہا کرو۔''

تشریح: اس حدیث شریف میں یوں فرمایا: تم میں سے کوئی شخص یوں نہ کہے کہ میں یونس بن متیٰ سے بہتر ہوں، حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے اور اس سے بعض لوگوں (مودودی صاحب) کو یہ خیال ہو جاتا ہے کہ یہ کام انہوں نے ٹھیک نہیں کیا، تو ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کے دل میں یہ وہم ہو جائے کہ میں بہتر ہوں، اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ ایسا خیال کرنا بھی کفر ہے، اس لئے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام پوری انسانی برادری میں افضل ترین شخصیتیں ہیں، کوئی بھی شخص ان کے مرتبے کو نہیں پہنچ

سکتا اور بعض اکابر نے فرمایا: إِنِّي خَيْرٌ مِنْ يُونُسَ بْنِ مَتّٰى۔ میں إِنِّي سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی ہے، یعنی کوئی شخص یہ نہ کہے کہ ہمارے نبی یونس بن متی سے بہتر ہیں، جب کسی دوسرے نبی سے مقابلہ کرو گے تو دوسرے کی تحقیر کر کے کرو گے، تو آنحضرت ﷺ کی ایسی فضیلت نہ بیان کی جائے جس سے دوسرے کسی نبی کی تحقیر لازم آتی ہو۔

یہ مسئلہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ حضرات انبیاء میں کامل اور ناقص کا تقابل اور فرق نہیں، کہ ایک نبی کامل ہے اور دوسرا ناقص ہے، وہ سب ہی کے سب کامل ہیں، البتہ کامل اور کامل تر کا فرق ہے کہ ایک زیادہ کامل ہے اور دوسرا اپنے کمال میں اس سے کم مرتبہ ہے، بلکہ حکیم الاُمت کے بقول: اکمل اور اکمل ترین کا فرق، ایک نہایت کامل ہے اور ایک اس سے بھی زیادہ تر کامل ہے، وہ حضرات سارے کے سارے صاحب کمال ہیں اور ان کا کمال بھی انتہائی درجہ کا ہے لیکن پھر ان کے بھی درجات ہیں۔

جیسے کہ کلامِ الٰہی قرآنِ کریم الحمد شریف سے والناس سے سارا کا سارا پاک ہے، مقدس ہے، اللہ کا کلام ہے لیکن اس کے کچھ دوسرے حصوں سے افضل ہیں، اب ایک حصہ جو افضل ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرا حصہ ناقص ہے، نعوذ باللہ! قرآن کریم کے ایک لفظ کے بارے میں بھی نقص کا شبہ نہیں کیا جا سکتا، تو قرآن کریم کی آیات بھی ایک دوسرے سے افضل ہیں لیکن یہ فرق کامل اور ناقص کا نہیں، ساری آیتیں کامل ہیں، اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں، مقدس کلام ہے اور پورے قرآن کریم کے ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں تلاوت کرنے پر لیکن اس کے باوجود کچھ آیتیں افضل بھی ہیں، کچھ سورتیں افضل بھی ہیں۔

تو یہی مطلب ہے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا کہ آنحضرت ﷺ کی فضیلت کو اس انداز سے بیان نہ کیا جائے کہ کسی دوسرے نبی کی تنقیص کا وہم ہو، خیال تک بھی نہیں آنا چاہیے۔

حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ میں لوگوں نے بہت سی ٹھوکریں کھائی ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ نہایت باکمال نبی ہیں، تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام باکمال ہیں، ان کے کمال کے دائرے میں کوئی بڑے سے بڑا ولی بھی قدم نہیں رکھ سکتا، قدم رکھنا تو دور کی بات ان کے مرتبے کو پہچان بھی نہیں سکتا۔

انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا مرتبہ بہت ہی عالی ہے اور کوئی امتی ان کے مرتبے کو پہچان ہی نہیں سکتا۔

آپ ﷺ کی برکت

[حدیث: ۱۲۸۰] ”......... سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ..... ، لَا تَنْزِلُنَّ بُرْمَتُكُمْ وَلَا تَخْبِزُنَّ عَجِينَكُمْ حَتّٰى أَجِيءَ۔“

(صحیح بخاری ج: ۱۳، ص: ۶۰، حدیث نمبر: ۳۷۹۳، باب غَزْوَةِ الْخَنْدَقِ وَهِيَ الْأَحْزَابُ قَالَ مُوسَى بْنُ عُقْبَةَ.)

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی ہنڈیا نہ اتاروا اور اپنے آٹے کی روٹی نہ پکانا شروع کیجیو یہاں تک میں نہیں آجاتا۔''

تشریح: اس حدیث شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ذکر کیا گیا ہے: جنگ خندق کے دوران جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام کے ساتھ خندق کھودنے میں مصروف تھے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک میں ضعف اور نقاہت دیکھی اور بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا تا کہ کمر کو سہارا رہے، میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر گھر آیا، گھر والی سے کہا: اللہ کی بندی! تیرے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں دیکھا ہے، کہنے لگیں: ایک صاع تقریباً ساڑھے تین سیر جو کا آٹا ہے اور یہ بکری کا بچہ ہے اس کو ذبح کر لیتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تو چل جائے گا، آگے اللہ مالک ہے، کہنے لگے: بہت اچھا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے اور چپکے سے کہا: یارسول اللہ! تھوڑا سا کھانا ہمارے گھر میں ہے، میں نے بیوی کو تیار کرنے کا حکم دیا ہے، آپ دو چار رفقاء کے ساتھ تشریف لے چلیں، کھانا تناول فرمالیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان عام فرمادیا: **يَا أَهْلَ الْخَنْدَقِ، إِنَّ جَابِرًا قَدْ صَنَعَ سُوْرًا فَحَيَّ هَلًا بِكُمْ** (بخاری ۱۳/ ۴۸۵، ۴۱۰۲) اے اہل خندق! جابر نے تمہارے لئے دعوت کا کھانا تیار کیا ہے سب چلو، وہاں پورا مدینہ خندق میں لگا ہوا تھا اور مجھ سے فرمایا: میں ابھی آتا ہوں، میرے آنے تک ہنڈیا چولہے سے نہ اتارنا اور روٹی پکانا شروع نہ کرنا، تم گھر چلے جاؤ۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بھاگے ہوئے آئے، رنگ فق، بیوی سے کہا: بڑا کام خراب ہوگیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اعلان عام فرمادیا کہ جابر نے تمہارے لئے دعوت تیار کی ہے سب چلو، بیوی کہنے لگی: آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا نہیں تھا کہ ہمارے پاس اتنا ہی کھانا ہے؟ کہا: بتایا تھا! تو کہا: جب بتایا تھا تو وہ جانیں، ہمیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، پھر وہ جانیں ان کا کام، ہم نے تو پہلے ہی بتادیا تھا، وہ لاکر رکھ دیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، لعاب مبارک ہنڈیا میں ڈالا او گوندھے ہوئے آٹے میں ڈالا، دعائے برکت فرمائی اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی بیوی سے کہا کہ ایک پکانے والی بلا لے، پکاتی رہو، گھر میں جگہ تھوڑی تھی حکم فرمایا کہ دس دس آدمی آتے جاؤ اور بیٹھ کر کھانا کھاتے جاؤ، پتا نہیں کتنی دیر لگی ہوگی، دس دس آدمیوں کے کھانے میں، بہر حال سارے ہی نمٹ گئے اور ہنڈیا چولہے پر جوش مار رہی تھی، فرمایا تھا کہ اس کو اتارنا نہیں، یہیں سے نکالتے رہو اور روٹیاں بدستور تندور پر پک رہی تھیں، گرم گرم روٹیاں اور گرم گرم شوربہ کھاؤ، سبحان اللہ! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا اور یہ قصہ نہیں، اس طرح کے بہت سارے قصے ہیں، اس قسم کے واقعات سیرت طیبہ میں بہت ہیں، کھانے میں برکت اور پانی میں برکت، اب لوگوں کو یہ تعجب ہے کہ یہ

کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر تمہاری عقل میں آجاتا تو وہ معجزہ کیوں ہوتا؟

آنحضرت ﷺ کی پیشین گوئی

"....أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ......، أَرَأَيْتَكُمْ لَيْلَتَكُمْ هٰذِهٖ فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقٰى مِمَّنْ هُوَ عَلٰى ظَهْرِ الْأَرْضِ أَحَدٌ۔

(صحیح بخاری ج:۱ص:۱۹۸، حدیث نمبر:۱۱۳، باب السَّمَرِ فِي الْعِلْمِ)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: بھلا بتاؤ! تمہاری یہ رات جو ہے اس رات سے پورے ایک سوسال کے بعد روئے زمین پر کوئی ایک آدمی زندہ نہیں رہے گا جو اب زندہ ہیں۔

تشریح: اس حدیث میں فرمایا: آج رات کے بعد سے پورے ایک سوسال کے بعد زمین میں کوئی زندہ آدمی موجود نہیں ہوگا جو اس وقت زندہ ہیں (یہ آنحضرت ﷺ نے اپنی آخری عمر شریف میں بات فرمائی)۔

آنحضرت ﷺ کی اُمّت کے ساتھ خیر خواہی

[حدیث:۱۲۸۱] "عَنْ جَابِرٍ......، مَثَلِي وَمَثَلُكُمْ كَمَثَلِ رَجُلٍ أَوْقَدَ نَارًا فَجَعَلَ الْجَنَادِبُ وَالْفَرَاشُ يَقَعْنَ فِيهَا وَهُوَ يَذُبُّهُنَّ عَنْهَا وَأَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ وَأَنْتُمْ تَفَلَّتُونَ مِنْ يَدِي۔"

(صحیح مسلم ج:۱۱ص:۴۰۰، حدیث نمبر:۴۲۳۶، باب شَفَقَتِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى أُمَّتِهٖ وَمُبَالَغَتِهٖ....)

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری مثال اور تمہاری مثال اس آدمی کی ہے جس نے آگ جلائی تو ٹڈے اور پتنگے اس میں گرنے لگے، وہ ان کو آگ سے ہٹاتا ہے لیکن وہ باز نہیں آتے اور میں تمہاری کمروں کو پکڑ پکڑ کر ہٹاتا ہوں، تم میرے ہاتھ سے چھوٹ جاتے ہو۔''

تشریح: اس حدیث میں فرمایا کہ میری مثال اور تمہاری مثال ایسی ہے کہ برسات کا موسم تھا ایک آدمی نے جنگل میں آگ جلائی، اس آگ کو دیکھ کر کے ٹڈے اور کیڑے مکوڑے گرنے لگے، پتنگے گرنے لگے، اب وہ سب کو پکڑ پکڑ کر پیچھے ہٹاتا ہے تاکہ آگ میں گر کر جل نہ جائیں۔ فرمایا یہی مثال میری اور تمہاری بھی ہے، میں ہر طرح کوشش کرتا ہوں کہ تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر پیچھے ہٹاؤں لیکن تم گرنا چاہتے ہو شہوت میں خواہشات میں اور گناہ کے کاموں میں، تم گرنا چاہتے ہو میں پکڑ پکڑ کر تمہیں اس سے ہٹا رہا ہوں کہ تم آگ

میں داخل نہ ہو، جہنّم سے بچ جاؤ لیکن تم نہیں بچتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی چیزوں سے منع فرمایا ہے وہ ہمیں دوزخ سے بچانے کے لئے منع فرمایا ہے ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تو کوئی نفع نہیں تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو بخشے بخشائے ہیں، سیدھے اللہ کے پاس پہنچ کر جنّت میں پہنچ جاتے، جتنی فکر اور جتنا غم تھا وہ سارے کا سارا اُمّت کے لئے تھا اور یہ فکر کہ اُمّت اللہ کی نافرمانیاں کر کے دوزخ کی مستحق نہ ہو جائے، دوزخ میں داخل نہ ہو جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر ممکن طریقے سے اُمّت کے افراد کو دوزخ سے بچانا چاہتے ہیں لیکن اُمت اس حقیقت کو سمجھتی نہیں ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے زبردستی چھوٹ کر دوزخ میں گھسنا چاہتی ہے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوّت کی مثال

[حدیث: ۱۲۸۲] ”عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ..... مَثَلِي وَمَثَلُ الْأَنْبِيَاءِ كَرَجُلٍ بَنٰى دَارًا فَأَكْمَلَهَا وَأَحْسَنَهَا إِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ فَجَعَلَ النَّاسُ يَدْخُلُونَهَا وَيَتَعَجَّبُونَ وَيَقُولُونَ لَوْلَا مَوْضِعُ اللَّبِنَةِ....

زَادَ مُسْلِمٌ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَنَا مَوْضِعُ اللَّبِنَةِ جِئْتُ فَخَتَمْتُ الْأَنْبِيَاءَ۔“

(صحیح بخاری ج:۱۱ص:۳۶۵، حدیث نمبر:۳۲۷۰، بَاب خَاتِمِ النَّبِيِّينَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

ترجمہ: ”حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری مثال اور انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی نے مکان بنایا بہت کامل ومکمل اور بہت خوبصورت لیکن ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی، پس لوگ اس میں داخل ہوتے اور اس کی حسن وخوبی پر تعجب کرتے اور یہ کہتے کہ یہ ایک اینٹ کی جگہ کیوں چھوڑ دی گئی؟

صحیح مسلم کی روایت میں اتنا اضافہ ہے: فرمایا: میں اس اینٹ کی جگہ ہوں، میں آیا اور میں نے انبیاء کو ختم کر دیا۔“

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ میری مثال اور پہلے انبیائے کرام کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے بہت عمدہ مکان بنایا، نہایت حسین جمیل خوبصورت اور لوگ اس کے اردگرد چکر لگانے لگے اور عش عش کرنے لگے کہ مکان کے بنانے پر تو کمال ہے، ایسا خوبصورت ایسا عمدہ اتنا بہترین لیکن دیکھا کہ مکان میں ایک اینٹ لگنا باقی ہے اور سب مکمل، تو لوگ تعجب کر کے کہتے کہ یہ اینٹ کیوں نہ لگا دی؟ صحیح بخاری میں تو اتنا ہی ہے لیکن

صحیح مسلم شریف کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ وہ آخری اینٹ میں ہوں میرے آنے سے یہ مکان کامل اور مکمل ہو گیا اور میں آیا اور میں نے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ختم کر دیا، میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس دنیا میں تشریف لانا ایک تو ختم نبوت کی تکمیل کے لئے تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری ہوئی اور نبوت کامل و مکمل ہو گئی، دوسری بات یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لانا اس کونے کی اینٹ کو مکمل کرنے کے لئے تھا، مکان کی یہ دیوار بھی بن رہی تھی، یہ دیوار بھی بن رہی تھی، یہ دیوار بھی بن رہی تھی اور کونے میں ایک اینٹ کی جگہ باقی تھی۔ ایک روایت میں: مِنْ زَاوِيَةٍ مِنْ زَوَايَاهُ (مسلم ۱۱/ ۴۰۴، ۴۲۳۹) یعنی مکان کے چار کونوں میں سے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ باقی تھی، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک تمثیل میں ارشاد فرمایا کہ تم نے سنا نہیں کہ جس پتھر کو معماروں نے بیکار سمجھ کر پھینک دیا تھا وہی کونے کا پتھر ٹھہرا۔

اور اس تمثیل سے مقصود یہ تھا کہ حضرت ہاجرہ حضرت سارہ کی خادمہ تھیں، ان کے یہاں بچہ پیدا ہو گیا حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اصل مالکہ یعنی حضرت سارہ ان کی اولاد نہیں ہوئی، وہ کہنے لگیں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہ ان کی اولاد ہو گئی میری نہیں، اس کو میری نظر سے دور کر دو، یہ طبعی چیزیں ہیں، ادھر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ جس طرح یہ کہتی ہیں اس طرح کرو۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت ہاجرہ کو اور ان کے شیر خوار بچے کو لے کر ملک شام سے مکہ مکرمہ پہنچے، اس وقت مکہ نہیں تھا کوئی آبادی نہیں تھی، نہ بندہ نہ بندے کی ذات بیت اللہ شریف کے پاس، بیت اللہ کی بھی کوئی جگہ نہیں تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ یہاں بٹھا دو، وہاں کوئی سایہ بھی نہیں تھا کوئی درخت بھی نہیں تھا اور گرمی بلا کی، حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مشکیزے میں پانی تھوڑا سا دیا تھا، اب کتنا آ سکتا ہے مشکیزے میں پانی اور تھوڑی سی کھجوریں وہ ان کے پاس رکھ دیں، یہ ان کی خوراک ہے، حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تھا کہ بات نہیں کرنی، ان کو بٹھا دینا ہے اور واپس آ جانا ہے بات نہیں کرنی، حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اس بچے کو اس جگہ لٹایا اور آپ چل پڑے، چلے تو حضرت ہاجرہ نے پیچھے سے دامن پکڑ لیا اور کہا کہ ابراہیم! ہمیں کس جرم کی سزا دے رہے ہو اور کس کے سپرد کر کے جا رہے ہو؟ یہاں نہ کوئی آدمی نہ کوئی بندہ بشر، یہاں تو کسی آدمی کی آواز بھی نہیں سنائی دیتی، حکم تھا کہ بولو نہیں، وہ بلا رہی ہیں اور یہ گم سم، آخر میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم کیا ہے؟ انہوں نے سر سے اشارہ کیا: ہاں، حضرت ہاجرہ نے پلو چھوڑ دیا اور فرمایا: إِذَنْ لَا يُضَيِّعُنَا (بخاری ۱۱/ ۱۵۰، ۳۱۱۳) اگر یہ اللہ کا حکم ہے تو وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا، وہ پیچھے لوٹ گئیں اپنے بچے کی طرف، وہ آگے بڑھ گئے، وہاں پہاڑ ہی پہاڑ ہیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں ایک پہاڑی کے اوٹ میں جا کر اللہ تعالیٰ کے سامنے دُعا کی: ﴿رَبَّنَا إِنِّي

أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ﴾ (ابراهيم: ۳۷) اے اللہ! میں نے اپنی اولاد کا ایک حصہ تیرے حرمت والے گھر کے پاس آباد کر دیا ہے۔ ﴿رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ﴾ اور ان کو یہاں اس لئے ٹھہرایا ہے کہ وہ نماز کی پابندی کریں۔ ﴿فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ﴾ یا اللہ! لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے۔ وہ تو چلے گئے دُعا کر کے اور یہ کھجوریں تھیں پانی تھا وہ ختم ہو گیا، اب وہ دیکھتی ہیں کہ کوئی پانی ہو اِدھر اُدھر تو سات چکر لگائے صفا مروہ کے درمیان اور بچہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے پیاس کی وجہ سے، بھوک کی وجہ سے۔ ماں کی چھاتیوں میں بھی تو دودھ نہیں ہے، خوراک اندر جائے تو دودھ آئے، بچہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رہا ہے وہ کبھی ادھر جاتی ہیں کبھی اُدھر جاتی ہیں، سات چکر لگائے اور میلین اخضرین کے درمیان دوڑتی ہوئی گزرتی ہیں کیونکہ وہ جگہ ایسی تھی جہاں سے بچہ نظر نہیں آرہا تھا۔

بالآخر بچے کے پاس آئیں تو حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنی رحمت سے اسماعیل علیہ السلام کی ایڑیوں سے اور جبرئیل علیہ السلام کے پر سے وہاں چشمہ پیدا کر دیا، چشمہ بہنے لگا تو حضرت ہاجر نے پانی کو روکنے کے لئے ارد گرد کی دیواری سی بنا دی اور پانی کو فرمایا: زَمْزَمْ ٹھہر جا، اُچھل نہیں، جب سے زمزم بنا، زمزم کے یہی معنی ہیں، اس کے بعد دستور دنیا کا یہی ہے کہ جہاں پانی ہوتا ہے وہاں پرندے آتے ہیں، وہاں سے ایک قافلہ جا رہا تھا بنی جرھم کا، انہوں نے دیکھا کہ یہاں پرندے ہیں ان کو دیکھا کہ پانی ہے ایک عورت ہے ایک چھوٹا سا بچہ ہے شیر خوار اور پانی ہے ان کے ساتھ، پانی کا چشمہ ہے تو وہ حضرت ہاجر سے کہنے لگے کہ آپ اجازت دے دیں تو ہم بھی یہاں ٹھہر جائیں، وہ فرمانے لگیں تم شوق سے ٹھہرو مگر اس پر تمہارا حق نہیں ہوگا یعنی ملکیت اس پانی پر تمہاری نہیں ہوگی، پانی اس بچے کا ہے، چنانچہ اس طرح مکہ کی آبادی آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔

حضور ﷺ کا معجزہ غزوۂ تبوک کے موقع پر

[حدیث ۱۲۸۳۰] ”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَوْ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ شَكَّ الْأَعْمَشُ قَالَ لَمَّا كَانَ غَزْوَةُ تَبُوكَ أَصَابَ النَّاسَ مَجَاعَةٌ، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ! لَوْ أَذِنْتَ لَنَا فَنَحَرْنَا نَوَاضِحَنَا فَأَكَلْنَا وَادَّهَنَّا، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: افْعَلُوا، قَالَ: فَجَاءَ عُمَرُ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنْ فَعَلْتَ قَلَّ الظَّهْرُ وَلَكِنِ ادْعُهُمْ بِفَضْلِ أَزْوَادِهِمْ ثُمَّ ادْعُ اللهَ لَهُمْ عَلَيْهَا بِالْبَرَكَةِ لَعَلَّ اللهَ أَنْ يَجْعَلَ فِي ذَلِكَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: نَعَمْ، قَالَ: فَدَعَا بِنِطَعٍ فَبَسَطَهُ ثُمَّ دَعَا بِفَضْلِ أَزْوَادِهِمْ، قَالَ: فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَجِيءُ بِكَفِّ ذُرَةٍ، قَالَ: وَيَجِيءُ الْآخَرُ بِكَفِّ

تَمْرٍ، قَالَ: وَيَجِيءُ الْآخَرُ بِكِسْرَةٍ حَتَّى اجْتَمَعَ عَلَى النِّطَعِ مِنْ ذٰلِكَ شَيْءٌ يَسِيرٌ، قَالَ: فَدَعَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْهِ بِالْبَرَكَةِ، ثُمَّ قَالَ: خُذُوا فِي أَوْعِيَتِكُمْ، قَالَ: فَأَخَذُوا فِي أَوْعِيَتِهِمْ حَتَّى مَا تَرَكُوا فِي الْعَسْكَرِ وِعَاءً إِلَّا مَلَئُوهُ، قَالَ: فَأَكَلُوا حَتَّى شَبِعُوا وَفَضَلَتْ فَضْلَةٌ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللهِ لَا يَلْقَى اللهَ بِهِمَا عَبْدٌ غَيْرَ شَاكٍّ فَيُحْجَبَ عَنِ الْجَنَّةِ۔"

(صحیح مسلم ج:۱، ص:۱۲۷، حدیث نمبر:۴۰، بَابُ الدَّلِيلِ عَلَى أَنَّ مَنْ مَاتَ عَلَى التَّوْحِيدِ دَخَلَ الْجَنَّةَ قَطْعًا)

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ یا حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ان دونوں میں سے کسی ایک سے روایت ہے جس میں راوی کو شک ہے اور صحابی کی تعیین میں شک مضر نہیں، اس لئے کہ صحابہ سب کے سب عدول ہیں، بہر حال وہ صحابی فرماتے ہیں کہ غزوۂ تبوک میں لوگوں کو بھوک پہنچی تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر آپ ہمیں اجازت دیتے تو ہم اپنے اونٹ ذبح کر کے کھاتے اور مالش وغیرہ کرتے جب بھی استعمال کرتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا کرلو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے، کہنے لگے: یا رسول اللہ! اگر آپ نے ایسا کیا تو سواریاں کم ہوجائیں گی لیکن ایسا کیجئے کہ ان سے جو بچے کھچے توشے ہیں وہ منگوالیجئے پھر ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے برکت کی، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈال دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہت اچھا، پس آپ نے دستر خوان بچھانے کا حکم دیا، دستر خوان منگوایا اس کو بچھایا پھر آپ نے جو بچے ہوئے توشے تھے وہ طلب فرمائے، ایک آدمی مٹھی بھر جو لا رہا تھا، دوسرا آدمی ایک مٹھی کھجوروں کی لا رہا تھا، کوئی روٹی کا ٹکڑا لا رہا تھا یہاں تک کہ دستر خوان پر کچھ معمولی چیز جمع ہوگئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعائے برکت فرمائی پھر فرمایا کہ اب اپنے برتنوں میں دینا شروع کرو، چنانچہ انہوں نے اس کے برتن بھرنا شروع کردیئے یہاں تک کہ لشکر میں کوئی برتن نہیں چھوڑا جس کو بھر نہ لیا ہو، پس خوب کھایا یہاں تک کہ سیر ہوگئے اور کچھ بچ بھی رہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں، نہیں ملاقات کرے گا اللہ تعالیٰ سے ان دونوں کلموں کے ساتھ دونوں شہادتوں کے ساتھ کوئی بندہ جو کہ شک کرنے والا نہ ہو

کہ پھر اس کو جنّت سے روک دیا جائے۔''

تشریح: اس واقعہ کا اجمالی خاکہ تو ترجمہ سے ہی واضح ہو گیا ہو گا، بہت سے مسائل ہیں اس حدیث کے ان کی طرف اشارہ کرتا ہوں مختصراً:

پہلی بات یہ کہ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے یا حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں راوی کو شک ہو گیا اور علمائے اُصول نے یعنی محدثین نے یہ قاعدہ لکھا ہے کہ جب اس بات کا یقین ہو کہ یہ حدیث میں نے فلاں سے سنی ہے یا فلاں سے سنی ہے ان دونوں میں سے کسی ایک سے سنی ہے اور وہ دونوں قابل اعتماد آدمی ہوں تو اتنا شک حدیث کی روایت میں مضر نہیں ہے، حدیث قابل اعتماد ہی سمجھی جائیگی، اس لئے کہ ان دونوں آدمیوں کے بارے میں یقین ہے کہ یا اس سے سنی یا اس سے سنی اور وہ دونوں قابل اعتماد آدمی ہیں، لہٰذا حدیث مشکوک نہیں ہوگی، خصوصیت کے ساتھ صحابہ کرام چونکہ سب کے سب عادل ہیں اور سب ثقہ ہیں اس لئے کسی صحابی سے بھی حدیث مروی ہو صحیح ہے اور اگر صحابی میں شک ہو جائے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے یا حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی تب بھی یہ مضر نہیں، اس لئے کہ ان دونوں میں سے جس سے بھی یہ مروی ہو اور جس نے بھی یہ حدیث نقل کی ہو قابل اعتماد ہے، یہ مسئلہ تو علم اُصول کا انہوں نے نقل کر دیا ہے۔

دوسرا مسئلہ ۹ھ میں ہوا تھا، اس کی قرآن مجید میں بڑی لمبی تفصیلات ہیں، سورۃ توبہ ساری اسی سے متعلق ہے دسویں اور گیارہویں پارے میں، ملک شام کی سرحد پر تبوک کی بستی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ سے وہاں تشریف لے گئے تھے، گرمیوں کا موسم تھا لیکن اس کے باوجود صحابہ کرام چلے گئے اور اتفاق کی بات یہ کہ وہاں ایک مہینہ قیام کرنا پڑا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو، اب آپ جانتے ہیں کہ کتنے توشے بیچاروں نے اُٹھائے ہوں گے وہاں جیسے آج کل کا فوجی رسد کا انتظام ہے وہ تو تھا نہیں ساتھ ہی اپنے جتنے توشے لینے تھے لے لئے تھے، وہ توشے ختم ہو گئے تھے اور صحابہ کرام کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس موقع پر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لی کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم کچھ اُونٹ ذبح کر کے کھانا شروع کر دیں تاکہ کم از کم جان تو بچے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دے دی۔

یہاں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مجاہدہ اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں ان کا مشقتیں برداشت کرنا معلوم ہو جاتا ہے، ذرا اندازہ کیجئے رومیوں کی فوج سے لڑنے کے لئے گئے ہوئے ہیں یہ حضرات، اس بات کو ذہن میں رکھئے آج کل کے امریکہ سے وہ اپنے دور کا امریکہ تھا شاہ روم، اس کی فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے گئے تھے، وہ سامنے نہیں آیا اس کو اللہ نے جرأت نہیں دی ہمت نہیں دی کہ وہ مقابلے میں آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سرحد پر پہنچ کر ایک مہینہ وہاں قیام فرمایا، عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ ایک طرف ان کے مجاہدے

کو دیکھئے، ان کی بے سروسامانی کو دیکھئے اور تیسری طرف حق تعالیٰ شانہٗ نے ان کو جو فتوحات اور نصرتیں عطا فرمائی تھیں اس پر غور فرمائیے، اسلحہ یا دوسری زائد چیزیں کیا ہوتی کھانے کے لئے روٹی بھی نہیں ہے ان کے پاس اور یہیں سے دنیا کی حقارت اور ذلت بھی معلوم ہو جاتی ہے، اگر دنیا کا ساز و سامان یہاں کی لذتیں اور نعمتیں کچھ بھی قابل قدر ہوتیں تو اس کے سب سے زیادہ مستحق رسول اللہ ﷺ تھے اور دوسرے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور ان کے بعد پھر صحابہ کرام اس کے مستحق تھے، اس لئے کہ وہ حق تعالیٰ شانہٗ کے سب سے زیادہ محبوب تھے لیکن شاید اللہ تعالیٰ نے بھی قسم کھا رکھی ہے کہ ان کو کچھ نہیں دیں گے تا کہ ان کا اعتماد ان چیزوں پر نہ رہے، حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات عالی پر رہے اور یہ تو حضور ﷺ اور ان کے صحابہ کرام ہیں۔

اس دور کی بات کرتا ہوں چودہویں صدی کی، حضرت مولانا محمد یوسف دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تبلیغی جماعت کے امام، ایک دفعہ نظام الدین دہلی میں ایسا ہوتا تھا کہ مطبخ بڑا لمبا چوڑا ہوتا تھا، ہزار آدمی روزانہ تقریباً کھانے والے ہوتے تھے، ایک دُکان دار کے یہاں سے یہ آٹا وغیرہ آتا تھا ضرورت کی چیزیں اور مہینے کے بعد اللہ تعالیٰ پیسے دے دیتا تھا اس کا حساب چکا دیا جاتا تھا، جو صاحب اس خدمت پر مامور تھے ان کو دُکان دار نے جواب دے دیا کیونکہ مہینے سے زائد گزر چکا تھا اور اس نے آئندہ کے لئے بند کر دیا، اس نے خاص خاص لوگوں کو بتایا کہ یہ صورتحال ہے اور انہوں نے بیٹھ کر مشورہ کیا، کہنے لگے حضرت جی کو پتہ نہ چلے کچھ انتظام کر دیا روپے کا اس کے پیسے بھی ادا کر دیئے تو آئندہ کے لئے بھی کچھ پیسے جمع کر لئے اور ساتھ میں ایک دوسرے کو وصیت کر دی کہ بھائی دیکھو کوئی شخص حضرت کو نہ بتائے لیکن کسی طرح حضرت کو پتہ بہر حال چل گیا کچھ دنوں کے بعد آپ نے سب حضرات کو تنہائی میں جمع فرمایا اور جمع کر کے کہا کہ آپ نے جو جمع کیا ہے اخلاص کے ساتھ کیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں اور آپ اس طرح کریں گے تو ہمیں بگاڑ دیں گے، ہمارا تعلق حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ قائم نہیں رہے گا اگر آپ اس طرح کریں گے تو پھر ہم حق تعالیٰ شانہٗ سے واپس لینے والے نہیں رہیں گے اس لئے بہت برہمی کا اظہار فرمایا اور ان کی رقم واپس فرمائی۔

اب کہاں سے آتا تھا تو ذرا سوال پوچھئے کہ کہاں سے آتا تھا، خاص لوگ چندہ دے رہے ہیں انتظام کر رہے ہیں تو فرمایا کہ تم ہماری عادت کو بگاڑ رہے ہو، یہ مستقل موضوع ہے اس کو چھوڑتا ہوں، عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ فقر و فاقہ یہ تنگی و درشتی یہ بے سروسامانی حق تعالیٰ شانہٗ کی وہ نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ سید الانبیاء ﷺ کو اپنے رسولوں کو ان کے صحابہ کرام کو عطا فرمائی اور اس کے بعد پھر حضرات اولیاء اللہ کو نصیب فرمائی۔

تو معلوم ہوا کہ دنیا اتنی حقیر اور ذلیل چیز ہے جس کی خاطر لوگ لڑتے مرتے ہیں جھگڑے فساد کرتے ہیں، اتنی ذلیل چیز ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ انبیاء علیہم السلام کو اس سے محفوظ رکھتے ہیں، بس اتنی بات اپنے

ذہن میں بٹھالو یہ جتنی چیزوں پر آج فخر کیا جارہا ہے اور جن کو بلندی کا معیار سمجھا جارہا ہے، اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں اگر ان میں کوئی بھی خوبی ہوتی تو رسول اللہ ﷺ کو اس سے محروم نہ کیا جاتا، میں حرام ہونے کا فتویٰ نہیں دے رہا یہ دیکھئے دوسری بات ہے ہم اس کے اہل بھی نہیں مگر ہم اپنی نا اہلی تو سمجھیں، آج ہمارے ذہنوں میں ایک عجیب سوال آیا، عجیب بات ذہن میں آئی پتہ نہیں کیوں، کہ قرآن کریم اور حدیث نبوی مومن کے لئے آئینہ ہے، آئینہ سامنے رکھیں تو چہرہ صاف نظر آنے لگتا ہے اس میں جو داغ دھبے ہوتے ہیں وہ بھی نظر آنے لگتے ہیں اور جسم کے کسی حصے کا ایکسرے لیا جائے تو وہ بھی تصویر ہوتی ہے، وہ بتاتا ہے کہ فلاں جگہ پھوڑا ہے یا فلاں جگہ ہڈی ٹوٹ گئی ہے، اب ہمارے سامنے قرآن کریم اور احادیثِ نبوی کا آئینہ ہے یا تو یہ آئینہ دُھندلا گیا کہ ہمیں ہمارے عیب نظر نہیں آتے، آئینہ کے اوپر اگر سیاہی مل دی جائے یا دھند پھنس جائے تو اس میں چہرہ نظر نہیں آتا اور یا ہماری نظر اور بصیرت ختم ہوگئی ہے کہ ہم دیکھ نہیں سکتے، تمام کے تمام عیوب جو مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں ان کو عیب اگر سمجھتے کہ یہ چیز عیب ہے تو ان کو چھوڑ جانا بھی کسی وقت اہتمام ہوتا لیکن مشکل یہ ہوئی کہ عیوب کو ہم نے ہنر سمجھ لیا، گندگی کو عزت سمجھ لیا اور سیاہی کو بقول میراثی کے نور سمجھ لیا، اب تو قرآن کریم کا اور احادیث نبوی کا آئینہ ہمارے سامنے آتا ہے ہمیں کوئی پرواہ ہی نہیں، ہماری بصارت کم ہوگئی یعنی ختم ہی ہورہی ہے۔

اور تیسرا احتمال ایک اور بھی ہے وہ یہ کہ ہم آئینہ کبھی دیکھیں ہی نہیں حبشی کی طرح ویسے ہی پٹخ دیں اس کو تو یہ دوسری بات ہے، حدیث شریف میں آنحضرت ﷺ کے فقر و فاقہ کے جو واقعات آئے ہیں میں اس کو مستقل بیان نہیں کرتا، صرف ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں، اب لوگوں کی عقل میں وہ باتیں نہیں آتیں اور منکرین حدیث ان احادیث کو لوگوں کے سامنے پیش کر کے مذاق اُڑاتے ہیں کہ دیکھو جی مولوی نقشہ کھینچ رہا ہے حضور ﷺ کا، میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں صحیح کہہ رہا ہوں کہ بصارت ختم ہوگئی، ایک آنحضرت ﷺ نہیں میں تو پورے انبیاء علیہم السلام کی زندگی کا کہہ رہا ہوں، سلیمان علیہ السلام تخت پر بیٹھے ہیں، داؤد علیہ السلام بادشاہت کرتے ہیں لیکن صحیح بخاری کی روایت ہے: "أَنَّ دَاوُدَ النَّبِيَّ عَلَيْهِ السَّلَام كَانَ لَا يَأْكُلُ إِلَّا مِنْ عَمَلِ يَدِه" (بخاری ۷/۲۳۶، ۱۰۳۱) اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی محنت سے روٹی کھاتے تھے باوجود بادشاہی کے اور یہی حال حضرت سلیمان علیہ السلام کا تھا اپنی ذاتی زندگی ان کی فقر کی تھی اور ہمارے آنحضرت ﷺ تو مشہور ہیں بادشاہی میں فقیری کی۔

تو خیر مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اس حدیث سے ایک تو آپ کو یہ اندازہ ہونا چاہئے کہ صحابہ کرام پر کیسے کیسے مجاہدے گزرے ہیں اور اسی کے ساتھ یہ بھی اندازہ ہونا چاہئے کہ یہ دنیا کتنی ذلیل چیز ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے محبوب بندوں کو یہ عطا نہیں فرمائی جتنے حق تعالیٰ شانہٗ کے زیادہ پیارے تھے اتنا ہی دور

رکھا ہے، مجھے ایسے موقعے پر حدیث یاد آجاتی ہے، مشہور حدیث ہے: حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو اسے دنیا سے اس طرح بچا کر رکھتے ہیں جس طرح تم میں سے ایک آدمی مریض کو پانی سے بچا کر رکھتا ہے، اطبا کہتے ہیں کہ پانی نہ پلانا اس کو، مریض کا تو بہت جی چاہتا ہے پانی پینے کو، بعض امراض ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں پانی نہیں پیا جاتا، مریض کا دل چاہتا ہے پانی پینے کو لیکن تیماردار اس کو بچا کے رکھتا ہے، فرمایا: جس طرح تم اپنے بیمار کو پانی سے بچا کر رکھتے ہو اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کو دنیا سے بچا رکھتے ہیں اور آج ہم اس دنیا کے لئے مرمٹ رہے ہیں، دین اس کے لئے چھوڑا، شرم اس کے لئے چھوڑی، غیرت اس کے لئے چھوڑی، اپنی وضع قطع ہم نے اس کے لئے چھوڑی، سب چیزیں ہم نے اس کے لئے چھوڑ دی ہیں اس مردار کے لئے! ذرا اندازہ فرمایئے۔

تیسرا مسئلہ یہ کہ صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ! آپ اجازت دیں تو اونٹ ذبح کر کے کھالیں اور ان کی چربی وغیرہ استعمال کرلیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کرلو ایسا ٹھیک ہے، اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ صحابہ کرام اپنے دنیاوی امور بھی آنحضرت ﷺ کی اجازت کے بغیر طے نہیں فرماتے تھے۔

آج سب سے بڑی آفت یہ ہے کہ مسلمان قوم کا کوئی مقتدا نہیں ہے جس کے بعد ان کو چوں چراں کرنے کی ضرورت نہ رہے جن کو ائمہ مساجد بنایا ہے وہ غریب میرے جیسے ہیں کہ آپ لوگوں کے جوتے سیدھے کریں تو ان کی روٹی مل سکتی ہے، نہ کریں تو نہ سہی، آپ کے مشورے کے مطابق چلیں تو بے چارے دو رکعت کے امام رہ سکتے ہیں غریب ورنہ کون رہنے دیتا ہے اور جن کو لیڈر چن لیا گیا ہے یا بدقسمتی سے وہ خود بن گئے ہیں ان میں نہ عقل ہے نہ دین۔

قوم کی یہ حالت ہے آج سے ۵۰ سال پہلے کی بات کر رہا ہوں یہ پاکستان سے پہلے کہ خاندان کا بڑا جو کہہ دیتا تھا سب سر نیچا کر دیتے تھے "کہ ٹھیک ہے" بڑوں کی بات رد نہیں کی جاتی تھی، ہر قبیلے کا ایک یا ہر خاندان کا ایک بڑا ہوتا ہے ہر محلے کا ایک بڑا ہوتا تھا کم از کم دنیوی اعتبار سے ہی سہی بڑوں کی بڑائی کو مانتے تھے اور اب کسی کی نہیں سن رہے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھوک سے مر رہے ہیں لیکن حضور ﷺ سے پوچھ رہے ہیں کہ حضور ﷺ اگر اجازت دیں تو اونٹ ذبح کر دیں، معمولی سی بات ہے، صحابہ کرام کی کوئی نقل وحرکت آنحضرت ﷺ کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتی تھی اور یہ اُمت کے لئے سب سے بڑی نعمت تھی کسی مقتداء پر جمع ہوجانے کی اور اُمت کے حق میں سب سے بڑی لعنت یہ مسلط ہوئی ہے کہ آج اس قوم کا کوئی مقتدا نہیں ہے، کس پر اعتماد کریں کوئی ہے ہی نہیں، جس کو بڑا بنا دیں وہ بڑا بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور ہم چھوٹا بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ!

اب سوائے اس کے کیا عرض کیا جائے کہ لوگ بڑی تجویزیں سوچتے ہیں، بڑے بڑے منصوبے

بناتے ہیں، اگر پوری اُمت مسلمہ ستر اسی یا نوے کروڑ جتنے بھی ہیں دنیا میں لیکن ان کا ایک امام ہوتا اور اس کی آواز پر یہ لبیک کہتے، اگر کہتا کہ دیوار سے سر ٹکرا دو تو دیوار کو توڑ ہی سکتے تھے انشاء اللہ، پتھر کی دیوار بھی توڑ سکتے تھے سر مار مار کر توڑ سکتے تھے، اب چھوٹا سا اسرائیل نہیں فتح ہوتا اگر پیشاب کر دیتے مسلمان تو اسرائیل کو بہا کر لے جاتے۔

چوتھا مسئلہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ! اگر آپ نے ایسا کیا یعنی اونٹ ذبح کرنے کی اجازت دے دی پھر تو سواریاں کم ہو جائیں گی، ہمیں سفر بھی تو کرنا ہے آخر یہیں تو نہیں رہنا، پہلے ہی یہ ایک ایک دو دو تین تین آدمی ایک ایک اونٹ پر سوار ہو کر آئے تھے، کوئی پیدل چل رہا ہے کوئی اونٹ پر سوار ہے، باری باری اس پر چل کر آئے تھے، اونٹ اتنے کہاں تھے لیکن اگر اب ذبح کر کے کھانے شروع کر دیئے پھر واپس کیسے جائیں گے، سواریوں کی بھی تو ضرورت پڑے گی، اس لئے میرا مشورہ تو یہ ہے کہ حضور ان کے زائد توشے منگوالیں اور اس میں دعائے برکت فرمائیں کیا بعید ہے حق تعالیٰ شانہٗ برکت فرمادیں اور اونٹوں کے ذبح کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہت اچھا، یہاں سے ایک تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی علو مرتبت معلوم ہوتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کیا مقام ہے۔

درمیان میں ایک بات عرض کر دوں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی وہیں تھے لیکن انہوں نے مشورہ نہیں دیا، بہت کم موقعے ایسے ہیں جہاں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب تک پوچھتے نہیں تھے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کوئی بات نہیں کرتے تھے یہ ان کی شان تھی وہ فنا تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے پر ان کی کوئی رائے نہیں تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان دوسری تھی۔

یہاں سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کیا مقام اور مرتبہ تھا، یہ دونوں وزیر تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی، متعدد مواقع میں انہی سے مشورہ لیا جاتا تھا اور یہی مشورہ دیتے تھے اس موقعے پر بھی حالانکہ ان سے مشورہ نہیں لیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا اِفْعَلُوْا کرلو کاٹ لو اونٹ لیکن یہ تو بہر حال مقام ہی ان کا مشیر کا تھا آنحضرت کے، اس لئے یہ از خود آگے بڑھے اور آگے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مشورہ عرض کیا۔

یہاں سے علماء نے ایک اور مسئلہ بھی نکالا ہے، اگر امام کے مشیر، امام کہتے ہیں مسلمانوں کے قائد کو حاکم کو، اگر اس کے مشیر کسی بات کو مصلحت سمجھیں تو ان کو چاہئے کہ بلا تکلف عرض کر دیا کریں اور اس کا انتظار نہ کریں کہ ان سے مشورہ لیا جاتا ہے یا نہیں، اپنا مشورہ پیش کر دینے کے بعد پھر جو اس کی رائے ہو وہ پیش کرے، تم اپنا مشورہ پیش کر دو اس کے بعد جو وہ کریں وہ ٹھیک ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہت اچھا، چنانچہ

یہی ہوا، آنحضرت ﷺ نے دستر خوان منگوایا، دستر خوان آنحضرت ﷺ کا چمڑے کا تھا اور گول ہوتا تھا وہ منگوایا اور بچھایا گیا اور آنحضرت ﷺ نے حکم فرمایا: بھائی کسی کے پاس کوئی چیز بچی ہوئی ہو وہ لے آؤ، کوئی آدمی بھنے ہوئے دانے لے آیا ایک مٹھی، کسی کے پاس کھجوروں کی کوئی مٹھی بچی ہوئی تھی چند کھجوریں بچی ہوئی تھیں وہ لے آیا، کسی کے پاس کوئی روٹی کا ٹکڑا بچا ہوا تھا وہ لے آیا، جس کے پاس جو بچا ہوا تھا وہ لے آیا اور ایک ڈھیر اس کے اوپر بن گیا، اب آنحضرت نے دُعائے برکت فرمائی، ایسے موقعوں پر معمول یہ تھا کہ اس چیز کو ڈھانک دیا جاتا تھا تو اس حدیث میں آیا تو نہیں ہے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ اس پر آنحضرت ﷺ نے کپڑا اڑھوا دیا ہوگا، دُعائے برکت فرمائی اور حکم دے دیا کہ بھرو، برتن بھرنے شروع ہو گئے اور لشکر میں جتنے برتن تھے سارے کے سارے بھر گئے کوئی برتن خالی نہیں رہا، خوب کھایا سب نے پیٹ بھر کر کھایا، خوب کھایا اور کچھ بقیہ بچ رہا، اس پر آنحضرت ﷺ نے اگلا ارشاد فرمایا۔

یہاں یہ بات عرض کرنے کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا اس طرح دُعائے برکت فرمانا اور آپ کی دُعائے برکت سے اس کھانے میں برکت ہو جانا یہ آنحضرت ﷺ کا معجزہ تھا، انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء اللہ کی کرامات یہ دونوں برحق ہیں، یہ اہل سنّت والجماعت کا عقیدہ ہے، انبیاء علیہم السلام کو حق تعالیٰ شانہٗ معجزات عطا فرماتے ہیں یعنی ان کے ہاتھ پر جو چیزیں خلاف عادت ظاہر ہوتی ہیں ان کو کرامت کہتے ہیں، اس طرح آنحضرت ﷺ کا دُعا کرنا اور آپ کی دُعا پر اس کھانے میں برکت کا ہو جانا یہ آنحضرت ﷺ کا معجزہ تھا اور اس قسم کے معجزات آنحضرت ﷺ سے ایک دفعہ نہیں بیسیوں دفعہ صادر ہوئے ہیں اور صحابہ کرام نے ان کا مشاہدہ بھی کیا اور ان سے برکتیں بھی ہوئی ہیں، حضرات اولیاء اللہ سے بھی اس قسم کی کرامتیں ظاہر ہوئی ہیں، تکثیرِ طعام یعنی کھانے کا زیادہ ہو جانا لیکن ان کو حکم یہ ہے کہ ذرا کرامت کے معاملے میں احتیاط کیا کریں چونکہ بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔

تھانہ بھون میں اپنے وقت کے تین قطب رہتے تھے: حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ، حضرت حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، یہ تینوں ایک ہی بزرگ کے مرید تھے، میاں جی نور محمد لوہاری میں رہتے تھے، حضرت میاں جی صاحب بچوں کو قرآن مجید پڑھا دیتے تھے مسجد کے میاں جی تھے، اس لئے میاں جی کہتے تھے، لیکن عارف اتنے بڑے کامل تھے، اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے بندوں کی عجیب شانیں بنائی ہیں۔

بہر حال یہ تینوں بزرگ ایک ہی شیخ سے بیعت تھے اور ان کو اَقطابِ ثلاثہ کہا جاتا تھا، تین قطب۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ذکر کیا ہے کہ ایک دفعہ مہمان بے وقت آ گئے، گھر میں کوئی چیز نہیں، گھر میں معمولی تھوڑا بہت آٹا تھا، ہنڈیا تھی تو حضرت نے یوں فرمایا: بھائی! ایسا کرو کچھ پڑھ کے دَم کر دیا آٹے کو

اور کوئی دم کر دیا ہنڈیا پر، اور فرمایا کہ آٹا پکانا شروع کر دو، اس پر کپڑا ڈال لیا اس کو اسی طرح ہی رہنے دو اور ہنڈیا بھی چولہے پر ہی رہنے دو، چولہے کے اُوپر ہی سے ڈالتے رہو، اُتارو نہیں۔ اپنا رومال ڈال دیا تھا آٹے پر، چند مہمان تو بھگت گئے اللہ تعالیٰ نے پورا کر دیا، حافظ جی کو پتہ چل گیا، وہ بڑے تھے، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت بھی انہوں نے فرمائی تھی، اگلے دن حافظ صاحب رحمۃ اللہ کہنے لگے کہ حاجی جی! آپ کا رومال سلامت رہے، اب اللہ کے فضل سے قحط کیوں آنے لگا؟ بس اتنی بات سننا تھی کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ لرز گئے، کانپ گئے تھر تھر، اور کہنے لگے کہ میں معافی مانگتا ہوں، آئندہ نہیں کروں گا۔ ہمارے اکابر ان چیزوں کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھتے، اس قسم کی کرامتوں کا ظہور ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں۔

حقیقت میں جو سب سے بڑی کرامت ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کا اتباع اور حق تعالیٰ شانہٗ کے اَحکام پر مرمٹنا ہے، اگر یہ دولت کسی کو نصیب ہے تو کسی کرامت کے دیکھنے کی ضرورت نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر عمل کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کی پیروی کرنا یہ دولت اگر کسی کو نصیب نہیں تو کرامتوں وغیرہ کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہے، بہر حال عقیدہ یہ ہے اہلسنّت والجماعت کا کہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معجزات بھی برحق ہیں اور اولیاء اللہ کی کرامتیں بھی برحق ہیں۔

آخری مسئلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ سارا لشکر سیر ہو گیا ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے برکت فرمادی تو چونکہ یہ معجزہ تھا اور معجزہ ہے دلیل نبوت، معجزے سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنِّي رَسُوْلُ اللهِ۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا کی کرامت ہے حق تعالیٰ شانہٗ کی الوہیت کا کرشمہ ہے کہ اللہ نے کھانے میں برکت عطا فرمائی اور آگے اس کلمے کی فضیلت بیان فرمائی کہ جو شخص صدقِ دل کے ساتھ اس کلمے کے دونوں حصوں کا اقرار کرے ایک اللہ کی وحدانیت کا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور دوسرے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کا، جو شخص صدقِ دل سے اس کا اقرار کرے اور اس میں اس کو تردد نہ ہوا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کو جنّت میں جانے سے روک دیا جائے یعنی ضرور جنّت میں داخل ہوگا۔ حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں بھی صدق دل کے ساتھ اس کلمے پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اللہ اس کلمہ طیبہ کے تقاضوں کو بھی پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہادری

[حدیث:۱۲۸۴] "...الْبَرَاءِ فَقَالَ...، أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ اللّٰهُمَّ نَزِّلْ نَصْرَكَ...."

(صحیح مسلم ج:۹،ص:۱۴۱، حدیث نمبر:۳۳۲۶، باب فِي غَزْوَةِ حُنَيْنٍ)

ترجمہ: ”حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین میں فرمایا تھا کہ میں نبی ہوں جھوٹا نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں، اے اللہ! اپنی مدد نازل فرما۔“

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ جنگ حنین کے موقع پر براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا کہ سنا ہے تم حنین میں بھاگ گئے تھے؟ پہلے یہ بات ذہن میں رکھو کہ لشکر سے بھاگنے والا وہ ہوتا ہے جو اپنی جگہ چھوڑ جائے اگر اس کا امیر اپنی جگہ موجود ہو اور ان کے ساتھی بھی موجود ہوں تو کچھ لوگ اگر پیچھے ہٹ جائیں تو اس کو بھاگنا نہیں کہیں گے، تو حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ کون کہتا ہے کہ ہم بھاگ گئے تھے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو موجود تھے میدان میں اور کمال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر سوار تھے، جب کافروں نے نرغہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد گھیرا ڈال دیا تو اس کے بجائے کہ آپ سواری کو تیز کر کے ایک طرف کو ہو لیتے سواری سے اُتر گئے اور اس موقع پر فرمایا أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ میں نبی ہوں جھوٹ نہیں ہے، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں اور ساتھ دُعا کی یا اللہ! اپنی نصرت نازل فرما۔

صحابہ کرام یکایک بنو ہوازن کی تیراندازی کی وجہ سے ان کے پاؤں اُکھڑ گئے تھے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ان کی آواز بہت اُونچی تھی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر آواز دیتے تھے تین میل تک آواز پہنچتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھیرے میں تھے آپ کے ساتھ ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی تھے اور چند صحابہ تھے، ایک پاؤں ایک طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے پکڑا ہوا تھا اور دوسری طرف سے حضرت ابوسفیان نے پکڑا ہوا تھا، یہ ابوسفیان ابوسفیان ابن حرب نہیں حضرت معاویہ کے والد وہ نہیں بلکہ ابوسفیان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے لڑکے ہیں اور یہی ابوسفیان تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیا کرتے تھے اور آپ کے ہجو میں قصیدے پڑھا کرتے تھے اور ان ہی کے جواب میں حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ هَجَوْتَ مُحَمَّدًا فَأَجَبْتُ عَنْهُ تو نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مذمت کی ہے اور میں نے اس کا جواب دیا ہے وَعِنْدَ اللّٰهِ فِي ذَاكَ الْجَزَاءُ اور اللہ کے یہاں اس کا بدلہ ہے فَإِنَّ أَبِي وَوَالِدَتي وَعِرْضِي لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِنْكُمْ وِقَاءُ میں میری ذات، میری عزت، میری آبرو، میرے ماں باپ یہ سب کے سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا ہوں۔

وہی ابوسفیان آج تھے، فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کی لگام پکڑے ہوئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کون ہے؟ یہ کون ہے؟ تو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ! میں آپ کی ماں کا بیٹا ہوں، بہر حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عباس سے فرمایا عباس! یہ جن لوگوں نے کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھ کر بیعت کی تھی ان کو آواز دو ذرا، چنانچہ وہ ٹیلے پر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے زور سے

یہ آواز دی کہ اصحاب شجرہ کہاں ہیں؟ تو روایت میں آتا ہے کہ صحابہ کرام آنحضرت ﷺ کی طرف اسی طرح ٹوٹ پڑے جس طرح کہ بچہ ماں کی گود کی طرف دوڑتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے نصرت بھی نازل فرمائی، چند منٹ میں فتح ہو گیا۔

بہرکیف اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ میں نبی ہوں جھوٹ نہیں ہے، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں، اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہو گئی کہ باپ کے بجائے دادا کی طرف نسبت کر دینا صحیح ہے، آنحضرت ﷺ نے اپنی نسبت بجائے عبداللہ کے اپنے دادا کی طرف کی اور کہا کہ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں تو ایسے موقع پر نسبت کر دینا صحیح ہے، نیز اقوام عرب میں حضرت عبدالمطلب زیادہ مشہور تھے اور سردار تھے ان کے رعب، دبدبہ، شان وشوکت کے چرچے تھے۔

دوسری بات یہ کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات فخر کے طور پر نہیں فرمائی تھی بلکہ دلیل نبوت کے طور پر فرمائی تھی، ایسے موقع پر نبی کا میدان سے بھاگ جانا یہ ممکن نہیں ہے، ہو نہیں سکتا کہ نبی میدان سے بھاگ جائے یا میدان کو چھوڑ دے، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں نبی ہوں جھوٹ نہیں ہے میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

آنحضرت ﷺ سب سے پہلے شفاعت کرنے والے ہیں

[حدیث: ۱۲۸۵] ''.....قَالَ أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ.....، أَنَا أَوَّلُ شَفِيعٍ فِي الْجَنَّةِ لَمْ يُصَدَّقْ نَبِيٌّ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ مَا صُدِّقْتُ وَإِنَّ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ نَبِيًّا مَا يُصَدِّقُهُ مِنْ أُمَّتِهِ إِلَّا رَجُلٌ وَاحِدٌ۔''

(صحیح مسلم ج:۱، ص:۴۵۳، حدیث نمبر:۲۹۱، باب فِي قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا أَوَّلُ النَّاسِ يَشْفَعُ.)

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں سب سے پہلا شفاعت کرنے والا ہوں گا جنّت میں، نہیں تصدیق کی گئی کسی نبی کی انبیائے کرام علیہم السلام میں سے جس قدر کہ میری تصدیق کی گئی ہے اور بے شک انبیاء میں سے بعض نبی ایسے ہوئے ہیں جن کی تصدیق اس کی اُمّت میں سے صرف ایک آدمی نے کی۔''

تشریح: اس حدیث شریف میں تین مضمون ہیں:

پہلا مضمون یہ ہے کہ میں جنّت میں سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں، جنّت میں شفاعت رفع درجات کے لئے ہوگی یعنی جن اہل ایمان کا درجہ نیچے ہے شفاعت کے ذریعہ سے ان کا درجہ اونچا کر دیا

جائے گا، اس سے پہلے کی شفاعت شفاعتِ کبریٰ ہے جو جنت سے پہلے پہلے ہوگی وہ میدانِ محشر میں ہوگی اور اس میں تمام مؤمن اور کافر شامل ہوں گے۔

دوسرا مضمون اس حدیث شریف میں یہ ہے کہ کسی نبی کی اتنی تصدیق نہیں ہوئی جتنی کہ میری ہوئی ہے، یعنی میری اُمت میں تصدیق کرنے والے زیادہ ہیں بنسبت دوسرے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار کم وبیش نبی ایک طرف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے ایک طرف، ان تمام لوگوں کی حضرات انبیاء کرام کی امتیں مل کر بھی اتنی نہیں ہوئیں جتنی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہوئی، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ایک سو بیس صفیں ہوں گی اہل ایمان کی، وہ صفیں کتنی لمبی ہوں گی اللہ ہی جانتے ہیں، بہرحال ۱۲۰ صفیں ہوں گی اہل ایمان کی، فرمایا چالیس صفیں پہلے نبیوں کی اُمتوں کی ہوں گی اور ۸۰ صفیں اس اُمت کی ہوں گی، گویا دو تہائی جنتی اس اُمت کے ہوں گے اور ایک تہائی تمام انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے۔

تیسرا مضمون اس حدیث کا یہ ہے کہ انبیائے کرام میں سے اللہ کے بعض نبی ایسے ہوئے ہیں جن کی اُمت میں سے صرف ایک آدمی نے ان کی تصدیق کی باقی کسی نے ان کی تصدیق نہیں کی، ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ میرے سامنے اُمتیں اور ان کے نبی پیش کئے گئے میں نے دیکھا کہ ایک نبی جارہا ہے اس کے ساتھ ایک دو آدمی تھے اور ایک نبی جارہا ہے اکیلا ہے اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں ہے، میں نے ایک بہت بڑی جماعت بہت بڑی اُمت دیکھی تو مجھے خیال گزرا کہ غالباً یہ میری اُمت ہوگی، مجھ سے کہا گیا کہ نہیں یہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی اُمت کے ساتھ ہیں اور مجھ سے فرمایا گیا کہ تم اپنا سر اُٹھاؤ، میں نے دیکھا کہ ادھر سے لے کر ادھر تک مشرق سے لے کر مغرب تک جنوب سے لے کر شمال تک تمام کا تمام بھرا ہوا ہے، فرمایا یہ آپ کی اُمت ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے، ہم لوگ اس مغالطے میں رہتے ہیں کہ اگر کوئی کسی نبی کی دعوت وتبلیغ پر مسلمان ہوگیا جتنے زیادہ آدمی مسلمان ہوئے اتنے زیادہ کامیاب اور نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ اگر کوئی مسلمان نہیں ہوا تو وہ نبی ناکام نعوذ باللہ۔ نبی کامیاب ہی ہے خواہ ان کے ہاتھ پر کوئی مسلمان ہوا یا نہیں ہوا، انہوں نے اپنا فریضہ تبلیغ پورے کا پورا ادا کردیا اور اللہ کے ہاں سرخرو ہو کر اور کامیاب ہو کر بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوا، یہ جو فرمایا گیا ہے کہ آپ کی اُمت اتنی ہوگی، موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اُمت اتنی ہوگی اور آج کل نصرانی بھی بہت ہیں وہ حقیقت میں عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اُمتی نہیں ہیں کچھ اور ہی اوٹ پٹانگ ہے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو جو بیان فرمایا تو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور منقبت ظاہر ہوتی ہے لیکن کسی کو یہ خیال کبھی نہیں آنا چاہئے کہ کوئی نبی ناکام ہوا ہے۔ معاذ اللہ۔

(یہاں ایک بات سمجھ لیجئے: افادہ (فائدہ دینا) ہر نبی کا عام وتام ہوتا ہے البتہ استفادہ (فائدہ حاصل کرنا) اس کی صلاحیت ہر کسی میں نہیں ہوتی، للہذا افادہ ہر نبی کا عام تھا اور ہے، وہ اپنا کام کر چکے ہیں، ہاں! جس جس میں استعداد تھی اس کو فائدہ ہوا، جس میں نہیں تھی اس کو نہیں ہوا، اس کی مثال سورج کی سی ہے کہ اس کے نکلنے سے سارے عالَم کو فائدہ ہوتا ہے، لیکن جن میں خود عیب ہوتا ہے مثلاً بصارت کام نہیں کرتی یا چمگادڑ کی مثال لے لیں، ان کو آفتاب سے فائدہ نہیں ہوتا اپنے عیب کی وجہ سے، اس میں آفتاب کا کیا قصور؟)

عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ

[حدیث:۱۲۸۶] "....أَبا هُرَيرَةَ......، أَنَا أَوْلَى النَّاسِ بِابْنِ مَرْيَمَ وَالْأَنْبِيَاءُ أَوْلَادُ عَلَّاتٍ لَيْسَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ نَبِيٌّ۔"

(صحیح بخاری ج:۱۱ص:۲۵۹، حدیث نمبر:۳۱۸۶، باب قَوْلِ اللهِ {وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ..)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تمام لوگوں سے زیادہ تعلق رکھنے والا ہوں ابن مریم کے ساتھ، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام علاتی بھائی ہیں اور میرے درمیان اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا۔''

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ مجھے سب سے زیادہ تعلق ابن مریم کے ساتھ ہے، ابن مریم حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام، انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سب کے سب علاتی بھائی ہیں، علاتی بھائی ان کو کہتے ہیں جن کا باپ ایک ہو مائیں الگ الگ ہوں، تو تمام انبیاء کرام آپس میں علاتی بھائی ہیں کہ ان کا دین ایک اور شریعتیں الگ الگ ہیں لیکن ایک ہی ہے اور فرمایا کہ مجھے ابن مریم کے ساتھ یعنی عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ سب سے زیادہ تعلق اس لئے ہے کہ میرے درمیان اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا، اس لئے میری بشارت انہوں نے دی، قرآن کریم میں ہے ﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ (الصف:۶) اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں، مجھ سے پہلے جو کتاب آئی ہے توریت اس کی تصدیق کرتا ہوا اور ایک عظیم الشان رسول کے آنے کی خوشخبری دیتا ہوں جن کا نام احمد ہوگا، میرے بعد ایک نبی آئیں گے اور وہ ہوں گے احمد۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشارت کے مطابق آئے، خود ارشاد فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں، پہلے پارے کے آخر میں ہے: اے اللہ! میری اولاد میں ایک نبی برپا کیجئے جو ان کے سامنے آپ کی آیتوں کی تلاوت کریں اور ان کو کتاب وحکمت سکھائیں اور ان کو پاک کریں، یہ رسول اللہ

ﷺ کے لئے دعا ہے، تو اس لئے فرمایا میں اپنے باپ حضرت ابراہیم کی دعا ہوں اور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں کیونکہ میرے آنے کی بشارت دی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اور میں اپنی والدہ ماجدہ کا خواب ہوں جبکہ انہوں نے خواب میں دیکھا تھا اور فرشتے نے ان سے کہا تھا کہ تم اس اُمّت کے سردار کو جنم دو گی اور اس کے نور سے بصریٰ کے محلات روشن ہو گئے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنی والدہ ماجدہ کی بشارت ہوں یعنی ان کے خواب کا مصداق ہوں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دو خصوصیتیں ہیں حضور ﷺ کے ساتھ، ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کی خوشخبری دی اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ حضور اقدس ﷺ کے نائب اور خلیفہ بن کر آئیں گے اس اُمّت میں دجال کو قتل کرنے کے لئے۔

حضور ﷺ کی اولیت (پہلا شخص ہونا)

[حدیث:۱۲۸۷] ''....أَبُو هُرَيْرَةَ.....، أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَأَوَّلُ مَنْ يَنْشَقُّ عَنْهُ الْقَبْرُ، وَأَوَّلُ شَافِعٍ وَأَوَّلُ مُشَفَّعٍ۔''

(صحیح مسلم ج:۱۱ص:۳۸۳، حدیث نمبر:۴۲۲۳، باب تَفْضِيلِ نَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى جَمِيعِ الْخَلَائِقِ)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا میں اولاد آدم کا سردار ہوں گا قیامت کے دن اور سب سے پہلا آدمی ہوں جس کو قبر پھٹے گی اور پہلا آدمی ہوں جس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔''

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ میں قیامت والے دن آدم علیہ السلام کی اولاد کا سردار ہوں گا، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر تا قیامت تمام مخلوق رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ قیامت کے دن جب مردوں کو اُٹھایا جائے گا اور قبریں پھٹیں گی تو سب سے پہلے میری قبر پھٹی گی یعنی سب سے پہلے مجھے اُٹھایا جائے گا، ایک حدیث میں فرمایا کہ میں ایک طرف ہوں گا، ایک طرف عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے، درمیان میں ابوبکر وعمر ہوں گے کیونکہ آنحضرت ﷺ کے روضہ اقدس میں چار قبروں کی جگہ ہے، ایک آنحضرت ﷺ کی قبر شریف اور ایک عیسیٰ علیہ السلام وہاں دفن ہوں گے ان کی جگہ باقی ہے اور ان دونوں کے درمیان حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما ہیں، زہے نصیب ان حضرات کے جو دونبیوں کے درمیان ہیں، ایک طرف حضور ﷺ ہیں اور دوسری طرف عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور درمیان میں ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ہیں۔

اور تیسری بات یہ ارشاد فرمائی: ''اول مشفَّع'' سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک

[حدیث: ۱۲۸۸] ”عَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَبْعَةً لَيْسَ بِالطَّوِيلِ وَلَا بِالْقَصِيرِ، حَسَنَ الْجِسْمِ أَسْمَرَ اللَّوْنِ، وَكَانَ شَعْرُهُ لَيْسَ بِجَعْدٍ وَلَا سَبْطٍ إِذَا مَشَى يَتَوَكَّأُ۔“

(سنن ترمذی ج:۶، ص:۳۸۷، حدیث نمبر: ۱۶۷۲، بَاب مَا جَاءَ فِي الْجُمَّةِ وَاتِّخَاذِ الشَّعْرِ، صحیح بخاری ج:۱۱، ص:۳۸۲، حدیث نمبر: ۳۲۸۳، بَاب صِفَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

ترجمہ: ”حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میانے قد کے تھے نہ زیادہ لمبے تھے اور نہ زیادہ پستہ قد، جسم مبارک بہت ہی زیادہ خوبصورت تھا اور آپ کے بال مبارک نہ اُلجھے ہوئے پیچیدہ تھے اور نہ بالکل سیدھے، رنگ گندمی تھا، جب چلتے تھے تو پاؤں مضبوطی سے اُٹھاتے تھے یا آگے کو جھکتے تھے۔“

تشریح: یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم تھے، فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میانہ قد کے تھے زیادہ لمبے بھی نہیں تھے اور زیادہ پستہ قد بھی نہیں تھے، یہ مضمون اس سے پہلی حدیث میں بھی آچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قد مبارک درمیانہ تھا لیکن یہ معجزہ تھا کہ جب ایک جماعت کے ساتھ چل رہے ہوتے تھے تو سر مبارک سب سے اونچا نظر آتا تھا۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک بہت خوبصورت تھا، بدن مبارک کا خوبصورت ہونا کئی اعتبار سے ہے۔

ایک یہ کہ قد کے اعتبار سے ہو بہت متناسب قد تھا زیادہ لمبا ہو تو بھی اچھا نہیں لگتا اور بہت چھوٹا قد ہو تو وہ بھی اچھا نہیں لگتا، درمیانہ قد ہو تو متناسب معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ موٹاپے اور لاغری کے اعتبار سے نہ زیادہ موٹا تھا بدن اور نہ بالکل دبلا پتلا بلکہ بھرا ہوا بدن تھا، جس کو موٹاپا کہنا چاہئے وہ نہیں تھا۔

تیسرے اس اعتبار سے کہ جسم کا ہر حصہ جسم کی بناوٹ کو موزونیت لئے ہوئے تھے اور جیسا کہ وہ عضو ہونا چاہئے ویسا بنا ہوا ہوتا تھا، حسن کس چیز کا نام ہے خوبصورتی کا، خوبصورتی کیا ہے؟ حکماء کہتے ہیں کہ تناسب اعضاء کا نام خوبصورتی ہے، صرف رنگ کے معنی خوبصورتی نہیں ہے سفید رنگ ہو تو خوبصورت ہوگا، خوبصورتی رنگ کے معنی میں نہیں ہے بلکہ جیسا کسی عضو کو ہونا چاہئے ویسا ہونا بہتر سے بہتر شکل میں اس کا نام خوبصورتی ہے، تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حَسَنَ الْجِسْمِ کہہ کر آپ کا بدن مبارک بہت خوبصورت تھا اس کی

طرف اشارہ کردیا ہے کہ بدن کے تمام اعضاء مبارکہ موزونیت لئے ہوئے تھے۔

اس کے بعد بالوں کے متعلق فرمایا اور یہ مضمون پہلے بھی گزر چکا ہے کہ آپ کے بال مبارک نہ زیادہ گھنگھریالے تھے جیسے حبشیوں کے ہوتے ہیں اور نہ بالکل سیدھے تھے بلکہ یہ تھا کہ جڑوں سے سیدھے چلے گئے تھے اور پیچھے جا کر اُنڈل پڑ گیا تھا اور یہ سب سے زیادہ خوبصورت سمجھے جاتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ گندمی تھا، ایک اور حدیث جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس میں فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ گندمی نہیں تھا، یہاں یہ بات سمجھ لیں کہ گندمی رنگ کے دو معنی آتے ہیں: ایک وہ جس کو ہم پکا کہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ جیسا انگریزوں کا ہوتا ہے، اس کے مقابلے میں ہمارا ہندوستانیوں کا رنگ ہوتا ہے، اس لئے وہ ہمیں رنگ دار کہتے ہیں، تو گندم گوں ہونا اس اعتبار سے تھا کہ بالکل سفید رنگ نہیں تھا بلکہ اس میں قدرے رنگت پائی جاتی تھی گندمونی اور یہ حسین ترین رنگ ہوتا ہے، اس کی صحیح تعبیر یوں ہوتی ہے کہ "گندم گوں رنگ تھا" لیکن نہایت سرخ وسفید یا اس سے بہتر، یہ جو رنگ دار کھال ہوتی ہے اس میں اس سے بہتر رنگ نہیں ہوسکتا۔

اور آخری بات حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہ بیان فرمائی کہ إِذَا مَشٰى يَتَوَكَّأُ اس يَتَوَكَّأُ کو علماء نے کئی طرح سے تعبیر کیا ہے، جب چلتے تھے تو قدم اُکھاڑ کر چلتے تھے یعنی قوت کے ساتھ قدم اُٹھاتے تھے، یہ نہیں کہ جس طرح مریل لوگ ہوتے ہیں پاؤں گھسیٹ کر زمین پر چلتے ہیں ایسا نہیں پوری قوت کے ساتھ اور بعض حضرات نے اس کا مطلب بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیز رفتاری کے ساتھ چلتے تھے، آہستہ آہستہ نزاکت کے ساتھ قدم اُٹھا کر چلنا نہیں تھا بلکہ نہایت جوانمردی اور تیز رفتاری کے ساتھ چلتے تھے اور بعض حضرات نے يَتَوَكَّأُ کے معنی یہ کئے ہیں کہ آگے کو جھکے ہوئے چلتے تھے، متکبروں کی طرح سینہ تان کر چلنا نہیں تھا بلکہ عاجزانہ متواضعانہ انداز میں چلتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار مبارک میں یہ تینوں باتیں پائی جاتی تھیں، اس لئے تینوں تفسیریں اپنی جگہ صحیح ہیں، جب چلتے تھے پوری قوت سے پاؤں اُٹھاتے تھے تیزی سے چلتے تھے اور آگے کو جھکے ہوئے چلتے تھے۔

[حدیث: ۱۲۸۹] "......سَمِعْتُ الْبَرَاءَ يَقُولُ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا مَرْبُوعًا، بَعِيدَ مَا بَيْنَ الْمَنْكِبَيْنِ، عَظِيمَ الْجُمَّةِ إِلٰى شَحْمَةِ أُذُنَيْهِ، عَلَيْهِ حُلَّةٌ حَمْرَاءُ، مَا رَأَيْتُ شَيْئًا قَطُّ أَحْسَنَ مِنْهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔"

(صحیح مسلم ج:۱۱ص:۴۹۱، حدیث نمبر: ۴۳۰۸، بَابٌ فِي صِفَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَّهُ كَانَ أَحْسَنَ)

ترجمہ: "حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میانہ قد کے آدمی

تھے، دونوں کندھوں کے درمیان کا فاصلہ دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ تھا، سر کے بال مبارک گھنے تھے اور کانوں کی لوتک جاتے تھے، آپ نے سرخ حلہ پہنا ہوا تھا، میں نے کوئی چیز آپ سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھی۔"

تشریح: یہ حدیث حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی ہے کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَجُلًا مَرْبُوعًا بعض لوگوں نے اس کو رَجْلًا پڑھا ہے ایک میانہ قد کے آدمی تھے مَرْبُوعًا کا معنی میانہ قد اور بعض حضرات نے کہا کہ یہ رَجِلًا ہے جیم کی زیر کے ساتھ جس کے معنی وہی ہیں جو اوپر آ چکے ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال سیدھے تھے لیکن نیچے جا کر گھنگھریالے تھے بالکل سیدھے نہیں تھے، مَرْبُوعًا اوپر کی روایت میں آیا تھا رِبْعَةً مِنَ الْقَوْلِ اور یہاں مَرْبُوعًا ہے ایک ہی معنی ہیں دونوں کے یعنی قد مبارک درمیانہ تھا نہ زیادہ لمبا اور نہ زیادہ چھوٹا۔

تیسری بات یہ فرمائی بَعِیدَ مَا بَیْنَ الْمَنْکِبَیْنِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں کندھوں کا فاصلہ دوسرے لوگوں کی نسبت قدرے زیادہ تھا اور یہ علامت ہے سینے کے چوڑا ہونے کی اور سینے کا چوڑا ہونا علامت ہے مردانگی کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دونوں کندھوں کا فاصلہ یعنی ایک کندھے سے دوسرے کندھے کا فاصلہ عام لوگوں کی نسبت زیادہ تھا۔

عَظِیمَ الْجُمَّةِ جمہ کہتے ہیں سر کے بالوں کو اور عَظِیمَ الْجُمَّةِ کے معنی ہیں سر کے بال بہت زیادہ تھے، بڑے گھنے بال تھے سر کے إِلٰی شَحْمَةِ أُذُنَیْہِ کانوں کی لوتک پہنچتے تھے، اس سلسلے میں آپ سنیں گے کہ تین قسم کی روایتیں ہیں، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کانوں کے درمیان تک ہوتے تھے اور بعض روایتوں سے کانوں کی لوتک اور بعض سے نیچے تک کا معلوم ہوتا ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ یہ مختلف حالات کے اعتبار سے ہے، کبھی ایسا ہوا کہ اصلاح بنوائی تو بال چھوٹے نظر آتے ہیں اور کبھی اصلاح بنوانے میں دیر ہوگئی تو بال لمبے نظر آتے ہیں اور کنگھی کی ہوئی نہیں ہوتی تو بال اُٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور ذرا چھوٹے نظر آتے ہیں، نیچے لٹکتے ہوئے کم نظر آتے ہیں، عام طور سے معمول مبارک بال کانوں کی لوتک رکھنے کا تھا کبھی اس سے زیادہ بھی ہو جاتے تھے۔

عَلَیْہِ حُلَّةٌ حَمْرَاءُ..... فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سرخ حلہ پہنے ہوئے دیکھا، حُلَّةٌ کہتے ہیں دو چادروں کو، ایک نیچے لنگی کے طور پر باندھی جاتی ہے اور ایک اوپر اوڑھ لی جاتی ہے، اس وقت عربوں کے یہاں چادروں کے پہننے کا معمول تھا اور حُلَّةٌ ان نئی چادروں کو کہتے ہیں جن کو ابھی ابھی تھان سے الگ کیا ہو، دُھلی ہوئی چادریں اگر ہوں تو اس کو حُلَّةٌ نہیں کہتے اور ایک ہی وضع کی ہوں تو حُلَّةٌ کہلاتا ہے جس کو ہم جوڑا کہتے ہیں لیکن اگر ایک چادر کا رنگ ایک ہے دوسری کا دوسرا ہے تو اس کو حُلَّةٌ نہیں کہا جائے گا،

جہاں تک سرخ حلے کا تعلق ہے تو آنحضرت ﷺ سے سرخ لباس پہننے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، خالص سرخ پہننا اس سے منع فرمایا مردوں کو، عورتوں کو اجازت ہے، تو یہاں جو فرمایا سرخ حلہ اصل میں یمن سے چادریں بن کر آتی تھیں اس میں ڈورے ہوا کرتے تھے، خطوط کوئی سبز ہے کوئی سرخ ہے کوئی کسی رنگ کا ہے تو جس قسم کے وہ خطوط ہوتے تھے اسی نام سے ان کو پکارا جاتا تھا، ہمارے یہاں بھی ایسا ہے کہ سفید چادر ہو لیکن اس کی ''کنی'' سرخ ہے، ایک کی سبز ہے ایک کی سیاہ ہے تو ہم کہیں گے وہ ذرا سرخ والی دکھانا حالانکہ اس کے اندر صرف کنی اس کی لگی ہوئی ہے سرخ پوری چادر سفید ہے لیکن ہم اس کو کہیں گے وہ سرخ والی دکھادو، اسی طرح ان چادروں میں خطوط ہوا کرتے تھے، تو آنحضرت ﷺ نے کسی موقع پر ایسا حلہ زیب تن فرمایا تھا جس کے اندر سرخ ڈورے تھے سرخ خطوط تھے اور اس کی ممانعت نہیں ہے، خالص سرخ کپڑا اس کی ممانعت ہے لیکن اگر اس کے اندر خطوط ہوں ڈورے بنے ہوئے ہوں تو اس کی اجازت ہے۔

تو حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے سرخ حلہ پہنا ہوا تھا اتنے خوبصورت لگ رہے تھے کہ میں نے آپ سے زیادہ خوب صورت کوئی چیز نہیں دیکھی حالانکہ یہ کہنا چاہئے کہ کسی آدمی کو نہیں دیکھا آپ ﷺ سے زیادہ خوبصورت کوئی آدمی نہیں دیکھا مگر اس کے بجائے یہ فرما رہے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ سے زیادہ خوبصورت آپ ﷺ سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں دیکھی یعنی جن چیزوں کو دیکھا جا سکتا ہے تم ان کی خوبصورتی کی تعریف کر سکتے ہو ان میں آنحضرت ﷺ سب سے زیادہ حسین ہیں۔

حوضِ کوثر پر حضور ﷺ کا پیش رو ہونا

[حدیث:۱۲۹۰] ''عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ۔''

(صحیح بخاری ج:۲۰، ص:۲۴۰، حدیث نمبر:۶۰۸۹، باب فِي الْحَوْضِ وَقَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى {إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ})

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا میں تمہارا پیش رو ہوں گا حوضِ کوثر پر۔''

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ میں حوض کوثر پر تم لوگوں کا پیشوا اور پیش رو ہوں گا، میں پہلے جاتا ہوں انتظار کرتا ہوں تم بعد میں آجانا حوض پر تمہارا انتظار کروں گا حوضِ کوثر پر، اس حوضِ کوثر کو یہاں بیان نہیں کیا گیا یوں فرمایا ہے کہ یہاں سے یعنی مدینے سے لے کر یمن کے علاقے میں ایک شہر ہے وہاں تک وہ لمبا ہے اور اس حوض میں کٹورے ہوں گے آب خورے پانی پینے کے لئے جتنے آسمان کے ستارے ہیں، جو ایک گھونٹ پی لے گا وہ کبھی دوبارہ پیاسا نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حوضِ کوثر نصیب فرمائے اور آنحضرت

ﷺ کی شفاعت ہمارے حق میں قبول فرمائے۔

حضور ﷺ کے مختلف نام

[حدیث: ۱۲۹۱] ''عَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَمِّي لَنَا نَفْسَهُ أَسْمَاءً فَقَالَ أَنَا مُحَمَّدٌ وَأَحْمَدُ وَالْمُقَفِّي وَالْحَاشِرُ وَنَبِيُّ التَّوْبَةِ وَنَبِيُّ الرَّحْمَةِ۔''

(صحیح مسلم ج:۱۲،ص:۳۶، حدیث نمبر:۴۳۴۴، بَابٌ فِي أَسْمَائِهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

ترجمہ: ''حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا میں محمد ہوں احمد ہوں حاشر ہوں نبی التوبہ ہوں نبی رحمت ہوں۔''

اور ابومسعود کے ''الاطراف'' میں ہے کہ میں نبی رحمت ہوں لڑائی کا نبی ہوں نبی توبہ ہوں۔

تشریح: اس جگہ آنحضرت ﷺ نے اپنے چند اسماء گرامی ذکر فرمائے ہیں، فرمایا میں محمد ہوں، محمد کے معنی بسیار بسیار ستودہ شدہ، جس کی بہت بہت تعریف کی گئی ہو، میں محمد ہوں دنیا میں تو کسی نے مانا کسی نے نہیں مانا کسی نے پہچانا کسی نے نہیں پہچانا لیکن قیامت کے دن اولین اور آخرین کا مجمع عش عش کرے گا رسول اللہ ﷺ پر کیا مسلم کیا کافر اس اُمت کے مسلمان بھی اور دوسری اُمتوں کے مسلمان بھی حتی کہ کافر بھی رسول اللہ کی تعریف کریں گے یہ ترجمہ محمد کا ہے۔

''وانا احمد''، دوسرا میرا نام ہے کہ میں احمد ہوں، احمد کا معنی سب سے بڑھ کر تعریف کرنے والا، اللہ کی جتنی حمد آنحضرت ﷺ نے کی ہے اتنی کسی نبی نے بھی نہیں کی دوسرے کسی نے کیا کی ہوگی؟

اور تیسرا اسم گرامی ہے المقفی، اس کے معنی ہیں سب سے پیچھے آنے والے کیونکہ آنحضرت ﷺ سے پہلے جتنے نبی اللہ نے لکھے تھے وہ بھیج دیئے تھے صرف ایک رہ گئے تھے وہ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ اقدس تھی ان کے پیچھے وہ آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ ﷺ سے پہلے آئے لیکن زندہ آسمان پر اٹھالئے گئے، قربِ قیامت میں آنحضرت ﷺ کے تابع کی حیثیت سے وہ دجال کو قتل کرنے کے لئے تشریف لائیں گے، اس لئے سب سے آخری نبی حضور ﷺ ہیں عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہیں، عیسیٰ علیہ السلام پہلے آچکے ہیں۔

ایک مرزائی نے مجھ سے کئی سوال کئے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو اگر آنا ہے تو آنحضرت ﷺ سے پہلے نبی نہ ہوئے سب سے آخری نبی نہ ہوئے پھر تو عیسیٰ علیہ السلام ہوئے، میں نے کہا نہیں عیسیٰ علیہ السلام پہلے آچکے ہیں اور ان کو زندہ بچا لیا گیا ہے حضور اقدس کی اتباع کے لئے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر حضور ﷺ کی خدمت کے لئے ان کو باقی رکھا گیا ہے تو جبکہ حضور ﷺ بہت

مشکل حالات میں تھے مکہ مکرمہ میں اس وقت آنا چاہئے تھا ان کو، یہ سارا مضمون میری کتاب ''تحفۂ قادیانیت'' کی تیسری جلد میں ہے، میں نے کہا کہ وہ اپنے اختیار سے نہ آسکتے ہیں نہ جاسکتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو بندۂ حکم ہیں جب حکم ہوگا آئیں گے جب تک حکم نہیں ہوتا اس وقت تک تشریف نہیں لاتے ایک بات اور دوسری بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ مخدوم ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام خادم ہیں، ایسا سمجھ لو کہ فوج کے سپہ سالار آنحضرت ﷺ ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے ایک سپاہی ہیں، سپاہ سالار اور فوج کے کمانڈر کو معلوم ہوگا کہ کس وقت محاذ پر بھیجنا ہے ان کی اپنی مرضی تو نہیں ہوگی۔

چوتھا اسم مبارک ہے الحاشر، اس کی تفسیر دوسری حدیث میں خود فرمائی ہے رسول اللہ ﷺ نے يُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰى قَدَمَيَّ لوگوں کا حشر میرے قدموں پر ہوگا، یعنی سب سے آخر میں تشریف لائے تو آنحضرت ﷺ کے بعد پھر حشر ہے۔

پانچواں اسم گرامی ہے نبی رحمت، رحمت کا نبی اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کا اسم گرامی ہے نبی الملحمہ جنگ کا نبی، اگرچہ جنگ کا حکم تو پہلے انبیائے کرام علیہم السلام کو بھی دیا گیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے جنگ کا حکم نہیں تھا، آنحضرت ﷺ نبی الملحمہ ہیں جنگ کے نبی ہیں لیکن آنحضرت ﷺ کی یہ خصوصیت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پورے دور میں کوئی آٹھ نو سال کا عرصہ ہے یعنی جہاد جب سے فرض ہوا چند سو آدمی قتل ہوئے دونوں فریقوں کے مسلمانوں کے بھی کافروں کے بھی اور اگر کوئی چاہے تو اس کو رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں شمار کرنا چاہئے اتنی جنگیں ہوئی لیکن آدمی اتنے مرے اور آنحضرت ﷺ نے اپنے ہاتھ سے سوائے ایک کے کسی کو قتل نہیں کیا، پہلے اس کا قصہ آچکا ہے ایک چھوٹی سی خراش لگادی تھی امیہ بن خلف کو اس کے علاوہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی کافر کو مارا نہیں اور اس کی حکمت خود بیان فرمائی، فرمایا قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب دو آدمیوں کو ہوگا ایک وہ جس نے نبی کو قتل کیا ہو دوسرے وہ جو نبی کے ہاتھ سے قتل ہوا ہو، آنحضرت ﷺ کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ کافروں کا بھی لحاظ رکھتے تھے تاکہ ان کو اتنی سخت تکلیف نہ ہو۔

بدگمانی دور کرنے کے لئے حضور ﷺ کا فوری عمل

[حدیث: ۱۲۹۲] ''........أَنَّ صَفِيَّةَ........، عَلٰى رِسْلِكُمَا إِنَّمَا هِيَ صَفِيَّةُ بِنْتُ حُيَيٍّ........''

(صحیح بخاری ج: ۷، ص: ۲۷۱، حدیث نمبر: ۱۸۹۴، بَابُ هَلْ يَخْرُجُ الْمُعْتَكِفُ لِحَوَائِجِهِ إِلٰى بَابِ الْمَسْجِدِ)

ترجمہ: '' حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بنت حیی سے روایت ہے کہ دو آدمیوں کو آنحضرت ﷺ نے فرمایا ذرا ٹھہرو یہ میری بیوی صفیہ بنت حیی ہے۔''

تشریح: اس حدیث میں ایک قصہ ہے کہ اُمّ المؤمنین حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا جو کہ خیبر کے سردار کی بیٹی ہیں ان سے مروی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف میں تھے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے مسجد میں آئیں، کچھ وقت بیٹھیں اس کے بعد واپس جانے لگیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے کہ ٹھہرو میں تمہیں دروازے تک چھوڑ کر آتا ہوں، چنانچہ مسجد کے دروازے تک چھوڑنے کے لئے تشریف لائے، ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مسجد کے دروازے تک چھوڑنے کے لئے تشریف لائے اور ادھر دو آدمی گزر رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاتون کے ساتھ دیکھ کر انہوں نے جلدی جلدی تیزی سے گزرنا چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذرا ٹھہرو تیزی سے بھاگنے کی ضرورت نہیں ذرا ٹھہرو، یہ میری بیوی صفیہ بنت حیی ہے، مجھ سے میرے معتکف میں ملنے کے لئے آئی تھی، انہوں نے کہا: حضرت! نعوذ باللہ استغفر اللہ! آپ کے بارے میں کوئی بدگمانی ہوسکتی ہے؟ ارشاد فرمایا پتہ نہیں شیطان آدمی کے دل میں کیا وسوسہ ڈال دے فَإِنَّ الشَّيطَانَ يَجرِيْ مِنَ الْإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ جہاں جہاں خون گردش کرتا ہے وہاں وہاں شیطان گردش کرتا ہے آدمی کے اندر، آج تو تمہارے دل میں وسوسہ نہیں لیکن کل کلاں تمہارے دل میں وسوسہ پیدا ہوجائے شیطان کہے کہ کون تھی وہ رات کے اندھیرے میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی وہ کون خاتون تھی نعوذ باللہ۔ شیطان وسوسہ ڈال دے گا تمہارے دل میں اور تمہارا ایمان برباد کر دے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اگر اس قسم کا وسوسہ پیدا ہوجائے تو شیطان نے تو بہت چالاکی کے ساتھ کسی مسلمان کو ورغلایا لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ دل کی پھانس بن جائے اور پھر ایمان برباد ہوجائے، کہتے ہیں جی ہمیں تو کہتے ہیں ایسا کیا کرو اور خود نامحرم عورتوں کے ساتھ۔ نعوذ باللہ استغفر اللہ معاذ اللہ۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بجائے کہ وہ جارہے تھے تیزی سے گزرنا چاہتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھہر جاؤ! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ میری بیوی صفیہ بنت حیی ہے۔

پیلو کے پھل کی فضیلت

[حدیث: ۱۲۹۳] ”.....أَخْبَرَنِي جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ......، عَلَيْكُمْ بِالْأَسْوَدِ مِنْهُ فَإِنَّهُ أَطْيَبُ فَقَالَ أَكُنْتَ تَرْعَى الْغَنَمَ قَالَ نَعَمْ وَهَلْ مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا رَعَاهَا۔“

(صحیح بخاری ج:۱۷، ص:۹۳، حدیث نمبر: ۵۰۳۳، باب الكَبَاثِ وَهُوَ ثَمَرُ الْأَرَاكِ)

ترجمہ: ”حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اپنے اوپر لازم جانو پیلو کا پھل جو کالے رنگ کا ہو کیونکہ وہ پاکیزہ ہوتا ہے اور عمدہ ہوتا ہے، جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: کیا آپ بکریاں چراتے رہے ہیں؟ ارشاد فرمایا:

ہاں! اور کوئی نبی ایسا نہیں جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔"

تشریح: اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: پیلو کا پھل جو سیاہ رنگ کا ہو وہ چنا کرو کیونکہ وہ عمدہ ہوتا ہے اور میٹھا ہوتا ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: یارسول اللہ! ایسا لگتا ہے کہ آپ ﷺ بکریاں چراتے رہے ہیں کیونکہ اس کی شناخت بکریاں چرانے والوں کو ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا جی ہاں بلکہ اللہ کا کوئی ایسا نبی نہیں کہ جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں اور انبیائے کرام سے بکریاں چرانے کا کام لیا جاتا ہے تاکہ ان کو اُمت کی گرم وسرد کا برداشت کرنا آجائے، کوئی سخت کہے گا کوئی سست کہے گا تو بکریاں چراتے چراتے آدمی کو مشق ہو جائے گی ان چیزوں کو برداشت کرنے کی۔

ہر نبی کے لئے ایک مقبول دُعا مقرر ہے

[حدیث:۱۲۹۴] "......أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ......، لِكُلِّ نَبِيٍّ دَعْوَةٌ فَأُرِيدُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ أَنْ أَخْتَبِيَ دَعْوَتِي شَفَاعَةً لِأُمَّتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔"

(صحیح بخاری ج:۲۲،ص:۴۸۹،حدیث نمبر:۶۹۲۰،باب فِي الْمَشِيئَةِ وَالْإِرَادَةِ{وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ.)

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر نبی کو ایک مقبول دُعا دی گئی ہے جو وہ دُعا کرے گا، پس میں چاہتا ہوں کہ اگر اللہ کو منظور ہو تو میں اپنی دُعا کو چھپا کر رکھوں قیامت کے دن اپنی اُمت کی سفارش کے لئے۔"

تشریح: اس حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہر نبی کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک دعا دی گئی ہے، یوں تو نبیوں کی دعائیں ویسے قبول ہی ہوتی ہیں لیکن اس کے لئے ہر نبی کے لئے وعدہ ہو گیا کہ تمہاری ایک دعا قبول ہوگی لازماً جو بھی مانگو، آنحضرت ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ دعا مجھے بھی دی گئی، لیکن میں نے اس دعا کو استعمال نہیں کیا بلکہ چھپا کر رکھا ہے، قیامت کے دن جب مجھے اُمت کی ضرورت ہوگی اس وقت استعمال کروں گا، یہاں تو اللہ تعالیٰ کام چلا ہی رہے ہیں اور آنحضرت ﷺ کی کتنی بے شمار دعائیں اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائیں کیا ٹھکانہ ہے لیکن اُمت کی شفاعت کے لئے آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ میں دعا کو استعمال کروں گا اللہ تعالیٰ کے فضل سے اور اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائیں گے۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار دیا گیا کہ تم چاہو تو آدھی اُمت بخشوالو بخش دیں گے، میں نے کہا جی نہیں فرمایا پھر تم کیا چاہتے ہو؟ فرمایا کہ میں اُمت کے لئے شفاعت کروں گا، مانگنا میرا کام اور قبول کرنا آپ کا کام، شفاعت کرنا اُمت کے لئے میرا کام اور بخشنا آپ کا کام

ہے،قبول کرنا یہ آپ پر منحصر ہے ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ (الضُّحیٰ:۵) اورعنقریب آپ کوعطا کرے گا آپ کا ربّ کہ آپ راضی ہوجائیں گے،قرآن مجید میں فرمایا، لام تاکید کے لئے ہے اورالبتہ تحقیق آپ کا ربّ آپ کوعطا کرے گا اتنا عطا کرے گا اتنا عطا کرے گا کہ آپ راضی ہوجائیں گے، گویا رسول اللہ ﷺ کو راضی کرنے کی ضمانت اللہ تعالیٰ نے دے دی اور رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر میری اُمّت کا ایک آدمی بھی دوزخ میں رہے گا اس وقت تک میں راضی نہیں ہوں گا، یہ آنحضرت ﷺ کی اُمّت پر شفقت اور رحمت ہے جس کے مظاہر بہت سارے ہیں۔

ان میں سے ایک یہ ہے، وہ تو نبیوں کی بات ہے فرمایا کہ نبیوں کی دُعائیں قبول ہوتی ہیں ایک دُعا تو لازماً قبول ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کو بھی یہ چیز دی جاتی ہے کہ ان کی دُعائیں قبول کی جاتی ہیں مگر مانگنے کا بھی ڈھنگ چاہئے، آدمی بے ڈھنگے طریقے سے مانگے تو سب کچھ ضائع کر بیٹھتا ہے۔

آپ ﷺ کے دیگر نام

[حدیث:۱۲۹۵] ”عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ عَنْ أَبِيهِ......، لِي خَمْسَةُ أَسْمَاءٍ أَنَا مُحَمَّدٌ وَ أَحْمَدُ وَ أَنَا الْمَاحِي الَّذِي يَمْحُو اللهُ بِي الْكُفْرَ وَ أَنَا الْحَاشِرُ الَّذِي يُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰى قَدَمِي وَ أَنَا الْعَاقِبُ۔“

(صحیح بخاری ج:۱۱ص:۶۲ ۳،حدیث نمبر:۳۲۶۸،بَاب مَا جَاءَ فِي أَسْمَاءِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ..)

ترجمہ: ”حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشادفرمایا میرے پانچ نام ہیں، میں محمد ہوں احمد ہوں اور میں ماحی ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے ذریعے سے کفرکو مٹاتے ہیں، میں حاشر ہوں کہ جس کے قدموں پر لوگوں کو جمع کیا جائے گا اور میں عاقب ہوں یعنی سب سے آخری پیغمبر۔“

تشریح: اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ارشادفرمایا کہ میرے پانچ نام ہیں أَنَا مُحَمَّدٌ وَ أَحْمَدُ میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں وَ أَنَا الْمَاحِي الَّذِي يَمْحُو اللهُ بِي الْكُفْرَ میں مٹانے والا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے ذریعے سے کفر کو اور شرک کو مٹاتے ہیں وَ أَنَا الْحَاشِرُ اور میں حاشر ہوں کہ لوگوں کو میرے قدموں پر اُٹھایا جائے گا وَ أَنَا الْعَاقِبُ اور میں عاقب ہوں، عاقب کہتے ہیں اس کو جو سب سے آخر میں آئے اور اس کے بعد کوئی نبی نہ ہو۔

علمائے کرام نے آنحضرت ﷺ کے بہت سے اسماء گرامی ذکر کئے ہیں اور بعض حضرات نے ۱۰۰۰ ایک ہزار اسمائے گرامی ذکر کئے ہیں، مسجد نبوی میں آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی لکھے ہوئے ہیں،

لائنوں میں لکھے ہوئے ہیں، ان میں یہ دونام بہت مشہور ہیں، محمد اس کے معنی ہیں ''بسیار بسیار ستودہ شدہ'' جن کی بہت بہت تعریف کی جائے اور آنحضرت ﷺ کے اس اسم شریف کا ظہور دنیا میں بھی ہو رہا ہے اور قیامت میں بھی ہوگا۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی نور اللہ مرقدہٗ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ ایک عیسائی نے کتاب لکھی ہے پتہ نہیں اس کا نام کیا ہوگا؟ حضرت فرماتے کہ دنیا کی سب سے بڑی سو شخصیتیں اس کتاب کا نام ہے، وہ خود عیسائی تھا وہ عیسیٰ علیہ السلام کو مانتا ہے لیکن عیسیٰ علیہ السلام کا نمبر دس دیا ہے اور محمد ﷺ کو پہلے نمبر پر رکھا ہے، جو متعصب نہیں اور جنہوں نے محمد ﷺ کے صحیح حالات پڑھے ہیں وہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے بڑی شخصیت دنیا میں پیدا نہیں ہوئی، ہم لوگ تو خیر عقیدت اور محبت کی وجہ سے کہتے ہیں اور کہنا چاہئے، جو لوگ رسول اللہ ﷺ کو نہیں مانتے وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضور ﷺ سب سی بڑی شخصیت ہیں جیسا کہ میں پہلے ایک دفعہ عرض کر چکا ہوں کہ آنحضرت ﷺ نے تیرہ سال تو مکہ میں گزارے اس وقت تک تو ہاتھ اُٹھانے کا بھی حکم نہیں تھا، لیکن مدینے میں آئے صرف آٹھ سال آنحضرت ﷺ نے جہاد کیا اور ان آٹھ سالوں میں پورا جزیرہ عرب آپ ﷺ کے قدموں میں آ گیا۔

یہ تو دنیا میں تعریف ہے اور آخرت میں تعریف یہ کہ جب شفاعت کے لئے سب دنیا تمام انبیائے کرام کا دروازہ کھٹکھٹائے گی اور ان کی خدمت میں شفاعت کے لئے کہا جائے گا، حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام علی الترتیب ان کے پاس جائیں گے لوگ سب جواب دے دیں گے اور کہیں گے کہ لَسْتُ لَهَا میں شاید یہ کام نہ کر سکوں، ایک روایت میں ہے کہ إِنَّ رَبِّي قَدْ غَضِبَ الْيَوْمَ غَضَبًا لَمْ يَغْضَبْ قَبْلَهُ مِثْلَهُ وَلَنْ يَغْضَبَ بَعْدَهُ مِثْلَهُ (بخاری ۱۴/ ۳۲۲، ۴۳۴۳) میرا رب آج اتنا غضبناک ہے کہ نہ کبھی پہلے ہوا تھا نہ بعد میں ہوگا، توبہ توبہ نفسی نفسی، سارے پیغمبر نفسی نفسی کریں گے اور آخر میں آنحضرت ﷺ کے پاس آئیں گے تو آپ فرمائیں گے أَنَا لَهَا اس کے لئے میں حاضر ہوں، آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ کریں گے، خود فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ کتنی دیر سجدے میں پڑا رہوں گا اور مجھے معلوم نہیں ہے کہ میں کیا کیا کروں گا سجدے میں، بالآخر کہا جائے گا یَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ محمد اپنا سر اُٹھاؤ سَلْ تُعْطَهْ مانگو تمہیں دیا جائے گا وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ اور شفاعت کرو تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی، اس وقت آنحضرت ﷺ شفاعت کریں گے اور یہ شفاعت مقام محمود میں کھڑے ہو کر کریں گے اور اس وقت ساری دنیا اولین اور آخرین سب کیا مومن کیا کافر رسول اللہ ﷺ کی تعریف کریں گے۔

نبوت میں سے مبشرات کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہا

[حدیث:۱۲۹۶] ''......أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ......، لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ قَالُوا وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ: الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ۔''

(صحیح بخاری ج:۲،ص:۱۰۳۴،حدیث نمبر:۶۴۷۵،باب الْمُبَشِّرَاتِ)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا باقی نہیں رہی نبوت میں سے مگر بشارت دینے والی چیزیں کسی نے کہا کہ بشارت دینے والی چیزیں کیا ہیں؟ فرمایا اچھا خواب۔''

تشریح: اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نبوت میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی صرف مبشرات باقی رہ گئے ہیں، صحابہ نے پوچھا کہ مبشرات کیا ہیں؟ مبشرات کے معنی خوشخبری دینے والی چیز، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا خواب، نبوت میں غیب کی خبر دی جاتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء کرام غیب کی خبریں دیتے تھے، یہ جو ہم نماز روزہ رکھتے ہیں دوسرے اعمال صالحہ کرتے ہیں یہ سب غیب کی خبریں ہیں، ورنہ ہمیں کیا معلوم ہوتا کہ نماز کیسے پڑھنی چاہئے روزہ اس طرح رکھنا چاہئے حج اس طرح کرنا چاہئے غرضیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے لے کر اُمّت کو عبادات کا معاملات کا معاشرت کا پورا ایک نظام عطا فرمایا ہے۔

ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ تَرَكْتُكُمْ عَلَى سَحْرَةِ الْبَيْضَاءِ میں تم کو ایک نرم اور روشن شریعت پر چھوڑ کر جا رہا ہوں لَيْلُهَا وَنَهَارُهَا سَوَاءٌ جس کا دن اور رات برابر ہیں، رات آتی ہی نہیں کبھی یہاں دن ہی دن ہوتا ہے، غلام احمد قادیانی بدبخت نے نجومیوں کی طرح غیب کی خبریں دینے کا نام نبوت سمجھ لیا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ یہی پتہ نہیں کہ نبوت کہتے کس کو ہیں۔

تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ مقام نبوت کی کسی اُمتی کو ہوا بھی نہیں لگی، اگر تھوڑا بہت سمجھا ہے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سمجھا ہے کیونکہ جہاں صدیقیت کا سر لگتا ہے وہاں نبوت کے پاؤں لگتے ہیں، اس لئے کوئی تھوڑا بہت تعارف ہوسکتا ہے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہوسکتا ہے باقی کسی کو پتہ ہی نہیں کہ نبوت کیا چیز ہے، تو فرمایا کہ نبوت میں سے صرف مبشرات باقی رہ گئے ہیں اور پوچھنے پر فرمایا کہ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ اچھا خواب جس کو مؤمن دیکھتا ہے یا مؤمن کے حق میں کوئی دیکھا جاتا ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ رویا صالحہ یعنی اچھا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت ملنے سے چھ مہینے تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سچا خواب دیکھا کرتے تھے اور ۲۳ سال نبوت کے پھر تو

اس طرح چھیالیسواں حصہ ہوگیا نبوت کا سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہوگیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام

[حدیث:۱۲۹۷] ”عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ........، إِنَّ اللهَ بَعَثَنِي إِلَيْكُمْ فَقُلْتُمْ كَذَبْتَ وَقَالَ أَبُو بَكْرٍ صَدَقَ وَوَاسَانِي بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ فَهَلْ أَنْتُمْ تَارِكُوا لِي صَاحِبِي (مَرَّتَيْنِ) فَمَا أُوذِيَ بَعْدَهَا۔“

(صحیح بخاری ج:۱۱، ص:۴۹۶، حدیث نمبر:۳۳۸۸، باب قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا..)

ترجمہ: ”حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف پیغمبر بنا کر بھیجا سو پہلے تم نے کہا کہ تو جھوٹا ہے اور ابوبکر نے کہا: سچا ہے اور انہوں نے میرے ساتھ اپنی جان اور مال کے ساتھ حسن سلوک کیا، سو کیا تم میرے ساتھی کو میری خاطر چھوڑ دو گے؟ (یہ آخری جملہ دو مرتبہ ذکر فرمایا) چنانچہ اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کوئی ایذا نہیں دی گئی۔“

تشریح: اس حدیث میں حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے ایک قصہ ذکر کیا ہے، واقعہ یہ ہوا کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ان دونوں کے درمیان کچھ گفتگو ہوئی، کچھ رنجش ہوگئی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فوراً محسوس کرلیا کہ مجھ سے زیادتی ہوئی ہے، فرمانے لگے: مجھ سے زیادتی ہوئی ہے معاف کردو! انہوں نے فرمایا: نہیں معاف کرتا، وہ سیدھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے اور فرمایا: ہمارے درمیان کچھ رنجش ہوگئی تھی، زیادتی میری ہے، میں نے عمر سے کہا کہ معاف کردو، انہوں نے کہا کہ: نہیں کرتا، یا رسول اللہ! سفارش فرمادیں کہ وہ معاف کردیں۔

ادھر تو ان کا یہ قصہ ہوا، ادھر وہ تو ناز کی وجہ سے کہہ دیا ہوگا کہ نہیں معاف کرتا، ذرا سی دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر گئے کہ ان کو راضی کریں، معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسجد گئے دیکھا کہ ابوبکر وہاں موجود ہیں اور سفارش کروانا چاہ رہے تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک غصے سے سرخ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جو دیکھا تو چہرہ غصے سے سرخ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گھٹنے ٹیک دیئے اور کہا کہ: یارسول اللہ! یہ تو دہری زیادتی ہو جائے گی مجھ سے، زیادتی اور قصور بھی میرا تھا اور پھر حضور کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ کا عمر سے رنج کرنا یہ بھی میرا قصور ہوگا، اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے پاس رسول بنا کر بھیجا لیکن شروع میں تم سب نے کہا کہ جھوٹ ہے لیکن ابو بکر نے کہا: سچ کہتے ہو جو بیسویں پارے کی آیت ہے: ﴿وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ

الْمُتَّقُوْنَ﴾ (الزمر:۳۳) اور جو لایا سچ کو اور جس نے تصدیق کی، وہ لوگ ہیں متقی۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ ﴿وَالَّذِیْ جَاءَ بِالصِّدْقِ﴾ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں اور ﴿وَصَدَّقَ بِهٖ﴾ سے مراد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، ایک تو یہ کہ تم سے ہر ایک نے اپنے اپنے وقت میں شروع میں مجھے "کذبت" کہا لیکن ایک ابوبکر ہیں جنھوں نے مجھے کبھی یہ نہ کہا بلکہ "صدق" کہا، آپ سچ فرماتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وَوَاسَانِي بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ میں انہوں نے اپنی جان اور مال کے ساتھ میری غم خواری کی ہے، میری مدد کی ہے، اپنی جان و مال مجھ پر قربان کیا ہے فَهَلْ أَنْتُمْ تَارِكُوالِي صَاحِبِي کیا تم سے ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم میرے لئے میرے ساتھی کو چھوڑ دو؟

یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وہ منقبت ہے جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں، یہ ان کی فضیلت ہے، آخری دن کو خطبہ دیا سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی منبر پر تشریف لائے، آواز بہت نحیف تھی، ارشاد فرمایا: ایک بندے کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا تھا کہ وہ دنیا میں رہنا پسند کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنا پسند کرتا ہے، اس بندے نے اللہ سے ملنے کو پسند کرلیا۔ منبر کے بالکل نیچے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے، یہ سن کو رو پڑے اور فرمایا: "فَدَيْنَا بِآبَائِنَا وَأُمَّهَاتِنَا وَأَنْفُسِنَا يَا رَسُوْلَ اللهِ!" یا رسول اللہ! ہماری جانیں اور ہمارے ماں باپ آپ پر قربان۔

صحابہ فرماتے ہیں: ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ رسول اللہ ﷺ تو ایک بندے کی بات بتاتے ہیں اس آدمی کو کیا ہوگیا؟ بعد میں معلوم ہوا: "كَانَ أَبَا بَكْرٍ أَعْلَمُنَا" ابوبکر ہم سب سے زیادہ جاننے والے تھے، عالم تھے، یہ بندے خود رسول اللہ ﷺ تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ گریہ سن کر آنحضرت ﷺ پر بھی رقت طاری ہوئی اور اس موقع پر فرمایا کہ: إِنَّ مِنْ أَمَنِّ النَّاسِ عَلَيَّ فِي صُحْبَتِهٖ وَمَالِهٖ أَبَا بَكْرٍ (بخاری ۱۳/ ۲۴۳، ۳۹۰۴) تمام انسانوں میں سب سے زیادہ احسان مجھ پر ابوبکر کا ہے، اور فرمایا کہ: جن جن صاحبوں نے ہم پر کوئی احسان کیا سب کا بدلہ ہم نے چکا دیا سوائے ابوبکر کے، ابوبکر کا بدلہ ہم نہیں چکا سکے، ان کا بدلہ اللہ تعالیٰ ہی چکائیں گے اور پھر فرمایا کہ: مسجد کی طرف جتنی کھڑکیاں کھوکھے کھلتے ہیں وہ سب بند کر دیئے جائیں سوائے ابوبکر کے کھوکھے کے، ان کو خلافت کے کام کے لئے مسجد میں آنا تھا، سب کھوکھے بند کر دو، ایک ابوبکر کا کھوکھا کھلا رہنا چاہئے۔

بہر حال فرمایا کہ سب سے زیادہ احسان اور سب سے زیادہ قربانی جان کی اور مال کی آنحضرت ﷺ کی خاطر ابوبکر نے کی اور یہی ان کے سب سے زیادہ اقرب عند اللہ ہونے کی دلیل ہے۔ مجھے آپ ﷺ کا یہ ارشاد: فَهَلْ أَنْتُمْ تَارِكُوالِي صَاحِبِي کیا تم میرے ساتھی کو چھوڑ نہیں سکتے؟ مجھے اس ارشاد کو پڑھ کر بڑا وجد آیا کرتا ہے، اس اُمّت میں کوئی ایسا نہیں ہے جو رسول اللہ ﷺ کی خاطر ان کے

صحابہ کو چھوڑ دے؟ میرا لحاظ کرلو، تمہارے خیال میں ان سے کوتاہیاں ہوئی ہیں اور نعوذ باللہ! تمہارے خیال میں ان سے گناہ صادر ہوئے ہیں اور تمہاری غلط ذہنی کی وجہ سے وہ تمہارے نزدیک لائق تنقید ہیں، فرض کرلو تو لحاظ بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے، کسی کی خاطر کسی کا لحاظ کرنا یہ بھی تو دنیا کی ایک رسم ہے۔ فَهَلْ أَنْتُمْ تَارِكُوا لِي صَاحِبِي تو کیا تم میری خاطر میرے ساتھی کو چھوڑ نہیں سکتے؟ یہاں مفرد کی جگہ جمع کا صیغہ بول دیا جائے: فَهَلْ أَنْتُمْ تَارِكُونَ لِي أَصْحَابِي تو کیا تم میری خاطر میرے ساتھیوں کو چھوڑ نہیں سکتے؟

ابوبکر امام ہیں

[حدیث:۱۲۹۸] "...... كُنَّا عِنْدَ عَائِشَةَ....، إِنَّكُنَّ صَوَاحِبُ يُوسُفَ مُرُوا أَبَابَكْرٍ فَلْيُصَلِّ بِالنَّاسِ (قَالَهُ فِي مَرَضِهِ الَّذِي تُوُفِّيَ فِيهِ)۔"

(صحیح بخاری ج:۳،ص:۵۸،حدیث نمبر:۶۲۴،باب حَدِّ الْمَرِيضِ أَنْ يَشْهَدَ الْجَمَاعَةَ)

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک تم یوسف کے ساتھ والی عورتیں ہو، ابوبکر سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض وفات میں فرمائی تھی۔''

تشریح: اس حدیث شریف میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز میں اپنی جگہ قائم مقام بنانے کا قصہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری شدت اختیار کرگئی تھی اور کچھ غشی کی سی کیفیت ہوگئی تھی، ارشاد فرمایا: کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟ عرض کیا گیا: نہیں! آپ کا انتظار کررہے ہیں، فرمایا: پانی رکھو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل فرمایا، اس کے بعد نماز کو جانے کی تیاری کرنے لگے تو پھر غشی ہوگئی، پھر یہی دریافت کیا، وہی جواب ملا، پھر غسل فرمایا لیکن تشریف نہیں لے جاسکے، پھر فرمایا: ابوبکر سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائے!

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میرے دل میں خیال آیا کہ لوگ یکا یک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ میرے باپ کو دیکھیں گے تو ان کے دل میں برا خیال آئے گا کہ یہ منحوس آدمی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ اب ہمیں اس کے پیچھے نماز پڑھنا پڑھ رہی ہے، اس لئے میں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ کو معلوم ہے کہ ابوبکر بہت نرم دل آدمی ہے، حضور تشریف نہیں لے جائیں گے تو وہ لوگوں کو قراءت نہیں سنا سکیں گے، ان کو نماز میں رونا آئے گا، لوگوں کو قراءت کی آواز نہیں آئے گی، نماز میں گڑبڑ ہوجائے گی، بہتر ہوگا کہ آپ عمر سے کہہ دیتے وہ نماز پڑھا دیتے، وہ مضبوط دل کے آدمی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں! میں نے حفصہ سے کہا: تم کہو! حضرت حفصہ کو خیال ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ میرا باپ کھڑا ہوگا، عزت کی چیز ہے، ان کے دل میں یہ خیال تھا، انہوں نے بھی یہی بات کی کہ ابوبکر نرم دل کے آدمی ہیں، ان پر گریہ

طاری ہوجائے گی، آپ عمر سے کہہ دیتے کہ نماز پڑھا دیتے، اس موقع پر فرمایا: "إِنَّكُنَّ صَوَاحِبُ يُوسُفَ" بے شک تم یوسف کی عورتوں کی طرح ہو زنانِ مصر کی طرح۔

جب زلیخا نے زنانِ مصر کو دعوت دی تھی تو ان سے کہا تھا کہ تم ہماری سفارش کرو، یوسف مانتے نہیں ہیں، تم سفارش کرو تو سب نے سفارش کی زلیخا کی کہ یہ تمہاری آقا ہے، یہ تم سے ایک مطالبہ کرتی ہے تم اس کا مطالبہ مان لو لیکن دل میں ہر ایک کے یہ تھا کہ میری طرف ملتفت ہوجائیں، زبان سے کچھ اور کہہ رہی تھیں لیکن دل میں کچھ اور تھا، اس لئے فرمایا: تم زنانِ مصر کی طرح پٹی پڑھا رہی ہو، عائشہ کے دل میں یہ ہے کہ میرے باپ کو لوگ منحوس نہ سمجھیں اور حفصہ کے دل میں یہ ہے کہ یہ اعزاز میرے باپ کو حاصل ہوجائے حضور ﷺ کی جگہ نماز پڑھانے کی، اس لئے فرمایا: "مُرُوا أَبَا بَكْرٍ فَلْيُصَلِّ بِالنَّاسِ" ابوبکر سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

اس حدیث کا تتمہ یہ ہے کہ اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو کچھ خفت محسوس ہوئی، طبیعت میں ذرا ہلکا پن محسوس ہوا تو دو آدمیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر تشریف لے گئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ آپ ﷺ تشریف لا رہے ہیں تو پیچھے ہٹنے لگے، آنحضرت ﷺ نے اشارے سے فرمایا کہ: اپنی جگہ کھڑے رہو! اور آ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بائیں جانب بیٹھ گئے۔

روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت کر رہے تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کی امامت کر رہے تھے، امام تو ایک ہی ہوتا ہے دو نہیں ہوتے، مطلب یہ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حیثیت مکبّر کی سی ہوگئی، اب نماز آنحضرت ﷺ پڑھا رہے تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تکبیر کہہ رہے تھے، آپ ﷺ کے برابر کھڑے تھے جیسے کہ ایک امام اور ایک مقتدی ہوتا ہے، یہ نماز آنحضرت ﷺ نے خود پڑھائی، حضرت ابوبکر مکبّر رہے۔ اور روایت میں آتا ہے کہ جہاں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قراءت کی تھی وہاں سے آنحضرت ﷺ نے شروع کردی۔

اس حدیث سے چند مسائل معلوم ہوجاتے ہیں: ایک یہ کہ اگر امام مصلّٰی پر کھڑا ہو، نماز پڑھا رہا ہو اور امامِ اعظم آجائے تو یہ ممکن ہے کہ اس کو امام بنا دیا جائے اور یہ مقتدی بن جائے، ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ: "إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ" (مسند احمد بن حنبل، ابوداود ۲/ ۳۱۶، ۶۰۱، السنن الکبریٰ للبیہقی) امام اس لئے بنایا گیا ہے تاکہ اس کی اقتداء کی جائے، جب وہ کھڑا ہو کر نماز پڑھائے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم سب بھی بیٹھ کر نماز پڑھو، یہ ارشاد آپ ﷺ نے سن پانچ ہجری میں اس وقت ارشاد فرمایا تھا جب آپ ﷺ گھوڑے سے گر گئے تھے اور آپ ﷺ کے خراش آگئی تھی اور پاؤں مبارک میں موچ آگئی تھی تو مسجد میں تشریف نہیں لا سکے تھے، صحابہ آپ ﷺ کے بالاخانے میں ملنے

گئے، آپ ﷺ نے نماز پڑھی تو صحابہ نے بھی پیچھے نماز پڑھ لی، انہوں نے کھڑے ہوکر نماز پڑھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ!

بہت سے علماء اس حدیث سے اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ اگر امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدیوں کو بھی بیٹھ کر نماز پڑھنی چاہئے، مگر یہ صحیح نہیں، اس حدیث نے جو آنحضرت ﷺ کا آخری عمل ہے، فیصلہ کر دیا کہ آنحضرت ﷺ بیٹھ کر نماز پڑھا رہے تھے، حضرت ابوبکر کھڑے ہوکر ان کی اقتداء کر رہے تھے اور قوم کے تمام افراد کھڑے ہوکر اقتداء کر رہے تھے، معلوم ہوا کہ اگر امام بیٹھ کر امامت کرائے تو قوم کھڑے ہوکر اقتداء کرے گی بیٹھ کر نہیں، وہ حدیث اور وہ حکم اب منسوخ ہوگیا۔

اس حدیث سے ہمارے امام کا وہ مسئلہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہوتی ہے، اس لئے کہ اگر مقتدی کے ذمے فاتحہ پڑھنا فرض ہوتا اور فاتحہ کے بغیر کسی کی نماز نہ ہوتی تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ ابوبکر جو فاتحہ پڑھ چکے وہ کالعدم قرار ہوتی اور آنحضرت ﷺ نئے سرے سے فاتحہ پڑھتے، وہ جو حضرت ابوبکر نے فاتحہ پڑھ لی تھی اس کو کافی سمجھا اور جہاں تک حضرت ابوبکر کی قراءت پہنچی تھی وہاں سے آنحضرت ﷺ نے شروع کی اور اسی مرض الوفات میں ایک موقع پر ایسا بھی ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز بھی پڑھی، وہ دوسرا واقعہ ہے، اس میں امام ابوبکر تھے اور آنحضرت ﷺ پیچھے اقتداء فرما رہے تھے، اس لئے کہتے ہیں کہ دو شخص ایسے ہیں جن کے پیچھے آنحضرت ﷺ نے نماز پڑھی، ایک حضرت ابوبکر اور ایک حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما۔

ایک سفر میں آنحضرت ﷺ باہر استنجے کے لئے تشریف لے گئے تھے اور دیر ہوگئی، صحابہ کو معلوم نہیں تھا کہ آنحضرت ﷺ تشریف فرما ہیں، فجر کا وقت تنگ ہو رہا تھا، اس لئے صحابہ کرام نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو اپنا امام بنالیا اور آنحضرت ﷺ جب واپس تشریف لائے تو ایک رکعت ہو چکی تھی، آنحضرت ﷺ نے ایک رکعت ان کے پیچھے پڑھی اور ایک رکعت مسبوق کی طرح اُٹھ کر پڑھی، جب لوگوں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھا، بہت ہی اظہار افسوس کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے اچھا کیا، ان کی تحسین کی۔

اور اس حدیث شریف سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے سچے جانشین اور خلیفہ بلا فصل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے، باوجودیکہ اصرار کیا گیا کہ آپ ﷺ عمر کو خلیفہ بنادیں، مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے اپنی جگہ کھڑا کیا، صحابہ کرام اور خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس سے استدلال کیا کہ خلیفہ آنحضرت ﷺ کے بعد ابوبکر ہیں، ایسا ہے جیسے بادشاہ اپنے جانشین کے لئے بستر شاہی حوالے کردے، تو آپ ﷺ کا بستر شاہی مصلیٰ تھا، جب مصلیٰ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا، تو کون تھا جو آپ کو وہاں

سے ہٹاتا؟ اور خلیفہ وہی ہوتا ہے جو نماز پڑھائے، دوسرا ممکن ہی نہیں کہ خلیفہ کوئی اور ہو اور نماز کوئی اور پڑھائے، یہ تو بعد میں ہوا جب بادشاہ بے دین ہو گئے، تو مصلیٰ الگ ہو گیا، تخت الگ ہو گیا، خلافت کی مسند الگ ہو گئی اور مسجد کا مصلیٰ الگ ہو گیا، آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں مسندِ خلافت وحکومت اور محراب کا مصلیٰ دونوں ایک ہی تھے۔

فضیلت سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ

[حدیث: ۱۲۹۹] "عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ.... إِنَّهُ قَدْ كَانَ فِيمَا مَضَى قَبْلَكُمْ مِنَ الْأُمَمِ مُحَدَّثُونَ وَإِنَّهُ إِنْ كَانَ فِي أُمَّتِي هٰذِهِ مِنْهُمْ فَإِنَّهُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ۔"

(صحیح بخاری ج:۱۱ص:۲۸۸، حدیث نمبر:۳۲۱۰، باب حَدِيثُ الْغَارِ)

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک بات یہ ہے کہ تم سے پہلے جو اُمتیں ہوئی ہیں ان میں محدث ہوتے تھے اور بات یہ ہے کہ میری اس اُمّت میں اگر کوئی آدمی ہے تو عمر بن خطاب یقیناً ہے۔"

تشریح: اس حدیث شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت ہے اور اس فضیلت کو آنحضرت ﷺ نے محدث کے عنوان سے ذکر فرمایا ہے اور یوں ارشاد فرمایا کہ پہلی اُمتوں میں کچھ لوگ ہوتے تھے جن کو محدث کہتے تھے، ایک ہوتا ہے مُحَدِّث حدیث بیان کرنے والے یا پڑھانے والے کو کہا جاتا ہے اور ایک ہوتا ہے مُحَدَّث جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کچھ باتیں القاء کی جاتی ہیں، یہ تحدیث ہے، یعنی فرشتے اس سے ہم کلام ہوتے ہیں یا یوں کہو کہ اس کے دل میں یہ باتیں ڈال کر جاتے ہیں، یہ نبوت کا مرتبہ نہیں ہوتا لیکن فراست صحیحہ کا مرتبہ ہوتا ہے، یعنی یوں کہو کہ نبوت سے نیچے کی چیز ہے اس لئے کہ نبی کے دل میں من جانب اللہ جو بات القاء کی جاتی ہے وہ ایسی قطعی اور یقینی ہوتی ہے کہ اس پر ایمان لانا بھی ضروری، اس کی تبلیغ بھی لازم اور اس کا انکار کفر ہے، جبکہ مُحَدَّث پر جو علوم القاء کئے جاتے ہیں ان کا مرتبہ نیچا ہوتا ہے، لوگوں کو اس پر ایمان لانے کا مکلّف نہیں کیا جاتا ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں، اگر وہ کوئی بات کہے اور دوسرے لوگ اس کا انکار کر دیں تو اس کا انکار کرنے والے کافر نہیں ہوتے لیکن یہ ضرور ہوگا کہ منہ کی کھائیں گے کیونکہ بات وہی ہوگی جو قلندر نے کہی تھی، نقصان ضرور پہنچے گا لیکن کافر نہیں ہوں گے اور اس کے ذمے اس کی تبلیغ بھی لازم نہیں، لوگوں کو پہنچانے کا بھی مکلّف نہیں، اگر اظہار کر دے تو ٹھیک ہے کہ میرے دل میں یہ بات آئی ہے اسی کو مُلہَم بھی کہتے ہیں کہ جس کو الہام ہوتا ہے لیکن الہام پانے والوں میں بھی مُحَدَّث کا درجہ اونچا ہوتا ہے، مُحَدَّث کا درجہ ملہمین سے اوپر ہے، علوم صحیحہ اس کو القاء کئے جاتے ہیں، غلام احمد کی طرح نہیں، اس کے دماغ میں

شیطان چونچ مارتا تھا اور ایک چیز ڈال کر چلا جاتا، یہ خبیث سمجھتا ہے کہ میں مُحدَّث ہوں، مجھ سے اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوتا ہے، لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ حالانکہ نکلتی جھوٹی بات تھی اور اللہ تعالیٰ کی باتیں جھوٹی نہیں نکلتیں۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ پہلی اُمتوں میں اس قسم کے لوگ ہوتے تھے ان کو مُحدَّث کہا جاتا تھا، یعنی علوم صحیحہ ان پر القاء ہوتے تھے وہ نبی نہیں ہوتے تھے، نبیوں کے علاوہ میری اُمت میں اگر کوئی شخص ایسا ہے تو عمر ہے۔

جب یہ بات سب کو معلوم ہے کہ یہ اُمّت خیر الامم ہے، پہلی اُمتوں میں سب سے افضل ہے، تمام اُمتوں کی سرتاج ہے اور یہ بات آنحضرت ﷺ خود ارشاد فرما رہے ہیں کہ پہلی اُمتوں میں کچھ مُحدَّث ہوتے تھے تو جب پہلی اُمتوں میں مُحدَّث ہوتے تھے تو اس اُمت میں کیوں نہیں ہوں گے؟ لازماً اور یقیناً ہوں گے بلکہ پہلی اُمتوں میں نبی بھی ہوتے تھے اور اس اُمّت میں نبی بھی نہیں لیکن پہلی اُمّت میں نبیوں کی مکافات یعنی اس کی کمی تلافی یہاں کے مُحدِّثوں سے کی، علمائے ربانیین اور مُحدِّثین ان حضرات سے نبیوں کی کمی پوری کی، تو ظاہر ہے کہ لازماً آنحضرت ﷺ کی اُمّت میں مُحدَّث ہوں گے، پھر آنحضرت ﷺ اس عنوان سے کیوں ذکر فرماتے ہیں کہ اگر میری اُمّت میں کوئی ہے تو وہ عمر بن خطاب ہے۔

یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مُحدَّث ہونے کو قطعی طور پر ثابت کرنا ہے، جیسے کہا جائے کہ دوست تو میرے بہت ہیں لیکن اگر دوست ہے تو فلاں ہے، مقصود یہ ہے کہ اور کوئی دوست ہو یا نہ ہو لیکن اس کا دوست ہونا تو قطعی اور یقینی ہے، تو آنحضرت ﷺ کی اُمّت میں مُحدَّث تو ہوں گے، آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ اور کوئی ہو یا نہ ہو لیکن عمر بن خطاب ضرور ہیں اور جب یہ بات معلوم ہوگئی تو معلوم ہوا کہ وہ اس اُمّت میں سب سے افضل ہیں سوائے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے۔

اور یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ صدیقیت کا مقام محدَّثیت سے بھی اُونچا ہے، جیسے کہ رسالت کا مقام نبوت سے اُونچا ہے، ہیں دونوں نبی لیکن ایک رسول ہے اور ایک صرف نبی، رسالت کا مقام نبوت سے اونچا ہے، اسی طرح صدیقیت کا مقام مُحدَّثیت سے اونچا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُمّت میں صدیق بھی بہت ہیں اور مُحدَّث بھی بے شمار ہیں لیکن ''صدیق اکبر'' صرف ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں اور ''مُحدَّث اعظم'' صرف عمر رضی اللہ عنہ ہیں، صحابہ میں بھی کوئی اس مرتبے کا آدمی نہیں تھا دُوسروں میں تو کہاں آجاتا؟

فضیلتِ شیخین رضی اللہ عنہما

[حدیث:۱۳۰۰] ''وَاَخرَجَ ابنُ اَبِیْ عَاصِمٍ وَابنُ شَاھِینَ وَالْلَالکَائِیُ فِی السُّنَّۃِ وَالْاَصْبَحَانِیُ فِی الْحُجَّۃِ وَابنُ عَسَاکِرَ عَنْ عَلْقَمَۃَ قَالَ: خَطَبَنَا عَلِیٌ

رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، فَحَمِدَ اللهَ وَ اَثْنٰى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: اِنَّهُ بَلَغَنِيْ اَنَّ نَاسًا يُفَضِّلُوْنِيْ عَلٰى اَبِيْ بَكْرٍ وَ عُمَرَ، رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، وَلَوْ كُنْتُ تَقَدَّمْتُ فِيْ ذَالِكَ لَعَاقَبْتُ فِيْهِ، وَلٰكِنِّيْ اَكْرَهُ الْعَقُوْبَةَ قَبْلَ التَّقَدُّمِ۔ فَمَنْ قَالَ شَيْئًا مِنْ ذَالِكَ بَعْدَ مَقَامِيْ هٰذَا فَهُوَ مُفْتَرٍ، عَلَيْهِ مَا عَلَى الْمُفْتَرِيْ، خَيْرُ النَّاسِ بَعْدَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبُوْ بَكْرٍ ثُمَّ عُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، ثُمَّ اَحْدَثْنَا بَعْدَهُمْ اَحْدَاثًا يَقْضِي اللهُ فِيْهَا مَا يَشَاءُ، كَذَا فِي الْمُنْتَخَبِ۔

وَعِنْدَ اَبِيْ نُعَيْمٍ فِي الْحِلْيَةِ عَنْ زَيْدِ بْنِ وَهْبٍ اَنَّ سُوَيْدَ بْنَ غَفَلَةَ دَخَلَ عَلٰى عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ فِيْ اِمَارَتِهٖ، فَقَالَ: يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! اِنِّيْ مَرَرْتُ بِنَفَرٍ يَذْكُرُوْنَ اَبَا بَكْرٍ وَ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، بِغَيْرِ الَّذِيْ هُمَا لَهٗ اَهْلٌ۔ فَنَهَضَ فَرَقِيَ الْمِنْبَرَ، فَقَالَ: وَالَّذِيْ فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ! لَا يُحِبُّهُمَا اِلَّا مُؤْمِنٌ فَاضِلٌ، وَلَا يَبْغَضُهُمَا اِلَّا شَقِيٌّ مَارِقٌ، فَحُبُّهُمَا قُرْبَةٌ وَبُغْضُهُمَا مُرُوْقٌ، مَا بَالُ اَقْوَامٍ يَذْكُرُوْنَ اَخَوَيْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوَزِيْرَيْهِ وَصَاحِبَيْهِ وَسَيِّدَيْ قُرَيْشٍ وَاَبَوَيِ الْمُسْلِمِيْنَ؟ فَاَنَا بَرِيْءٌ مِمَّنْ يَذْكُرُهُمَا بِسُوْءٍ وَعَلَيْهِ مُعَاقَبٌ۔ كَذَا فِي الْمُنْتَخَبِ۔"

"وَاَخْرَجَ اللَّالْكَائِيُّ وَاَبُوْ طَالِبِ الْعُشَارِيُّ وَنَصْرٌ فِي الْحُجَّةِ عَنْ عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنٍ قَالَ: قَالَ فَتًى مِنْ بَنِيْ هَاشِمٍ لِعَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ حِيْنَ اِنْصَرَفَ مِنْ صِفِّيْنَ سَمِعْتُكَ تَخْطُبُ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! فِي الْجُمُعَةِ تَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْنَا بِمَا اَصْلَحْتَ بِهِ الْخُلَفَاءَ الرَّاشِدِيْنَ۔ فَمَنْ هُمْ؟ فَاغْرَوْرَقَتْ عَيْنَاهُ، ثُمَّ قَالَ: اَبُوْ بَكْرٍ وَعُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا اِمَامَا الْهُدٰى، وَشَيْخَا الْاِسْلَامِ، وَالْمُهْتَدِيْ بِهِمَا بَعْدَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مَنِ اتَّبَعَهُمَا هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ، وَمَنِ اقْتَدٰى بِهِمَا يَرْشُدُ، وَمَنْ تَمَسَّكَ بِهِمَا فَهُوَ مِنْ حِزْبِ اللهِ وَحِزْبُ اللهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔"

(حیاۃ الصحابۃ ج: ۶ ص: ۲۹۳، ۲۹۴)

ترجمہ: "ابن ابی عاصم، ابن شاہین اور لالکائی نے سنہ میں اور اصبہانی نے حجہ میں، اور ابن عساکر نے حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمیں خطبہ دیا، پس اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ کچھ لوگ مجھے فضیلت

دیتے ہیں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما پر، اگر اس سلسلہ میں میں نے پہلے تنبیہ کر دی ہوتی تو اس معاملہ میں میں ایسے لوگوں کو سزا دیتا، لیکن آگاہ کرنے سے قبل سزا دینے کو مناسب نہیں سمجھتا، جو شخص اس قسم کی کوئی بات میرے اس بیان کے بعد کرے گا، وہ مفتری ہے، اور اس کی وہی سزا ہوگی جو مفتری کی سزا ہے۔ پھر فرمایا: تمام انسانوں سے بہتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ہیں، پھر ہم نے ان کے بعد بہت سے کلام کئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان میں فیصلہ کرے گا جو چاہے کرے۔

ابونعیم نے حلیہ میں زید بن وہاب سے نقل کیا ہے کہ حضرت سوید بن غفلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ وہ کوفہ میں امیر المؤمنین تھے، سوید بن غفلہ نے کہا: اے امیر المؤمنین! چند لوگوں کے پاس سے میرا گزر ہوا، وہ لوگ حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا نامناسب انداز میں تذکرہ کر رہے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور منبر پر چڑھے اور پھر فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس نے دانہ کو پھاڑا اور روح کو وجود دیا، نہیں محبت رکھتا ان دونوں سے مگر مؤمن فاضل، اور نہیں بغض رکھتا ان دونوں سے مگر بدبخت اور دین سے نکلنے والا، سو ان دونوں سے محبت رکھنا عبادت ہے اور ان دونوں سے بغض رکھنا دین سے نکلنا ہے۔ کیا حال ہے ان لوگوں کا جو برا تذکرہ کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں بھائیوں کا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو وزیروں کا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں رفیقوں کا، قریش کے دونوں سرداروں کا اور مسلمانوں کے دونوں والدین کا۔ میں اس شخص سے بری ہوں جو ان کا تذکرہ کرتا ہے برائی کے ساتھ اور اس پر میں سزا دینے والا ہوں۔

لالکائی، ابوطالب عشاری اور نصر نے حجہ میں حضرت علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ بنوہاشم کے ایک نوجوان نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: اے امیر المؤمنین! آپ جنگِ صفین سے جب سے واپس آئے ہیں تو میں آپ سے سن رہا ہوں کہ آپ جمعہ کے خطبے میں یہ دعا کرتے ہیں: ''اے اللہ! ہماری اصلاح فرما جس چیز کے ساتھ آپ نے اصلاح فرمائی تھی خلفائے راشدین کی۔'' تو یہ کون لوگ ہیں؟ آپ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور فرمایا: ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما، دونوں ہدایت کے امام تھے، اسلام کے بزرگ تھے، جن کی اقتدا کی جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جس شخص نے ان دونوں کی پیروی کی، اس کو صراطِ مستقیم کی ہدایت ملی، اور جس شخص نے ان دونوں کی

اقتدا کی اس نے بھلائی پائی، اور جس نے ان دونوں سے تمسک کیا پس وہ اللہ کا گروہ ہے، اور اللہ کا گروہ ہی کامیاب ہونے والا ہے۔''

البدایہ والنہایہ میں امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ خطبہ ذکر کیا گیا ہے:

''خَیْرُ النَّاسِ بَعْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَبُوْبَکْرٍ ثُمَّ عُمَرُ (رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمَا)۔'' (البدایہ والنہایہ ج:۱۰ ص:۲۷۷)

ترجمہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس اُمّت میں سب سے بہتر اور افضل حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔''

''ازالۃ الخفا'' میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس خطبے کو نقل کرنے والے اسّی آدمی ہیں۔ گویا تواتر کے ساتھ یہ خطبہ ثابت ہے۔ اسّی آدمی جھوٹ نہیں بول سکتے، اور مختلف کتابوں میں ان حضرات سے مروی ہے، صحیح بخاری میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔

محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ:

اور ان کے صاحبزادے حضرت محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ جو اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے عالم اور فاضل تھے اور جن کو بعض لوگوں نے اپنے وقت کا امام مہدی کہا تھا، حالانکہ یہ جھوٹ کہا، کیونکہ امام مہدی تو بعد میں آئیں گے لیکن بہرحال ان کی مہدویت کی دعوت ایک عرصہ تک چلتی رہی، یہ حضرت محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے چھوٹے بھائی ہیں، لیکن دوسری والدہ سے تھے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نہیں تھے۔

محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ تسمیہ:

حدیث شریف میں ہے:

''عَنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَرَأَیْتَ اِنْ وُلِدَ لِیْ بَعْدَکَ اُسَمِّیْہِ مُحَمَّدًا؟۔۔۔۔قَالَ: نَعَمْ!'' (ترمذی ج:۲ ص:۱۰۷)

ترجمہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا: یا رسول اللہ! آپ کے بعد میرے یہاں لڑکا ہو تو اس کا نام ''محمد'' رکھ لوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جی ہاں!''

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا نام محمد رکھا تھا، محمد ابن علی، ان کو محمد بن حنفیہ بھی کہا جاتا ہے، اس لئے کہ قبیلہ بنوحنیفہ کی خاتون کے بطن سے ان کا تولد ہوا تھا۔

سب سے افضل کون ہے:

تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے انہی محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے:

"قَالَ: قُلْتُ لِاَبِیْ: اَیُّ النَّاسِ خَیْرٌ بَعْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ؟
قَالَ: اَبُوْبَکْرٍ۔ قُلْتُ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: عُمَرُ۔ وَخَشِیْتُ اَنْ یَقُوْلَ عُثْمَانَ، قُلْتُ: ثُمَّ
اَنْتَ؟ قَالَ مَا اَنَا اِلَّا رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔" (بخاری ج:۱ص:۵۱۸)

ترجمہ: "میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے افضل کون ہے؟ فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے بعد تمام انسانوں میں سب سے افضل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر میں نے پوچھا: ان کے بعد کون افضل ہیں؟ تو فرمایا: ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر میں نے اس ڈر سے کہ کہیں یہ نہ فرمادیں کہ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، میں نے خود ہی کہا کہ: اس کے بعد آپ افضل ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: نہیں! میں مسلمانوں میں سے ایک آدمی ہوں۔"

طرقِ حدیث:

اور یہ حضرت علقمہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے، اس سے پہلی ابوجحیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت تھی، دوسری علقمہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، تیسری سوید بن غفلہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے، سوید بن غفلہ رحمۃ اللہ علیہ مقدم ہیں، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پایا ہے، لیکن زیارت نہ ہوسکی، اس لئے صحابی نہیں ہیں، تابعی ہیں، لیکن اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اکابر تابعین میں سے ہیں۔

اکابر تابعین؟

حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا زمانہ جنہوں نے پایا ہو، وہ تمام تابعین میں سب سے بڑے شمار کئے جاتے ہیں، ابو یونس خولانی رحمۃ اللہ علیہ جن کا نام عائض باللہ ہے، وہ بھی اور یہ سوید بن غفلہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اکابر تابعین میں سے ہیں، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پایا تھا اور رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اسلام بھی لے آئے تھے لیکن زیارت سے مشرف نہ ہوسکے۔

ابو یونس خولانی رحمۃ اللہ علیہ:

ابو یونس خولانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آتا ہے کہ جس دن وہ مدینہ پہنچے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کو دفن کرکے مٹی سے ہاتھ جھاڑ رہے تھے، اللہ کی شان! زیارت نہ ہوسکی۔

امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ:

اور چوتھی روایت حضرت علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، جن کو "امام زین العابدین" کہتے ہیں۔ امام

باقر رحمۃ اللہ علیہ کے والد اور امام جعفر رحمۃ اللہ علیہ کے دادا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کربلا میں صرف یہی بچے تھے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے، نرینہ اولاد میں سے صرف یہی بچے تھے اور تمام کے تمام حسینی سیّد انہیں کی اولاد ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دُعا:

حضرت علی بن حسین بن ابی طالب، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں، امام باقر رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد ہیں اور امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے دادا ہیں، یہ فرماتے ہیں کہ قریش کے ایک نوجوان نے حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ سے پوچھا، جبکہ جنگِ صفین سے لوٹ کر آئے تھے کہ آپ اکثر اپنے خطبوں میں یہ دُعا کیا کرتے ہیں:

”اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْنَا بِمَا اَصْلَحْتَ بِهِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ“

ترجمہ: ”یا اللہ! ہماری ایسی اصلاح فرما، جیسی آپ نے خلفائے راشدین کی اصلاح فرمائی ہے۔“

یہ خلفائے راشدین کون ہیں؟ جن کا آپ تذکرہ کرتے ہیں، فرمایا کہ: ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما، ہدایت کے امام اور اسلام کے دونوں بزرگ۔

اس اُمّت کے پہلے ”شیخ الاسلام“:

”شیخ الاسلام“ کا لفظ سنا ہوگا آپ لوگوں نے کہ فلاں شیخ الاسلام ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس اُمّت میں سب سے پہلے یہ لقب حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو دیا ہے، شیخ الاسلام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور شیخ الاسلام حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اس وقت گویا پوری اُمّت کے شیخ تھے، اپنے وقت میں ملّتِ اسلامیہ کے شیخ یہی تھے، یہ مطلب ہوتا ہے شیخ الاسلام کا، اور پھر فرمایا کہ یہ وہ حضرات ہیں جن کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہدایت پائی جاتی ہے، جو شخص کہ ان کی اقتدا کرے گا وہ رشد وہدایت پر ہوگا، اور جو شخص ان سے تمسک کرے گا وہ حزب اللہ میں شمار ہوگا، وہ اللہ کے گروہ میں شمار ہوگا، اور اللہ کا گروہ ہی کامیاب ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرات شیخین رضی اللہ عنہما سے عقیدت:

اور سوید بن غفلہ کی روایت میں ہے کہ میں کوفہ میں حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے کہا کہ: میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا بیٹھے ہوئے حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا تذکرہ کچھ نامناسب انداز سے کر رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ علی رضی اللہ عنہ ان سے افضل ہیں۔ آپ یہ سن کر منبر پر

تشریف لے گئے، لوگ جمع ہو گئے، اور ارشاد فرمایا کہ: اس ذات کی قسم جس نے دانے کو چیر کر اس سے درخت نکالا اور جس نے روح کو پیدا کیا، یہ دونوں بزرگ رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے افضل ہیں، جو ان سے محبت رکھے گا وہ مؤمن فاضل ہوگا، اور جو شخص ان سے بغض رکھے گا وہ بد بخت اور دین سے نکلنے والا ہوگا، اس کے بعد دوسرے فضائل بیان فرمائے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے خطبہ دیا اور اس میں فرمایا:

''اَیُّهَا النَّاسُ! اِنَّ خَیْرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بَعْدَ نَبِیِّهَا اَبُوْ بَکْرٍ وَ عُمَرُ، وَلَوْ شِئْتُ اَنْ اُسَمِّیَ الثَّالِثَ لَسَمَّیْتُ۔'' (البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳)

ترجمہ: ''اے لوگو! بے شک رسول اللہ ﷺ کے بعد اس اُمّت میں سب سے بہتر ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) ہیں اور پھر اترتے ہوئے فرمایا: اگر میں چاہتا تو تیسرے کا نام بھی بتا دیتا (کسی نے پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ بتا دیجئے! فرمایا: عثمان! رضی اللہ عنہ)۔''

فرقِ مراتب:

اہلِ سنّت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد یہ چار خلفائے راشدین اس اُمّت میں سب سے افضل ہیں: حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم۔ خلیفہ راشد ہونے کے اعتبار سے یہ سب یکساں احترام کے مستحق ہیں، اور ان میں سے کسی ایک کی تنقیص بھی جیسا کہ حضرت امیر المؤمنین فرما رہے ہیں، دین سے نکلنے کی علامت ہے، لیکن جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب صحابیت کی وجہ سے لائق احترام ہیں اور مرجع عقیدت ہیں، بلکہ قبلہ عقیدت ہیں، لیکن ان کے مابین بھی درجات کا فرق ہے، اسی طرح یہ چاروں خلفائے راشدین بحیثیت خلیفہ راشد ہونے کے یکساں اور برابر ہیں، لیکن ان کے درجوں میں بھی فرق ہے، تیسرے پارے کے شروع میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (البقرہ:۲۵۳)

ترجمہ: ''یہ رسولوں کی جماعت ان میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔''

تمام کے تمام رسول اور نبی آپ حضرات کو معلوم ہے کہ معصوم ہیں، اللہ تعالیٰ کے مقدس و برگزیدہ ہیں لیکن ان کے درجات میں بھی فرق ہے اور کسی بڑے کو بڑا کہنے کا یہ معنی نہیں ہے کہ دوسرے کی تنقیص کی جائے، کوئی نبی اپنی ذات کے اعتبار سے چھوٹا نہیں ہے، سب بڑے کے بڑے ہیں لیکن جب انبیاء کا آپس

میں مقابلہ ہوتا ہے تو ان کے اعتبار سے کہہ سکتے ہیں، مثلاً پانچ اولوالعزم رسول ہیں، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام اور حضرت محمد ﷺ سب سے افضل ہیں، خیر البشر ہیں، سید الرسل ہیں، امام الانبیاء ہیں، خاتم الانبیاء ہیں، ٹھیک اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ خلفائے راشدین سب کے سب لائق احترام ہیں، ان میں سے کسی ایک کی تنقیص اور ادنیٰ سے ادنیٰ تنقیص بھی جائز نہیں، کسی ایک صحابی کی تنقیص محرومی کی علامت ہے اور بدبختی کا نشان ہے اور دین سے نکلنے کی ابتدا ہے۔

اس اُمّت کے افضل:

تاہم ان چاروں کے درجات میں فرق ہے، حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا **افضل هذه الامة** ہونا قطعی تھا اور ہے، اُمّت کے کسی ایک متنفس کا بھی اس میں اختلاف نہیں، اور پوری اُمّت میں دو آدمیوں کا بھی اس سلسلہ میں اختلاف نہیں ہے، شیعوں کو شمار نہ کرو، ان کے علاوہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت میں ایک متنفس بھی اس عقیدے سے اختلاف کرنے والا نہیں ہے کہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما اس اُمّت میں سب سے افضل ہیں، اسی طرح تابعین، تبع تابعین اور اسی طرح ائمہ دین، مجددینِ اُمّت، محدثین وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شیخین حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ہیں، اور حضرات عثمان وعلی رضی اللہ عنہما یہ دونوں داماد ہیں رسول اللہ ﷺ کے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے دہری دامادی کا شرف عطا فرمایا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا شرف:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آنحضرت ﷺ کی کتنی صاحبزادیاں تھیں؟ دو صاحبزادیاں تھیں، حضرت رقیہ اور حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہما، میں کہتا ہوں کہ صرف دو نہیں بلکہ بے شمار، کیونکہ جب حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا: اگر میری تیسری بیٹی ہوتی تو عثمان کو دیتا، وہ مرجاتی تو چوتھی ہوتی تو عثمان کو دیتا، وہ مرجاتی تو اگلی ہوتی تو عثمان کو دیتا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی حاضر جوابی:

نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! کوفہ میں ایک شخص تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہودی کہتا تھا، کوفہ ہمیشہ اہل بیت کی عداوت کا گڑھ رہا ہے، ظاہر میں محبت اور اندرونِ خانہ عداوت، بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عداوت میں کوفہ تو ہمیشہ بدنام رہا ہے۔ اس لئے مثل بن گئی تھی: ”اَلْكُوْفِيُّ لَا يُوْفِيْ“ یعنی کوفی کبھی وفا نہیں کریں گے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے وفا نہ کی، ان کے صاحبزادے سبط اکبر حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے وفا نہ کی اور ان کے بعد پھر ان کے چھوٹے بھائی حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے وفا نہ کی،

"اَلْكُوْفِيُّ لَا يُوْفِيْ" کوفی کبھی وفا نہیں کرے گا، اہل بیت سے غداری کرنے میں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے عداوت رکھنے میں کوفی مشہور تھے۔

اہل کوفہ کے دلوں میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وجاہت:

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ایک کوفی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہودی کہتا تھا، حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کی وجاہت تو سارے کوفہ میں تھی، ہر دشمن اور دوست عزت کرتا تھا اور جو بڑا آدمی صاحب اخلاق بھی ہو اور صاحب علم وفضل بھی ہو، تو تمام طبقے کے لوگ اس کا احترام کیا کرتے ہیں، وہ اپنے اخلاق اور اپنے اعمال کی بنا پر سب کے نزدیک محترم ہوتا ہے، شیعوں کا اور سنیوں کا اختلاف تمہیں معلوم ہے، دیوبندیوں کا اور بریلویوں کا اختلاف آپ کو معلوم ہے۔

ہمارے مولانا مفتی منیر احمد اخون صاحب کے والد ماجد کا جس دن انتقال ہوا، میں نے ان کا جنازہ پڑھایا، سارا بھاول نگر امڈ آیا تھا، تمام شیعہ بھی اور تمام بریلوی بھی کہنے لگے: ہمیں ان سے کوئی اختلاف نہیں ہے، یہ تو ولی اللہ آدمی تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دشمن کا علاج:

تو حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ ان صاحب کے پاس گئے اس نے پوچھا: کیسے تشریف آوری ہوئی؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہنے لگے: ایک رشتے کا پیغام لے کر آیا ہوں، جناب کی صاحبزادی کے رشتے کا پیغام لے کر آیا ہوں، بہت خوش ہوا، لڑکے کے بارے میں بتایا کہ لڑکا بہت اچھا ہے، برسر روزگار ہے، علّامہ ہے، وغیرہ وغیرہ، دنیا میں جو وجاہت کی چیزیں رائج ہیں ساری گنوادیں، وہ آدمی کہنے لگا: بہت اچھا! منظور ہے، حضرت فرمانے لگے کہ: بھئی میں نے اس کے ہنر بتادیئے ہیں، تھوڑے سے عیب بھی بتادینے چاہئیں کہ ہر ایک کو پتہ چل جائے، دوسرے سامنے والے کو پتا چل جائے، دھوکہ نہ ہو، تھوڑا سا اس میں عیب بھی ہے وہ یہ کہ وہ لڑکا یہودی ہے، یہ سن کر اس کو تو آگ لگ گئی، چہرہ سرخ ہوگیا، کہنے لگا کہ: اتنے بڑے امام ہو کر آپ مجھ سے مذاق کرنے کے لئے آئے ہیں؟ وہ بھی میری بیٹی کے معاملے میں! حضرت امام: برافروختہ نہیں ہوئے، بلکہ نہایت متانت سے فرمانے لگے: کیوں کیا بات ہے؟ یہ برافروختہ ہونے کی چیز ہے؟ میں نے تو سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کو دو بیٹیاں دی تھیں، اب اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اس نے ہاتھ جوڑے اور کہا: آئندہ میں توبہ کرتا ہوں، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بس یہی مسئلہ سمجھانے کے لئے آیا تھا، تیری بیٹی کے لئے اگر میں یہودی کا رشتہ لاؤں تو تو مجھے قتل کرنے پر آمادہ ہوجائے اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کے شوہر کو کوئی یہودی کہہ دے تو وہ واجب القتل نہیں؟

منکرینِ بناتِ نبوّت:

لیکن اس وقت لوگ اتنے ڈھیٹ نہیں ہوئے تھے کہ حضور ﷺ کی دوسری صاحبزادیوں کا بالکلیہ انکار ہی کر دیں اور اب تو یہاں یار لوگوں نے باقی تین صاحبزادیوں کا انکار ہی کر دیا اور کہتے ہیں کہ کوئی بیٹی تھی ہی نہیں سوائے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے، یہ غلط ہے، بھائی! حضور ﷺ کے اہل بیت سے محبت یہ نہیں کہ حضور ﷺ کے اہل بیت ہی کا انکار کر دو، یہ ایک مستقل موضوع ہے۔

اہلِ بیت کے دشمن:

میں نے اپنی کتاب ''شیعہ سنی اختلاف'' میں تھوڑا سا بادلِ نخواستہ اس کا ذکر کیا ہے کہ یہ حضرات جو محبت اہل بیت کا دم بھرتے ہیں اور ان کی ہر مجلس میں یا حسین! پر سینہ کوبی ہوتی ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت کے سب سے بدترین دشمن ہیں، آپ حضرات میری اس کتاب کو پڑھ لیں، مزہ آئے گا، ان کے بارہ امام ہیں، بارہواں امام تو بے چارہ غائب ہو گیا ہے اور پہلے امام حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، دوسرے حضرت حسن رضی اللہ عنہ، تیسرے حضرت حسین رضی اللہ عنہ تھے، ان تین کو بھی چھوڑ دو، پیچھے کتنے رہ گئے؟ آٹھ، ہر امام کے زمانے میں اس کے بھائی بندوں نے اختلاف کیا، اس کی امامت پر شیعوں نے لکھا اور میں نے شیعہ کتابوں کے حوالے سے اس کی پوری تفصیل لکھ دی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد اِمامت سے غائب:

یہی علی بن حسین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بھائی، اور بڑے بھائی کے بعد امامت کس کو ملتی ہے؟ چھوٹے بھائی کو، تو محمد بن علی مستحق تھے امامت کے، جیسے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو امامت ملی، اور اب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد کس کو ملنی چاہیے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لڑکے موجود ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادوں کو ملی، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد کو بھی امامت سے نکال دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد بھی امامت سے غائب، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دو بیٹوں کو لے کر باقی بیٹوں کو امامت سے نکال دیا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ایک بھی امام نہیں، سب امامت سے خارج۔

چچا بھتیجے کا اختلاف:

حضرت علی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لڑکے ہیں، ''علی زین العابدین'' جن کا میں نے ابھی تذکرہ کیا، ان کا اپنے چچا کے ساتھ اختلاف ہوا، چچا یعنی محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے تھے کہ میں امام ہوں، یہ کہتے

تھے کہ میں امام ہوں اور اصولِ کافی میں لکھا ہے کہ حجرِ اسود سے فیصلہ لیا گیا، مکہ مکرمہ میں پہنچے اور دونوں نے وہاں کھڑے ہو کر دُعا کی تو حجرِ اسود سے آواز آئی ''علی'' یعنی بھتیجے امام ہیں، چچا امام نہیں ہیں، آئی ہوگی آواز، ایک بات تو یہ ہوگئی۔

ہر زمانہ میں مسئلہ اِمامت پر اِختلاف ہوا:

اسی طرح ہر امام کے زمانے میں یہاں تک کہ حضرت حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ تک جو امام غائب کے باپ ہیں، ہر ایک کے زمانے میں امامت کے مسئلہ میں اختلاف ہوا، یعنی اس کے بھائی بندوں میں سے، اس کے عزیزوں میں سے، ایک بھی ان کی امامت کا قائل نہیں، امام جعفر رحمۃ اللہ علیہ کے آٹھ بیٹے تھے اور آٹھوں اپنی اپنی جگہ امامت کے مدعی تھے موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے بھائیوں میں سے کوئی امام نہیں مانتا تھا۔ خیر یہ تو چھوڑو!

روافض کے ہاں منکرِ اِمامت ''حرامی'' ہے:

لیکن شیعہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جو اِمامت کا منکر ہو وہ حرام زادہ ہے، اس کتاب میں حوالے دیکھ لو، ان کی کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اس کا نسب ناپاک ہے، میں گستاخی کی معافی چاہتے ہوئے پوچھوں گا: جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے محمد رحمۃ اللہ علیہ نے انکار کر دیا تھا اپنے بھتیجے کی امامت سے، تو وہ کون ہوئے؟ اور امام باقر رحمۃ اللہ علیہ کے بھائیوں نے امام باقر رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کا انکار کر دیا تو وہ کون ہوئے؟ ہم نے آج تک مخالف کو حرام زادہ نہیں کہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو یہ لقب دینے کا پہلی بار ان حضرات کو شرف حاصل ہوا ہے (نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ)۔ یہ گیارہ آدمی ہوگئے، بارھواں تو ہے ہی نہیں، ان گیارہ آدمیوں سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری نسل کو یہ خطاب دیتے ہیں، فرمایئے! یہ محب اہل بیت ہیں یا اہل بیت کے دشمن ہیں؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عقیدت:

تو خیر مسئلہ یہ چل رہا تھا کہ حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ہیں اور اگر کسی کی عقل میں نہ آئے تو میں نے اس کتاب میں یہ بھی حوالہ نقل کر دیا ہے کہ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کہیں کہ آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی کا وہ شرف حاصل ہے جو کہ شیخین کو نہیں، ٹھیک ہے ان دو حضرات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خسر ہونے کا شرف تو حاصل ہے۔ لیکن داماد ہونے کا شرف حاصل نہیں، تو ان میں ذرا اختلاف ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں کون افضل ہے؟ بعض لوگوں کا خیال ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ افضل ہیں۔

ترتیبِ خلافت، ترتیبِ فضیلت ہے:

صحیح بات جس پر کہ جمہور اُمّت متفق ہوئے وہ یہ ہے کہ ان کی ترتیبِ خلافت کے مطابق ان کی ترتیبِ فضیلت ہے، یعنی یوں کہو کہ جس طرح اللہ کے نزدیک ان کی ترتیبِ فضیلت تھی، اسی ترتیب سے اللہ نے ان کو خلیفہ بنایا۔ سب سے اوّل نمبر پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے، تو وہ پہلے خلیفہ ہوئے، اور دوسرے نمبر پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے وہ بعد میں خلیفہ ہوئے، تیسرے نمبر پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تھے وہ بعد میں خلیفہ ہوئے اور چوتھے نمبر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے وہ بعد میں خلیفہ ہوئے۔

دُور والا قریب تر:

یہاں ایک لطیفہ یہ ہے کہ جتنا دور والا تھا، اتنا پہلے خلیفہ بنا، حضرت علی رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد ہیں، دادے میں جاکے مل جاتے ہیں، وہ سب سے آخری نمبر پر، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پردادے میں جاکے ملتے ہیں وہ تیسرے نمبر پر آئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ قبیلہ بنوعدی کے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچویں پشت میں جاکے ملتے ہیں، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس سے بھی اوپر جاکے ملتے ہیں، بتایا گیا کہ اسلام میں نسلی قرب کا لحاظ نہیں ہے بلکہ باطنی کمالات اور دائمی قرب کا لحاظ ہے، جتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی قریب ہوگا اتنا عنداللہ افضل ہوگا، یعنی اللہ کے نزدیک افضل ہوگا۔ تو بہرکیف اس اُمّت میں سب سے افضل حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شیخین رضی اللہ عنہما پر فضیلت دینے والا مفتری ہے:

یہ خطبہ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کوفے کے منبر پر ارشاد فرماتے تھے اور ان لوگوں کو جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو مفتری کہتے تھے یعنی کسی پر بہتان لگانے والا اور بہتان لگانے والے کی سزا اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً﴾ (النور: ۴)

ترجمہ: ......''وہ لوگ جو بہتان باندھتے ہیں کسی پر، پھر نہیں لاتے چار گواہ، ان کے اسّی کوڑے لگاؤ۔''

حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے پہلے اعلان نہیں کیا تھا اس لئے آج تو کچھ نہیں کہتا لیکن اگر آئندہ میں نے کسی کو سنا کہ وہ مجھے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیتا ہے تو اس کو سزا دوں گا، اور سزا

اس کی مفتری کی سزا ہوگی، یعنی اسّی کوڑے لگاؤں گا۔

شیعوں کے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پوزیشن:

حضرات شیعہ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ واقعی امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے کوفے کے منبر پر اس قسم کے خطبات ارشاد فرمائے تھے لیکن کہتے ہیں کہ یہ مجبوری تھی، اس لئے کہ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو تھوڑے بہت آدمی رہ گئے تھے باقی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ لے گئے تھے، جو تھوڑے بہت ان کے ساتھ رہ گئے تھے وہ بھی حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے گرویدہ تھے، اگر حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ ان کے بارے میں اپنا عقیدہ بیان کرتے تو سارا لشکر تتر بتر ہو جاتا۔ سبحان اللہ!

میں نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ تم ہی بتاؤ کہ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا دشمن کون نکلا؟ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ قسم کھا کر اور منبرِ رسول پر بیٹھ کر کہہ رہے ہیں اور اپنی امارت میں کہہ رہے ہیں، اپنی قوم کے درمیان میں کہہ رہے ہیں جن پر وہ امیر المؤمنین اور خلیفۃ المسلمین ہیں، ان کے سامنے کہہ رہے ہیں، مگر تم کہتے ہو کہ ڈر کے مارے کہہ رہے تھے، ورنہ خلافت ہاتھ سے چلی جاتی، کیا اپنی خلافت کو بچانا بڑا ضروری تھا؟ یہ ہے شیعوں کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پوزیشن۔

بہرحال اہل سنّت والجماعت کا عقیدہ وہی ہے جیسا کہ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ شیخین رضی اللہ عنہما افضل ہیں اور یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ سب سے پہلے دن سے یہ عقیدہ ان ہی کے ہاں سے نکلنا شروع ہوا ہے، حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی فضیلت کا انکار کرتا ہے یا ان کی تنقیص کرتا ہے یا ان پر کسی قسم کا اعتراض کرتا ہے یا نکتہ چینی کرتا ہے، اسے سمجھنا چاہئے کہ اس نے دین سے نکلنا شروع کر دیا، اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت اور مقام!

[حدیث: ۱۳۰۱] "أَخْرَجَ اِبْنُ سَعْدٍ عَنْ هُبَيْرَةَ قَالَ: لَمَّا تُوُفِّيَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَامَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، فَصَعِدَ الْمِنْبَرَ فَقَالَ: أَيُّهَا النَّاسُ! قَدْ قُبِضَ اللَّيْلَةَ رَجُلٌ لَمْ يَسْبِقْهُ الْأَوَّلُونَ وَلَا يُدْرِكُهُ الْآخِرُونَ، قَدْ كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَبْعَثُهُ الْمَبْعَثَ فَيَكْتَنِفُهُ جِبْرَائِيلُ عَنْ يَمِينِهِ وَمِيكَائِيلُ عَنْ شِمَالِهِ فَلَا يَنْثَنِي حَتَّى يَفْتَحَ اللهُ لَهُ وَمَا تَرَكَ إِلَّا سَبْعَمِائَةِ دِرْهَمٍ أَرَادَ أَنْ يَشْتَرِيَ بِهَا خَادِمًا وَلَقَدْ قُبِضَ فِي اللَّيْلَةِ الَّتِي عُرِجَ فِيهَا بِرُوحِ عِيسَى بْنِ مَرْيَمَ لَيْلَةَ سَبْعٍ وَعِشْرِينَ مِنْ رَمَضَانَ۔ وَزَادَ فِي رِوَايَةٍ أُخْرَى: مَا تَرَكَ

صَفْرَاءَ وَلَا بَيْضَاءَ إِلَّا سَبْعَمِائَةِ دِرْهَمٍ فَضَلَتْ مِنْ عَطَائِهِ۔

وَعِنْدَ أَبِيْ يَعْلٰى وَابْنِ جَرِيْرٍ وَابْنِ عَسَاكِرَ: عَنِ الْحَسَنِ۔۔۔۔ أَنَّهُ لَمَّا قُتِلَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَامَ خَطِيْبًا فَحَمِدَ اللّٰهَ وَأَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ: أَمَّا بَعْدُ! قَالَ: وَاللّٰهِ لَقَدْ قَتَلْتُمُ اللَّيْلَةَ رَجُلًا فِيْ لَيْلَةٍ نَزَلَ فِيْهَا الْقُرْآنُ، وَفِيْهَا رُفِعَ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَفِيْهَا قُتِلَ يُوْشَعُ بْنُ نُوْنٍ فَتٰى مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَفِيْهَا تِيْبَ عَلٰى بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ۔۔۔۔ وَزَادَ ثُمَّ قَالَ: مَنْ عَرَفَنِيْ فَقَدْ عَرَفَنِيْ وَمَنْ لَّمْ يَعْرِفْنِيْ فَأَنَا الْحَسَنُ بْنُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْآيَةَ قَوْلَ يُوْسُفَ: ”وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِيْ إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ۔“ ثُمَّ أَخَذَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ ثُمَّ قَالَ: أَنَا ابْنُ الْبَشِيْرِ! أَنَا ابْنُ النَّذِيْرِ! وَأَنَا ابْنُ النَّبِيِّ! أَنَا ابْنُ الدَّاعِيْ إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهِ، وَأَنَا ابْنُ السِّرَاجِ الْمُنِيْرِ! وَأَنَا ابْنُ الَّذِيْ أُرْسِلَ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ، وَأَنَا مِنْ أَهْلِ الْبَيْتِ الَّذِيْنَ أَذْهَبَ اللّٰهُ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَطَهَّرَهُمْ تَطْهِيْرًا، وَأَنَا مِنْ أَهْلِ الْبَيْتِ الَّذِيْنَ افْتَرَضَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ مَوَدَّتَهُمْ وَوِلَايَتَهُمْ وَقَالَ فِيْمَا أَنْزَلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قُلْ لَّا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى۔“

(حياة الصحابة ج:٦ ص:٦٩٨، ٦٩٩ طبع دار الفكر)

ترجمہ: ”ابن سعد نے ہبیرہ سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کھڑے ہوئے، منبر پر تشریف لے گئے، پھر فرمایا: اے لوگو! تحقیق قبض کیا گیا ہے آج کی رات وہ شخص جس سے آگے نہیں نکلے پہلے لوگ، اور جس کو پائیں گے نہیں پچھلے لوگ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کو بھیجتے تھے کسی مہم کے لئے تو فرشتے ان کے ساتھ ہوتے تھے، جبرائیل دائیں جانب، میکائل بائیں جانب، وہ لوٹتے نہیں تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے فتح کردے اور انہوں نے نہیں چھوڑی کوئی چیز سوائے سات سو درہم کے کہ ان پیسوں سے خادم خریدنے کا ارادہ رکھتے تھے اور وہ قبض کئے گئے اس رات میں جس میں اوپر لے جایا گیا روح اللہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو، یعنی رمضان المبارک کی ۲۷ رات۔

اور ابن سعد کی دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے کوئی سونا، چاندی نہیں چھوڑا، سوائے سات سو درہم کے، جو ان کے وظیفے سے بچ گئے تھے۔

ابو یعلیٰ ابن جریر اور ابن عساکر نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی

ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا: امابعد! اللہ کی قسم تم نے قتل کردیا آج کی رات اس آدمی کو، اس رات میں جس میں قرآن نازل ہوا تھا اور جس میں حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اٹھایا گیا اور جس میں حضرت یوشع بن نون علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قتل کیا گیا، جو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خادم تھے اور جس رات میں بنی اسرائیل کی توبہ قبول ہوئی۔

طبرانی نے ابوطفیل سے ایک اور روایت نقل کی ہے، اس میں یہی روایت ہے، آگے اتنا اضافہ ہے کہ: پھر آپ نے فرمایا: جو مجھے جانتا ہے وہ تو جانتا ہے اور جو مجھے نہیں جانتا میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ میں حسن بن محمد ہوں (صلی اللہ علیہ وسلم) پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی جس میں حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول ہے: ''اور میں نے پیروی کی اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے مذہب کی۔'' پھر قرآن کریم کی تلاوت فرماتے رہے، اس کے بعد فرمایا: میں بشیر کا بیٹا ہوں، میں نذیر کا بیٹا ہوں، میں نبی کا بیٹا ہوں، میں داعی الی اللہ کا بیٹا ہوں، میں سراجاً منیراً کا بیٹا ہوں، میں اس ذات کا بیٹا ہوں جن کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا گیا تھا، میں ان اہل بیت میں سے ہوں جن سے اللہ تعالیٰ نے رجس اور گندگی کو دور کردیا اور ان کو خوب پاک کردیا اور میں اس اہل بیت کا فرد ہوں جن پر اللہ عزوجل نے ان کی دوستی اور ولایت کو تم پر فرض کردیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: آپ کہہ دیجئے کہ میں اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا مگر اتنا کہتا ہوں کہ قرابت کی دوستی کا لحاظ رکھو۔''

خلافتِ راشدہ کا تتمہ:

خلفائے راشدین چار ہیں، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان حضرت علی رضی اللہ عنہم اور پانچویں خلیفہ راشد حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما ہیں، امام حسن رضی اللہ عنہ اور ان کی خلافت حقیقت میں تتمۂ خلافت راشدہ تھی، وہ چھ مہینے خلیفہ رہے، چالیس کا سن ہونے میں چھ مہینے باقی تھے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا جیسا کہ اس سے پہلے آچکا ہے، لوگوں نے آخری وقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ کے صاحبزادے کو آپ کا جانشین بنادیا جائے؟ یعنی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہ میں اس کا تمہیں حکم کرتا ہوں اور نہ اس سے منع کرتا ہوں۔ آپ سے کہا گیا کہ: آپ کسی کو اپنی جگہ نامزد کرجائیں، فرمایا: میں کسی کو نامزد نہیں کرتا، میں تمہیں اسی طرح چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں چھوڑ گئے تھے، بہرکیف

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے نواسے ہیں، سبط اکبر ہیں، ان کو خلیفہ بنایا گیا، اور یہ خلیفہ تھے اس حصہ پر جس حصے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکومت تھی اور اس وقت ملک کا بیشتر حصہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زیر نگیں آچکا تھا، تھوڑا سا حصہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس رہ گیا تھا، چھ مہینے کے بعد جبکہ چالیس کا سن پورا ہوا تو اکتالیسویں سال میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی اور حکومت ان کے سپرد کر کے خود دستبردار ہو گئے، اس لئے اکتالیسویں سن کو اسلامی تاریخ میں عام الجماعۃ کہا جاتا ہے یعنی وہ سال جس میں سارے مسلمان متفق ہو گئے اور دو گروہ اور دو جماعتیں نہیں رہیں۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح:

صحیح بخاری کی حدیث ہے، اور یہ حدیث شیعہ کتابوں میں بھی موجود ہے، جس کو میں نے ''شیعہ سنی اختلافات اور صراطِ مستقیم'' میں نقل کر دیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا تھا، جبکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ بچے تھے، فرمایا:

''اِبْنِی ھٰذَا سَیِّدٌ، وَلَعَلَّ اللّٰہَ اَنْ یُّصْلِحَ بِہٖ بَیْنَ فِئَتَیْنِ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔''

(صحیح بخاری ج:۱ ص:۵۳۰)

ترجمہ: ''یہ میرا بیٹا سید ہے، مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان جوڑ پیدا کر دیں گے، صلح کر دیں گے۔''

میں نے شیعہ کی مستند کتابوں کے حوالے سے اس میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کی تو ایک تحریر لکھ کر دی تھی:

''ھٰذَا مَا صَالَحَ عَلَیْہِ حَسَنُ بْنُ عَلِیٍّ وَمُعَاوِیَۃُ بْنُ اَبِی سُفْیَانَ۔''

ترجمہ: ''یہ وہ تحریر ہے جس پر کہ حسن بن علی اور معاویہ بن ابوسفیان نے صلح کی۔''

یعنی یہ وہ معاہدہ ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ حکومت سے دستبردار ہوتے ہیں اور حکومت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کرتے ہیں اور یہ ہے کہ ان سے عہد لیتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سنّت پر عمل کریں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی چھ ماہ خلافت یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا تتمہ تھا، اس لئے خلفائے راشدین چار ہی کہلاتے ہیں، مشہور چار خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم ہیں اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بھی خلفائے راشدین میں بایں معنی شامل کیا جاتا ہے کہ ان کی خلافت ان کے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا تتمہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام:

ہبیرہ کہتے ہیں کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ فجر کی نماز کے وقت عبدالرحمٰن بن ملجم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا تھا اور اس سے وہ زخمی ہو گئے تھے، رات میں جا کے انتقال ہو گیا، تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف لے گئے اور خطبہ پڑھا اور اس میں فرمایا:

''لوگو! آج رات ایک ایسے آدمی کا انتقال ہو گیا ہے کہ پہلے لوگ اس سے آگے نہیں نکل سکے اور پچھلے لوگ نہیں پا سکیں گے۔''

بالکل صحیح فرمایا، یہ آخری خلفائے راشدین وخاتمۃ الخلفائے المہدیین تھے۔

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا درجہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم اس صف کے آدمی تھے، جب ایک لائن میں امام کے پیچھے کھڑے ہوں، تو ایک آدمی بھی ان میں سے آگے نہیں ہیں اور نہ پیچھے، یہ حضرات اپنے اپنے درجے کے اعتبار سے الگ الگ ہیں لیکن صف ایک ہے، یہ چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اپنے اپنے مراتب اور اپنی اپنی افضلیت کے باوجود ایک لائن کے اور ایک صف کے آدمی ہیں اور وہ صف خلافتِ راشدہ کی صف ہے، اس لئے پہلے لوگوں میں سے ایک آدمی بھی اس سے آگے نہیں نکل سکا کہ اس سے اگلی صف میں چلا جائے، آگے صف بھی نہیں ہے، آگے تو امام کا مصلیٰ ہے، اور امام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سب سے پہلی صف خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی ہے۔

پوری اُمّت کے اولیاء مل کر صحابی کی شان کا مقابلہ نہیں کر سکتے:

فرمایا کہ پچھلوں میں سے ان کو کوئی پا نہیں سکے گا، یہ بات بھی بالکل بجا ہے، ساری اُمّت کے اولیاء اللہ، پیرانِ پیر، شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ، صرف اس سطح کے بزرگ نہیں بلکہ اس سے بھی اوپر کے امام حسن بصری، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور دوسرے اکابر تابعین رحمۃ اللہ علیہم، یہ سارے کے سارے مل جائیں، کسی ایک صحابی کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتے۔

مشکوٰۃ شریف کی حدیث ہے اور یہ صحیحین کے حوالے سے یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے حوالے سے ہے:

''قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ فَيَغْزُوْ فِئَامٌ مِنَ النَّاسِ فَيَقُوْلُوْنَ: هَلْ فِيْكُمْ مَنْ صَاحَبَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ؟ فَيَقُوْلُوْنَ: نَعَمْ! فَيُفْتَحُ لَهُمْ۔ ثُمَّ يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ فَيَغْزُوْ فِئَامٌ مِنَ النَّاسِ فَيُقَالُ: هَلْ فِيْكُمْ مَنْ صَاحَبَ اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَيَقُوْلُوْنَ: نَعَمْ! فَيُفْتَحُ لَهُمْ۔ ثُمَّ يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ فَيَغْزُوْ فِئَامٌ مِنَ النَّاسِ فَيُقَالُ: هَلْ فِيْكُمْ مَنْ صَاحَبَ مَنْ صَاحَبَ اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَيَقُوْلُوْنَ: نَعَمْ! فَيُفْتَحُ لَهُمْ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔" (مشکوٰۃ ص:۵۵۳)

ترجمہ: ''آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: لوگوں پر ایک وقت آئے گا کہ ایک مجاہد فوج جہاد کے لئے جائے گی (کافروں سے مقابلہ ہو رہا ہے اور صورتحال پیچیدہ ہو رہی ہے) تو لوگ کہیں گے: (تلاش کرو) تم میں کوئی حضرت محمد ﷺ کا صحابی ہے؟ (یعنی جس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہو، جس کی ظاہری نظریں آنحضرت ﷺ کے چہرۂ انور پر پڑی ہوں، کوئی ہے تم میں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تلاش کرنے پر ایک آدمی مل جائے گا، جس نے آنحضرت ﷺ کے رخِ انور کے جمال جہاں آرا کو دیکھا تھا) لوگ کہیں گے: جی ہاں! (لوگ اس کے طفیل سے دعا کریں گے کہ یا اللہ! یہ تیرے محمد ﷺ کے صحابی ہیں، ان کی برکت سے ہمیں فتح عطا فرمادے۔) پس اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمادیں گے۔ اس کے بعد ایک اور فوج جائے گی کافروں کے مقابلہ میں (یہاں بھی یہی صورتحال پیچیدہ ہوگی) تو لوگ کہیں گے: کیا تم میں سے کوئی ایسا آدمی ہے جس نے حضور ﷺ کے کسی دیکھنے والے کو دیکھا ہو؟ (اس کو تابعی کہتے ہیں، کوئی ایسا خوش نصیب انسان جس نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زیارت کی ہو، فرمایا: تلاش کرنے پر وہ مل جائے گا، اس کے طفیل سے لوگ دعا کریں گے۔ ناقل) اور اللہ اس کو فتح عطا فرمائیں گے۔ پھر ایک تیسرا لشکر جائے گا (کسی زمانے میں ان کافروں سے مقابلہ ہوگا) تو لوگ کہیں گے: تم میں سے کوئی ایسا آدمی ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے دیکھنے والوں کے دیکھنے والوں کو دیکھا ہے؟ (یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کے دیکھنے والوں کو دیکھا ہو، تابعین میں سے کسی کو دیکھا ہو، ان کو کہتے ہیں تبع تابعین، فرمایا: تلاش کرنے پر مل جائے گا، لوگ اس کی برکت سے دعا کریں گے فتح کی) اللہ تعالیٰ ان کو فتح عطا فرمادیں گے۔''

تو میں عرض کر رہا تھا کہ ساری اُمت کے اولیاً اور اکابر مل کر، کسی صحابی کے ساتھ قدم ملا کر نہیں چل سکتے، چل ہی نہیں سکتے، ممکن ہی نہیں، تو بعد والے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کیسے مل جائیں گے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا موازنہ:

شیعوں کی کتاب ہے "نہج البلاغۃ" جس کو سید شریف رضی نے جمع کیا ہے، اس میں گڑبڑ تو بہت کی گئی ہے لیکن خیر اس میں امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک خط نقل کیا ہے (اور اس کو بھی میں نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے)، جس کا ترجمہ یہ ہے: "زمانے کی بوالعجبی دیکھو کہ میرے مقابلے میں معاویہ کو لایا جاتا ہے۔" اور واقعی یہ بوالعجبی تھی زمانے کی، کوئی شک نہیں، کہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور کہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، دونوں کا کوئی جوڑ نہیں ہے، صحابی دونوں ہیں اس میں شک نہیں ہے لیکن امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ "السابقون الاولون" میں سے ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں میں سے ہیں، جن کو طلقاء کہا جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطَّلَقَاء۔" (یعنی جاؤ تم سب آزاد ہو)، بالکل صحیح فرمایا، بالکل بجا ارشاد فرمایا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ جوڑنا، ان کا ان کے ساتھ موازنہ کرنا، زمانے کی ستم ظریفی اور بوالعجبی ہے، بھائی! ان دو آدمیوں کو تولا جاتا ہے جن کے درمیان دو قدریں مشترک ہوں، دونوں کا باٹ تو ایک ہو۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور بعد کے لوگوں کا موازنہ:

میں نے حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے اس قول کی شرح کرنے کے بعد لکھا کہ جس طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں لانا اور ان سے موازنہ کرنا زمانے کی ستم ظریفی اور بوالعجبی ہے، اسی طرح بعد کے لوگوں کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے برابر لانا اور ان سے موازنہ کرنا یہ بھی ستم ظریفی اور بوالعجبی ہے، بعد کے لوگوں کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کیا مقابلہ؟ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آج رات وہ آدمی اللہ کو پیارا ہو گیا کہ پہلے لوگ اس سے آگے نہیں نکل سکے، ایک ہی صف میں کھڑے ہیں، مرتبہ کے اعتبار سے عند اللہ آگے پیچھے ہوں گے، مگر ہم تو سب کو ایک لائن میں کھڑا دیکھتے ہیں، چاروں ایک لائن میں کھڑے ہیں اور پچھلے لوگ اس کو پا نہیں سکتے، پھر فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بھیجتے تھے کسی مہم پر، یعنی جہاد کے لئے تو دائیں جانب جبرائیل ہوتے تھے اور بائیں جانب میکائیل ہوتے تھے اور وہ آتے تھے تو فتح کر کے آتے تھے۔

فتح خیبر کا قصہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ خیبر کی وجہ سے مشہور ہیں، خیبر کا دروازہ توڑنے والے تھے۔ لوگوں نے کچھ اس میں اپنی طرف سے بھی ملا دیا ہے، ملا بھی دیتے ہیں زیب داستان کے لئے، لیکن اتنی بات ہے کہ خیبر کا قلعہ فتح

نہیں ہوا، پہلے دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا مگر قلعہ فتح نہیں ہوا، دوسرے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا مگر قلعہ فتح نہیں ہوا، ایک دن میں فتح نہیں ہوا کرتا، بعض دفعہ کسی قلعے کو فتح کرنے میں مہینوں لگ جاتے ہیں، پہلے دن تو یوں کہو کہ تدبیروں میں گزر جاتے ہیں کہ کس طرح کیا جائے، توشیخین رضی اللہ عنہما نے جو کچھ کیا تھا وہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے لئے کیا تھا، ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لَاُعْطِیَنَّ هٰذِهِ الرَّایَةَ رَجُلًا یَفْتَحِ اللّٰہُ عَلٰی یَدَیْهِ یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیُحِبُّهُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ ۔۔۔۔۔۔ قَالَ فَلَمَّا اَصْبَحَ النَّاسُ غَدَوْا عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کُلُّهُمْ یَرْجُوْ اَنْ یُّعْطَاهَا فَقَالَ اَیْنَ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ؟ فَقَالُوْا: هُوَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ یَشْتَکِیْ عَیْنَیْهِ۔ قَالَ: فَاَرْسِلُوْا اِلَیْهِ، فَاُتِیَ بِهٖ فَبَصَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ عَیْنَیْهِ وَدَعَا لَہٗ فَبَرِءَ حَتّٰی کَاَنْ لَّمْ یَکُنْ بِهٖ وَجْعٌ فَاَعْطَاهُ الرَّایَةَ ۔۔۔۔۔۔ قَالَ: ثُمَّ ادْعُهُمْ اِلَی الْاِسْلَامِ ۔۔۔۔۔۔ فَوَاللّٰہِ لَاَنْ یَّهْدِیَ اللّٰہُ بِکَ رَجُلًا وَّاحِدًا خَیْرٌ لَّکَ مِنْ اَنْ یَّکُوْنَ لَکَ حُمْرُ النَّعَمِ۔"

(صحیح مسلم ج:۲ ص:۲۷۹)

"وَفِیْ رِوَایَةٍ قَالَ اِمْشِ وَلَا تَلْتَفِتْ حَتّٰی یَفْتَحِ اللّٰہُ عَلَیْکَ قَالَ فَسَارَ عَلِیٌّ شَیْئًا ثُمَّ وَقَفَ وَلَمْ یَلْتَفِتْ فَصَرَخَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! عَلٰی مَاذَا اُقَاتِلُ النَّاسَ؟ قَالَ: قَاتِلْهُمْ حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ ۔۔۔ الخ۔" (صحیح مسلم ج:۲ ص:۲۷۹)

ترجمہ: "آج میں جھنڈا ایک ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اس سے محبت رکھتے ہیں، جب صبح ہوئی صحابہ رضی اللہ عنہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور ہر ایک اس امید میں تھا کہ جھنڈا اس کو دیا جائے گا، لوگ سر اونچا کرکے دیکھنے لگے کہ کس کو دیا جاتا ہے، (اور امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "وَاللّٰہِ! مَا اَحْبَبْتُ الْاِمَارَةَ اِلَّا یَوْمَئِذٍ۔" اللہ کی قسم! امیر بننے کی کبھی خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی، سوائے اس دن کے، تو لوگ گردن اونچی کرکے دیکھنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ہم پر پڑے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر دوڑائی) اور فرمایا: "اَیْنَ عَلِیٌّ؟" علی کہاں ہیں؟ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! ان کی تو آنکھیں پھولی ہوئی ہیں، آشوبِ چشم ہے، آنکھیں دکھتی ہیں، فرمایا: ان کو لاؤ، ان کے خیمے سے ایک آدمی ان کا بازو پکڑ کر لایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا تو فرمایا: قریب ہو جاؤ! حضرت علی رضی اللہ عنہ قریب ہو گئے، لعاب مبارک لے کر دونوں آنکھوں پر لگایا،

امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم! اسی لمحہ آنکھیں ٹھیک ہوگئیں، اور پھر ساری عمر کبھی مجھے آنکھوں کی شکایت نہیں ہوئی۔ جھنڈا ان کے ہاتھ میں دیا، اور فرمایا: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ تیرے ذریعہ سے ایک آدمی کو ہدایت عطا فرمادیں، تو یہ تیرے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا، حضرت علی رضی اللہ عنہ چل پڑے، ساتھ لشکر تھا، ابھی چند قدم چلے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بات پوچھنے کی ضرورت پیش آئی، منہ اسی طرف ہے پیچھے نہیں لوٹے، کہنے لگے: یا رسول اللہ! کس بات پر لوگوں سے قتال کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔۔۔۔۔الخ۔"

تو کوئی شک نہیں کہ اللہ کے فرشتے ان کے دائیں بائیں ہوتے ہوں، یہ جہاد کے لئے جاتے تھے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کسی مہم پر بھیجا ہو اور اللہ نے فتح نہ عطا فرمائی ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شیخین رضی اللہ عنہما پر فضیلت:

یہاں کسی کو یہ وہم نہیں ہونا چاہئے کہ شیخین رضی اللہ عنہما پر افضلیت ثابت ہوگئی، اس پر اگر بحث کروں گا تو بات بہت لمبی ہوجائے گی اور میں یہاں سے دوسری طرف نکل جاؤں گا، بہرحال ایک خاص فضیلت جو اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عطا فرمائی ہے، اس کا نہ دوسروں سے مقابلہ ہے اور نہ اس سے ان کا ان اکابر سے افضل ہونا لازم آتا ہے۔

فضیلتِ شیخین رضی اللہ عنہما اور حضرت علی رضی اللہ عنہ:

میں پہلے بتاچکا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کے منبر پر بیٹھ کر اپنے امیر المؤمنین ہونے کے زمانے میں فرمایا کرتے تھے کہ:

"اِنَّ خَیْرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بَعْدَ نَبِیِّهَا اَبُوْ بَکْرٍ وَ عُمَرَ۔"

(البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳)

ترجمہ: "اس اُمّت میں سب سے افضل ترین انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر اور عمر ہیں (رضی اللہ عنہما)۔"

اور میں نے یہ بھی نقل کیا تھا کہ منبر سے اترتے ہوئے فرمایا: "لَوْ شِئْتُ اَقُوْلُ ثَالِث۔" اگر میں چاہوں تو تیسرے کا نام بھی لے سکتا ہوں، کسی نے پوچھا ہوگا کہ وہ تیسرا کون ہے؟ فرمایا: "عثمان! (رضی اللہ عنہ)۔"

محمد بن حنفیہ ان کے صاحبزادے ہیں، ان کا قول بھی نقل کرچکا ہوں کہ:

''قُلْتُ لِاَبِیْ اَیُّ النَّاسِ خَیْرٌ بَعْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: اَبُوْبَکْرٍ! قَالَ: قُلْتُ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: عُمَرُ! وَخَشِیْتُ اَنْ یَقُوْلَ عُثْمَانُ، قُلْتُ: ثُمَّ اَنْتَ! قَالَ: مَا اَنَا اِلَّا رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔'' (بخاری ج:۱ص:۵۱۸)

ترجمہ: ''میں نے اباجان سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل آدمی کون ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (بیٹے تم جانتے نہیں؟ میں نے کہا: نہیں!) حضرت ابوبکر! میں نے کہا پھر کون افضل ہیں؟ فرمایا: عمر! میں نے کہا اگر پھر میں نے ''ثُمَّ مَنْ؟'' کہہ دیا کہ اور کون؟ تو یہ حضرت عثمان کا نام لیں گے، اس لئے میں نے سوال بدل دیا اور کہا: ''ثُمَّ اَنْتَ؟'' پھر آپ؟ فرمایا: میں تو مسلمانوں کی جماعت کا ایک آدمی ہوں۔''

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تواضع تھی (میں مسلمانوں کی جماعت کا ایک آدمی ہوں، میری کیا بات)۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے افضلیت کا تاج تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سر پر سجایا ہے، مگر ان کے افضل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے سے فضیلت کی نفی ہورہی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زُہد:

اس کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ دنیا سے اس شان سے گئے ہیں کہ صرف سات سو درہم باقی تھے اور یہ ان کے عطیے میں سے باقی تھے اور وہ بھی ایک خادم خریدنے کے لئے رکھے تھے، یہ حضرت امیرالموٴمنین رضی اللہ عنہ کا زُہد تھا، کوئی چیز ساتھ نہیں تھی، یہ سات سو درہم کسی ضرورت کے لئے رکھے تھے، ورنہ ان کو بھی نمٹا دیتے، جیسے ان سے پہلے دونوں بھائیوں نے نمٹا دیئے تھے۔

شیخین رضی اللہ عنہما کا زُہد:

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما جس دن گئے ہیں، دامن جھاڑ کر گئے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا معمول شریف یہ تھا کہ ہر ہفتے بیت المال میں جھاڑو دلوادیتے تھے کہ کوئی چیز پڑی نہ رہے، آپ کو معلوم ہے یہ تو پہلے آچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو روز کے روز نمٹا دیتے تھے، اگلے دن کے لئے نہیں رکھتے تھے، یعنی مسلمانوں کے مال سے بھی اسی دن نمٹا دیتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زُہد:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن کروٹیں بدل رہے تھے، نیند نہیں آرہی تھی،

میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا بات اور کیا پریشانی ہے؟ تکیہ کے نیچے سے سات درہم نکالے (سات تھے یا کم وبیش تھے)، فرمایا: یہ آج خرچ ہونے سے رہ گئے ہیں، اور مجھے فکر لگ رہی ہے کہ اگر اسی رات میں میرا انتقال ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ آنحضرت ﷺ کا معمول تو یہ تھا کہ روز کے روز نمٹاتے تھے۔

اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا معمول یہ تھا (معیار نیچے آگیا) کہ ہفتے کے ہفتے نمٹاتے تھے اور جس شخص کو بیت المال پر مقرر کیا تھا، اس کو حکم تھا کہ ہر ہفتے بیت المال پر جھاڑو دے دی جائے، قومی خزانے میں ایک سوئی بھی باقی نہ رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مہینے میں جھاڑو دلواتے تھے اور فرماتے تھے کہ کسی چیز کو ایک مہینے سے زیادہ نہیں پڑا رہنا چاہئے، سب کو نمٹا دو، تو ان اکابر کی طرح ایسا کون کر سکتا ہے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دِن:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آج رات جس میں کہ ان کا انتقال ہوا یہ وہ رات ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آسمان پر اٹھایا گیا اور اس میں کہ حضرت یوشع بن نون حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خادم کو شہید کیا گیا، بنی اسرائیل نے ان کو شہید کیا تھا، ان کے لئے تو یہ معمولی بات تھی اور اس رات میں بنی اسرائیل کی توبہ قبول کی گئی تھی اور یہ تھی رمضان کی ۲۷ رشب، لیلۃ القدر۔

یہاں دو مسئلے ذکر کرتا ہوں، وقت تھوڑا ہے، بہت مختصر کرتا ہوں:

موت کے لئے اچھے وقت کا ملنا:

ایک تو یہ ہے کہ کسی شخص کو وفات کے لئے مبارک ترین وقت دے دیا جاتا ہے، یہ حق تعالیٰ شانہٗ کی خاص عنایت ہے، شب قدر میں کسی کا انتقال ہو، سبحان اللہ! کیا بات ہے! زہے سعادت، زہے نصیب، اسی طرح رمضان المبارک میں کسی کا انتقال ہو جانا اور خصوصیت کے ساتھ رمضان المبارک میں جمعہ کے دن انتقال ہونا، شب جمعہ میں، سبحان اللہ! ایک حدیث میں آتا ہے:

"قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اَوْ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ اِلَّا وَقَاهُ اللهُ فِتْنَةَ الْقَبْرِ۔" (مشکوٰۃ ص:۱۲۱)

ترجمہ: "آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: شب جمعہ میں یا جمعہ کے دن میں جس مسلمان کا انتقال ہو، اس سے قبر کا حساب وکتاب نہیں ہوتا، (اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے، اچھی موت نصیب فرمائے اور موت کے لئے اچھا وقت نصیب فرمانا یہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔)"

حیات ورفع عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام:

دوسرا مسئلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اٹھایا جانا، اس معاملے میں مسلمانوں کو مرزائی بہت دھوکہ دیتے ہیں، مسلمانوں کی عام گفتگو میں یہ مسئلہ بھی نہیں آتا، نہ کبھی وعظ میں، نہ کبھی منبر پر، اس کا تذکرہ ہی نہیں آتا، مسلمان خالی الذہن ہوتے ہیں، مرزائی کہتے ہیں کہ جی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمان پر اٹھالیا، اچھا! اور ساتھ ہی کہتے ہیں کہ مولوی تو کہتے ہیں اٹھالیا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیسے اٹھالیا؟ کس طرح اٹھا سکتے ہیں؟ جدید سائنس تو یہ کہتی ہے کہ آسمان ہے ہی نہیں۔

قادیانی دجل:

ہمارے عوام بے چارے تو کسی چیز سے واقف نہیں، کہتے ہیں کہ بھائی! آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے اور قادیانی یہ بھی کہتے ہیں کہ دیکھیں ان مُلّاؤں کا عقیدہ عیسائیوں جیسا ہے، عیسائی بھی کہتے ہیں کہ وہ اپنے باپ کے پہلو میں جا کر بیٹھ گیا اور یہ مُلّا بھی یہی کہتا ہے (نعوذ باللہ! استغفر اللہ!)۔

ایک بات یہ بھی کہتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بچانے کے لئے زمین میں کوئی جگہ نہیں ملی تھی کہ اللہ پاک ان کو آسمان میں لے گئے، جو شخص کافر ہو، وہ جو چاہے بکتا رہے۔

حیات ورفع الی السماء کا عقیدہ قرآن وسنّت سے ثابت ہے:

میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کا مسئلہ، مولوی کا مسئلہ نہیں ہے، قرآن کا مسئلہ ہے، حدیث شریف کا مسئلہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک تمام بڑے بڑے علمائے اُمّت واکابرین کا مسئلہ ہے، ایک عالم کا، ایک بزرگ کا بھی اس میں اختلاف نہیں ہے۔

حیاتِ عیسیٰ اور قرآن:

ساتویں پارے کے شروع میں جو پہلا رکوع چلتا ہے، اس میں بنی اسرائیل پر، یہودیوں پر اللہ تعالیٰ نے کئی فردِ جرم عائد کئے ہیں، ایک نمبر، دو نمبر، تین نمبر، چار نمبر، ایسے چلتے گئے۔ اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ﴾ ان پر ایک فردِ جرم یہ ہے کہ بکتے ہیں کہ ہم نے قتل کردیا عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو، (نعوذ باللہ من ذالک)، قرآن کریم نے یہ ان کا دعویٰ نقل کیا، اس کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ

يَقِيْنًا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾ (النساء)

ترجمہ: ''انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو نہ قتل کیا، نہ سولی پر چڑھایا، بلکہ ان کو اشتباہ ہو گیا، جو لوگ اس مسئلہ میں اختلاف کرر ہے ہیں وہ خود شک میں پڑے ہوئے ہیں، ان کو کوئی علم نہیں حقیقت حال کا، محض اٹکل پچو خیالات کی پیروی کرر ہے ہیں، (بتادیا کہ ان کو علم نہیں جو کچھ بھی ان کی کوئی رائے وعقیدہ ہے، محض اٹکل پچو ہے، اس کی بنیاد یقین پر نہیں ہے اور آگے پھر لوٹتے ہیں) اور فرماتے ہیں: انہوں نے قتل نہیں کیا عیسیٰ علیہ السلام کو یقینی طور پر، بلکہ اٹھالیا ان کو اللہ نے اپنی طرف اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔''

ہمارے حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کوئی تشریح نہ کرو آیت کی اپنی طرف سے، ایک عام مسلمان کے سامنے اس آیت کو پڑھو اور پڑھ کر اس سے پوچھو کہ کیا مطلب سمجھے اس آیت کا؟ انہوں نے قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے اُٹھالیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں انہوں نے قتل نہیں کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قطعی طور پر، یقینی طور پر، بلکہ اللہ نے اُٹھالیا ان کو اپنی طرف۔

ہم نے نہیں اللہ نے اُٹھالیا:

رہی یہ بات کہ کیسے اُٹھالیا؟ اور وہ آسمان پر کیسے جاسکتے ہیں؟ بھائی! ہم نے کب کہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خود گئے تھے، ہم تو کہتے ہیں کہ اُٹھالیا تھا، یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ اُٹھاسکتا ہے کہ نہیں؟

رفع کی حکمت:

اور یہ دعویٰ کرنا کہ ان کے بچانے کے لئے کیا زمین پر کوئی جگہ نہ ملی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ملی ہوگی لیکن اللہ کو منظور ہی یہ ہوگا کہ وہاں رکھیں، چنانچہ فرمایا: اور اللہ تعالیٰ ہے بہت بڑا زبردست اور بڑی حکمت والا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سارے اعتراضات کا جواب دے دیا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ بجسدہ آسمان پر اُٹھایا جانا، قرآن کا مسئلہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسئلہ ہے، تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع ہے اور پوری اُمت کا اس پر اِجماع ہے، اب اگر کوئی اس کو نہیں مانتا ہے، اور وہ کفر کی وادی میں گرنا چاہے تو گرے، لیکن اسلام کا مسئلہ یہ ہی رہے گا۔

رفعِ عیسیٰ کے منکر معراج کے منکر کیوں نہیں؟

یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیسے اُٹھالیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو یہ بتایا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر کیسے تشریف لے گئے تھے؟ مشہور قصہ ہے کہ ایک کافر نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ وہ تمہارے

دوست دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اوپر تشریف لے گئے تھے، تو فرمایا کہ وہ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہیں، کہا کہ کیسے ٹھیک کہتے ہیں؟ وہ اوپر کیسے جاسکتا ہے؟ تو فرمانے لگے کہ ہم اس سے بڑی بات کو مانتے ہیں کہ اوپر والے ان کے پاس آتے ہیں، تم عجیب آدمی ہو، یہ تو چھوٹی بات ہے کہ ان کو اوپر لے گئے، ہم تو اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ جبرائیل علیہ السلام و میکائیل علیہ السلام ان کے پاس آتے ہیں، کیا فرشتے نہیں آتے؟ تو جو اللہ تعالیٰ جبرائیل و میکائیل اور دوسرے ملائکہ کو ان نبیوں کے پاس بھیج سکتا ہے وہی نبیوں کو اگر اُوپر لے جانا چاہے تو کیوں نہیں لے جاسکتا؟

خلفائے اربعہ کا انتخاب اور عدل وانصاف

[حدیث:۱۳۰۲] "عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ فِیْ خُطْبَتِهٖ: اَلَا! اِنِّیْ اُوْشِکُ فَاُدْعٰی فَاُجِیْبُ فَیَلِیْکُمْ عُمَّالٌ مِنْ بَعْدِیْ یَعْمَلُوْنَ بِمَا تَعْلَمُوْنَ وَیَعْمَلُوْنَ مَا تَعْرِفُوْنَ، وَطَاعَةُ اُولٰٓئِکَ طَاعَةٌ، فَتَلْبَثُوْنَ کَذٰلِکَ زَمَانًا فَیَلِیْکُمْ عُمَّالٌ مِنْ بَعْدِهِمْ یَعْمَلُوْنَ بِمَا لَا تَعْلَمُوْنَ وَیَعْمَلُوْنَ بِمَا لَا تَعْرِفُوْنَ، فَمَنْ قَادَهُمْ وَنَاصَحَهُمْ فَاُولٰٓئِکَ قَدْ هَلَکُوْا وَاَهْلَکُوْا وَخَالِطُوْهُمْ بِاَجْسَادِکُمْ وَزَایِلُوْهُمْ بِاَعْمَالِکُمْ وَاشْهَدُوْا عَلَی الْمُحْسِنِ اَنَّهٗ مُحْسِنٌ وَعَلَی الْمُسِیْءِ." (مجمع الزوائد ج:۵ ص:۲۳۷)

ترجمہ: "حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا اس خطبہ میں ارشاد فرمایا: سنو! وہ وقت قریب آیا چاہتا ہے کہ میرے پاس میرے رب کا بلاوا آئے گا، تو میں اس بلاوے پر لبیک کہوں گا، میرے بعد تم پر کچھ لوگ حاکم ہوں گے جو عمل کریں گے ایسی باتوں پر جن کو تم جانتے ہو اور کریں گے ایسے کام جو تمہارے نزدیک معروف اور نیکی کے کام ہیں، ان لوگوں کی فرماں برداری کرنا بندگی اور عبادت ہے، پھر تم ایک زمانے تک اسی طرح رہو گے۔ ان کے بعد پھر تم پر ایسے حاکم مقرر ہوں گے جو عمل کریں گے ایسی باتوں پر جو تم نہیں جانتے، اور جو کریں گے ایسے کام جو تمہارے نزدیک معروف نہیں، پس جو شخص ان کی قیادت کرے، اور ان سے خیر خواہی کرے، پس یہ لوگ خود بھی ہلاک ہوئے اور انہوں نے دوسروں کو بھی ہلاک کردیا۔ اور تم لوگ بدن کے اعتبار سے ان میں ملے جلے رہو، لیکن اپنے عمل کے اعتبار سے ان سے الگ رہو، اور نیکوکار پر گواہی دو کہ وہ نیکوکار ہے اور برا کرنے

والوں پر گواہی دو کہ وہ برا کرنے والا ہے۔"

اسی طرح صحیح بخاری میں روایت ہے:

[حدیث:۱۳۰۳] "عَنْ اَبِیْ حُمَیْدِ السَّاعِدِیْ رَضِیَ اللہُ عَنْهُ اَنَّهٗ اَخْبَرَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَعْمَلَ عَامِلًا فَجَائَهُ الْعَامِلُ حِیْنَ فَرَغَ مِنْ عَمَلِهٖ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللہِ! هٰذَا لَکُمْ وَهٰذَا اُهْدِیَ لِیْ۔ فَقَالَ لَهٗ: اَفَلَا قَعَدْتَّ فِیْ بَیْتِ اَبِیْکَ وَاُمِّکَ فَنَظَرْتَ اَیُهْدٰی لَکَ اَمْ لَا؟ ثُمَّ قَامَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَشِیَّةً بَعْدَ الصَّلَاةِ فَتَشَهَّدَ وَاَثْنٰی عَلَی اللہِ بِمَا هُوَ اَهْلُهٗ، ثُمَّ قَالَ: اَمَّا بَعْدُ فَمَا بَالُ الْعَامِلِ نَسْتَعْمِلُهٗ فَیَأْتِیْنَا فَیَقُوْلُ: هٰذَا مِنْ عَمَلِکُمْ وَهٰذَا اُهْدِیَ لِیْ۔ اَفَلَا قَعَدَ فِیْ بَیْتِ اَبِیْهِ وَاُمِّهٖ فَنَظَرَ هَلْ یُهْدٰی لَهٗ اَمْ لَا؟ فَوَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ! لَا یَغُلُّ اَحَدُکُمْ مِنْهَا شَیْئًا اِلَّا جَاءَ بِهٖ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یَحْمِلُهٗ عَلٰی عُنُقِهٖ، اِنْ کَانَ بَعِیْرًا جَاءَ بِهٖ لَهٗ رُغَاءٌ، وَاِنْ کَانَتْ بَقَرَةٌ جَاءَ بِهَا لَهَا خُوَارٌ، وَاِنْ کَانَتْ شَاةٌ جَاءَ بِهَا تَیْعَرُ، فَقَدْ بَلَّغْتُ۔ فَقَالَ اَبُوْ حُمَیْدٍ: ثُمَّ رَفَعَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَدَهٗ حَتّٰی اِنَّا لَنَنْظُرُ اِلٰی عُفْرَةِ اِبْطَیْهِ، قَالَ اَبُوْ حُمَیْدٍ: وَقَدْ سَمِعَ ذٰلِکَ مَعِیَ زَیْدُ بْنُ ثَابِتٍ مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَسَلُوْهُ۔" (صحیح بخاری ج:۲ ص:۹۸۲)

ترجمہ: "حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عامل مقرر کیا تھا، جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوکر آیا تو کہنے لگا: یا رسول اللہ! یہ مال تمہارا ہے اور یہ مجھ کو ہدیہ کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: پھر تو اپنے باپ کے گھر میں یا اپنی ماں کے گھر میں کیوں نہ بیٹھ گیا، پھر دیکھتے کہ تجھ کو ہدیہ ملتا ہے کہ نہیں ملتا؟ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کو نماز کے بعد خطبہ دیا، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا: یہ کیا بات ہے کہ ہم ایک عامل کو مقرر کرتے ہیں وہ ہمارے پاس آتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ تمہارے عمل کا نتیجہ ہے، اور یہ مجھ کو ہدیہ دیا گیا ہے، یہ شخص اپنے باپ کے یا اپنی ماں کے گھر کیوں نہ بیٹھا رہا پھر دیکھتے کہ اس کو ہدیہ ملتا ہے کہ نہیں، پس قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! کہ تم میں سے کوئی شخص اس میں سے جو چیز بھی چھپائے گا، تھوڑی یا زیادہ، وہ قیامت کے دن اپنی کمر پر اور اپنی گردن پر لادے ہوئے آئے گا، اگر اونٹ تھا تو اس کو لائے گا اور وہ بولتا ہوگا، گائے ہوگی تو اس کو لائے گا اور وہ آواز نکال رہی ہوگی اور اگر بکری ہوگی تو اس کو لائے گا اس حال میں

کہ وہ آواز نکال رہی ہوگی۔ دیکھو یہ بات میں نے تمہیں پہنچادی ہے۔ حضرت ابوحمید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے بعد اپنا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا یعنی اس طرح اشارہ کرنے کے لئے یہاں تک کہ ہم آپ کے بغل کی سفیدی دیکھ رہے تھے۔ (حضرت) ابوحمید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا یہ خطبہ میرے ساتھ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بھی سنا تھا، تم چاہو تو ان سے پوچھ لو۔''

آنحضرت ﷺ کے یہ دو خطبے حکام کے بارے میں ہیں۔ پہلے خطبہ میں دو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں:

نیک حکام کی طاعت نیکی ہے:

ایک یہ کہ عنقریب میرے پاس میرے ربّ کی طرف سے بلاوا آنے والا ہے، اور میں اس بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ جاؤں گا، دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا، میرے بعد تم پر کچھ لوگ حاکم مقرر ہوں گے اور وہ حاکم ایسے ہوں گے کہ جو علم میں تمہیں دے کر جا رہا ہوں، اس علم کے مطابق عمل کریں گے، اور جو کام تمہارے ہاں معروف یا نیکی کے سمجھے جاتے ہیں، وہ معروف اور نیکی کا کام کریں گے، برائی کا کام نہیں کریں گے، ان لوگوں کی اطاعت تو عبادت ہے، ایسے حکام کا حکم ماننا اور ان کے حکم کی تعمیل کرنا اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔

بُرے حکام کے بارے میں طرزِ عمل؟

آپ ﷺ نے فرمایا اس پر ایک زمانہ گزرے گا، اس کے بعد پھر دوسری قسم کے حاکم آئیں گے، وہ اس علم کے مطابق عمل نہیں کریں گے جو تمہیں دیا گیا ہے، اور ان کاموں کو نہیں کریں گے جو کہ معروف اور نیکی کے کام ہیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے ساتھ ان کی قیادت کرنے والا، ان کے جلسے میں شریک ہونے والا اور ان کی خیر خواہی کرنے والا خود بھی ہلاک ہوا، دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔ ان حکام کے بارے میں یہ طرز عمل اختیار کرو کہ اپنے جسموں کے اعتبار سے تو ان کے ساتھ مل کر رہو، مسلمانوں کے درمیان تفرقہ نہ ہو، پھوٹ نہ ڈالی جائے، ایسے حکام کے خلاف بغاوت نہ کی جائے، جس سے مسلمانوں کی قوت منتشر ہوتی ہو، لیکن اپنے اعمال کے ساتھ ان سے الگ تھلگ رہو، ان کے جیسے اعمال نہ کرو۔

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ بلا فصل تھے:

پہلی قسم کے حکام حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم تھے، اور ''خلفائے راشدین'' کہا جاتا ہے چار

خلفاء کو، پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ بلافصل ہوئے۔

اس اُمّت میں سب سے پہلا جھوٹ:

اس اُمّت میں جو سب سے پہلا جھوٹ بولا گیا تھا وہ یہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ بلافصل نہیں، بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بلافصل ہیں، جھوٹ تو اور بھی بہت سارے بولے گئے، لیکن سب سے پہلا جھوٹ یہ تھا۔

پوری جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بیعت کی:

اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پوری کی پوری جماعت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا، ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کو خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب دیا گیا، ''امیر المؤمنین'' ان کا خطاب نہیں تھا، ''امیر المؤمنین'' کا خطاب سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ''یا امیر المؤمنین!'' کہہ کر لوگ نہیں بلاتے تھے، بلکہ ''یا خلیفۃ رسول اللہ!'' اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ! جماعت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ایک فرد بھی ایسا نہیں جس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کی ہو اور ان کی خلافت پر متفق نہ ہو گیا ہو۔

ثقیفہ بنی ساعدہ کے اختلاف کا قصہ:

ثقیفہ بنی ساعدہ (بنو ساعدہ انصار مدینہ کا ایک قبیلہ تھا) ان کا ایک چھپر تھا یعنی چوپال کہنا چاہئے جہاں لوگ بیٹھتے تھے، مجلس ہوتی تھی، اس میں حضرات انصار جمع ہو گئے اور اس پر غور کرنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نظام کیسے چلے گا؟ ان میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ان کے رئیس اور سردار بھی تھے، وہ کہنے لگے کہ بھائی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف لائے تھے، آپ ہمارے مقتدا تھے، ہمارے رسول تھے، ہماری جان، ہمارا مال، ہماری بیوی، بچے، ہمارے گھر بار آپ پر قربان تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نظم و نسق تو مقامی لوگوں کے پاس ہونا چاہئے۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیمار تھے کھڑے ہو کر تقریر بھی نہیں کر سکتے تھے، بیٹھے تھے، انصار ان کے ارد گرد جمع تھے اور قریب قریب اس پر متفق تھے کہ انہی کو خلیفہ بنائیں گے، ان حضرات کے پیش نظر صرف اتنی بات تھی کہ چونکہ یہ جگہ انصار کی جگہ ہے، لہٰذا یہاں کا حاکم بھی انصار میں سے ہونا چاہئے، لیکن یہ قصہ پورے عرب کا اور اس سے بڑھ کر پوری دنیا کا ہے۔

حضرات شیخین اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم کا ثقیفہ میں جانے کا قصہ:

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو کسی شخص نے آکر اطلاع دی اور کہا: ''اَدْرِکُوْا ھٰذِہِ الْاُمَّۃَ قَبْلَ

اَنْ تَھْلِکَ'' اس اُمّت کو سنبھالو اس سے قبل کہ یہ شروع ہی سے ہلاک ہو جائے، پہلے دن ان میں پھوٹ پڑ جائے، مہاجرین اور باہر کے لوگ انصار کو اپنا بڑا ماننے سے انکار کردیں، تو پہلے ہی دن سے اختلاف ہو جائے گا، یہ دونوں بزرگ اور تیسرے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ تھے، جن کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَمِیْنٌ، وَاَمِیْنُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اَبُوْ عُبَیْدَۃَ بْنُ الْجَرَّاحِ۔''

(مشکوٰۃ ص:۵۶۶)

یعنی ہر اُمّت کا ایک امین ہوتا ہے اور اس اُمّت کے امین ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، یعنی وہ دس آدمی جن کو دنیا میں جنّت کی بشارت دی گئی ہے، حضرات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی بات ہی کیا ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سوچ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم خاموشی سے جارہے تھے، آپس میں بات نہیں کررہے تھے، وہاں جاکر دیکھیں گے کہ مجلس کا کیا رنگ ہے؟ اور میں اپنے ذہن میں ایک تخلیق سوچ رہا تھا کہ جاکر یہ تقریر کروں گا، حضرات انصار کو سمجھاؤں گا، ہم وہاں پہنچے تو حضرات انصار کی تقریریں ہو رہی تھیں کہ بھئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اور مہاجرین بھی ہمارے مہمان تھے، نظم و نسق کا حصہ تو انصار کے پاس ہونا چاہئے، جب یہ تینوں حضرات تشریف لے گئے، چونکہ بزرگ تھے، اس لئے حضرات انصار خاموش ہوگئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اٹھنے لگا کہ میں تقریر کروں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے میرا بازو پکڑ کر مجھے بٹھادیا، جیسا کہ معلوم ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ذرا تیز آدمی تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نہایت حلیم تھے۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوگئے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دُرود شریف پڑھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سانحۂ ارتحال پر تعزیت کی، پھر حضراتِ انصار کے فضائل بیان فرمائے اور انہوں نے اسلام کی خاطر جو جو جانفشانیاں کی تھیں، ان کو ذکر فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کی جس طرح خدمت کی، اس کا تذکرہ فرمایا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے جو فضائل بیان فرمائے ہیں، وہ ذکر فرمائے، اس انداز سے تذکرہ کیا کہ تمام آنکھیں اشکبار تھیں اور سب کے سب رو رہے تھے، اس کے بعد فرمایا کہ بھائیو! تمہیں معلوم ہوگا اور آپ حضرات میں سے اکثر کو یاد ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

''اَلنَّاسُ تَبَعٌ لِقُرَیْشٍ فِیْ ھٰذَا الشَّانِ مُسْلِمُھُمْ تَبَعٌ لِمُسْلِمِھِمْ

وَ کَافِرُھُمْ تَبَعٌ لِکَافِرِھِمْ۔" (مشکوٰۃ ص:۵۵۰)

ترجمہ:......"لوگ ہمیشہ قریش کے تابع رہیں گے، اس شان میں کہ ان کے مسلمان، مسلمان قریش کے تابع رہیں گے، اور کافر، کافر قریش کے تابع رہیں گے۔"

اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمادیا تھا: "اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ" یعنی امام قریش میں سے ہوں گے، یعنی حکام۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قریش میں سے امام ہونا چاہئے یعنی خلیفہ اور حاکم اور آپ حضرات آنحضرت ﷺ کے زمانے میں بھی دین کے انصار اور حضور ﷺ کے وزیر تھے، اب بھی یہی منصب تمہیں ملے گا۔

ایک صاحب انصار میں سے اُٹھ کر کہنے لگے، ایک اعرابی کا فقرہ ضرب المثل ہے وہ انہوں نے پڑھا اور کہا کہ میں اس کا فیصلہ کئے دیتا ہوں: "مِنَّا اَمِیْرٌ وَ مِنْکُمْ اَمِیْرٌ" ایک امیر ہمارا اور ایک امیر تمہارا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بھائیو! کبھی ایک نیام میں دو تلواریں بھی سمائی ہیں؟ نہیں! بلکہ "مِنَّا اَمِیْرٌ وَ مِنْکُمْ وَزِیْرٌ" امیر قریش میں سے ہوں گے اور وزیر تمہارے ہوں گے۔ یہ کہا تو اس کے بعد فرمایا: قریش کے یہ دو بزرگ تمہارے پاس موجود ہیں، حضرت عمر بن خطاب اور ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہما۔ رسول اللہ ﷺ اس حالت میں ان سے رخصت ہوئے ہیں کہ آپ ان سے راضی تھے، ان میں سے ایک کے ہاتھ پر بیعت کرلو۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی بیعت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو تقریر میں سوچتا ہوا گیا تھا، ساری باتیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہہ ڈالیں، میری ایک بات بھی نہیں چھوڑی اور آپ کی پوری تقریر میں مجھے کوئی بات بری نہیں لگی، کسی بات سے مجھے اختلاف نہیں تھا، سوائے اس بات کے: "یہ دو بزرگ موجود ہیں، ان میں سے ایک کی بیعت کرلو" تو یہ بات مجھے بری لگی اور میں اُٹھ کر کھڑا ہوگیا، میں نے کہا: اس قوم کو شرم نہیں آئے گی جن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ موجود ہوں اور وہ کسی دوسرے کی بیعت کرے؟ میں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا کہ ایک انصاری نے مجھ سے پہلے بیعت کرلی اور پھر تو وہاں جتنے آدمی تھے، سب کے سب نے بیعت کرلی۔ وہاں ثقیفہ بنی ساعدہ میں صرف اتنا اختلاف ہوا تھا۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا قصور؟

مگر شیعہ لوگ آج تک اس بات کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) نے اُمت پر یہ احسان کیوں کیا؟ ان کو ایک کلمہ پر متفق کیوں کردیا؟ ان کے درمیان اتحاد و اتفاق کیوں باقی رہ

گیا؟ ان کو یہ اختلاف اور تکلیف ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اُمت کی خدمت کیوں کی؟ فتنۂ ارتداد کو فرو کیوں کیا؟ اور فوجیں جا کر عراق و شام سے کیوں لڑائیں؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو فوجیں افغانستان میں لڑ رہی تھیں اور ادھر مصر وغیرہ فتح ہو چکے تھے، اتنی ہزار مسجدیں بنا کر دیں، اتنے لاکھوں انسان مسلمان ہوئے، قیصر و کسریٰ کے خزانے مسجد نبوی میں ڈھیر ہوئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کوئی زکوٰۃ لینے والا نہیں ملتا تھا۔

پوری اسلامی آبادی میں مدت العمر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کسی عزیز قریب رشتہ دار تک کو کسی جگہ کا حاکم مقرر نہیں کیا، حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ جو عشرۂ مبشرہ میں ہیں اور حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا کے شوہر ہیں، وہی فاطمہ جن کا چہرہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زخمی کیا تھا، ان کو کبھی کسی علاقے کا گورنر مقرر نہیں کیا، ایک قریہ کا بھی، ایک بستی کا بھی اور کسی فوج کا سپہ سالار مقرر نہیں کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے، اپنے بھتیجے اور اپنے کسی عزیز کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ دوسرے عزیزوں کی تو بات ہی چھوڑ دو۔

دو ہی قسم کی منفعتیں ہوتی ہیں یا مالی منفعت ہوتی ہے یا لوگ اثر و رسوخ کی وجہ سے اپنے رشتے داروں کو، اپنے عزیزوں کو بھرتی کروا دیتے ہیں۔

میرا چیلنج ہے:

میں نے پہلے بھی چیلنج کیا تھا اور آج پھر کرتا ہوں کہ حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ذمہ اگر بیت المال کا کوئی پائی پیسہ باقی ہے تو میں دینے کے لئے تیار ہوں، اور ان کے زمانے میں ان کا کوئی عزیز و قریب حاکم مقرر ہوا ہو تو آ کر میری گردن پکڑ لو، اور اگر وہ بھی نہیں ہوا، یہ بھی نہیں ہوا، ایک پیسہ انہوں نے بیت المال کا استعمال نہیں کیا، جو استعمال کیا تھا وہ بھی واپس کر دیا، اور ایک عزیز و قریب کو بھی انہوں نے کسی علاقے کا گورنر مقرر نہیں کیا، تو تم انصاف سے بتاؤ کہ بارہ سال خدمت کا صلہ یہ گالیاں ہیں؟ انہوں نے کیا مفاد اُٹھایا ہے؟ مجھے یہ تو بتاؤ آج تک ''غصبِ خلافت، غصبِ خلافت'' کا شور مچا رہے ہو، مجھے بتاؤ کہ خلافت کو غصب کر کے کہاں لے گئے تھے؟ انہوں نے ایک جھونپڑی بھی بنائی؟ چونکہ خلیفہ صاحب ہیں تو ان کا مکان اچھا بنا دو، جو کچھ تھا اللہ تعالیٰ کی خاطر تھا، رضائے الٰہی کے لئے تھا۔

یہی قصہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تھا، جس کو لوگ بدنام کرتے ہیں، پہلے بزرگوں نے تو بیت المال سے تنخواہ اور معمولی وظیفہ لیا تھا، لیکن وہ بھی بعد میں واپس کر دیا، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شروع سے لی ہی نہیں، جو خدمت کی اللہ تعالیٰ کے لئے کی، یہ چار ہمارے خلفائے راشدین ہیں، ان کی سیرت، ان کا عدل،

ان کا انصاف، ان کی حکمرانی، رعایا پروری اس کے واقعات ریکارڈ میں محفوظ ہیں، گم نام نہیں ہیں۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد ایسا پاکیزہ معاشرہ فلک نے کہیں دیکھا ہے تو مجھے بتاؤ؟ یہ وہ خلفاء ہیں جن کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میرے بعد کچھ حاکم ہوں گے جو اس علم پر عمل کریں گے جو میں تمہیں دے کر جا رہا ہوں، اور ان اعمال کو بجالائیں گے جن پر میں اُمت کو چھوڑ کر جا رہا ہوں، لہٰذا ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی بندگی اور طاعت ہے۔ جس نے میرے مقرر کئے ہوئے امیر کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی، جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی طاعت کی، "وَمَنْ عَصٰى اَمِيْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ، وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَى اللهَ" اور جس نے میرے مقرر کئے ہوئے امیر کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گواہی:

حضرت امیر المؤمنین اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہمارے خلیفہ چہارم کوفہ کے منبر پر تشریف فرما تھے، کسی نے آکر کہا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ حضرات ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) سے افضل ہیں۔ کوفہ کے منبر پر خطبہ ارشاد فرمایا (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول جس کو نقل کرنے والے اسی آدمی ہیں): "میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اس اُمت میں سب سے افضل ابوبکر ہیں، ان کے بعد عمر اور اگر میں چاہوں تو تیسرے آدمی کا بھی نام لے سکتا ہوں۔" منبر سے اترتے ہوئے ارشاد فرمایا: "ثم عثمان، ثم عثمان" پھر عثمان ہیں، پھر عثمان ہیں۔

"ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے افضل کہنے والے کو حد لگاؤں گا":

اور یہ بھی اسی خطبہ میں ارشاد فرمایا: "آئندہ مجھے کسی کے بارے میں اطلاع پہنچی کہ وہ مجھے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے افضل کہتا ہے اس پر مفتری کی حد لگاؤں گا۔" بہتان لگانے والے کی حد اسی کوڑے ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی مرضی سے کوفہ گئے تھے:

ابن کوّا نے پوچھا کہ: امیر المؤمنین! ذرا اس کی وضاحت کریں۔ (اس خطبہ میں نہیں دوسرے موقع کی بات ہے) ذرا یہ تو وضاحت فرمائیں کہ یہ جو یہاں آپ تشریف لائے ہیں، مدینے سے چل کر کوفہ آئے ہیں، ذرا فرمایئے کہ حضور ﷺ نے آپ کو حکم فرمایا تھا یا آپ اپنی رائے اور اجتہاد سے تشریف لائے ہیں؟ فرمایا: "میں پہلا شخص نہیں بنوں گا جو رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولے، حضور نے مجھے کوئی حکم نہیں دیا، یہ میری ایک رائے تھی، میں اپنی رائے سے آیا ہوں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں صدیق رضی اللہ عنہ کو اِمام بنایا:

پھر قصہ بیان فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے اور کئی دن بیمار رہے اور ان دنوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لانے اور نماز پڑھانے سے بھی قاصر رہے، میں موجود تھا آپ کے سامنے، آپ کو میری موجودگی کا اور میری حاضری کا علم تھا، اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ''ابوبکر سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائے۔''

صدیق رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں عمر رضی اللہ عنہ کی امامت بھی روا نہیں تھی:

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہیں پہنچے نہیں تھے، نماز کا وقت ہوگیا تو مؤذن صاحب (حضرت بلال رضی اللہ عنہ) نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہہ دیا کہ آپ نماز پڑھا دیں، انہوں نے کہا اگر تم کہو تو پڑھا دوں گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے، آواز بہت اونچی تھی، بلند تھی، نر آدمی تھے (الحمدللہ! آج تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز گونج رہی ہے)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب آواز پہنچی، فرمایا: ''لَا! لَا! لَا!'' نہیں! نہیں! نہیں! ابوبکر کے سوا اللہ تعالیٰ بھی اور اہل ایمان بھی سب انکار کرتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کو ہماری نماز کا اِمام بنایا:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ میں موجود تھا، غیر حاضر نہیں تھا، میرے ہوتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مصلّے پر کھڑا کیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے تو ہم نے کہا کہ نماز دِین کا سب سے اُونچا عمل ہے، جب یہ کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سپرد کر کے گئے ہیں تو باقی دنیا کے معاملات بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سپرد کر کے گئے، چلو قصہ ختم! چنانچہ میں ان کے زمانے میں ان کے مخلص رفیق اور وزیر کی حیثیت سے رہا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتخاب:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے ربّ کے پاس گئے تو جانے سے پہلے انہوں نے کہہ دیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بناؤ، میں نے کہا: ''السمع والطاعة!'' چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں میں ان کا بہترین رفیق اور وزیر رہا، مالِ غنیمت میں حصہ آتا تھا تو مجھے دیتے تھے، مجھے جہاد کے لئے بھیج دیتے تھے تو میں جاتا تھا، مجھ سے مشورہ طلب فرماتے تھے تو میں مشورہ دیتا تھا، جو کام میرے ذمہ لگاتے تھے بصد شوق، دل و دماغ کے پورے اتفاق کے ساتھ میں سرانجام دیتا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب:

اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ دنیا سے تشریف لے گئے تو ہمارے چھ آدمیوں کی کمیٹی بنا گئے اور یہ چھ آدمی عشرۂ مبشرہ میں سے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جس دن دنیا سے تشریف لے گئے، (عشرۂ مبشرہ جانتے ہو؟ جن کو جنّت کی بشارت ملی) ان میں سے سات آدمی موجود تھے، تین رخصت ہو چکے تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رخصت ہو چکے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود رخصت ہو رہے تھے اور ایک اور بزرگ رخصت ہو رہے تھے، بلکہ ہو چکے تھے، باقی سات آدمی تھے ان سات آدمیوں میں ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی تھے، فرمایا ان کو شامل نہیں کروں گا، عجیب بات ہے! ان کو شامل نہیں کروں گا وہ میرے بہنوئی ہیں، باقی چھ جو رہ گئے ہیں ان پر مشتمل کمیٹی بنادی اور فرمایا: یہ چھ آدمی وہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جنّت کی بشارت دی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے اس حال میں رخصت ہوئے ہیں کہ ان سے راضی تھے، لہٰذا یہی فیصلہ کریں گے کہ کون خلیفہ بنے گا؟ جو یہ فیصلہ کریں پوری اُمّت اس کو مانے۔ یہ ادارۂ انتخاب ہے اور تین دن تک ان حضرات کو اپنا فیصلہ سنانا ہوگا، اس زمانے میں حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ مسجد میں نماز پڑھایا کریں گے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر ہم چھ آدمیوں کی جماعت تشکیل دے گئے، اس وقت مجھے نفس نے کہا تھا کہ اب تیرا موقع ہے، لیکن اس جماعت میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے، انہوں نے کہا کہ بھائیو! میں تو اس سے دست بردار ہوتا ہوں، میں خلافت کا امیدوار نہیں، میں اپنا نام واپس لیتا ہوں، تم چاہو تو میں تمہارا فیصلہ کر سکتا ہوں، باقی پانچ آدمی ہیں فیصلہ کر دیتا ہوں، اس سے پہلے تین آدمیوں نے تین آدمیوں کے معاملہ سپرد کر دیا تھا، حضرت عبدالرحمٰن، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم یہ ہی تین رہ گئے تھے، باقی تین نے اپنا معاملہ ان کے سپرد کر دیا تھا، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے حق میں، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں اپنا معاملہ سپرد کر دیا تھا کہ یہ حضرات جو فیصلہ کریں گے ٹھیک ہے، اب تین آدمی درمیان میں رہ گئے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں خلافت سے دستبردار ہوتا ہوں اس شرط پر کہ ان دو آدمیوں میں سے جس کو مناسب سمجھوں اس کو مقرر کر دوں، سب نے کہا کہ منظور ہے، چھ کے چھ نے کہا کہ منظور ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اگر علی کو میں خلیفہ مقرر کر دوں تو تم بیعت کرو گے؟ انہوں نے کہا: شوق سے! حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اگر عثمان کو مقرر کر دوں، بیعت کرو گے؟ کہنے لگے کہ بالکل خوشدلی سے۔ یہ پہلے دن کے اجلاس کی کاروائی تھی چونکہ تین دن کے بعد فیصلہ سنانا تھا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان تین راتوں میں میں سویا نہیں، پردہ نشین عورتوں کے پاس جا کر بھی میں نے پوچھا کہ ان دو بزرگوں میں

سے کس کو مقرر کیا جائے؟ سب نے یہ ہی رائے دی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مقرر کرو، گویا ووٹ بھی لئے گئے لیکن خفیہ، چنانچہ تیسرے دن جب اجلاس ہوا، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس دن میرے نفس میں کچھ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ مجھے خلیفہ بنایا جائے، لیکن جب میں نے دیکھا تو "عَھْدٌ فِیْ عُنُقِیْ" حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جو عہد مجھ سے لیا تھا وہ میری گردن میں پہلے پڑ چکا تھا، اب میں اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہو گئے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تک وہ خلیفہ رہے میں ان کا ناصح وزیر رہا، مشیر رہا جس طرح کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا تھا، اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا تو میں نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا عہد پورا کر چکا ہوں، عثمان رضی اللہ عنہ کا عہد جو میری گردن میں تھا پورا کر چکا ہوں اب پیچھے کون رہ گیا؟ موٹی سی بات ہے کہ وہ ادارۂ خلافت جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قائم کیا تھا، اس میں ایک ہی آدمی پیچھے رہ گیا، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ ساری تفصیلات میری کتاب ''شیعہ سنی اختلافات اور صراطِ مستقیم'' میں آگئی ہیں، اس میں یہ ساری تفصیلات ذکر کر دی گئی ہیں۔

بہر کیف! یہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم ہیں اور جیسا کہ میں نے کتاب کا حوالہ دیا ہے، ہمارے اکابر اور ان کی اقتداء کرتے ہوئے میں نے بھی قرآنِ کریم کی چار آیات سے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چار ارشادات سے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چار اقوال سے ان حضرات کا خلیفہ راشد ہونا ثابت کیا ہے، چوتھے میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں ہے، یہ حضرات خلیفہ راشد تھے تو ان کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان کی اطاعت بجالانا عبادت ہے۔ اور اس کے بعد پھر اور خلفاء ہوئے ان میں کچھ عادل تھے، کچھ جائر تھے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ عادل تھے:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ عادل تھے اور اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ عادل تھے، حافظ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا فقرہ میں نے اس کتاب میں نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر، حضرتِ عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی صف کے آدمی نہیں تھے، لیکن ان کے بعد ایسا خلیفہ اور ایسا حاکم کبھی پوری اُمّت میں نہیں ہوا، ایسا عادل خلیفہ اُمّت میں نہیں ہوا، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے عدل کا چرچا ہے، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عدل کے ساتھ ان کا کوئی جوڑ نہیں۔ اور کچھ حاکم جائر بھی ہوئے ہیں، ظالم بھی ہوئے، منحرف تھے، ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو ان کے ساتھ ان کی قیادت کرے گا وہ خود بھی ہلاک ہوگا، لوگوں کو بھی ہلاک کرے گا، تم ان سے مل کر رہو لیکن اپنے اعمال الگ رکھو اور وہ قصہ آگے چلتے چلتے اب ہمارے ہاں پہنچ چکا ہے اور جو حال ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی چھ نصیحتیں!

[حدیث:۱۳۰۴] ”عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّهٗ وَعَظَ رَجُلًا فَقَالَ: لَا تُلْهِکَ النَّاسُ عَنْ نَفْسِکَ فَاِنَّ الْاَمْرَ یَصِیْرُ اِلَیْکَ دُوْنَهُمْ، وَلَا تَقْطَعِ النَّهَارَ سَارِبًا فَاِنَّهٗ مَحْفُوْظٌ عَلَیْکَ مَا عَمِلْتَ وَاِذَا اَسَأْتَ فَاَحْسِنْ فَاِنِّیْ لَا اَرٰی شَیْئًا اَشَدَّ طَلَبًا وَلَا اَسْرَعَ دَرَکَةً مِنْ حَسَنَةٍ حَدِیْثَةٍ لِذَنْبٍ قَدِیْمٍ۔“

(کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۲۰۲)

[حدیث:۱۳۰۵] ”عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: اِعْتَزِلْ مَا یُؤْذِیْکَ وَعَلَیْکَ بِالْخَلِیْلِ الصَّالِحِ وَقَلَّ مَا تَجِدُهٗ وَشَاوِرْ فِیْ اَمْرِکَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اللہَ۔“ (کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۱۹۶)

ترجمہ: ”حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: تجھ کو لوگ تیری ذات سے غافل نہ کردیں، اس لئے کہ معاملہ تیری طرف لوٹے گا ان کی طرف نہیں اور دن کو چل پھر کر نہ گزار، اس لئے کہ جو تو نے عمل کیا وہ تجھ پر محفوظ کرلیا گیا اور جب تو برائی کرے تو اس کے پیچھے بھلائی کر اس لئے کہ میں نے کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جو تیزی سے تلاش کرتی ہو اور سختی سے طلب کرتی ہو، اس نئی بھلائی سے جو پرانے گناہ کو تلاش کرتی ہے۔“

ترجمہ: ”امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: جو چیزیں تمہیں ایذا پہنچاتی ہیں ان سے الگ رہو اور نیک دوست کو لازم پکڑو اور تم اس کو کم پاؤ گے اور اپنے معاملہ میں ان لوگوں سے مشورہ کرو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔“

تشریح: یہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی چھ نصیحتیں ہیں، تین پہلی روایت میں اور تین دوسری روایت میں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عظمت:

رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”وَلَقَدْ کَانَ فِیْمَا قَبْلَکُمْ مِنَ الْاُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ فَاِنْ یَکُ فِیْ اُمَّتِیْ اَحَدٌ فَاِنَّهٗ عُمَرُ۔“ (مشکوٰۃ ص:۵۵۶)

ترجمہ: ''پہلی اُمتوں میں محدث ہوتے تھے، یعنی جن کی زبان پر فرشتے باتیں کرتے تھے، میری اُمت میں اگر کوئی ہے تو وہ عمر ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر سکینہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمیں ایسا لگا کرتا تھا: ''اِنَّ السَّکِیْنَةَ تَنْطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ'' (مشکوٰۃ ص:۵۵۷) یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسی بات ارشاد فرماتے ہیں کہ جس سے دلوں کو سکون اور اطمینان آجاتا ہے۔ زبان پر سکینہ بولتی ہے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے:

''اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِہٖ۔''

(مشکوٰۃ ص:۵۵۷)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے حق کو عمر کی زبان اور دل پر رکھ دیا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی راست گوئی:

ایک اور حدیث میں فرمایا کہ:

''رَحِمَ اللّٰہُ عُمَرَ، یَقُوْلُ الْحَقَّ وَاِنْ کَانَ مُرًّا، تَرَکَہُ الْحَقُّ وَمَا لَہٗ مِنْ صَدِیْقٍ۔'' (البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۳۶۰)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو عمر پر! وہ حق بات کہتے ہیں اگرچہ حق کڑوا ہوتا ہے، ان کے حق کہنے نے ان کا کوئی دوست نہیں چھوڑا۔''

کیونکہ نصیحت کی بات کڑوی لگا کرتی ہے اور جس کی بات کڑوی لگے آدمی پھر اس سے دوستی نہیں کرتا، تو ان ارشادات نقل کرنے سے میرا مدعا یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قلب مبارک کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کا خزانہ بنا دیا تھا اور جو بات دل میں ہوتی ہے زبان سے وہی نکلتی ہے، دل کی بات کسی نہ کسی طریقہ سے زبان پر آہی جاتی ہے۔ لا الٰہ الا اللہ!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کے مرشد:

امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ دنیا کے اعتبار سے لوگوں کے سربراہ مملکت اور حاکم اعلیٰ ہی نہیں تھے بلکہ ان کے مرشد بھی تھے اور یہ حضراتِ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی جامعیت تھی، بعد کے خلفاء میں یہ بات نہیں رہی، وہ حضرات بیک وقت منتظم اعلیٰ بھی تھے، ان کے معلّم اور مدرس بھی تھے، ان کے قائد اور سپہ سالار

بھی تھے، ان کے منصف اور قاضی بھی تھے، ان کے مرشد اور پیر بھی تھے، رسول اللہ ﷺ کی تمام جہتوں کے جامع ہوتے تھے۔

پہلی روایت میں ہے کہ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے تین باتیں ارشاد فرمائیں:

اپنی ذات سے غافل نہ ہو:

ا:......ایک یہ ہے کہ لوگ تجھے اپنی ذات سے غافل نہ کردیں۔ یعنی لوگوں کے دھندوں میں مشغول ہوکر اپنے آپ کو نہ بھول جاؤ، لوگوں کی فکر پڑی ہوئی ہے اور یہ فکر اس قدر غالب آگئی کہ اپنے ضروری مشاغل یا اپنے ذاتی معمولات کا وقت ہی نہیں ملتا، اس لئے کہ تیرا معاملہ تیری طرف پہنچے گا، ان کی طرف نہیں، یعنی تیرے اعمال کی باز پرس اور تیرے اعمال کے مطابق برتاؤ تیرے ساتھ ہوگا، لوگوں کے ساتھ نہیں، جو اعمال کہ ہم کرتے ہیں خواہ کسی کی خیر خواہی کے لئے کریں، یا کسی کی بدخواہی کے لئے کریں، اچھا کریں، یا برا کریں، اس کا بھگتان ہمیں خود کرنا ہوگا، لوگوں کی جائز فرمائشیں پوری کرتے ہو تو ٹھیک اور اگر ناجائز فرمائشیں پوری کرتے ہو تو حساب تمہیں دینا ہوگا، ان کو نہیں، ان کو اپنے عمل کا حساب دینا ہوگا، اس لئے کہ قیامت کے دن تم یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکتے کہ جی کیا کریں؟ بچے تنگ کرتے تھے، دوستوں نے مجبور کردیا تھا۔

نفس کی تاویلات کا علاج:

عام طور پر ہمارا نفس تاویلیں کیا کرتا ہے اور جتنے گمراہ لوگ ہیں، وہ اپنے غلط مطلب کے لئے تاویلیں کیا کرتے ہیں، ہمارا نفس ہمارے غلط کاموں کے لئے تاویل کرتا ہے، قادیانی اپنے غلط عقائد کی تاویلیں کیا کرتے ہیں، یعنی یہ مطلب ہے، یہ مطلب ہے، ان کی ساری عمر "یعنی یہ مطلب ہے" سے ختم نہیں ہوتی اور اسی طرح دوسرے گمراہ فرقے بھی ہیں جو اپنی بدعات اور اپنی گمراہیوں کے لئے قرآنِ کریم اور سنّتِ نبوی میں تحریف کرتے ہیں، ادل بدل کرتے ہیں، ان کے مطالب بگاڑتے ہیں، تاویلات کرتے ہیں، اور ہمارا نفس ہماری غلط روی کے لئے تاویل کیا کرتا ہے کہ جی کیا کریں، یہ عذر ہے، وہ عذر ہے، میں جو باتیں کہہ رہا ہوں یہ بہت بڑا علم ہے، یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے کئی دفعہ قادیانیوں کو لکھا کہ یہ سوچ کر قرآن کریم اور احادیث میں تاویل کرو کہ قیامت کے دن تم اللہ کے سامنے کھڑے ہوکر یہ تاویل بیان کرسکو، بس ایک ہی فقرہ ہے، اس پر غور کرلو کہ تمہارا نفس اگر تمہاری غلطیوں کی تاویل کرتا ہے اور تمہیں دھوکہ دیتا ہے تو اس سے پوچھ لو کہ جب تم اللہ کے سامنے کھڑے ہوگے، تو یہ تاویل کرسکو گے؟ اور یہ تمہاری تاویل چل جائے گی؟ اگر نہیں تو مجھے کیوں دھوکہ دیتے ہو؟ مجھے کیوں فریب دیتے ہو؟ یہ جتنے غلط رو فرقے ہیں، یہ سارے کے

سارے اللہ تعالیٰ کے کلام میں، رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں غلط تاویلات کرتے ہیں، کاش کہ یہ اپنے نفس کی طرف رجوع کرتے اور اس سے پوچھ لیتے کہ کل قیامت میں ہم اللہ کے سامنے یہ تاویل کرسکیں گے؟ اور کاش کہ ہم اپنی غلطی پر تاویل کا پردہ ڈالنے سے پہلے اپنے نفس سے رجوع کرکے پوچھ لیتے کہ کل قیامت کے دن یا قبر میں تمہاری یہ تاویل سنی جائے گی؟

اس کو میں نے بہت بڑا علم اس لئے کہا کہ ہر قدم پر اگر اس بات کو پیش نظر رکھا جائے تو انشاء اللہ! ہماری بہت سی غلطیوں کی اصلاح ہوسکتی ہے، تو حضرت امیر المؤمنین فرماتے ہیں: "لَا تُلْهِکَ النَّاسَ عَنْ نَفْسِکَ" لوگ تجھے تیرے معاملہ سے غافل نہ کردیں، "فَإِنَّ الْأَمْرَ يَصِيْرُ إِلَيْکَ دُوْنَهُمْ" اس لئے کہ معاملہ تجھ تک پہنچے گا ان تک نہیں۔

اوقات کی حفاظت:

۲:......اور دوسری نصیحت یہ فرمائی کہ سارا دن مٹرگشت کرتے ہوئے نہ گزارو:

"صبح ہوئی، شام ہوئی، عمر یونہی تمام ہوئی"

اس لئے کہ تمہارے اعمال محفوظ کرکے بند کردیئے گئے ہیں، قرآن کریم میں ہے: "أَحْصَاهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ" اللہ تعالیٰ نے ان کو تو گن کر اور شمار کرکے رکھا تھا لیکن ان لوگوں نے ان کو بھلا دیا تھا۔ ہمارا حافظہ کمزور ہے، ہم تو عمل کرتے ہیں بھول جاتے ہیں اور جب غلطیاں ہماری پرانی ہوجاتی ہیں تو ان پر نسیان کا پردہ آجاتا ہے، بھول کا پردہ آجاتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے، "يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ" (جس دن یہ پردے ہٹا دیئے جائیں گے، بھیدوں کے) اور اندر جو کچھ چھپا ہوا ہے وہ نکال کر دکھا دیا جائے گا، اس دن معاملہ ذرا مشکل ہوگا، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، آمین!

پہلا نقصان تو یہ تھا کہ ہم عمل کرتے وقت تاویلیں کرکے اپنے نفس کو مطمئن کرلیتے ہیں اور دوسرا یہ ہے کہ غلطیاں کرکے پھر ان کو بھول جاتے ہیں، یہاں ہم سے کسی نے انتقام نہیں لیا، ہمارے جرم کا کسی کو پتہ نہیں چلا اور ہم بلی کی طرح سوچو ہے کھا کر حاجی کے حاجی رہ گئے، تو ہم سمجھتے ہیں کہ واقعتاً ہم حاجی ہیں، کسی کو ہماری غلطیوں کا پتہ نہیں چلا اور یوں چلتے چلتے وقت گزر گیا تو پرانی غلطیاں ویسے ہی بھول گئیں۔ بچپن کیسے گزارا تھا؟ جوانی کی دہلیز پر کیسے قدم رکھا تھا؟ اور عنفوان شباب میں، چڑھتی جوانی میں کیا کیا خرمستیاں کی تھیں؟ اور بڑھے ہونے کے بعد بھی تبلیغ والوں کے بقول: بچپن کی عادتیں پچپن تک نہیں جاتیں گویا بچپن کی عادتیں پچپن تک نہیں چھوڑیں، کیونکہ پردہ پڑا ہوا ہے، کچھ تو اللہ تعالیٰ کی ستاری کا پردہ ہے اور کچھ ہمارے حافظہ کی کمزوری کا پردہ ہے کہ ہم ان کو بھول گئے، حضرت فرماتے ہیں: "مَحْفُوْظًا إِلَيْکَ" وہ تجھ پر محفوظ

ہیں، تو نے جو عمل کیا وہ ضائع نہیں ہوا، اچھا عمل کیا تو بھی، اور برا عمل کیا تو بھی۔

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ زکوٰۃ کا مسئلہ ارشاد فرما رہے تھے، کسی نے مجلس میں سے پوچھا کہ حضور! اگر کسی کے پاس گدھے ہوں ان پر بھی زکوٰۃ ہوتی ہے؟ ارشاد فرمایا:

"مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیَّ فِیْهَا اِلَّا الْاٰیَةُ الْفَاذَّةُ الْجَامِعَةُ: مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ۔" (مسند احمد ج:۲ ص:۲۶۲)

ترجمہ: "ان کے بارے میں مجھ پر کوئی چیز نازل نہیں کی گئی سوائے ایک تنہا آیت کے جو کہ پوری کی پوری جامع ہے کہ جو شخص عمل کرے گا ایک ذرہ برابر خیر کا، اس کو بھی دیکھ لے گا اور جو شخص عمل کرے گا ایک ذرہ برابر برائی کا، اس کو بھی دیکھ لے گا۔"

حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ ایک ذرہ نیکی کا ضائع نہیں ہوگا، اس کی قدر کریں گے، اور ایک ذرہ برائی کا غائب نہیں ہوگا، یعنی لا کے حاضر کردیں گے، سزا دینا ضروری نہیں، ہوسکتا ہے کہ معاف کردیں لیکن ایک دفعہ دکھا ضرور دیں گے کہ تو نے یہ کیا تھا، اس لئے غفلت میں اور سوتے ہوئے وقت نہ گزارو، اس لئے کہ تمہارے اعمال کا ریکارڈ جمع کیا جارہا ہے، اور وہ محفوظ ہے۔

بدی کے بعد نیکی:

۳:......اور تیسری نصیحت یہ فرمائی کہ جب تجھ سے کوئی غلطی ہوجائے، کوئی گناہ ہوجائے، کوئی برائی ہوجائے تو فوراً نیکی کا کام کرو، یہ حدیث شریف کا مضمون ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک صاحب کو نصیحتیں فرمارہے تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "وَاَتْبِعِ السَّیِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا" (مسند احمد ج:۵ ص:۱۵۳) (اور برائی کے پیچھے بھلائی کرلو، فوراً وہ بھلائی اس برائی کو مٹادے گی) دونوں کی کشتی ہوجائے گی، تم سے کوئی غلطی ہوگئی، کوئی برا کام ہوگیا فوراً نیک کام کرو، اب ان میں سے جو طاقت ور ہوگا وہ اس کو گرادے گا ان شاء اللہ! نیکی برائی کو گرادے گی، اس لئے کہ نیکی میں دس گنا طاقت ہوتی ہے، دس گنا ثواب ملتا ہے، ایک نیکی پر دس نیکیاں ملتی ہیں، اللہ تعالیٰ نو گنا اس میں مزید طاقت پیدا فرمادیتے ہیں، اب یہ دس آدمی ہیں، وہ اکیلا ہے، اکیلا دس آدمیوں کا مقابلہ کیسے کرے گا؟

اکابر تو یوں فرماتے ہیں کہ اگر غلطی ہوجائے، گناہ ہوجائے، کوئی برائی ہوجائے تو نیکی کرتے ہی رہو، کرتے ہی رہو، یہاں تک کہ تمہیں یقین ہوجائے کہ ان شاء اللہ! وہ برائی مٹ گئی ہوگی، تمہاری یہ نیکیاں ان برائیوں کو مٹادیں گی، یعنی چھپادیں گی، اس پر غالب آجائیں گی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ

تعالیٰ علیہم اجمعین کا اور بعد کے اولیاء اللہ کا یہی معمول تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ندامت:

حضرت اُمّ المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا جنگِ جمل میں گئی تھیں، بس وہ اللہ کی حکمت تھی، چلی گئیں، لیکن بعد میں جب یہ بات کبھی یاد آتی تو اتنا روتیں کہ دوپٹہ تر ہو جاتا اور پچاس کے قریب غلام آزاد فرمائے، اور فرماتی تھیں: یا اللہ! میری غلطی تھی، مجھے نہیں جانا چاہئے تھا۔

لوگوں کو طعن کرنا تو آتا ہے لیکن ان اکابر کا حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ جو تعلق تھا، وہ ان کو معلوم نہیں ہے، یہ دُور سے بیٹھے ہوئے بزرگوں پر، اکابر پر تنقیدیں کرتے ہیں۔

تو امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب تو بُرائی کرلے تو اس کے پیچھے بھلائی کرلیا کر، اس لئے کہ ایک چیز دوسری چیز کا تیزی کے ساتھ تعاقب کر رہی ہے۔ پھر اس کو ایک مثال سے سمجھایا کہ جیسے ایک آدمی دوڑا جا رہا ہے، اس کے پیچھے دوسرا آدمی اس کو پکڑنے کے لئے دوڑا جا رہا ہے، اسی طرح برائی کے پیچھے نیکی دوڑ رہی ہے، اسی لئے فرمایا میں نے نیکی سے زیادہ کسی کو تعاقب کرنے والا نہیں دیکھا، جتنا نیکی برائی کا تعاقب کرتی ہے اور اس کو جا کے پکڑ لیتی ہے، میں نے کسی تعاقب کرنے والے کو اتنا تیز رو نہیں دیکھا، جتنا کہ نیکی برائی کا تعاقب کرتے ہوئے تیز دوڑتی ہے اور فوراً جا کر اس کو پکڑتی ہے، یہ بھی بہت بڑا علم ہے، جب بھی کوئی کوتاہی ہو جائے، جب بھی کوئی لغزش ہو جائے، دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہم میں یہ حس پیدا کردے کہ ہمیں پتہ چل جائے کہ مجھ سے غلط کام ہوا ہے، دل سیاہ ہو جاتا ہے تو آدمی تمیز ہی نہیں کرسکتا کہ میں اچھا کر رہا ہوں کہ بُرا کر رہا ہوں؟ دل اندھا ہو جاتا ہے۔

تو پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ کرے ہم میں تمیز پیدا ہو جائے کہ یہ نیکی ہے یا بدی ہے؟ میں اچھا کر رہا ہوں یا بُرا کر رہا ہوں؟

نیکی اور بُرائی کی پہچان:

ایک صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، کہنے لگے: یا رسول اللہ! مجھے کیسے معلوم ہو کہ میں نے اچھا کام کیا ہے یا بُرا کام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:

”اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ، وَالْاِثْمُ مَا حَاکَ فِیْ صَدْرِکَ وَکَرِھْتَ اَنْ یَّطَّلِعَ عَلَیْہِ النَّاسُ۔“ (مشکوٰۃ ص:۴۳۱)

ترجمہ: ”نیکی تو اچھے اخلاق کا نام ہے، (اگر تم نے کسی کے ساتھ اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا ہے تو سمجھ لو کہ تم نیکی کے راستے پر ہو) اور بُرائی وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹک

پیدا کرے اور تجھے یہ اچھا نہ لگے کہ لوگوں کو پتہ چلے۔''

جس چیز کو ہم لوگوں سے چھپا کر رکھنا چاہتے ہیں یا کہتے ہیں کہ لوگوں کو پتا نہیں چلنا چاہئے، معلوم ہوا کہ بُرائی ہے، انسانی بدن کے جو اعضا ستر کہلاتے ہیں، آدمی نہیں چاہتا کہ اس پر کوئی مطلع ہو، ڈھانپ کر رکھتا ہے، پردہ کر کے رکھتا ہے، اسی طرح انسانی اخلاق و اعمال میں جو چیزیں عیب کی ہیں، آدمی نہیں چاہتا کہ کوئی ان پر مطلع ہو اور اگر علی الاعلان گناہ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اللہ کے پردہ کو خود چاک کر دیا، اللہ تو لوگوں کا پردہ رکھتا ہے اور اس نے ''ستر اللہ'' کو، اللہ کے تانے ہوئے پردے کو پھاڑ کے پھینک دیا ہے، علی الاعلان گناہ کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ نہ اس کو خالق سے شرم، نہ مخلوق سے شرم، تو پہلی بات تو یہ کہ ہم میں بدی اور نیکی کی حس پیدا ہو جائے، جب بھی ہم سے کوئی غلطی اور کوتاہی ہو، ہم جان لیں کہ میں نے اچھا نہیں کیا، برا کیا ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ جب یہ پتا چل جائے تو فوراً اپنی غلطی کا اقرار کر کے اس کا تدارک کرے، سب سے آسان، سہل تدارک یہ ہے کہ اللہ سے معافی مانگے، توبہ کرے۔

موذیوں سے احتراز:

۴:......اور چوتھی نصیحت یہ فرمائی: ''اِعْتَزِلْ مَا یُؤْذِیْکَ'' جو چیزیں تجھے ایذاء پہنچانے والی ہیں ان سے الگ تھلگ رہو، جو کام ایذا پہنچانے والا ہو اس کے قریب نہ جاؤ، کوئی آدمی موذی ہے، تو کوشش کرو کہ اس کے قریب نہ جاؤ، ایذا پہنچانے والا جسم کے اعتبار سے ہو یا ذہنی طور پر ایذا پہنچانے والا ہو، دنیا کے اعتبار سے ہو یا آخرت اور قبر کے اعتبار سے ہو، جو چیز کہ ایذا پہنچانے والی ہے، اس سے الگ رہو، موذی کے قریب نہ جاؤ، موذی انسان ہوں، موذی چیزیں ہوں، یا موذی تمہارے اعمال ہوں، موذیوں سے بچو، ہم دوسروں کو تو موذی سمجھتے ہیں، لیکن اپنے آپ کو نہیں سمجھتے، تمہارا نفس تو موذی نہیں ہے؟ اس سے پوچھ لو، کیوں میاں کسی کو ایذاء تو نہیں پہنچائی تم نے؟ تنہائی میں بٹھا کے اس سے پوچھو، اگر تم نے ایذاء پہنچائی یا پہنچانے کی عادت ہے تو قیامت کے دن تمہارا شمار موذیوں میں ہوگا، تم اللہ کی مخلوق کو ایذاء پہنچانے والے ہو۔

حدیثِ مسلسل:

یہ حدیث حدیثِ مسلسل ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر جب بھی مشائخ اس کی سند کی اجازت دیتے ہیں تو وہ خاص کیفیت جو ملحوظ تھی، اس کو محفوظ رکھتے ہیں، مثلاً حدیث بیان کرتے ہوئے چھوہارہ کھلایا، کھجور کھلائی اور پانی پلایا پھر حدیث سنائی، چنانچہ جو صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے تھے، وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کھلائی، پانی پلایا اور یہ حدیث ارشاد فرمائی، اس وقت سے ہمارے شیخ تک یہ حدیث

مسلسل چلی آرہی ہے، اسی لئے جب ہمارے شیخ نوراللہ مرقدہ نے ہمیں اس حدیث کی اجازت دی تھی، تو اسی طرح اجازت دی تھی، پہلے کھجور کھلائی، پانی پلایا اور پھر ارشاد فرمایا:

''اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ۔ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمُکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ۔'' (ترمذی ج:۲ص:۱۴)

ترجمہ: ''رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔''

یہ راحمین ہیں جن پر رحمٰن رحم کرتا ہے، جو اللہ کی مخلوق کو ایذاء نہیں پہنچاتے ان کے مقابلے میں وہ لوگ موذی اور ایذاء پہنچانے والے ہیں، قرآنِ کریم میں ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا﴾ (الاحزاب)

ترجمہ: ''جو لوگ ایذاء پہنچاتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کو، ان پر اللہ کی لعنت ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور ان کے لئے تیار کر رکھا ہے اہانت آمیز یعنی ذلیل کرنے والا عذاب۔''

بعض لوگ ایسے موذی ہیں جو اللہ اور رسول کو ایذاء پہنچاتے ہیں، وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں جو لمبی حدیث مشہور ہے کہ ''اللہ! اللہ! فِیْ اَصْحَابِیْ!'' میرے صحابہ کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو! آگے چل کر اس کا ایک فقرہ یہ ہے:

''وَمَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِیْ، وَمَنْ آذَانِیْ فَقَدْ آذَی اللّٰهَ، وَمَنْ اٰذَی اللّٰهَ فَیُوْشِکُ اَنْ یَّاْخُذَهٗ۔'' (مشکوٰۃ ص:۵۵۴)

ترجمہ: ''جس نے ان کو ایذاء پہنچائی، اس نے مجھ کو ایذاء پہنچائی اور جس نے مجھے ایذاء پہنچائی اس نے اللہ کو ایذاء پہنچائی اور جو شخص اللہ کو ایذاء پہنچائے تو قریب ہے کہ اس کو پکڑ لیا جائے۔''

بعض لوگ اللہ کو ایذاء پہنچاتے ہیں، تو بعض لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایذاء پہنچاتے ہیں، اور صحیح بخاری کی حدیث ہے:

''مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ۔'' (بخاری ج:۲ص:۹۶۳)

ترجمہ: ''جو میرے کسی ولی کو ستاتا ہے اور اس سے عداوت رکھتا ہے، تو میں اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں۔''

بعض لوگ اللہ کے مقبول بندوں کو ایذاء پہنچاتے ہیں اور بعض لوگ عام مسلمانوں کو ایذاء پہنچاتے ہیں، اوران کو ایذاء پہنچانے میں مزہ آتا ہے، یہ سب موذی ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے موذیوں سے محفوظ رکھے اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہمارا شمار ان موذیوں میں نہ کرے جو اللہ کی مخلوق کو ایذاء پہنچاتے ہیں، بہرحال فرمایا: "اِعْتَزِلْ مَایُؤْذِیْکَ" جو چیز تمہیں ایذا پہنچائے اس سے الگ تھلگ رہو۔

اچھا دوست بناؤ:

۵:......اور پانچویں نصیحت یہ ہے کہ: "وَعَلَیْکَ بِالْخَلِیْلِ الصَّالِحِ" اور لازم پکڑو نیک خلیل کو، نیک دوست کو، "وَقَلَّ مَاتَجِدُهٗ" بہت کم ملے گا، آسانی سے نہیں ملتا۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قصیدہ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ کل رات شیخ ہاتھ میں چراغ لئے سڑک پر کوئی چیز ڈھونڈ رہے تھے، میں نے پوچھا کہ حضرت! کیا تلاش کررہے ہیں؟ فرمایا: ان بھیڑیوں اور درندوں سے تنگ آگیا ہوں، کسی انسان کو ڈھونڈ رہا ہوں! یہ شکار کرنے والے جانور ہیں، انسان نہیں مل رہے۔ میں نے بہت نیازمندی سے عرض کیا کہ حضور! "یافتہ نمی شود" وہ تو ملتا نہیں، میں نے بھی تلاش کیا تھا، انسان نہیں ملتا، فرمایا جو ملتا نہیں ہے اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں، اگر مل جاتا تو ڈھونڈنے کی ضرورت کیا تھی؟ تو فرمایا خلیل صالح کو لازم پکڑو، جو دل سے دوستی کرنے والا ہو اور نیک بھی ہو۔ "وَقَلَّ مَاتَجِدُهٗ" بہت کم ملے گا، بہت کم پاؤ گے۔

کس سے مشورہ کیا جائے؟

۶:......چھٹی نصیحت یہ فرمائی: "وَشَاوِرْ فِیْ اَمْرِکَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اللّٰہَ" اور اپنے معاملہ میں مشورہ ان لوگوں سے کرو جو اللہ سے ڈرتے ہیں، کسی معاملے میں مشورہ کرنا ہو تو ایسے لوگوں سے مشورہ کرو جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا کہ: "وَلَا تُحَدِّثْ بِهَا اِلَّا لَبِیْبًا اَوْ حَبِیْبًا" (ترمذی ج:۲ ص:۵۲) یعنی اگر کسی کو خواب آوے تو ہر ایک سے بیان نہ کرے، اپنا خواب یا تو کسی حبیب سے بیان کرو، جو تم سے محبت کرتا ہے، تمہارا محبوب ہو یا لبیب ہو، یعنی عقل مند ہو، کیونکہ جو ان دونوں صفتوں کے ساتھ موصوف نہیں، وہ تو الٹی سیدھی ہانک دے گا۔ لوگ تعبیر پوچھتے ہیں، میں کہتا ہوں میں تو تعبیر نہیں جانتا، تکلف کرنے کا کیا فائدہ؟

خواب کا اچھے اور برے پر مدار نہیں ہے، تمہاری بیداری کی زندگی کا اچھے اور برے ہونے پر مدار ہے، مجھ سے تو تعبیریں پوچھو زندگی کی، زندگی کے اعمال کے بارے میں پوچھو، خواب کی تعبیر کیا پوچھتے ہو؟ لیکن میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ بعض خواب اچھے بھی ہوتے ہیں، سچے بھی ہوتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نصیحتیں

[حدیث:۱۳۰۶] "عَنْ عَلِيِّ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهُ قَالَ لِعُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: يَا أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! اِنْ سَرَّكَ أَنْ تَلْحَقَ بِصَاحِبَيْكَ فَاقْصُرِ الْأَمَلَ، وَكُلْ دُوْنَ الشَّبْعِ، وَانْكَمِشِ الْإِزَارَ، وَارْقَعِ الْقَمِيْصَ وَاخْصِفِ النَّعْلَ تَلْحَقْ بِهِمَا۔" (کنز العمال ج:۱۶ ص:۲۰۴ حدیث:۴۲۲۲۷)

ترجمہ: "امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ: انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ: امیر المؤمنین! اگر آپ کو اس بات کی خوشی ہے کہ آپ اپنے دونوں ساتھیوں سے جاملیں تو اپنی اُمیدوں کو کم کردیجئے، پیٹ بھرنے سے کم کھایئے، لنگی چھوٹی کیجئے، قمیص کو پیوند لگایا کیجئے، اور جوتے کو گانٹھ لیا کیجئے، آپ ان دونوں کے ساتھ جاملیں گے۔"

[حدیث:۱۳۰۷] "عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: لَيْسَ الْخَيْرُ أَنْ يَكْثُرَ مَالُكَ وَوَلَدُكَ، وَلٰكِنَّ الْخَيْرَ أَنْ يَكْثُرَ عِلْمُكَ وَيَعْظُمَ حِلْمُكَ، وَأَنْ تُبَاهِيَ النَّاسَ بِعِبَادَةِ رَبِّكَ، فَاِنْ أَحْسَنْتَ حَمِدْتَ اللّٰهَ وَاِنْ أَسَأْتَ اِسْتَغْفَرْتَ اللّٰهَ، وَلَا خَيْرَ فِي الدُّنْيَا اِلَّا لِأَحَدِ رَجُلَيْنِ، رَجُلٌ أَذْنَبَ ذَنْبًا فَهُوَ تَدَارَكَ ذٰلِكَ بِتَوْبَةٍ، أَوْ رَجُلٌ يُسَارِعُ فِي الْخَيْرَاتِ وَلَا يَقِلُّ عَمَلٌ فِيْ تَقْوٰى وَكَيْفَ يَقِلُّ مَا يُتَقَبَّلُ۔"

(حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۷۵)

ترجمہ: "امام ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حلیۃ الاولیاء میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: خیر یہ نہیں ہے کہ تمہارا مال اور اولاد زیادہ ہو، بلکہ خیر یہ ہے کہ تمہارا علم زیادہ ہو اور تمہارا حلم بڑھ جائے، اور یہ کہ تو اپنے رَبّ کی عبادت میں لوگوں کا مقابلہ کرے، اگر تو نیکی کا کام کرے تو اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے، اور اگر کوئی بُرا کام کرے تو اللہ تعالیٰ سے اِستغفار کرے، دُنیا میں خیر صرف دو آدمیوں کے لئے ہے، ایک وہ آدمی جس نے گناہ کیا ہو پھر وہ اس کا تدارک کر رہا ہو توبہ کے ساتھ، اور دُوسرا وہ آدمی جو نیکی کے کاموں میں تیزی کرتا ہو اور کوئی عمل جو تقویٰ میں کیا جائے کم نہیں ہوتا اور کیسے کم ہوسکتا ہے وہ عمل جو قبول کرلیا جائے۔"

تشریح: یہ دو روایتیں امیر المؤمنین حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مواعظ کی ہیں، پہلی روایت میں

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا کہ سب کو معلوم ہے وہ شخص ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حق کو ان کی زبان پر اور ان کے دِل پر جاری فرمادیا تھا، دِل میں حق رکھ دیا اور زبان سے جاری فرمادیا تھا، اور شیطان کے وسوسے سے اللہ تعالیٰ نے ان کی یہاں تک حفاظت فرمائی تھی کہ جس راستے پر چل رہے ہوں، شیطان وہ راستہ چھوڑ کر دُوسرا راستہ اختیار کر لیتا تھا، وہ وسوسہ کیا ڈالتا جو اتنا ڈرتا ہو، لیکن نصیحت کے وہ بھی محتاج ہیں، اپنے آپ کو نصیحت کا محتاج سمجھتے ہیں، جیسا کہ گزشتہ جمعہ میں نے عرض کیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمائش کرتے تھے کہ مجھے کچھ نصیحت کیجئے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فرمائش پر ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: امیر المؤمنین! اگر آپ اپنے ان دونوں ساتھیوں سے ملنا چاہتے ہیں، جو آپ سے پہلے جاچکے ہیں اور یہ وہی ہیں جن کا تذکرہ قرآنِ کریم نے کیا ہے:

﴿ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ﴾ (التوبۃ:۴۰)

ترجمہ: ''کہ وہ دُوسرا تھا دو میں کا جب وہ دونوں تھے غار میں، جب وہ کہہ رہا تھا اپنے رفیق سے تو غم نہ کھا........''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام:

مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایک بادشاہ کی دعوت کی گئی، اب بادشاہ کے ساتھ اس کے اہلِ خانہ بھی ہیں، اور جس مکان میں بادشاہ کو ٹھہرایا گیا، ظاہر بات ہے کہ وہاں بادشاہ کے اہلِ خانہ بھی ہوں گے، خدام بھی ہوں گے، وزراء، اُمراء بھی ہوں گے، جب دسترخوان لگے گا یہ تمام وزراء اور خدام اس دسترخوان پر بیٹھیں گے، ایک ہی دسترخوان پر بیٹھیں گے لیکن مراتب کا فرق ہوگا۔ بادشاہ کا مرتبہ اپنی جگہ ہے، وزیر کا اپنی جگہ ہے، اور جو دُوسرے لوگ ساتھ مل گئے ان کا مقام اپنی جگہ ہوگا، ایسے موقع پر کچھ طفیلی بھی آجاتے ہیں، اسی طرح شاہی دسترخوان پر بیٹھ جانا اور بادشاہ کے ساتھ معیت اور رفاقت کا حاصل ہوجانا اپنی جگہ، مگر اس کا یہ معنی نہیں کہ وزیر، دوسرے لوگ یا طفیلی بادشاہ کے مرتبے کو پہنچ جائیں، ٹھیک اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبے پر کون پہنچ سکتا ہے؟ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مرتبے کو دوسرا کون پہنچ سکتا ہے؟

صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کی نیکیوں کا فرق:

ایک دن آسمان صاف تھا، رات کا وقت تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحن میں لیٹے ہوئے تھے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آسمان کی طرف دیکھ کر کہنے لگیں کہ: ستارے چمک رہیں:

''........ هَلْ يَكُوْنُ لِأَحَدٍ مِنَ الْحَسَنَاتِ عَدَدَ نُجُوْمِ السَّمَاءِ؟ قَالَ:

نَعَمْ، عُمَرُ! قُلْتُ: فَأَيْنَ حَسَنَاتُ أَبِي بَكْرٍ؟ قَالَ: إِنَّمَا جَمِيعُ حَسَنَاتِ عُمَرَ كَحَسَنَةٍ وَاحِدَةٍ مِنْ حَسَنَاتِ أَبِي بَكْرٍ۔" (مشکوٰۃ ص:۵۶)

ترجمہ: "کوئی ایسا بندہ بھی ہوگا جس کی نیکیاں آسمان کے ستاروں کے برابر ہوں گی؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہاں! وہ عمر ہیں۔ ان کو فوراً خیال آیا کہ میرے ابا کا نام تو نہیں آیا، کہنے لگیں: میرے ابا؟ فرمایا: عمر کی ساری زندگی کی نیکیاں اور تیرے ابا کی ایک نیکی برابر ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خواہش:

یہ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا، اور خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: میں ابوبکر کے ساتھ مصارفہ کرنے کے لئے تیار ہوں، "مصارفہ" کہتے ہیں سونے چاندی کا تبادلہ۔ میں ابوبکر کے ساتھ مصارفہ کرنے کے لئے تیار ہوں، عمر کی ساری عمر کی نیکیاں وہ لے لیں اور اپنی ایک رات اور ایک دن مجھے دے دیں، اور میری ساری عمر کی نیکیاں مصارفہ کرلیں۔

نبی وصدیق سے ملنے کا مفہوم:

آنحضرت ﷺ کے ساتھ جاملنا یا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ جاملنا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی ان کے مرتبے کو پہنچ جائے، بلکہ اکرام وانعامِ خداوندی کے جس دسترخوان پر ان کو بٹھایا گیا ہے، اس کو بھی اس پر جگہ دے دی جائے، یہ مطلب ہے اس کا۔ اس محفل میں اس کو بھی شریک کردیا جائے، اور یہی معنی ہیں "وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ" کے، یعنی یا اللہ! ہمیں وفات دے نیک لوگوں کے ساتھ، مطلب یہ کہ وفات دے کر ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ ملادے۔

حضراتِ انبیاء کی صالحین سے ملنے کی خواہش:

اور سیّدنا یوسف علیہ السلام فرمارہے ہیں:

﴿وَأَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِينَ﴾ (یوسف:۱۰۱)

ترجمہ: "اور ملادے مجھے نیک لوگوں کے ساتھ۔"

سیّدنا یوسف علیہ السلام خود نبی ہیں، لیکن انبیائے کرام علیہم السلام کا ادب دیکھئے فرمارہے ہیں کہ: ملادے مجھے نیک لوگوں کے ساتھ۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام تختِ سلیمانی پر بیٹھ کر کہہ رہے ہیں:

﴿وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصّٰلِحِينَ﴾ (النمل:۱۹)

ترجمہ: ''اور داخل کردیجئے مجھے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے نیک بندوں میں۔''

قدوسیوں کی رفاقت کی شرائط:

تو یہ جو رفاقت ہے یہ رفاقت مرتبے میں نہیں ہے، مرتبہ ہر ایک کا اپنا اپنا ہے، الگ الگ ہے، مقصود یہ ہے کہ اس محفل میں باریابی نصیب ہوجائے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نصیب فرمادیں، لیکن اس محفل میں داخلے کا ٹکٹ ہر ایک کو نہیں ملتا، یہ قدوسیوں کی محفل جن کو کہیں صالحین فرمایا، کہیں ابرار فرمایا ہے، اور کہیں منعم علیہم فرمایا ہے، تو اس محفل میں داخلے کی بھی کچھ شرائط ہیں۔

پرل کانٹی نینٹل کا لباس:

مجھے ایک صاحب نے لطیفہ بتایا تھا کہ میانوالی کا بہت بڑا نواب تھا لیکن وہ پنجابی لوگ ہیں لمبی سی چادر پہنتے ہیں...... شلوار وغیرہ نہیں پہنتے تھے...... اب تو وہ بھی شلوار پہننے لگے ہوں گے، نیا زمانہ ہے...... اور خاص قسم کا ان کا کُرتا ہوتا تھا، اور خاص قسم کی ان کی پگڑی ہوتی تھی، تو پرل کانٹی نینٹل ہوٹل اسلام آباد میں وہ جانا چاہتے تھے، کہنے لگے: آپ کو داخلے کی اجازت نہیں ہے، کیوں بھائی؟ کہنے لگے: اس ہوٹل میں جانے کے لئے خاص قسم کا یونیفارم استعمال کرنا پڑتا ہے، اور وہ ہے انگریزی لباس۔

قدوسی محفل کا یونیفارم:

میرے بھائیو! ان ابرار یا صالحین کی قدوسی محفل میں داخلے کے لئے بھی کچھ یونیفارم چاہئے، اور امیر المؤمنین حضرت علی کرّم اللہ وجہہ اسی کو بیان فرمارہے ہیں۔ امیر المؤمنین اگر آپ اپنے دونوں ساتھیوں سے ملنا چاہتے ہیں تو چند باتوں کا التزام کیجئے۔

قصرِ امل:

ایک تو یہ کہ دُنیا میں لمبی آرزوئیں رکھنا اس کو ختم کردیجئے، اگلے سال یہ کریں گے، فلاں سال یہ کریں گے، یہ ہوگا، وہ ہوگا، ہمارا منصوبہ شام تک کبھی نہیں ہوگا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''مَرَّ بِنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا وَأُمِّيْ نَطِيْنُ شَيْئًا، فَقَالَ: مَا هٰذَا يَا عَبْدَاللهِ؟ قُلْتُ: شَيْئٌ نُصْلِحُهٗ! قَالَ: اَلْأَمْرُ أَسْرَعُ مِنْ ذٰلِكَ۔''

(مشکوٰۃ ص: ۴۵۰، بحوالہ مسند احمد، ترمذی)

ترجمہ: ''میں اپنی والدہ کے ساتھ مویشی کی کھلی جس میں اس کو چارہ ڈالا جاتا ہے، ٹھیک کررہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گزرے، فرمایا: کیا بن رہا ہے؟ کہا کہ:

حضور! یہ ذرا مرمت کر رہے ہیں۔ فرمایا: معاملہ اس سے زیادہ جلدی کا ہے۔"
تمہارے مویشی بھی یہاں رہ جائیں گے، اور یہ کھلیاں بھی یہاں رہ جائیں گی، تم نہیں رہو گے۔
حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا:
﴿اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿۱۳۰﴾﴾ (الشعراء)
ترجمہ: "کیا بناتے ہو ہر اُونچی زمین پر ایک نشان عبث اور بے معنیٰ، اور بناتے ہو کاریگریاں شاید تم ہمیشہ رہو گے، اور جب ہاتھ ڈالتے ہو تو پنجہ مارتے ہو ظلم سے۔"
جہاں تم اچھی جگہ دیکھتے ہو وہاں نشانِ پاکستان بنا کے بیٹھ جاتے ہو، گھر اور کارخانے اتنے مضبوط بناتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ کے لئے رہنا ہے، پہلے تو مرنے کی اُمید نہیں، اتنے موٹے موٹے سریے اور اس کے اندر سیمنٹ اور زمین کے اندر تک کھدائی، وہاں تک بھرائی ہو رہی ہے، شاید تمہیں ہمیشہ رہنا ہے۔
"مصنع" کہتے ہیں کارخانے کو اور تم اتنے بڑے بڑے اُونچے کارخانے لگاتے ہو، اور اتنے مضبوط، ایسا لگتا ہے کہ تمہیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے؟ اور جب پکڑتے ہو تو جباروں کی طرح پکڑ کرتے ہو، پھر تمہارے ہاں معافی کی کوئی گنجائش نہیں، کسی قصوروار کو معاف بھی کر دو، کہتے ہیں: نہیں! اس نے ہماری توہین کی ہے، یہ بچ کے نہیں جا سکتا۔ تو یہ ہے لمبی اُمیدیں ہونا۔
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:
"كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ۔" (مشکوٰۃ ص:۴۵۰، بحوالہ صحیح بخاری)
ترجمہ: "دُنیا میں اس طرح رہو کہ تم اجنبی وطن میں آئے ہوئے یا رہ چلتے مسافر۔"
یہ زندگی ویزا ہے اور جب ویزے کے دن ختم ہو جائیں گے تو پھر یہاں نہیں رہنے دیں گے، سعودیہ والے پندرہ دن کا ویزا دیتے ہیں، پھر نہیں رہنے دیتے، یہاں چھپ کر کوئی رہ جائے تو اس کی مرضی ہے، ورنہ پکڑا جائے تو فوراً چلتا کر دیتے ہیں، "خروج" لگا دیتے ہیں، گویا تم اجنبی وطن میں ہو، تمہیں یہاں رہنا نہیں ہے، نہیں! نہیں! بلکہ راستے پر چلنے والا اجنبی، کوئی وطن میں ٹھہرا ہوا ہے، چلو رات کو ٹھہر گیا وہ بھی ایک درجے میں رہائش ہے، لیکن راہ چلنے والے کی تو رات ہی نہیں ہوتی۔
اور ہمارے فقہاء فرماتے ہیں کہ جنگل میں اِقامت کی نیت ہی صحیح نہیں، اگر کوئی کہے کہ مجھے پندرہ دن جنگل میں رہنا ہے، تو یہ نیت غلط ہے، اس کی نیت ہی صحیح نہیں، وہ مقیم نہیں بنے گا، مسافر ہی رہے گا، اس لئے کہ وہ رہنے کی جگہ ہی صحیح نہیں ہے۔
اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"....... مَالِیْ وَلِلدُّنْیَا؟ وَمَا اَنَا وَالدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَھَا۔"
(مشکوٰۃ ص:۴۴۲، بحوالہ احمد، ترمذی، ابوداؤد)

ترجمہ: "مجھے دُنیا سے کیا تعلق؟ میری حیثیت تو اس سوار کی ہے کہ چلتے چلتے دوپہر کو کسی درخت کے نیچے سایہ لینے، ستانے کے لئے ٹھہر گیا، پھر چھوڑ کر چل دیا۔"

دِین داری صرف نماز روزے کا نام نہیں ہے:

یہ ہے قصرِ امل یعنی اُمیدوں کا کم کر دینا، دِین داری صرف نماز روزے کا نام نہیں ہے، حج اور عمرے کا نام دِین داری نہیں ہے، یہ تو دِین داری کے مظاہر ہیں، دِین داری یہ ہے کہ دُنیا کے اندر تمہیں نہیں رہنا، اس لئے فرمایا گیا ہے کہ دُنیا کے لئے اتنا عمل کرو جتنا تمہیں یہاں رہنا ہے، اور قبر کے لئے اور آخرت کے لئے اتنا عمل کرو جتنا تمہیں وہاں رہنا ہے۔

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: امیر المؤمنین آپ اگر اپنے دونوں ساتھیوں سے ملنا چاہتے ہیں تو ایک کام تو یہ کیجئے کہ اپنی اُمیدوں کو کوتاہ کر لیجئے، چھوٹا کر لیجئے۔ یہ نہیں کہ پاکستان کے حکمرانوں کی طرح جو تخت پر آ گیا اس کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اب مجھ ہی کو ساری زندگی اُمر کرنا ہے، جب تک پاکستان ہے، جب تک میں ہوں، نہیں! نہیں! جب تک پاکستان ہے میں ہی اس کا حکمران ہوں۔ یہ غلط فہمی سب کو ہو جاتی ہے، پھر چاہے پانچ سال بھی پورے نہ کریں۔

شکم سیری سے احتراز:

اور دُوسرا کام یہ کیجئے کہ شبع یعنی پیٹ بھرنا۔ اس سے کم کھایا کیجئے، شکم سیر ہو کر، پیٹ بھر کر نہ کھایا کیجئے، بلکہ تھوڑی سی گنجائش رکھ کر کھایا کیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

"بِحَسْبِ ابْنِ اٰدَمَ اُکُلَاتٌ یُقِمْنَ صُلْبَہٗ، فَاِنْ کَانَ لَا مَحَالَۃَ فَثُلُثٌ طَعَامٌ وَّثُلُثٌ شَرَابٌ وَّثُلُثٌ لِنَفَسِہٖ۔"
(مشکوٰۃ ص:۴۴۲، بحوالہ ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: "ابنِ آدم کے لئے چند چھوٹے چھوٹے لقمے کافی ہیں، جو اُس کی کمر کو سیدھا رکھیں، اور اگر بہت ہی کھانا ہو تو ایک تہائی پیٹ روٹی سے بھرو، ایک تہائی پانی سے بھرو، اور ایک تہائی پیٹ سانس کے لئے رہنے دو۔"

زیادہ کھانے سے آدمی صحت مند نہیں ہوتا، لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے۔

ہمارے حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ افریقہ تشریف لے گئے تو وہاں فرمایا کہ: وہاں وہ لوگ بہت کھاتے ہیں، کھلاتے بھی بہت ہیں، مسکرا کر فرمایا کہ: لوگ جینے کے لئے روٹی کھایا کرتے ہیں، لیکن

افریقہ والے مرنے کے لئے روٹی کھاتے ہیں۔

تو دُوسری بات یہ ہے کہ پیٹ کا حدودِ اَربعہ ناپ لیجئے کہ معدہ شریف اتنا ہے، اور یہ دیکھئے کہ اتنے سے یہ بھر سکتا ہے، بھرنے سے کم کھایا کریں۔

لنگی چھوٹی کرنا:

تیسری بات یہ ہے کہ لنگی ذرا چھوٹی پہنیں۔ ہمارے پنجاب کے چودھری لنگی پہنتے ہیں، لیکن دو ہاتھ پیچھے لٹکتی ہے اور سڑک کو جھاڑو دیتی ہوئی جاتی ہے، عرب بھی لنگی پہنتے تھے، خود آنحضرت ﷺ بھی لنگی پہنا کرتے تھے، البتہ شلوار آنحضرت ﷺ نے ملاحظہ فرمائی اور اس کو پسند فرمایا، اور ایک روایت میں ہے کہ:

"...... فَجَاءَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْشِيْ فَسَاوَمَنَا بِسَرَاوِيْلَ فَبِعْنَاهُ......" (مشکوٰۃ ص:۲۵۳، بحوالہ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: "آپ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور آپ نے بھاؤ کیا، پھر آپ نے شلوار خرید بھی فرمائی۔"

لیکن کسی روایت سے پہننا ثابت نہیں۔ بہرکیف! لنگی آپ پہنئے، لیکن چھوٹی ہو، یعنی ٹخنوں سے اُونچی ہو۔

حضرت خریم اسدی رضی اللہ عنہ جو قبیلہ بنواسد کے تھے، صحابی ہیں، آپ ﷺ نے ایک دفعہ مجلس میں بیٹھے بیٹھے فرمایا:

"...... نِعْمَ الرَّجُلُ خُرَيْمٌ الْأَسَدِيُّ لَوْ لَا طُوْلُ جُمَّتِهٖ وَإِسْبَالُ إِزَارِهٖ، فَبَلَغَ ذٰلِكَ خُرَيْمًا فَأَخَذَ شَفْرَةً فَقَطَعَ بِهَا جُمَّتَهُ إِلٰى أُذُنَيْهِ وَرَفَعَ إِزَارَهُ إِلٰى أَنْصَافِ سَاقَيْهِ۔" (مشکوٰۃ ص:۳۸۲)

ترجمہ: "خریم اسدی بہت اچھا آدمی ہے، لیکن کاش! کہ اس کی زُلفیں زیادہ بڑی نہ ہوتیں اور چادر زیادہ نیچے نہ ہوتی، یعنی لنگی زیادہ نیچے نہ ہوتی۔ سبحان اللہ! خریم اسدی کو اس سے زیادہ کیا چاہئے تھا، "نعم الرجل" کا خطاب مل گیا کہ بہت اچھا آدمی ہے، انہوں نے سنا تو گھر گئے اور کانوں کی لَو تک بال کٹوا دیئے، یعنی پٹھے بنوالئے اور اپنی لنگی آدھی پنڈلی تک کرلی۔"

ساری عمر پھر اسی طرح گزری۔ ان کا ایمان اس طرح بنا تھا کہ ایک دفعہ اشارہ ہوجانا کافی تھا، حکم نہیں، حکم تو حکم ہوتا ہے، اشارۂ ابروئے چشم، آنکھوں کا اشارہ بھی ان کے لئے کافی ہوجاتا تھا۔

تو لنگی چھوٹی کرو، کتنی کرو؟ مؤمن کی لنگی آدھی پنڈلی تک ہوتی ہے، آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:

"......اِزَارَةُ الْمُؤْمِنِ اِلٰی اَنْصَافِ سَاقَیْهِ لَا جُنَاحَ عَلَیْهِ......فِیْمَا بَیْنَهٗ وَبَیْنَ الْكَعْبَیْنِ، وَمَا أَسْفَلَ مِنْ ذٰلِكَ فَفِی النَّارِ۔"

(مشکوٰۃ ص:۳۷۴، بحوالہ ابوداؤد، ترمذی)

مؤمن کی لنگی آدھی پنڈلی تک ہوتی ہے، اور اس کا کوئی گناہ نہیں، آدھی پنڈلی سے لے کر ٹخنوں کے درمیان رہنے تک اگر ٹخنوں سے اُوپر رہے تو کوئی گناہ نہیں، کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر ٹخنوں سے نیچے لنگی چلی گئی تو وہ دوزخ میں ہے۔ لنگی اکیلی دوزخ میں نہیں جائے گی، وہ تمہیں بھی ساتھ لے کر جائے گی۔

تو تیسرا کام یہ کیجئے کہ لنگی چھوٹی کیجئے۔

قمیص کو پیوند لگانا:

اور چوتھا کام یہ کیجئے کہ قمیص کو پیوند لگائیے، کُرتے کو پیوند لگائیے، جب تک کہ کُرتے کو پیوند نہ لگ جائیں، اس کو پُرانا نہ سمجھئے۔

جس دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس کو فتح کرنے کے لئے تشریف لے گئے ہیں، اس دن امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کُرتے مبارک کو چودہ پیوند لگے ہوئے تھے، جس میں تین یا چار چمڑے کے پیوند تھے، کپڑے کو چمڑے کا پیوند لگا ہوا تھا، یہ مسلمانوں کا امیر المؤمنین جا رہا ہے اور پادریوں کے مطالبے پر جا رہا ہے، اپنی نمائش کرانے کے لئے نہیں۔ پادریوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دُور سے دیکھ کر کہا کہ اگر فلسطین کا فاتح یہی ہے تو ہم لڑائی کے بغیر دروازہ کھول دیں گے، اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو تم ہزار ٹکریں مارتے پھرو، تم فلسطین کو فتح نہیں کر سکتے، بیت المقدس کو فتح نہیں کر سکتے۔

جوتا گانٹھنا:

اور پانچواں کام یہ کیجئے اپنا جوتا گانٹھ لیا کیجئے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے مشاغل گھر میں آنے کے بعد کیا ہوتے ہیں؟ فرمانے لگیں:

"......كَانَ بَشَرًا مِّنَ الْبَشَرِ، یَفْلِیْ ثَوْبَهٗ وَیَحْلِبُ شَاتَهٗ وَیَخْدِمُ نَفْسَهٗ۔"

(شمائل ترمذی ص:۲۴، ۲۵)

ترجمہ: "آپ ﷺ انسانوں میں سے ایک انسان تھے، آپ اپنا کپڑا سلائی کر لیتے تھے، اور بکری کا دُودھ نکال لیتے تھے، بکری دوہ لیتے تھے، اور اپنی ضروریات بدستِ خود پوری فرما لیتے تھے۔"

یہ پانچ کام ہو گئے، امیر المؤمنین ان پانچ نمبروں پر عمل کیجئے، اِن شاء اللہ آپ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ جاملیں گے۔

خلاصہ یہ کہ:

۱: امیدیں کم کرنا۔

۲: بھوک سے کم کھانا۔

۳: لنگی چھوٹی پہننا۔

۴: قمیص کو پیوند لگانا۔

۵: جوتے خود گانٹھ لینا۔

میرا ذوق:

میری شلوار درزیوں کے پاس جاتی ہے تو درزی لوگ مذاق کرتے ہیں کہ کسی بچے کی شلوار لے آئے ہو، میرے بچوں کی شلواریں مجھ سے بڑی ہیں، لیکن پھر وہ زبردستی نیچا کر دیتے ہیں، میں ہر موقع پر کہہ کر بھیجتا ہوں کہ ایک اِنچ کم رکھنا، اگر میری نصیحت پر عمل ہوتا تو اب تک گھٹنوں تک آ گیا ہوتا، مگر وہ میری سنتے نہیں، اور اس کا اثر یہ ہے کہ مجھے اُوپر کر کے باندھنا پڑتا ہے، جی چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے پاجامے، شلواریں آدھی پنڈلی تک ہوں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو یہی محبوب تھا، اور یہی ان کا عمل تھا، محبوب کا نقشہ یہ ہے، لیکن خیر اِجازت ہے، لیکن ٹخنوں سے نیچے پہننا تو خالص کبر ہے جو میں بتا ہی چکا ہوں۔

پیوند کا بدل:

اِزار کہو، شلوار کہو، پاجامے کہو، یا پینٹ کہو، پینٹ پہننا ویسے ہی گناہ ہے، کیونکہ تم لوگ صرف انگریزوں کی مشابہت کے لئے پہنتے ہو، پینٹ پہننا مکروہِ تحریمی ہے، باقی سرد علاقے کے لوگ اپنا گرم لباس بنالیں تو ان کو یہ مناسب ہے، لیکن تم یہاں بیٹھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ سرد علاقے کے لوگوں کو تو پینٹ پہننا لازم ہوگا، میں وہاں بھی گیا ہوں، ان کے لباس بھی دیکھے ہیں، ان کے ہاں بھی یہ چیزیں کوئی لازم نہیں، یہ تمہارا اِحساسِ کمتری ہے، اور قمیصوں کو پیوند لگاؤ، میرے گھر والے ایک دن کہنے لگے: تم نیا جوتا اور نئے کپڑے بہت پہننے لگے ہو۔ میں نے کہا: ایک بزرگ تھے اللہ تعالیٰ ان کو ہر روز نیا لباس پہناتے تھے، نیا جوتا پہناتے تھے، تو میں خرید کر نہیں لاتا ہوں، اگر اللہ تعالیٰ مجھے روزانہ جوتوں اور کپڑوں کا نیا جوڑا پہنایا کریں تو تمہیں کیا تکلیف ہے؟ دیتے رہو جو اُتر جائے وہ دیتے رہو، اور یہی مسئلہ جوتے گانٹھنے کا بھی ہے۔

جوتے گانٹھنے پر مجھے لطیفہ یاد آیا، ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی نوّر اللہ مرقدہٗ جو ہمارے پیرو

مرشد ہیں، وہ سناتے تھے کہ بھئی ایک دن ہمارا جوتا ٹوٹ گیا تو ہم نے بنانے کے لئے موچی کو دیا، ہم بھی وہاں اتنی دیر کھڑے رہے، تو وہ اس کے ٹانکے بہت بڑے لگا رہا تھا، میں نے کہا: میاں! چھوٹے چھوٹے ٹانکے لگاؤ۔ تو مجھے بگڑ کے کہنے لگا: میاں! کبھی جوتا گانٹھا بھی ہے؟ حضرت فرماتے ہیں کہ اس کی یہ بات سن کر مجھے بڑا مزہ آیا، جوتے گانٹھنے کا کام بھی جانتے ہو؟ پھر اس نے بتایا کہ یہ جو پُرانا جوتا ہوتا ہے، ان کے ٹانکے چھوٹے چھوٹے نہیں لگتے، کیونکہ چمڑا گل جاتا ہے اور دھاگہ یعنی ڈور جوتے کے چمڑے کو کاٹ دیتی ہے، اس کے ٹانکے بڑے بڑے لگائے جاتے ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بھئی جوتے گانٹھنا بھی ایک فن ہے، اور یہ بھی اُستاذ سے سیکھنا پڑتا ہے۔

مال، اولاد نہیں، علم زیادہ ہو:

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دُوسرا ارشاد ہے کہ خیر یہ نہیں کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد زیادہ ہو، بلکہ خیر یہ ہے کہ تمہارا علم زیادہ ہو اور تمہارا حلم بڑھتا رہے۔ علم کے ساتھ حلم، جتنا علم بڑا ہو اتنا حلم بھی بڑا ہو۔

مال کی زیادتی فضلِ الٰہی نہیں:

عام طور پر لوگ کسی سے پوچھیں گے: تمہارا کیا حال ہے؟ کہتا ہے: ''بڑا اللہ تعالیٰ کا فضل ہے!'' کیا فضل ہے؟ نماز کی کبھی توفیق نہیں ہوتی، زکوٰۃ، حساب کر کے دینے کی کبھی توفیق نہیں ہوئی، حج سالہا سال سے فرض ہے اس کی کبھی توفیق نہیں ہوئی، زمین پر زمین خرید رہے ہیں، کارخانے پر کارخانے بنا رہے ہیں، فیکٹریوں پر فیکٹریاں بنا رہے ہیں، دُکانوں پر دُکانیں بنا رہے ہیں، اور بچے پیدا کر رہے ہیں، اور جب پوچھا جائے تو کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے!'' یہ اللہ تعالیٰ کا فضل نہیں ہے، اس سے انکار نہیں کہ یہ دُنیا کی نعمتیں بھی اللہ تعالیٰ کی عنایت ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل اس پر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال و اولاد دے کر اپنی بندگی کی توفیق عطا فرمائی، اس پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ ورنہ ہندوؤں کے پاس، سکھوں کے پاس، چوڑھوں کے پاس، عیسائیوں کے پاس، یہودیوں کے پاس، اور لامذہب قوموں کے پاس پیسہ تم سے زیادہ ہے، تمہارے پاس پاکستانی روپیہ ہے، ان کے پاس ڈالر ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضل تھا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کا فضل تھا، کندھے پر ایک چادر اور ہاتھ میں ایک عصا تھا، اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اور قارون جس کے خزانوں کو قرآنِ کریم کے مطابق خزانے کی کنجیوں کو ایک بڑی جماعت نہیں اُٹھا سکتی تھی:

﴿مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ﴾ (القصص:۷۶)

ایک طاقت ور جماعت سے مراد ایک اُونٹوں کی جماعت مراد ہے، اتنے خزانے تھے کہ اس کے خزانوں کی کنجیاں اُونٹوں کی جماعت پر لادی جاتی تھیں، تو ان کو تھکا دیتے تھے۔ اتنا خزانہ، اتنا مال، کیمیا گری حاصل کر لی تھی اس بدبخت نے، حضرت جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کی سم سے کہ نیچے سے مٹی اُٹھائی تو اس کے ذریعے سے اس کو کیمیا گری حاصل ہوئی ہے، سونا بنانا جانتا تھا، سیٹھ ہو گیا اور اتنا بڑا سیٹھ، اس پر اللہ تعالیٰ کا فضل نہیں تھا، اللہ تعالیٰ کا فضل موسیٰ علیہ السلام پر تھا۔

تو امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: خیر کثرتِ مال کا نام نہیں بلکہ کثرتِ علم اور حلم کے زیادہ ہونے کا نام ہے۔

شیعانِ علی اور حضراتِ اہلِ بیت

[حدیث:۱۳۰۸] "اَخرَجَ الطِّبرَانِیُّ عَنْ اَبِیْ جَمِیْلَةَ اَنَّ الْحَسَنَ بْنَ عَلِیٍّ رَضِیَ اللہُ عَنْهُمَا حِیْنَ قُتِلَ عَلِیٌّ رَضِیَ اللہُ عَنْهُ، اُسْتُخْلِفَ فَبَیْنَا هُوَ یُصَلِّیْ بِالنَّاسِ اِذْ وَثَبَ اِلَیْهِ رَجُلٌ فَطَعَنَهٗ بِخَنْجَرٍ فِیْ وَرِکِهٖ فَتَمَرَّضَ مِنْهَا اَشْهُرًا ثُمَّ قَامَ فَخَطَبَ عَلَی الْمِنْبَرِ فَقَالَ: یَا اَهْلَ الْعِرَاقِ! اِتَّقُوا اللہَ فِیْنَا فَاِنَّا اُمَرَاءُکُمْ وَضِیْفَانُکُمْ وَنَحْنُ اَهْلُ الْبَیْتِ الَّذِیْنَ قَالَ اللہُ عَزَّ وَجَلَّ: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللہُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا ﴿۳۳﴾ فَمَا زَالَ یَوْمَئِذٍ یَتَکَلَّمُ حَتّٰی مَا تَرٰی فِی الْمَسْجِدِ اِلَّا بَاکِیًا." (تفسیر ابن کثیر ج:۳ ص:۴۸۶)

ترجمہ: "طبرانی میں حضرت ابوجمیلہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما جب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو وہ خلیفہ ہوئے ایک دن وہ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے کہ اچانک ایک آدمی ان کی طرف لپکا پس ان کی سرین میں خنجر کا زخم لگایا جس سے وہ کئی مہینے بیمار رہے پھر آپ کھڑے ہوئے منبر پر اور خطبہ دیا، اس میں فرمایا کہ: اے اہلِ عراق اللہ تعالیٰ سے ڈرو ہمارے معاملے میں بے شک ہم تمہارے امیر ہیں اور ہم تمہارے مہمان ہیں اور ہم اس اہلِ بیت میں سے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ اللہُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا ﴿۳۳﴾﴾ (الاحزاب) (اللہ تعالیٰ تو بس یہ چاہتے ہیں کہ اے اہلِ بیت تم سے گندگی کو دور کر دیں اور تم کو اچھی طرح پاک کر دیں) پس اس دن آپ گفتگو فرماتے رہے یہاں تک کہ مسجد میں کوئی آدمی بھی باقی نہیں رہا جو نہ رو رہا ہو۔"

تشریح: اس واقعہ میں تین باتیں ذکر کی گئی ہیں:

۱:......ایک یہ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور وہ لوگوں کو نماز پڑھارہے تھے تو ایک آدمی نے ان کو خنجر کا زخم لگایا کولہے پر، جس سے وہ کئی دن بیمار رہے۔

۲:......دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ آپ نے خطبہ دیا اور اہل عراق سے فرمایا: ''اے اہل عراق ہمارے معاملے میں تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو ہم تمہارے امیر بھی ہیں، حاکم بھی ہیں، اور تمہارے مہمان بھی ہیں کیونکہ مدینے سے آئے ہوئے ہیں، اہل عراق نہیں ہیں۔''

۳:......اور تیسری بات یہ فرمائی کہ: ہم ان اہل بیت میں سے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا ﴿ۚ۳۳﴾﴾ (الاحزاب) (اللہ تعالیٰ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ اے اہلِ بیتِ نبی! اللہ تعالیٰ تم سے گندگی کو دور کردے اور تم کو پوری طرح پاک کردے)۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ایسا خطبہ دیا کہ مسجد کے تمام لوگ رو رہے تھے، اہل کوفہ اور اہل عراق یہ شیعانِ علی کہلاتے تھے یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گروہ اور ان کی جماعت۔

شیعانِ علی کا کردار:

حضرت علی کرم اللہ وجہہ مدینہ کے بجائے کوفہ میں تشریف لے آئے تھے اور کوفہ کو اپنا دارالخلافہ بنالیا تھا لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان لوگوں نے وفا نہیں کی، اسی طرح حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں نے بڑی ایذائیں پہنچائیں، شریف نجفی نے (جو شیعہ مصنف ہیں) اپنی کتاب ''نہج البلاغۃ'' میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جو چند خطبے جمع کئے ہیں ان میں بار بار اس بات کی شکایت کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب بھی ان کو حکم فرماتے تھے، قتال کا، لڑائی کا، تو وہ اس کے لئے آمادہ نہیں ہوتے تھے، اور جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی سے صلح کا ارادہ فرماتے تھے تو وہ اس پر معترض ہوتے تھے۔

شیعانِ علی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں:

ایک خطبے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ میں تم لوگوں سے تنگ آگیا ہوں اور شاید تم مجھ سے تنگ آگئے ہو، اللہ کی قسم! میں اس بات پر راضی ہوں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ سودا کرلوں، جس طرح کہ دینار کا درہم سے سودا کیا جاتا ہے، دینار سونے کا سکہ تھا اور درہم چاندی کا سکہ، ایک دینار کے دس درہم ملتے تھے تو میں چاہتا ہوں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کے آدمیوں کا تم سے سودا کرلوں جس طرح کہ

دینار کا درہم سے سودا کیا جاتا ہے، یعنی تمہارے دس آدمی دے دوں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک آدمی لے لوں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعت کے لوگ ان کے نہایت فرمانبردار ہیں، وہ جو حکم کرتے ہیں اس کی تعمیل کرتے ہیں لیکن تم لوگ میرے حکم کی تعمیل نہیں کرتے۔

اسی سے معلوم ہوجاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں کے ہاتھوں کتنے تنگ ہوں گے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کسی فیصلے پر وہ جان و دل سے راضی نہیں ہوتے تھے، نکتہ چینی کرتے تھے، معارضہ کرتے تھے، مقابلہ کرتے تھے ایسے لوگوں کو لے کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیسے لڑیں؟ یہی معاملہ ان لوگوں نے ان کے صاحبزادہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ شیعانِ علی کے مظالم:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو یہ کہا جاتا تھا اور اہل کوفہ کہا کرتے تھے کہ یہ سخت آدمی ہیں، جو رائے قائم کرلیتے ہیں اس سے بدلتے نہیں اور بلاوجہ لڑائی بھڑائی کرتے ہیں، مختلف قسم کی نکتہ چینیاں کرتے تھے، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت حسن سبط اکبر، نواسہ رسول، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھول، ریحانۃ النبی انکا لقب تھا، یہ مزاج کے بہت نرم تھے، ان میں سخت گیری نہیں تھی اور نرم مزاج حاکم رعایا کے دل میں محبوب ہوتا ہے لیکن ان لوگوں کا رویہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی یہی رہا یہاں تک کہ نماز کی جماعت کھڑی ہے، ایک آدمی نے خنجر کے ساتھ حملہ کیا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زخمی کردیا۔

اور بعض روایات میں آتا ہے کہ ان لوگوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا خیمہ لوٹ لیا، سامان اڑا کے لے گئے، زدوکوب بھی کیا ایک صاحب حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے ملنے کے لئے آئے حضرت حسن رضی اللہ عنہ ان سے فرمانے لگے کہ تم دیکھ رہے ہو یہ لوگ جو میرے شیعہ کہلاتے ہیں انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟ اللہ کی قسم! میں یہ چاہتا ہوں کہ معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کرلوں اور اپنی جان کو، اپنے اہل وعیال کو اس کے ذریعے سے محفوظ کرلوں اس لئے کہ اگر یہی عالم رہا تو میں سمجھتا ہوں کہ نہ میری جان محفوظ رہے گی ان لوگوں سے اور نہ میرے اہل وعیال محفوظ رہیں گے، نہ میرا خاندان محفوظ رہے گا۔

شیعہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو کچھ ان کوفہ والوں نے کیا وہ تو سب کو معلوم ہے، ان لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلایا اور جن لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر غائبانہ بیعت کی تھی سینکڑوں خطوط لکھ کر، انہیں لوگوں نے آپ کے خلاف تلوار اٹھائی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی، یعنی تینوں زمانوں میں ان لوگوں نے جو کہ شیعان

علی کہلاتے تھے ان تینوں بزرگوں کی خوب خوب بددعائیں سمیٹیں اور شاید اسی کا اثر ہے کہ کبھی ان لوگوں کو چین نصیب نہیں ہوا، ان بزرگوں کی بددعائیں سمیٹنے کے بعد یہ کبھی چین سے نہیں بیٹھے، یہاں تک کہ سینہ کوبی ان کا شعار بن گیا۔

تو ایک مضمون تو یہ ہے کہ اہل کوفہ اور اہل عراق، جو خاص حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گروہ تھا ان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور ان سے پہلے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ رویہ۔

اور دوسرا مضمون ہے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا ان کو خطبہ دینا اور فہمائش کرنا جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اپنے خطبات شریفہ میں ان کو بار بار فہمائش کرتے تھے، خدا کا خوف دلاتے تھے، نصیحت کرتے تھے، خیرخواہی کرتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد تھے ان کی زبان کتنی مبارک ہوگی، کتنی بابرکت ہوگی، باب مدینۃ العلم تھے، ان کی زبان مبارک سے علم اور معرفت کے گویا چشمے پھوٹتے تھے، لیکن ان لوگوں پر کوئی چیز اثر نہیں کرتی تھی حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بھی خطبے دیئے، اور متعدد بار خطبے دیئے، ایک خطبہ کا اس روایت میں ذکر کیا گیا ہے جس میں فرمایا:

اے اہل عراق تم اس معاملے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو اس لئے کہ ہم تمہارے امیر بھی ہیں اور تمہارے یہاں مہمان بھی ہیں، امیر کا بھی حق ہے کہ جب تک وہ راہ راست پر چلے لوگ اس کی اطاعت کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بار بار تاکید فرماتے ہیں: "اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا" سنو اور اطاعت بجالاؤ یعنی اپنے حاکم کی سنو اور اس کی مانو، "اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ مِنَ اللہِ فِیْہِ بُرْھَانٌ" (مشکوٰۃ:۳۱۹) الا یہ کہ تم دیکھو کہ وہ صریح کفر بک رہا ہے، تمہارے پاس اس معاملے میں اللہ کی جانب سے برہان (واضح دلیل) موجود ہے۔

غیر مشروط اطاعتِ نبوی:

یہ مسئلہ اس سے پہلے میں ذکر کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے علاوہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت غیر مشروط ہے اس میں کوئی شرط نہیں ہے، یہ نہیں کہ اگر کوئی اچھی بات کہیں تو مانو اور اگر کوئی دوسری قسم کی بات کہیں تو نہ مانو۔ اس لئے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیر کے علاوہ کوئی دوسری بات کہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت صرف دین کے کاموں میں نہیں ہے، صرف یہ نہیں کہ دین کے کاموں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مانی جائے، بلکہ اگر خالص دنیاوی کام میں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ کسی شخص کے شخصی اور ذاتی معاملے میں کوئی حکم صادر فرمائیں تو اس کی تعمیل بھی واجب ہے، قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ﴾ (الأحزاب)

ترجمہ: ''کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو ان کو اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہ جائے، (رسول اللہ ﷺ کا حکم صادر ہونے کے بعد کسی شخص کو اپنے ذاتی معاملے میں بھی اختیار باقی نہیں رہتا، تعمیل واجب ہے) اور جو شخص نافرمانی کرے، اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی، تو وہ بہہ گیا دور کی صریح گمراہی میں۔''

تو آنحضرت ﷺ کی اطاعت غیر مشروط ہے، مگر اس کے باوجود آنحضرت ﷺ جب بھی فرماتے تھے تو یہ فرماتے تھے کہ میرے نیک کاموں میں اطاعت کرو۔

ماں باپ کی اطاعت مشروط ہے:

اسی طرح والدین کی اطاعت بھی فرض ہے، ماں باپ کی اطاعت بھی فرض ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ﴾ (بنی اسرائیل: ۲۳)

ترجمہ: ''اور تیرے رب نے قطعی فرمان جاری کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔''

لیکن ماں باپ کی اطاعت مشروط ہے غیر مشروط نہیں اس کے لئے شرط یہ ہے کہ ماں باپ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف حکم نہ دیں اگر اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف حکم دیں تو اطاعت کرنا جائز نہیں، قرآن کریم میں ہے:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾

(لقمٰن: ۱۵)

ترجمہ: ''اور اگر تجھے والدین اس بات پر مجبور کریں کہ تو ایسی چیز کی عبادت کرے جس کا تجھے علم نہیں تو ان کا کہنا نہ مان۔''

حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنی والدہ ماجدہ کے بہت ہی زیادہ فرمانبردار تھے جب یہ مسلمان ہو گئے تو ان کی ماں نے کھانا کھانا چھوڑ دیا، کہنے لگیں کہ تم مسلمان ہو گئے ہو، جب تک محمد ﷺ کے دین کو نہیں چھوڑتے میں کھانا نہیں کھاؤں گی، یہ ان کی بڑی منت سماجت کرتے رہے کہ اماں تم کھانا کھا لو (دین کا معاملہ

آدمی کا اپنا اختیاری ہے، اپنی اپنی سمجھ کے مطابق آدمی دین اختیار کرتا ہے) لیکن بڑھیا نہیں مان کے دیتی تھی، دو دن گزر گئے اس نے کھانا نہیں کھایا، تیسرے دن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: اماں! اگر تو مر بھی جائے گی تو میں اسلام نہیں چھوڑوں گا، اب تیرا جی چاہے کھانا کھالے اور تیرا جی چاہے نہ کھا، مرجا، میں نہیں چھوڑوں گا، چنانچہ اس نے کھانا کھانا شروع کر دیا کہ یہ بیٹا تو نہیں مان رہا، بہر حال ماں باپ کا بہت بڑا حق، بہت بڑا حق ہے اور یہ تو بہت ہی مشہور حدیث ہے ہر ایک کو یاد ہوگی: "اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ" (کنز العمال: ج:۱۶ حدیث نمبر:۴۵۴۳۹) (جنّت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے)۔

ایک اور روایت میں ہے کہ:

"اَلْوَالِدُ اَوْسَطُ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَاِنْ شِئْتَ فَحَافِظْ عَلَى الْبَابِ اَوْ ضَيِّعْ۔"

(مشکوۃ:۴۲۰)

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باپ جنّت کا درمیانی دروازہ ہے اگر تو چاہے تو اس کو قائم رکھ، چاہے تو اس کو ڈھادے۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا:

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ وَلَدٍ بَارٍّ يَنْظُرُ اِلٰى وَالِدَيْهِ نَظْرَةَ رَحْمَةٍ اِلَّا كَتَبَ اللهُ لَهٗ بِكُلِّ نَظْرَةٍ حَجَّةً مَبْرُوْرَةً۔ قَالُوْا: وَاِنْ نَظَرَ كُلَّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ؟ قَالَ: نَعَمْ! اَللهُ اَكْبَرُ وَاَطْيَبُ۔" (مشکوۃ ص:۴۲۱)

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اگر فرمانبردار بیٹا اپنے ماں باپ میں سے کسی کو نظر رحمت کے ساتھ دیکھے تو ایک دفعہ نظر ڈالنے پر اللہ تعالیٰ اس کو حج مبرور کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔" (ایک دفعہ ماں باپ کو نظر رحمت کے ساتھ دیکھنے سے حج مبرور، حج مقبول کا ثواب ملتا ہے) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا چاہے ہم دن میں سو بار بھی اپنے ماں، باپ کو دیکھیں پھر بھی یہی ثواب ملتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا پھر بھی یہی ثواب ملتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ دینے والا ہے اس سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے۔"

تو اللہ تعالیٰ کو ثواب دینا کیا مشکل، کیا اللہ کا ثواب ختم ہو جائے گا؟ تو والدین کا بڑا درجہ ہے ان کی ہر جائز خواہش کو پورا کرو جہاں تک تمہارے امکان میں ہو، لیکن دو باتوں کا لحاظ رکھو:

ایک یہ کہ والدین کی اطاعت اللہ کی نافرمانی کر کے نہ کرو، شریعت کی خلاف ورزی کر کے نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ماں باپ کی اطاعت پر مقدم ہے، اگر والدین اس پر ناراض

ہوتے ہیں کہ یہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی بات کیوں مانتا ہے؟ تو ان کو ناراض ہونے دو، اللہ ان کو ہمیشہ رنجیدہ رکھے دنیا میں بھی، قبر میں بھی، آخرت میں بھی، اللہ کبھی ان کا رنج دور نہ کرے اس لئے کہ وہ اپنی اولاد کو اللہ کی نافرمانی پر آمادہ کرتے ہیں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتے ہوئے کسی کی حق تلفی نہ کرو، ساس اور بہو کا قضیہ تو ہمیشہ چلتا رہتا ہے اور شاید یہ اماں حوا کے زمانے سے چلا آرہا ہے، یہ ایسی لاعلاج بیماری ہے کہ کسی حکیم نے کبھی اس کا علاج نہیں کیا، کر ہی کیا سکتا ہے؟ اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ یہ وہ پل صراط ہے جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک، ماں کو خوش رکھے تو بیوی ناراض اور بیوی کو خوش رکھے تو اماں ناراض اور اس معاملے میں بعض احمق تو وہ ہیں جو زن مرید ہوکر ماں باپ کے گستاخ ہوجاتے ہیں، بیوی کی مانتے ہیں، ماں کی سنتے ہی نہیں، اس کے حقوق واجبہ بھی ادا نہیں کرتے اور ان کے مقابلے میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ماں باپ کے فرمانبردار ہوتے ہیں اور بیوی پر ظلم ڈھاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بیوی ان کی غلام بن کر رہے، بہت اچھی بات ہے اگر کوئی بیوی شوہر کے ماں باپ کو اپنے ماں باپ سمجھتے ہوئے (کہ چونکہ شوہر کے ماں باپ ہیں اس لئے اپنے بھی ماں باپ ہیں) ان کی خدمت اسی طرح کرے جس طرح ماں باپ کی خدمت کی جاتی ہے تو یہ اس کے لئے بڑی سعادت ہے اور ایسی بچیاں دنیا اور آخرت میں خوشحال ہوتی ہیں۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بوڑھی عورتوں کی عادت ہوتی ہے طعن تشنیع کی، بہو یہ بھی برداشت کرتی رہے، کوئی بات نہیں ٹھیک ہے آخر ماں بھی تو ناراض ہوجاتی ہے بچیوں سے، کوئی حرج نہیں کرنے دو، تو اگر کوئی بہو ایسی نیک بخت ہو کہ اپنے شوہر کے والدین کو واقعتا اپنے والدین سمجھے بلکہ ان سے بڑھ کر، تو یہ اس کی بہت بڑی سعادت ہے، اس کی کرامت اور بزرگی ہے، اس کی نیکی ہے اور انشاء اللہ دنیا میں بھی اس کا اجر پائے گی اور مرنے کے بعد بھی اجر پائے گی، لیکن بھائی! اگر وہ اس پر آمادہ نہیں ہوتی تو تم اس پر زبردستی نہیں کرسکتے، پھر شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس کا چولہا الگ کردو، بہت سے گھر برباد ہوگئے ہیں صرف اس نقطے کی وجہ سے کہ لڑکی کی اپنی ساس کے ساتھ بنتی نہیں اور میاں نے اسکو اپنے میکے میں بٹھادیا ہے۔

تو میں عرض کررہا ہوں کہ والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری مشروط ہے اس کے ساتھ کہ کسی دوسرے کی حق تلفی نہ ہو، اگر تم ماں باپ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے کسی کی حق تلفی کررہے ہو تو قیامت کے دن تم سے مواخذہ ہوگا اور تم فرمانبردار نہیں سمجھے جاؤ گے۔

حاکم کی اطاعت بھی مشروط ہے:

اسی طرح حاکم کی اطاعت بھی فرض ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول

ﷺ کے خلاف کوئی حکم نہ دے، اگر وہ شریعت کے خلاف کوئی حکم دیتا ہے تو اس کی اطاعت فرض نہیں: "فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ" اگر شریعت کی حدود میں حاکم کوئی حکم دیتا ہے تو امیر کا یعنی حاکم کا حق ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم تمہارے حاکم ہیں اور ظاہر ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ ایسی ناجائز بات کا تو حکم نہیں فرمائیں گے جیسا ان کے والد ماجد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کسی ناجائز بات کا حکم نہیں فرماتے تھے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے ایسے حاکم عطا فرمائے ہوں اور وہ ان کی قدر نہ کریں تو ان کی بڑی بدقسمتی ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبات میں یہ فرمایا تھا کہ میں تم سے تنگ آ گیا ہوں اور میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے یہاں سے رخصت کر دیں اور مجھے ایسے لوگوں کی رفاقت عطا فرمائیں جو تم سے بہتر ہوں اور تمہیں ایسے حاکم نصیب فرمائے جن کا تم مزہ چکھو، اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم تمہارے مہمان بھی ہیں، مہمان کا بھی حق ہے، کیونکہ حدیث میں ہے:

> "مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يُؤْذِ جَارَهُ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْ لِيَصْمُتْ۔" (مسند احمد ج:۲ ص:۱۷۴)
>
> ترجمہ: "جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے ہمسائے کو ایذا نہ پہنچائے (نہ قول کے ساتھ نہ فعل کے ساتھ)، اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ اچھی بات کہے یا خاموشی اختیار کرے۔"

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا مہمان کا اکرام ضروری ہے تو ہم تمہارے حاکم بھی ہیں اور تمہارے مہمان بھی ہیں اور تیسری بات یہ کہ ہم ان اہل بیت میں سے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

> ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝۳۳﴾ (الاحزاب)

رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ تمہیں یہ احکام اس لئے دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تم سے گندگی کو دور رکھیں اور تم کو پوری طرح پاک اور پاکیزہ کریں جس طرح کہ پاک اور پاکیزہ کرنے کا حق ہے۔

اہلِ بیت کا مصداق:

یہاں پر یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ یہاں پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جو آیت تلاوت فرمائی یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے اور اس آیت کے ٹکڑے سے پہلے اور بعد میں سلسلہ گفتگو چل رہا ہے اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے ساتھ اور پورے رکوع میں انہیں کے ساتھ گفتگو کا ذکر ہے اور اسی ضمن میں یہ بات ارشاد فرمائی کہ اے اہل بیت! اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور کر دے، ظاہر ہے کہ اس سے اخلاق اور اعمال کی گندگی مراد ہے یعنی تمہارے اخلاق بھی پاکیزہ ہوں، تمہارے اعمال بھی پاکیزہ ہوں، اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں۔تو اہل بیت کون ہیں؟ چونکہ گفتگو چل رہی ہے ازواجِ نبی کے بارے میں تو اہلِ بیت بھی وہی ہوں گے، اہلِ بیت کا خطاب بھی انہیں کے لئے ہے۔

ایک اور موقع پر بھی اہل بیت کا ذکر آیا ہے قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس فرشتے آئے تھے بیٹے کی خوشخبری لے کر، حضرت اسحاق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت کی خوشخبری لے کر فرشتے آئے تھے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ﴿۷۱﴾﴾ (ہود)

ترجمہ: ''ان کی اہلیہ کھڑی تھیں (حضرت اسحاق کی والدہ، حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیوی) پس وہ مسکرائیں ہم نے اس کو خوشخبری دی اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی۔''

یعنی ہم نے ان کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی خوشخبری دی اور یہ بھی خوشخبری دی کہ صرف بیٹا نہیں پوتا بھی ہوگا، یعنی اسحاق کے بعد یعقوب بھی ہوگا، اور تم دونوں میاں بیوی بیٹے کی اولاد دیکھ کر جاؤ گے، کہنے لگیں کہ تعجب کی بات ہے کہ اب میں بچہ جنوں گی نوے سال کی بڑھیا؟ اوپر یہ میرے میاں کھڑے ہیں! اس پر ارشاد ہوا:

﴿قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ﴿۷۳﴾﴾ (ہود)

ترجمہ: ''فرشتے کہنے لگے کیا تم تعجب کرتی ہو اللہ کے حکم سے؟ اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہیں تم پر اے گھر والو! بے شک اللہ بہت خوبیوں والا اور بہت بزرگی والا ہے۔''

یہ تو گھر ہی ایسا ہے کہ ہمیشہ اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کا مورد رہا ہے، تو اگر حق تعالیٰ شانہ نے اس عمر

میں بیٹا عطا فرما دیا کون سا مشکل ہے، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ اب یہاں پر فرشتے اہل البیت (اے گھر والو) کس کو کہہ رہے ہیں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سے گفتگو کر رہے ہیں، ان کو اہل بیت کہہ رہے ہیں، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو فرشتے اہل بیت کہہ رہے ہیں، اور نبی کی بیوی کو اللہ تعالیٰ اہل بیت کہہ رہے ہیں۔

شیعہ اور اہلِ سنّت کا اہلِ بیت کے مصداق میں اختلاف:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ایک چادر کے نیچے، حضرت علی کو، حضرت حسن کو، حضرت حسین کو اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور کہا:

"اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ فَاَذْھِبْ عَنْھُمُ الرِّجْسَ وَطَھِّرْھُمْ تَطْھِیْرًا۔"

(مجمع الزوائد ج:۹ ص:۱۶۷)

ترجمہ: "اے اللہ یہ لوگ میرے گھر والے ہیں اہل بیت ہیں یا اللہ ان سے بھی گندگی کو دور کر دے اور ان کو بھی پاک کر دے۔"

بس ہمارا اور ان حضرات کا جھگڑا بس اسی "بھی" اور "ہی" میں ہو گیا۔

ہم نے کہا کہ نبی کی بیویوں کو قرآن نے اہل بیت کہہ دیا تھا، بات کو سمجھو مسئلہ سمجھ لو، نبی کی بیویوں کو، اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کو اللہ تعالیٰ نے اہلِ بیت کہہ کر پکارا اہل بیت بھی انہیں کو کہا اور ان سے گندگی کو دور کرنے کا حکم بھی اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا، ان کو پوری طرح پاک کر دینے کا فیصلہ بھی خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اور آنحضرت ﷺ نے چاہا کہ اس حکم میں ان کو بھی شریک کر دیا جائے، چنانچہ ان کو چادر کے نیچے جمع کر کے اللہ سے دعا فرمائی اور رسول اللہ ﷺ کی دعا مقبول ہے اس لئے یہ چاروں بھی رسول اللہ ﷺ کی چادر کے نیچے اہل بیت میں شامل ہو گئے اور قرآن کریم کا یہ اعلان کہ اللہ تعالیٰ تم سے گندگی دور کرنا چاہتا ہے اور تمہیں پاک کرنا چاہتا ہے ان کو بھی شامل ہو گیا، کیونکہ حضور ﷺ کی دعا مقبول ہے، تو ہم نے کہا یہ بھی اہل بیت ہیں اور ان حضرات نے کہا نہیں یہی اہل بیت ہیں، جن کو اہل بیت قرآن نے کہا تھا ان کو خارج کر دیا، یہ تو زیادتی کی بات ہے، انصاف کیا جائے جن کو قرآن اہل بیت کہہ کر پکار رہا ہے "یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ، یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ، یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ" بار بار اور درمیان میں چلتے چلتے ان کو کہہ دیا اہل البیت جیسا کہ فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو کہا تھا اہل البیت ان سے بات کرتے ہوئے، اب یہ کیسے ممکن ہے کہ فرشتے بات تو کر رہے ہوں حضرت سارا سے اور اہل بیت کوئی اور ہو؟ کیا کسی کی عقل مانے گی؟ اسی طرح یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ گفتگو تو فرما رہے ہوں ازواج مطہرات سے لیکن ان کو اہلِ بیت کے زمرے سے خارج کر دیں، یہ

نہیں ہوسکتا، ہم نے کہا کہ اہل بیت تو اَزواج النبی ہیں، کیونکہ ان کو اللہ نے اہلِ بیت کہا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے کہا: یا اللہ! یہ چار بھی اہلِ بیت میں شامل کر لیجئے! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ٹھیک ہے یہ بھی شامل ہیں اور وہ بھی شامل ہیں، ہمارا اللہ پر بھی ایمان، رسول اللہ ﷺ پر بھی ایمان، لہٰذا ہمارے نزدیک یہ سب اہلِ بیت ہیں۔

''پنج تن پاک'' کا مسئلہ:

اب ایک اور مسئلہ سمجھو، کہتے ہیں پنج تن پاک جب اللہ نے کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں پاک کرنا چاہتا ہے تو ان کے پاک ہونے میں کیا شک ہے جن کو اللہ تعالیٰ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے گندگی دور کرنا چاہتا ہے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دینا چاہتا ہے، تو کون کافر ہوگا جو ان کے پاک ہونے سے انکار کرے اور جب رسول اللہ ﷺ اپنی مبارک زبان سے دعا کر رہے ہیں: ''اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ اَهْلُ بَيْتِي فَاَذْهِبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَطَهِّرْهُمْ تَطْهِيْرًا'' یا اللہ یہ بھی میرے اہل بیت ہیں یا اللہ ان سے بھی گندگی دور فرما دیجئے اور ان کو بھی پوری طرح پاک کر دیجئے تو ان کے پاک ہونے میں کیا شک ہے، کسی مسلمان کے ذہن میں دور دور تک بھی یہ خیال نہیں آسکتا کہ خدانخواستہ نجاست اور گندگی کا کوئی شائبہ، کوئی دھبہ ان حضرات کے دامن پر لگا ہوا ہو۔

میری بات کو اچھی طرح سمجھ لو! حضرت فاطمہ، حضرت علی، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم، رسول اللہ ﷺ کی تو بات ہی کیا ہے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کے ذہن میں کبھی دور تک بھی یہ وسوسہ نہیں آسکتا کہ خدانخواستہ ان حضرات کے دامن پر گندگی کی چھینٹ یا کوئی دھبہ دور سے بھی لگا ہوا ہو، ان حضرات کے پاک ہونے میں کیا شبہ ہے؟ پھر جھگڑا کس بات کا؟ تم کہتے ہو یہی ''پنج تن'' ہی پاک ہیں، ہم کہتے ہیں یہ ''پنج تن'' پاک ہیں اور ازواج مطہرات بھی، ''بھی'' اور ''یہی ہی'' کا جھگڑا ہے، ہم کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے گھر میں جو نو بیویاں تھیں جن کو مسلمانوں کی مائیں کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پاکیزگی اور طہارت کا اعلان فرمایا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں۔

مسلمان جب بھی بولتے ہیں ''اَزواجِ مطہرات'' یعنی پاک مائیں! سبحان اللہ! ان کے دامن ایمان اور دامن اخلاق پر کوئی دھبہ باقی نہیں رہا، رکھا ہی نہیں اللہ تعالیٰ نے، اور نبی ﷺ کے گھر میں ایسی ہی بیویاں ہونی چاہئے تھیں اور مسلمانوں کی مائیں ایسی ہونی چاہئے تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے بھائی تھے لیکن بمنزلہ فرزند تھے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی تھیں، لختِ جگر تھیں، جگر کا ٹکڑا تھیں اور حسن اور حسین رضی اللہ عنہما دونوں رسول اللہ ﷺ کے پھول تھے، وہ بھی پاک، یہ بھی پاک، یہ پنج تن بھی پاک، لیکن کہنے والے صرف ان کو پاک نہیں کہتے بلکہ دوسروں کو ناپاک کہنا چاہتے ہیں، ہمیں اختلاف اسی سے ہے۔

جب کسی کے دولڑکے کھڑے ہوں تم کہو یہ بچّہ اپنے ماں باپ کا بڑا فرمانبردار ہے تو حقیقت میں تعریض ہوتی ہے کہ دوسرا نافرمان ہے، وہ ازواج مطہرات اُمّت کی مائیں جن کو قرآن نے کہا تھا: ﴿وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ تم ان کے دامن پر چھینٹے اڑاتے ہو اور صرف اس لئے ان چار یا پانچ بزرگوں کو پنج تن پاک کہتے ہو، ہمیں اس سے اختلاف ہے، ان کے پنج تن پاک ہونے میں اختلاف نہیں ہے، کیونکہ ان کے پاک ہونے میں کیا شبہ ہے؟ ہمیں اختلاف اس بات سے ہے کہ تم پنج تن پاک کہہ کر دوسروں کو ناپاک کہنا چاہتے ہو۔

معصوم اور پاک کا فرق:

ایک اور بات بھی سمجھ لو کہ معصوم ہونا اور چیز ہے پاک ہونا اور چیز ہے، تم جانتے ہو کہ ہر گناہگار سے گناہگار مسلمان جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو اس کو گناہوں سے پاک کر دیتے ہیں، پاک تو وہ بھی ہو گیا اور کوئی ایسے ہوتے ہیں کہ اس کو پاک رکھتے ہیں یعنی گناہوں کی آلودگی سے ان کو ملوث ہی نہیں ہونے دیتے، یہ بھی پاک ہیں، اور کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ گناہوں کی آلودگی کے ساتھ ملوث ہونا ان کا ممکن ہی نہیں، ان کو معصوم کہتے ہیں، پاک وہ بھی ہیں اور اللہ کے بے شمار بندے ہیں جو پاک ہیں، لیکن معصوم نہیں، معصوم صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔

مہاجرین وانصار کی فضیلت

[حدیث:۱۳۰۹] ”أَخْرَجَ الطَّبَرَانِيُّ عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِيْ سُفْيَانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: صُبُّوْا عَلَيَّ مِنْ سَبْعِ قِرَبٍ مِنْ آبَارٍ شَتّٰى، حَتّٰى أَخْرُجَ إِلَى النَّاسِ فَأَعْهَدَ إِلَيْهِمْ۔ قَالَ: فَخَرَجَ عَاصِبًا رَأْسَهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى صَعِدَ الْمِنْبَرَ، فَحَمِدَ اللهَ وَأَثْنٰى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّ عَبْدًا مِنْ عِبَادِ اللهِ خُيِّرَ بَيْنَ الدُّنْيَا وَبَيْنَ مَا عِنْدَ اللهِ، فَاخْتَارَ مَا عِنْدَ اللهِ۔ فَلَمْ يَلْقَنْهَا إِلَّا أَبُوْبَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، فَبَكٰى فَقَالَ: نَفْدِيْكَ بِآبَائِنَا وَأُمَّهَاتِنَا وَأَبْنَائِنَا! فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: عَلٰى رِسْلِكَ۔ أَفْضَلُ النَّاسِ عِنْدِيْ فِي الصُّحْبَةِ وَذَاتِ الْيَدِ ابْنُ أَبِيْ قُحَافَةَ، أُنْظُرُوْا هٰذِهِ الْأَبْوَابَ الشَّوَارِعَ فِي الْمَسْجِدِ فَسُدُّوْهَا، إِلَّا مَا كَانَ مِنْ بَابِ أَبِيْ بَكْرٍ، فَإِنِّيْ رَأَيْتُ عَلَيْهِ نُوْرًا۔“

(حياة الصحابة ج:۳ ص:۴۲۸)

[حدیث:۱۳۱۰] ”وَأَخْرَجَ الْبَيْهَقِيُّ عَنْ أَيُّوْبَ بْنِ بَشِيْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ

رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِيْ مَرَضِهِ: اَفِيْضُوْا عَلَيَّ۔ فَذَكَرَهُ بِنَحْوِهِ وَزَادَ، فَكَانَ اَوَّلُ مَا ذَكَرَ بَعْدَ حَمْدِ اللهِ وَالثَّنَاءَ عَلَيْهِ، ذِكْرُ اَصْحَابِ اُحُدٍ فَاسْتَغْفَرَ لَهُمْ وَدَعَا لَهُمْ، ثُمَّ قَالَ: يَا مَعْشَرَ الْمُهَاجِرِيْنَ! اِنَّكُمْ اَصْبَحْتُمْ تَزِيْدُوْنَ وَالْاَنْصَارُ عَلٰى هَيْئَتِهَا لَا تَزِيْدُ، وَاِنَّهُمْ عَيْبَتِي الَّتِيْ اَوَيْتُ اِلَيْهَا، فَاَكْرِمُوْا كَرِيْمَهُمْ، وَتَجَاوَزُوْا عَنْ مُسِيْئِهِمْ۔ ثُمَّ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اَيُّهَا النَّاسُ! اِنَّ عَبْدًا مِنْ عِبَادِ اللهِ...... فَفَهِمَهَا اَبُوْ بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ مِنْ بَيْنِ النَّاسِ فَبَكٰى۔"

(حیاۃ الصحابۃ ج:۳ ص: ۴۲۹)

[حدیث: ۱۳۱۱] "وَعِنْدَ اَحْمَدَ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: خَطَبَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّاسَ فَقَالَ: اِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ خَيَّرَ عَبْدًا بَيْنَ الدُّنْيَا وَبَيْنَ مَا عِنْدَهُ، قَالَ فَاخْتَارَ ذَالِكَ الْعَبْدُ مَا عِنْدَ اللهِ۔ قَالَ: فَبَكٰى اَبُوْ بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، فَعَجِبْنَا لِبُكَائِهِ اِنْ خَبَّرَ رَسُوْلُ اللهِ عَنْ عَبْدٍ خُيِّرَ، وَكَانَ رَسُوْلُ اللهِ هُوَ الْمُخَيَّرُ، وَكَانَ اَبُوْ بَكْرٍ اَعْلَمَنَا بِهِ۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اَمَنَّ النَّاسِ عَلَيَّ فِيْ صُحْبَتِهِ وَمَالِهِ اَبُوْ بَكْرٍ، وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا مِنَ النَّاسِ خَلِيْلًا غَيْرَ رَبِّيْ لَاتَّخَذْتُ اَبَا بَكْرٍ، وَلٰكِنْ خُلَّةُ الْاِسْلَامِ اَوْ مَوَدَّتُهُ، لَا يُبْقٰى بَابٌ فِي الْمَسْجِدِ اِلَّا سُدَّ، اِلَّا بَابَ اَبِيْ بَكْرٍ۔" (مسند احمد ج:۳ ص:۱۸)

ترجمہ: "حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ پر مختلف کنوؤں کے پانی کے سات مشکیزے ڈالو، تاکہ میں لوگوں کی طرف نکلوں اور ان کو کچھ وصیتیں کروں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، سر مبارک پر پٹی بندھی ہوئی تھی، منبر پر تشریف لے گئے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، اس کے بعد فرمایا: ایک بندے کو اللہ کے بندوں میں سے دنیا کے درمیان اور جو چیز کہ اللہ کے پاس ہے اختیار دیا گیا ہے، پس اس نے اللہ کے پاس کی چیز کو اختیار کرلیا۔ اس بات کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سوا کسی نے نہیں سمجھا، وہ رو پڑے اور کہا کہ ہم آپ پر قربان کرتے ہیں اپنے باپوں کو، اپنی ماؤں کو اور اپنے بیٹوں کو یا رسول اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ٹھہرو! تمام لوگوں سے افضل میرے نزدیک رفاقت میں اور احسان میں ابوبکر بن ابی قحافہ ہیں، دیکھو یہ دروازے جو کھل رہے ہیں مسجد کی طرف ان سب کو بند کردو، صرف ایک ابوبکر کا دروازہ باقی رہے، کیونکہ میں اس پر نور دیکھتا ہوں۔"

ترجمہ: ''بیہقی کی روایت حضرت ایوب بن بشیر رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الوفات میں فرمایا کہ مجھ پر سات مشکیزے مختلف کنوؤں کے ڈالو، باہر تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد اصحاب احد کا، شہدائے احد کا تذکرہ کیا، ان کے لئے استغفار فرمایا، ان کے لئے دعائیں فرمائیں، پھر فرمایا کہ: اے مہاجرین کی جماعت! تم زیادہ ہوتے رہو گے اور انصار اپنی حالت پر رہیں گے، یہ زیادہ نہیں ہوں گے، یہ میرے مخصوص لوگ ہیں اور میری پناہ گاہ ہے، جن کی طرف میں نے پناہ لی تھی، اس لئے ان کے شرفا کی عزت کرو اور ان میں سے کسی سے غلطی ہو جائے تو اس سے تجاوز کرو۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگو! ایک بندے کو اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا۔ آگے وہی بات فرمائی، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس بات کو سمجھے اور رو پڑے۔''

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث مسند احمد میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بندے کو اختیار دیا ہے دنیا کے درمیان اور اس چیز کے درمیان جو اس کے پاس ہے، اس بندے نے اللہ کے پاس کی چیز کو اختیار کر لیا۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رو پڑے، ہمیں ان کے رونے پر تعجب ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک بندے کے بارے میں خبر دے رہے ہیں، اور یہ رو رہا ہے، لیکن ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی اختیار دیا گیا تھا، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہم میں سب سے بڑے عالم تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھ پر سب سے بڑھ کر احسان رفاقت میں اور مال میں ابوبکر کا ہے، اگر میں اپنے رب کے سوا کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا، لیکن اسلام کی دوستی اور اسلام کی محبت باقی ہے، مسجد میں کوئی دروازہ باقی نہ رکھا جائے سوائے ابوبکر کے دروازے کے۔''

تشریح: یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ شریفہ ہے، اس کے بعد کبھی منبر پر رونق افروز نہیں ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات مختلف کنوؤں کا پانی لاؤ اور وہ مجھ پر ڈالو، مجھے نہلاؤ، چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غسل فرما کر دو آدمیوں کے سہارے باہر تشریف لائے، سر مبارک پر پٹی بندھی ہوئی تھی، اور صحیح بخاری کی روایت میں ہے:

''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ يَقُوْلُ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَيْهِ مِلْحَفَةٌ مُتَعَطِّفًا عَلٰى مَنْكِبَيْهِ وَعَلَيْهِ عِصَابَةٌ دَسْمَاءُ حَتّٰى جَلَسَ عَلَى الْمِنْبَرِ

.....الخ۔" (بخاری ج:۱ص:۵۳۶)

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے آپ پر ایک چادر تھی جو آپ نے دونوں کندھوں پر ڈالی ہوئی تھی اور آپ کے سر پر ایک پٹی تھی جو میلی ہو رہی تھی آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے....."

اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد ارشاد فرمایا: اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو دنیا میں رہنے کا اور اللہ تعالیٰ کے پاس جانے کا اختیار دیا گیا، اس نے اللہ تعالیٰ کے پاس جو نعمتیں ہیں ان کو اختیار کرلیا، دنیا میں رہنا پسند نہیں کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم بات کو نہیں سمجھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ سن کر رونے لگے، اور کہنے لگے: "بِاٰبَائِنَا وَ اُمَّهَاتِنَا وَ اَبْنَائِنَا!" یا رسول اللہ! ہمارے باپ، ہماری مائیں اور ہمارے بیٹے آپ پر قربان ہوں! صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک آدمی کے بارے میں بتا رہے ہیں، اللہ کے ایک بندے کو دنیا میں رہنے کا یا یہاں سے رخصت ہونے کا اختیار دیا گیا اور یہ کیوں رو رہا ہے؟ لیکن اصل بات یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے بارے میں ارشاد فرما رہے تھے، تب ہمیں معلوم چلا کہ ابوبکر ہم سے بڑے عالم تھے۔

وفات سے پہلے انبیاء سے استفسار:

یہاں یہ بات یاد رکھو کہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ کی مستقل سنّت چلی آتی ہے کہ ان کو وقت سے پہلے آگاہ کر دیا جاتا ہے اور پھر پوچھا جاتا ہے کہ: یہاں رہنا چاہتے ہو تو مزید تاخیر کر دی جائے، یا چلنا چاہتے ہو تو وقت مقررہ آچکا ہے، حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام جن کی نظر دنیا تک محدود نہیں ہے، بلکہ ان کو اس آڑ اور پردہ کے پار کی چیزیں بھی ویسی ہی نظر آرہی ہوتی ہیں جیسے یہاں کی چیزیں نظر آتی ہیں، وہ اس اختیار ملنے پر دنیا میں رہنا کب پسند کریں گے؟ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا جواب ایک ہی رہا کہ چلنا ہے، یعنی یہاں نہیں رہنا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عزرائیل علیہ السلام کو مارنا:

صحیح بخاری شریف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ آتا ہے:

"عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: اُرْسِلَ مَلَکُ الْمَوْتِ اِلٰی مُوْسٰی فَلَمَّا جَاءَهٗ صَکَّهٗ فَرَجَعَ اِلٰی رَبِّهٖ فَقَالَ: اَرْسَلْتَنِیْ اِلٰی عَبْدٍ لَا یُرِیْدُ الْمَوْتَ! قَالَ: اِرْجِعْ اِلَیْهِ فَقُلْ لَهٗ یَضَعُ یَدَهٗ عَلٰی مَتْنِ ثَوْرٍ فَلَهٗ بِمَا غَطَّتْ یَدُهٗ بِکُلِّ شَعْرَةٍ سَنَةٌ۔ قَالَ: اَیْ رَبِّ ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: ثُمَّ الْمَوْتُ! قَالَ: فَالْاٰنَ! قَالَ: فَسَأَلِ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ اَنْ یُّدْنِیَهٗ مِنَ

الْاَرْضِ الْمُقَدَّسَةِ رِمْيَةً بِحَجَرٍ...... الخ۔" (صحیح بخاری ج:۱ص:۴۸۴)

ترجمہ: "حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجے گئے، جب ملک الموت ان کے پاس آئے تو انہوں نے حضرت عزرائیل علیہ السلام کو تھپڑ رسید کر دیا، جس سے ان کی آنکھ نکل گئی، انہوں نے جا کر شکایت کی کہ یا اللہ! آپ نے ایک ایسے بندے کے پاس بھیجا ہے جو دنیا میں رہنا چاہتا ہے، فرمایا: (تم نے پہلے اجازت نہیں لی، آنکھ تو تمہاری بنا دیتے ہیں) دوبارہ جاؤ جا کر ان سے پہلے پوچھو اور ان سے کہو اگر دنیا میں رہنا چاہتے ہیں تو ایک بیل کی پشت پر ہاتھ رکھ دیں، جتنے بال ہاتھ کے نیچے آئیں گے، اتنے سال ان کی عمر مزید بڑھا دیں گے۔ اب حضرت عزرائیل علیہ السلام دوبارہ تشریف لائے، سلام عرض کیا اور حق تعالیٰ شانہ کا پیغام دیا کہ وقت تو آپ کا آچکا ہے، لیکن اگر آپ یہاں رہنا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک بیل کی پشت پر ہاتھ رکھیں، اس کے نیچے جتنے بال آئیں گے اتنے سال آپ کی عمر بڑھا دی جائے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیغام ملا تو ارشاد فرمانے لگے کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ کہنے لگے: پھر چلیں گے! فرمایا: پھر ابھی کیوں نہ چلیں! چنانچہ فرمانے لگے: مجھے ذرا وہاں تک پہنچا دو، (رمیۃ بحجر) بیت المقدس کے قریب وہاں پہنچے تو جان قبض ہوگئی۔"

تو حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا اکرام کیا جاتا ہے کہ بغیر اجازت کے فرشتہ ان کے پاس نہیں آتا۔

رفیق اعلیٰ کی طرف:

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری وقت میں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے تھے اور فرما رہے تھے: "اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى۔" یا اللہ! اُوپر والے رفیق کو پسند کرتا ہوں... فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن رکھا تھا کہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اختیار دیا جاتا ہے، تو جب آپ کی یہ بات میں نے سنی: "اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى" میں نے کہا: "اذًا لَا يَخْتَارُنَا!" (مشکوٰۃ ص:۵۴۸) اب یہ ہمارے پاس نہیں رہیں گے، اب ہمارے پاس رہنا یہ پسند نہیں کریں گے۔

سات کنوؤں کے پانی ڈالنے کی حکمت:

دوسری بات یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سات کنوؤں کے مشکیزے لاؤ، اور وہ مجھ پر ڈالو۔

یہ چیز صحت کے لئے مفید ہے، لیکن بھائی! علاج کسی طبیب کے مشورے کے بغیر نہیں ہوتا، قاعدہ نہیں ہے، بسا اوقات آنحضرت ﷺ اس تدبیر سے علاج فرماتے تھے، کوئی بیمار ہوتا تو فرماتے کہ سات کنوں کا پانی لاؤ اور مریض کو غسل کرواتے، تو اس موقع پر آنحضرت ﷺ کو ضعف بہت تھا اور آپ کی خواہش تھی کہ باہر تشریف لا کر ایک دفعہ سب کو زیارت بھی کروادیں اور کچھ نصائح بھی فرمادیں۔ اس لئے فرمایا کہ مجھے سات کنوں کے پانی کے ساتھ غسل دو تا کہ ذرا تھوڑی قوت آجائے تو میں لوگوں کی طرف نکلوں اور ان کو کچھ وصیتیں کروں، کچھ نصیحتیں کروں، چنانچہ غسل فرمانے کے بعد تشریف لائے، سر درد کی وجہ سے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

آخری بدھ کو مٹھائی بانٹنا، منافقوں کی چال:

سر درد سے آنحضرت ﷺ کا آخری مرض شروع ہوا، مرض الوفات، اور ہمارے ہاں جاہلوں نے صفر کا آخری بدھ اس کو بہت بابرکت بنادیا، آخری بدھ کو بیماری شروع ہوئی تھی اور یہ ہمارے دوست اس دن مٹھائیاں تقسیم کرتے ہیں، کارخانوں میں، فیکٹریوں میں اور اداروں میں باقاعدہ مٹھائیاں تقسیم کی جاتی ہیں۔

معلوم نہیں کس شیطان نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی ہے کہ اس دن آنحضرت ﷺ نے غسل صحت فرمایا تھا، مطلب یہ ہے کہ جس دن آنحضرت ﷺ کی بیماری شروع ہوئی، منافقوں نے، زندیقوں نے تم سے جھوٹ بول کر اس دن مٹھائیاں تقسیم کروائیں، اور یہ تحقیق کرنے کی تم نے بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ جا کر کسی عالم سے پوچھ لیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ خالص جھوٹ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی آخری بدھ کو غسل صحت فرمایا ہو، خالص جھوٹ اور اس کی بنیاد پر مٹھائیاں تقسیم کرنا خالص جہالت۔

صفر کے آخری بدھ کو مرض الوفاۃ کی ابتداء

صفر کا آخری بدھ تھا جس دن آنحضرت ﷺ کی بیماری شروع ہوئی اور بیماری شروع ہوئی تھی سر درد سے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

”عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: رَجَعَ إِلَيَّ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ مِنْ جَنَازَةٍ مِنَ الْبَقِيْعِ فَوَجَدَنِي وَأَنَا أَجِدُ صُدَاعًا وَأَنَا أَقُوْلُ وَا رَأْسَاهُ قَالَ بَلْ أَنَا يَا عَائِشَةُ وَا رَأْسَاهُ قَالَ وَمَا ضَرَّكِ لَوْ مُتِّ قَبْلِي فَغَسَّلْتُكِ وَكَفَّنْتُكِ وَصَلَّيْتُ عَلَيْكِ وَدَفَنْتُكِ۔ قُلْتُ: لَكَأَنِّي بِكَ وَاللهِ لَوْ فَعَلْتَ ذَالِكَ لَرَجَعْتَ إِلَى بَيْتِي فَعَرَّسْتَ فِيْهِ بِبَعْضِ نِسَائِكَ، فَتَبَسَّمَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ بُدِئَ فِي وَجَعِهِ الَّذِي مَاتَ فِيْهِ۔“ (مشکوٰۃ ص:۵۴۹)

ترجمہ: ”اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ ایک جنازہ

سے فارغ ہوکر گھر تشریف لائے، ادھر اتفاق کی بات کہ میرے سر میں درد تھا، میں لیٹی ہوئی تھی، میں نے کہا: "وا رأساہ!" کہ سر میں درد ہو رہا ہے۔ آپ ﷺ ارشاد فرمانے لگے: اے عائشہ! سر میں درد تو میرے ہو رہا ہے، پھر ارشاد فرمایا کہ: (اے عائشہ!) تجھے کیا نقصان ہے، اگر تو میرے سامنے مرجائے تو میں تجھے اپنے ہاتھ سے غسل دوں اور کفن پہناؤں، تیری نماز جنازہ پڑھوں اور اپنے ہاتھ سے دفن کروں۔ میں نے کہا کہ: جی ہاں! آپ تو یہی چاہیں گے کہ یہ مرجائے تاکہ میرے بعد اور کسی اچھی بیوی کو لائیں، آپ ﷺ مسکرائے۔ تو اس دن آنحضرت ﷺ کی بیماری سر درد سے شروع ہوئی (اور یہ حقیقت میں زہر کا اثر تھا، جو آپ کو خیبر میں دیا گیا تھا)۔"

ابوبکر رضی اللہ عنہ سب سے بڑے عالم تھے:

بہرکیف! باہر تشریف لائے، منبر پر تشریف لے گئے تو یہ بات ارشاد فرمائی کہ اللہ کے ایک بندے کو اختیار دیا گیا ہے، یہ بات سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سمجھ گئے اور رونے لگے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابوبکر صدیق ہم میں سب سے بڑے عالم تھے۔

علم کثرتِ معلومات کا نام نہیں:

علم معلومات کا نام نہیں ہے کہ کسی کو معلومات زیادہ ہوں، کسی چیز کی صحیح حقیقت تک پہنچ جانا اس کا نام علم ہے۔

میں نے ایک موقع پر مدرسہ میں اپنے عزیز طالب علموں سے سبق پڑھاتے ہوئے عرض کیا تھا کہ مجھے اپنے اکابر سے کچھ زیادہ خوش اعتقادی ہے، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دنیا سے تشریف لے گئے، تو مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک صحیح بخاری شریف کا نسخہ اور ایک قرآن کریم ان کے گھر سے برآمد ہوا۔

قلّتِ اسباب و وسائل کا تو یہ حال ہے لیکن حجۃ الاسلام کہلاتے تھے، یعنی ان کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے۔ میں نے کہا: تم لوگ سالہا سال کے بعد غور و فکر کر کے قرآن و حدیث کے دلائل کو دیکھ کر جس نتیجہ پر پہنچو گے، میرا عقیدہ یہ ہے کہ میرے اکابر آنکھ کھولتے ہی وہاں پہنچ جاتے تھے۔

حضراتِ انبیاء اور ہمارے اکابر کی قوتِ قدسیہ:

اللہ تعالیٰ نے ان کو قوتِ قدسیہ عطا فرمائی تھی۔ فلاسفہ نے عقل انسانی کے درجات قائم کیے ہیں، ان

میں ایک درجہ قوتِ قدسیہ کا ہے، انبیاء اور اولیاء کو اعلیٰ درجہ کی قوتِ قدسیہ عطا ہوتی ہے، ان کو مقدمات کی ترتیب دینے کی ضرورت نہیں ہوتی، کسی بات پر غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ جب بھی وہ کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں علم لَدُنِی کے طور پر فوراً اس کی حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں، اس کا نام علم ہے۔

مستشرقین کا علم حرف شناسی ہے:

حرف شناسی کا نام علم نہیں ہے، اگر اس کا نام علم ہوتا تو مستشرقین سب سے بڑے عالم ہوتے۔ "مفتاح کنوز السنة" ایک کتاب ہے جو ایک عیسائی مستشرق کی لکھی ہوئی ہے، حدیث کی کتابوں میں جہاں جہاں کوئی احادیث آئی ہیں، اس نے ان کو عنوانات پر تقسیم کر دیا، مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کیا کیا احادیث ہیں۔ اور مستشرقین کی ایک جماعت نے ایک کتاب بڑی بڑی، موٹی موٹی آٹھ جلدوں میں جو اب سولہ جلدوں میں چھپی ہے، لکھی ہے، اس میں یہ بتایا ہے کہ حدیث کا فلاں لفظ، حدیث کی فلاں کتاب اور فلاں باب میں آیا ہے، اس کتاب کا نام ہے: "المعجم المفهرس لالفاظ الحديث"، لیکن اس کے باوجود وہ ایمان سے محروم ہیں، اس علم کو کوئی کیا کرے گا؟ وہ کیا علم ہے جو آدمی کو اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچاتا، یعنی اللہ تعالیٰ کے دروازے تک نہیں لے جاتا، وہ کیسا علم ہے؟ کسی چیز کی حقیقت تک پہنچ جانا علم کہلاتا ہے۔

تحصیلِ علم کے ذرائع:

پھر یہ علم کئی طریقے سے حاصل ہوتا ہے، کچھ تو یہ پڑھنے پڑھانے سے حاصل ہوتا ہے، بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ ہو۔

کبھی اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی صحبت میں رہنے سے علم ملتا ہے اور دل میں ایک بصیرت پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ حقائق کو پہچانتی ہے، اور کبھی علم لدنی ہوتا ہے، یعنی حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے القا کیا جاتا ہے، جیسے قرآن کریم میں ہے: "وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝" (الکہف) (اور ہم نے اس کو اپنی جانب سے علم سکھلایا)۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا علم:

سیّدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت بابرکت کا اثر تھا کہ ان کے قلب میں وہی چیز آتی تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں آتی تھی، دوسری بات آتی ہی نہیں تھی، اس لئے لقب صدیق ہوا۔

’’صدیق‘‘ کا معنی:

صدیق اس کو کہتے ہیں کہ سر کے بالوں سے لے کر، سر کی چوٹی سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک صدق ہی صدق ہو، اور کذب کا نام ونشان نہ ہو، وہ صدیق کہلاتا ہے، قرآن کریم نے بطور خاص حضرت یوسف علیہ السلام کو ﴿یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ﴾ (یوسف:۴۵) کہا ہے، صدیقین کا لفظ عام بولا ہے، دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوْسٰى اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ (مریم:۵۱)

ترجمہ: ’’ذکر کیجئے کتاب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کہ وہ صدیق تھے۔‘‘

مقام صدیقی، مقامِ نبوت کا عکس:

یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صدیق کہا، حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نبوت ملنے سے پہلے صدیق ہوتے ہیں، بعد میں جب ان کو نبوت عطا کی جاتی ہے، تو ان کے فیض صحبت سے صدیق بنتے ہیں، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ انبیاء کے بعد افضل الصدیقین ہیں، اس لئے کہ وہ افضل النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے برگزیدہ صحابی ہیں، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے خاص ان کے بارہ میں فرمایا ہے: ’’اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا‘‘ چنانچہ اس آیت میں: ’’صَاحِبِهٖ‘‘ سے مراد صاحب النبی ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جانشین رسول تھے:

اس لئے میں نے کہا ہے کہ امیر المؤمنین کا لفظ جو ہے ناں! یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایجاد ہوا، امیر المؤمنین کی اصطلاح خلیفۃ المسلمین کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایجاد ہوئی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین کہنا شروع کیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین نہیں کہتے تھے، ان کو امیر المؤمنین نہیں کہا جاتا تھا، ان کو جب بھی بلاتے یا خلیفۃ رسول اللہ! کہہ کر بلاتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند کی جانشینی انہی کو زیبا تھی۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام:

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ عرض کیا کہ: ’’بِآبَائِنَا وَاُمَّهَاتِنَا وَاَبْنَائِنَا! يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!‘‘ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’عَلٰى رِسْلِكَ‘‘ ٹھہرو ابوبکر ٹھہرو! یہ کیوں فرمادیا؟ اس میں بھی رمز تھا، ٹھہر جاؤ! بند لگالیا، کہیں غم واندوہ کی وجہ سے سیلاب امڈ آئے اور حاضرین کے لئے اس کا برداشت کرنا مشکل ہو جائے، فرمادیا: ’’علیٰ رسلک‘‘ ٹھہر جاؤ، بند لگادیا۔ وہ خاموش ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو باتیں ارشاد فرمائیں۔

ایک بات تو یہ ارشاد فرمائی کہ اس بھری دنیا میں کسی صاحب نے ہم پر کوئی احسان کیا ہے، ہم اس کا بدلہ چکا چکے ہیں، سوائے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کہ ان کے احسان کا بدلہ ہم سے نہیں چکایا گیا، اللہ تعالیٰ ہی ان کا بدلہ عطا فرمائیں گے۔

اور دوسری یہ بات ارشاد فرمائی کہ اپنی رفاقت اور اپنے مال کے ذریعہ سے جس قدر احسانات ہم پر ابوبکر کے ہیں، اتنے کسی کے نہیں، "اِنَّ اَمَنَّ النَّاسِ عَلَيَّ فِي صُحْبَتِهٖ وَ مَالِهٖ اَبُوْ بَكْرٍ" اور ان کے استخلاف کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: مسجد کی طرف دروازے کھلتے تھے، مسجد شریف کے اردگرد صحابہ رضی اللہ عنہم کی آبادی تھی، اور جلدی سے نماز کے آنے کے لئے مسجد میں دروازے کھول رکھے تھے، فرمایا: سارے دروازے بند کر دیئے جائیں سوائے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دروازے کے کہ ان کو تو ہمہ وقت آنے کی ضرورت ہوگی، باقی دروازے بند کر دو، تاکہ خلیفہ کا دوسرے لوگوں سے امتیاز ہو جائے۔

آٹھ سال بعد شہداء احد پر نماز جنازہ:

اسی خطبہ میں دو باتیں مزید ارشاد فرمائیں، ایک تو شہدائے احد کو یاد فرمایا، یہ اسلام کے لئے سب سے پہلے قربانی دینے والے حضرات تھے، ان کے لئے دعائے رحمت فرمائی اور استغفار فرمایا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

"وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: صَلّٰى رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى قَتْلٰى أُحُدٍ بَعْدَ ثَمَانِ سِنِيْنَ كَالْمُوَدِّعِ لِلْاَحْيَاءِ وَالْاَمْوَاتِ الخ۔"

(مشکوۃ ص:۵۴۷)

ترجمہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے وصال سے چند دن پہلے احد گئے، شہدائے احد کی قبروں پر گئے اور یہ عجائبات میں سے ہے کہ) آٹھ سال کے بعد ان حضرات پر نمازِ جنازہ پڑھی، گویا کہ آپ زندوں اور مردوں کو رخصت فرما رہے تھے، (زندوں کو تو رخصت کر ہی رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ مردوں سے بھی رخصت ہوئے)۔"

مہاجرین وانصار کا مقام:

اور دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ مہاجرین بڑھتے جائیں گے اور انصار کم ہوتے جائیں گے۔ یہ دو طبقے تھے، ایک مہاجرین کا جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ہجرت کی، مکہ مکرمہ چھوڑ کر یہاں آگئے، جو اس وقت ان کے لئے پردیس تھا، اپنا وطن چھوڑا، گھر بار چھوڑا، اپنے کاروبار چھوڑے اور بعض نے اپنے اہل وعیال چھوڑے، ایسے حضرات بھی تھے جو ہجرت کر کے تشریف لے آئے لیکن بال بچے وہاں رہے، ان

کے منگوانے کا کوئی انتظام نہیں ہوسکا تھا، یہ مہاجرین تھے اور مدینے کے حضرات جو پہلے سے ہی یہاں رہ رہے تھے اور جنہوں نے اسلام کے لئے اپنی آغوش کھول دی تھی، خود اسلام کی آغوش میں چلے گئے تھے، یہ انصار کہلاتے تھے، قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی تذکرہ آیا، ان دونوں فریقوں کا المہاجرین والانصار کے ساتھ آیا ہے، پہلے نمبر پر مہاجرین اور دوسرے نمبر پر انصار، گویا مہاجرین کو متبوع اور انصار کو تابع بنایا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ یہ انصار **"قرشی وعیبتی"** "میرے اعضائے باطنی ہیں اور عیبا کہتے ہیں اپنا خاص بکس جس میں آدمی نے اپنا سامان اور خزانہ رکھا ہوا ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ انہوں نے مجھے پناہ دی تھی، اس لئے ان میں سے جو کریم اور بڑے لوگ ہیں ان کا اکرام کرو، اور اگر ان میں سے کسی سے غلطی ہوجائے تو اس سے درگزر کرو، یہ کن کو کہہ رہے ہیں؟ مہاجرین کو! اس میں بھی اشارہ فرمادیا کہ خلافت مہاجرین میں ہوگی، انصار میں نہیں ہوگی اور یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اسی خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا:

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْاَنْصَارِ وَلِاَبْنَاءِ الْاَنْصَارِ وَاَبْنَاءِ اَبْنَاءِ الْاَنْصَارِ۔"

(مشکوٰۃ ص:۵۷۷)

ترجمہ: "یا اللہ! انصار کی بخشش فرما، انصار کی اولاد کی بخشش فرما، اور ان کی اولاد کی اولاد کی بخشش فرما۔"

انصار کے احسانات:

ان حضرات انصار کے عام مسلمانوں پر بڑے احسانات ہیں، اسلام پر احسان کہنا تو غلط ہوگا، بلکہ اسلام کا ان پر احسان تھا، ظاہریں رسول اللہ ﷺ پر ان کے احسانات تھے، لیکن حقیقت میں آنحضرت ﷺ کے ان پر احسانات تھے، یہ آنحضرت ﷺ کے عشاق تھے، بالکل وہی نقشہ نظر آتا تھا جو شمع اور پروانوں کا نظر آیا کرتا ہے، جس طرف آنحضرت ﷺ نکلتے تھے حضرات انصار آنحضرت ﷺ کے جلوے میں ہوتے تھے، اور ہر قربانی آنحضرت ﷺ کی ذاتِ اقدس کے لئے دینے کو تیار رہتے تھے، وہ جو جنگ ہوازن کے موقع پر قصہ پیش آیا تھا، وہ میں ذکر کرچکا ہوں، صحیح بخاری شریف میں ہے کہ کسی نوجوان انصاری کے منہ سے نکل گیا تھا:

"...... فَقَالُوْا يَغْفِرُ اللّٰهُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِيْ قُرَيْشًا وَيَدَعُنَا وَسُيُوْفُنَا تَقْطُرُ مِنْ دِمَاءِهِمْ فَحُدِّثَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَقَالَتِهِمْ فَاَرْسَلَ اِلَى الْاَنْصَارِ فَجَمَعَهُمْ فِيْ قُبَّةٍ مِنْ اَدَمٍ وَلَمْ يَدْعُ مَعَهُمْ اَحَدًا غَيْرَهُمْ فَلَمَّا اجْتَمَعُوْا جَاءَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا حَدِيْثٌ

بَلَغَنِیْ عَنْکُمْ فَقَالَ فُقَهَاءُهُمْ اَمَا ذَوُوْا رَاْیِنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَلَمْ یَقُوْلُوْا شَیْئًا وَاَمَّا اُنَاسًا مِنَّا حَدِیْثَةً اَسْنَانِهِمْ قَالُوْا یَغْفِرُ اللّٰهُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُعْطِیْ قُرَیْشًا وَیَدَعُ الْاَنْصَارَ وَسُیُوْفُنَا تَقْطُرُ مِنْ دِمَاءِهِمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَمَا تَرْضَوْنَ اَنْ یَذْهَبَ النَّاسُ بِالْاَمْوَالِ وَتَرْجِعُوْنَ اِلٰی رِحَالِکُمْ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَدْ رَضِیْنَا۔" (مشکوٰۃ ص:۵۷۶)

یعنی آنحضرت ﷺ اپنوں کو دیتے ہیں، ان کو مکہ یاد آ گیا ہے اور ہماری تلواروں سے ابھی تک خون ٹپک رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو بالکل الگ ایک خیمہ میں جمع ہونے کا حکم دیا، وہ حضرات جمع ہو گئے، آنحضرت ﷺ تشریف لائے، فرمایا: یہاں انصار کے علاوہ کوئی اور آدمی تو نہیں ہے؟ عرض کیا گیا کہ: حضور! اور تو کوئی نہیں ہے، ہمارا بھانجا ہے، یہ تو دوسرے قبیلے کا، انصار کا نہیں ہے، لیکن ہمارا بھانجا ہے، فرمایا اس کو رہنے دو، "فَاِنَّ ابْنَ اُخْتِ الْقَوْمِ مِنْهُمْ" کیونکہ کسی قوم کا بھانجا انہیں میں سے شمار ہوگا، یہ خاص بات تھی جو آنحضرت ﷺ نے اسی موقع پر ارشاد فرمائی، اور پھر پوچھا کہ وہ کیا بات ہے جو مجھے تمہاری طرف سے پہنچی ہے، حضرات انصار رونے لگے اور کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! ہم میں سے جو بڑے اور سمجھ دار لوگ ہیں انہوں نے تو کچھ نہیں کہا، یہ جو بچے، لونڈے ہیں، ان کے منہ سے یہ بات نکلی ہے۔ وہاں عجیب وغریب مکالمہ ہوا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: انصار! تم بھول گئے ہو، تم گمراہ تھے، اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے تمہیں ہدایت دی، تم بھوکے تھے، اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے تمہیں کھانا عطا فرمایا، تم ننگے تھے، فقیر تھے، قلاش تھے، میری وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں غنی کر دیا، اب وہ رو رہے ہیں، گرج کر فرمایا: مجھے جواب کیوں نہیں دیتے؟ وہ صرف اتنا کہہ پائے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔ فرمایا: جواب دو! تم جواب دینا چاہو تو جواب دے سکتے ہو کہ تجھے تیری قوم نے رہنے نہیں دیا تھا، نکال دیا تھا، ہم نے تجھے پناہ دی تھی، لوگ تجھ کو گالیاں دیتے تھے، ہم نے تیرے لئے یہ کیا تھا، وہ یہ کرتے تھے ہم نے یہ کیا۔ اور بہت ساری ایسی باتیں حضور ﷺ نے گنوا دیں، لیکن انہوں نے صرف اتنا ہی کہا کہ: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔ فرمایا کہ: اے انصار! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ لوگ شام کو اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو لے کر جاؤ، اور دوسری روایت میں ہے:

"وَلَوْ لَا الْهِجْرَةُ لَکُنْتُ امْرَأً مِنَ الْاَنْصَارِ، وَلَوْ سَلَکَ النَّاسُ وَادِیًا وَسَلَکَتِ الْاَنْصَارُ وَادِیًا اَوْ شِعْبًا لَسَلَکْتُ وَادِیَ الْاَنْصَارِ وَشِعْبَهِمْ۔" (مشکوٰۃ ص:۵۷۶)

اب میں کیا کروں میں مہاجر ہوں، ہجرت کر کے گیا ہوں، اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی اپنے آپ کو انصار ہی کہلاتا، میں بھی انصار ہی میں سے شمار ہوتا، ایک وادی میں چلے انصار، دوسری وادی میں چلے

لوگ، تو میں انصار کی وادی اور گھاٹی پر چلوں گا۔ آنحضرت ﷺ کو بھی ان کے ساتھ بہت ہی تعلق خاطر تھا، بے حد محبت، اس لئے اس آخری وقت میں آنحضرت ﷺ نے ان کے حق میں وصیت فرمائی اور ان کو بہت ہی زیادہ دعائیں دیں۔

حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا علمی مقام

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے:

[حدیث:۱۳۱۲] "وَأَخْرَجَ ابْنُ سَعْدٍ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا أَنَّهَا نَظَرَتْ إِلَى ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ مَعَهُ الْحِلَقُ يُعَلِّمُ الْحَجَّ وَهُوَ يُسْأَلُ عَنْ عِلْمِ الْمَنَاسِكِ فَقَالَتْ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ بَقِيَ بِالْمَنَاسِكِ۔" (ابن سعد ج:۴ ص:۱۸۴)

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے موسم حج میں دیکھا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اردگرد بہت سے لوگوں کے حلقے جمع ہیں اور وہ ان سے حج کے مسائل پوچھ رہے ہیں، تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کہ جو لوگ زندہ باقی ہیں ان میں یہ سب سے زیادہ مناسک کو جاننے والے ہیں، یعنی حج کے مسائل کو جاننے والے ہیں، (جو لوگ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اردگرد حج کے مسائل پوچھنے کے لئے جمع تھے، یہ صحابہ اور تابعین تھے)۔"

مسائلِ حج کی اہمیت:

اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوگئی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ علیہم کو بھی حج کے مسائل معلوم کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی اور وہ علماء سے پوچھتے تھے، جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں کہ حج اسلام کے ارکان میں سب سے آخری رکن ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے عمر میں ایک ہی مرتبہ فرض کیا ہے، ظاہر بات ہے کہ ایسا عمل جو عمر میں ایک مرتبہ کیا جاتا ہے، اس کے مسائل بہت زیادہ ہوں گے اور ان مسائل کو سیکھنے کی بھی ضرورت ہوگی۔

ہمارے لوگ حج کے لئے تشریف لے جاتے ہیں، اب اللہ تعالیٰ نے پیسے بھی لوگوں کو بہت دے دیئے ہیں، الٹا سیدھا جیسے بھی بن پڑتا ہے، لوگوں کی دیکھا دیکھی حج کرنا شروع کر دیتے ہیں اور حاجی بن کر گھر آجاتے ہیں، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ علیہم مسائل معلوم کرتے تھے ہر موقع پر، کہ یہ عمل کس طرح کیا جاتا ہے؟ اس کی تحقیق کرتے تھے، تفتیش کرتے تھے، خود کو اگر معلوم نہیں ہوتا تھا تو دوسرے علماء سے پوچھ لیتے تھے آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ اِلَّا الْجَنَّةَ۔" (مشکوۃ ص:۲۲۱)

ترجمہ: "جس شخص نے حج مبرور کیا ہو اس کا بدلہ جنّت کے سوا کچھ نہیں۔"

اور ساتھ ہی یہ فرما دیا کہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ حج مبرور کس کا ہوتا ہے؟ اب لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنی بیوی کو ساتھ لایا تھا تو وہ بیچاری ذرا معذور ہے، اس لئے میں نے اس کی کنکریاں خود ہی مار دیں اور کنکریاں بھی کیسے ماریں؟ جمرہ اتنی دور ہے اور اس نے سات کنکریاں لے لیں اور زور سے مار دیں، چلو حج ہو گیا اللہ اللہ خیر سلا۔

حج کی جان نکل گئی:

میں دیکھتا ہوں کہ حج کی تو جان نکل گئی ہے، کوئی اللہ کا بندہ ہوتا ہوگا جس کا حج مقبول ہوتا ہو اور جس کو صحیح طریقے سے حج کرنے کی توفیق ہوتی ہوگی، ورنہ اکثریت ایسی ہے جیسے میں نے ذکر کی ہے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اردگرد لوگوں کا حلقہ تھا اور وہ مسائل پوچھ رہے تھے، حج کے مسائل، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا اور فرمایا جتنے لوگ زندہ باقی رہ گئے ہیں، ان میں یہ شخص حج کے مسائل کا سب سے بڑا عالم ہے، اور بات یہ ہے کہ اگرچہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اردگرد کے علاقوں میں حاکم بھی رہے ہیں، لیکن آخر میں مکہ مکرمہ میں قیام ہو گیا تھا اور مکے والے جتنے حج کے مسائل کو جانتے ہیں، دوسرے نہیں جانتے۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

"عَنْ يَعْقُوْبَ بْنَ زَيْدٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ: سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِاللهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا يَقُوْلُ حِيْنَ بَلَغَهُ مَوْتُ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا وَ صَفَّقَ بِاِحْدَىٰ يَدَيْهِ عَلَى الْاُخْرٰى: مَاتَ اَعْلَمُ النَّاسِ وَاَحْلَمُ النَّاسِ وَلَقَدْ اُصِيْبَتْ بِهٖ هٰذِهِ الْاُمَّةُ مُصِيْبَةً لَا تُرْتَقٰى۔" (ابن سعد ج:۴ ص:۱۸۶)

ترجمہ: "حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب ان کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے انتقال کی خبر پہنچی (حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا انتقال طائف میں ہوا تھا اور طائف میں ان کی قبر ہے) تو انہوں نے فرمایا اور اس طرح اپنے ہاتھوں کو ملا اور مل کر کے فرمایا: آج انسانوں میں جو سب سے بڑا عالم تھا اور سب سے زیادہ حلیم تھا، اسکا انتقال ہو گیا ہے اور ان کے انتقال کی وجہ سے اس اُمّت پر جو مصیبت نازل ہوئی ہے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔"

یہ تو مشہور بات ہے کہ جو جاتا ہے اپنی جگہ خالی چھوڑ کر جاتا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی آجائے، رفتہ رفتہ اس اُمت کا رنگ پھیکا ہوتا جا رہا ہے، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اس اُمت کا رنگ اور تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں اور تھا اور چلتے چلتے چلتے اب ہم تک پہنچ گیا ہے، فإنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

ایک اور روایت میں ہے:

”عَنْ اَبِی بَکْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ قَالَ: لَمَّا مَاتَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَالَ رَافِعُ بْنُ خَدِیْجٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ: مَاتَ الْیَوْمَ مَنْ کَانَ یَحْتَاجُ اِلَیْہِ مَنْ بَیْنِ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ فِی الْعِلْمِ۔“ (حیاۃ الصحابۃ ج:۵ ص:۳۸۳)

ترجمہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے انتقال کے موقع پر حضرت رافع ابن خدیج رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آج اس شخص کا انتقال ہوگیا کہ مشرق سے لے کر مغرب تک ساری دنیا ان کے علم کی محتاج تھی اور وہ علم ساتھ لے گئے انہوں نے پڑھایا، لوگوں کو سکھایا، لوگوں کو تعلیم دی، لیکن آج ان کے ساتھ ان کا علم چلا گیا، ان جیسا کوئی دوسرا آدمی پیدا نہیں ہوسکا، کوئی ثانی پیدا نہیں ہوسکا۔“

حضرت محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یمامہ میں قبیلہ بنی حنیفہ کے ساتھ جو جہاد ہوا تھا، مسیلمہ کذاب کے مقابلے میں، ان میں جو قیدی پکڑے گئے تھے، ایک محمد بن حنفیہ کی والدہ ماجدہ تھیں اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئی تھیں اور ان سے محمد بن حنفیہ پیدا ہوئے۔

آنحضرت ﷺ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کہا تھا کہ یا رسول اللہ! اگر آپ کے بعد میرے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام آپ کے نام پر رکھ لوں؟ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ضرور رکھو، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس بچے کا نام محمد رکھا تھا، اصل نام محمد بن علی تھا، لیکن کہتے محمد بن حنفیہ یعنی قبیلہ بنی حنفیہ کی خاتون کا لڑکا، اور انہوں نے اپنے والد ماجد سے علوم سیکھے تھے اور بہت اونچے آدمی تھے، حضرات حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے بھائی تھے، کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لڑکے اور لڑکیاں ملا کر چالیس ہوئے تھے، ان کے اپنے بچے چالیس تھے، ان کے بچوں سے جو بچے پیدا ہوئے وہ الگ رہے، تو جس دن حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا انتقال ہوا حضرت محمد بن حنفیہ نے کہا: آج اس اُمت کا ربانی فوت ہوگیا، قرآن کریم میں ہے: ﴿وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ﴾ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ربانی بنو، ربّ والے بنو، تو ربانی

وہ ہوتا ہے جو رب والا ہو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما:

عمرو ابن دینار کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے، ان کو جنگ بدر میں نہیں لیا گیا تھا، کیونکہ چھوٹے تھے اور جنگ احد میں شریک ہوئے تھے، گویا نوجوان تھے، عمر ابن دینار فرماتے ہیں کہ: جوانوں میں سب سے بڑے عالم عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تھے اور ان کی عجیب شان تھی، کسی جگہ سفر کر رہے ہوتے تو جس جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی تقاضہ بشری کی بنا پر پیشاب کے لئے اترے تھے، ان کو ضرورت ہو یا نہ ہو، یہ اس جگہ اونٹنی بیٹھاتے تھے اور پیشاب کے لئے بیٹھتے تھے، اتنے متبع سنّت تھے کہ ایک ایک بات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل کو ضروری سمجھتے تھے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ:

”عَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ قَالَ: لَمْ يَبْقَ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالشَّامِ اَحَدٌ كَانَ اَوْثَقُ وَلَا اَفْقَهُ وَلَا اَرْضٰى مِنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ وَشَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا۔“ (ابن سعد ج:۴ ص:۱۸۸)

ترجمہ: ”خالد بن معدان رحمۃ اللہ علیہ ایک تابعی ہیں وہ کہتے ہیں: کہ (ملک شام میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے، تو ملک شام میں حضرت عبادہ ابن صامت اور شداد ابن اوس رضی اللہ عنہما تھے) خالد ابن معدان کہتے ہیں کہ ان سے بڑھ کر قابل وثوق اور ان سے بڑھ کر کوئی فقیہ اور ان سے زیادہ کوئی پسندیدہ آدمی اور نہیں تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ صحابہ عبادہ ابن صامت اور شداد ابن اوس رضی اللہ عنہما آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ ثقہ اور سب سے زیادہ فقیہ اور سب زیادہ پسندیدہ آدمی تھے۔“

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ:

حنظلہ ابن سفیان اپنے مشائخ سے نقل کرتے ہیں: کہ چھوٹے صحابہ میں یعنی جو کم عمر تھے، ان میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بڑا کوئی عالم نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو عقل عطا فرمائی تھی، علم عطا فرمایا تھا اور بہت ہی نیک اور پارسا آدمی تھے، ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک علاقے کا امیر بنا کر بھیجا اور کئی خطوط حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ان کے نام ہیں، ان کو خطوط کے ذریعے سے ہدایات دیتے تھے۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی احتیاط:

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک آدمی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مسئلہ پوچھا، انہوں نے مسئلہ بتادیا اور مسئلہ بتا کر فرمانے لگے کہ تم یہ مسئلہ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے جا کر پوچھو اور وہ جو جواب دیں وہ آکر مجھے بھی بتاؤ، چنانچہ وہ شخص حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت نے فرمایا تم نے یہ مسئلہ کسی اور سے بھی پوچھا ہے، انہوں نے کہا جی ہاں! میں نے یہ مسئلہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا، انہوں نے مجھے مسئلہ کا جواب دے دیا اور ساتھ ہی کہا کہ میں یہ مسئلہ آپ سے بھی پوچھوں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا علمی مقام:

"عَنْ اَبِی الزُّعَیْزِعَةَ کَاتِبِ مَرْوَانَ بْنِ الْحَکَمِ اَنَّ مَرْوَانَ دَعَا اَبَاهُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ فَاَقْعَدَنِیْ خَلْفَ السَّرِیْرِ، وَجَعَلَ یَسْأَلُهُ وَجَعَلْتُ اَکْتُبُ حَتّٰی اِذَا کَانَ عِنْدَ رَأْسِ الْحَوْلِ دَعَا بِهٖ فَاَقْعَدَهٗ وَرَاءَ الْحِجَابِ فَجَعَلَ یَسْأَلُهُ عَنْ ذٰلِکَ، فَمَا زَادَ وَلَا نَقَصَ وَلَا قَدَّمَ وَلَا اَخَّرَ۔"

ترجمہ: "مروان بن حکم کے کاتب سے روایت ہے کہ مروان نے مجھے چھپ چھپا کے بیٹھا دیا اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا، ان سے کچھ مسئلے پوچھے، وہ بتاتے رہے اور یہ پردے میں بیٹھے ان مسائل کو لکھ رہے تھے، ایک سال پورا گزرنے کے بعد انہوں نے پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور وہی مسئلے پوچھے اور ابوزعیزعہ رضی اللہ عنہ کو بدستور پردے میں بیٹھا دیا، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مسئلوں کا جواب دیا (ان کو بھی یہ یاد نہیں رہا ہوگا کہ انہوں نے پہلے بھی یہ مسئلے پوچھے تھے) لیکن کسی مسئلے میں ایک حرف کی کمی بیشی اور آگے پیچھا نہیں ہوا۔"

گویا ٹیپ تھی جو چل رہی تھی، ایک سال پہلے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جو مسئلے بیان کئے تھے، جن الفاظ سے بیان کئے تھے، جس ترتیب سے بیان کئے تھے، ایک سال کے بعد اسی طرح ان مسائل کو بیان کر دیا اور یہ صرف تین سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سب سے زیادہ احادیث کو جاننے والے یہ ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنے آپ کو علم کے لئے وقف کرنا:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ خود ہی فرماتے ہیں کہ انصار کو تو اپنی کھیتی باڑی کا بھی کام ہوجاتا تھا اور

حضرات مہاجرین کچھ اپنا تجارت کا مشغلہ کر لیتے تھے، لیکن اپنے لئے تو کوئی چیز بھی نہیں تھی، نہ گھر تھا اور فرماتے ہیں کہ میں بھوک کی وجہ سے مسجدِ نبوی میں بے ہوش ہو کر گر جاتا تھا اور لوگ میری گردن پر پاؤں رکھتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ ان کو مرگی کا دورہ ہو گیا ہے، فرماتے تھے کہ مرگی ورگی کچھ نہیں ہوتی تھی، صرف بھوک تھی۔

ایک روایت میں ہے:

"فَمَرَّ اَبُوْ بَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فَسَأَلْتُہٗ عَنْ اٰیَۃٍ مِّنْ کِتَابِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ مَا سَأَلْتُہٗ اِلَّا لِیَسْتَتْبِعَنِیْ فَلَمْ یَفْعَلْ، فَمَرَّ عُمَرُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فَسَأَلْتُہٗ عَنْ اٰیَۃٍ مِّنْ کِتَابِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ مَا سَأَلْتُہٗ اِلَّا لِیَسْتَتْبِعَنِیْ فَلَمْ یَفْعَلْ، فَمَرَّ اَبُو الْقَاسِمِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَعَرَفَ مَا فِیْ وَجْھِیْ وَمَا فِیْ نَفْسِیْ، فَقَالَ: اَبَا ھُرَیْرَۃَ! قُلْتُ لَہٗ: لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! فَقَالَ: اِلْحَقْ......" (حیاۃ الصحابۃ ج:۱ص:۳۳۲)

ترجمہ: "حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ (میرے قریب سے) گزرے، ان سے قرآن کریم کی ایک آیت کے بارے میں سوال کیا، میرے سوال کرنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ مجھے ساتھ لے جائیں گے (گھر میں) لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ گزرے، ان سے بھی قرآن کریم کی ایک آیت کے بارے میں سوال کیا، ان سے بھی سوال کا مقصد صرف یہ تھا کہ مجھے ساتھ لے جائیں گے، لیکن انہوں نے بھی ایسا نہیں کیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم گزرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ میرے دل اور چہرے پر تھا اس کو پہچان لیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی اے ابوہریرہ! میں نے کہا: اے اللہ کے رسول میں حاضر ہوں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے ساتھ چلو۔"

خلاصہ یہ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے گزرے، کہنے لگے کہ جی میں ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں، انہوں نے مسئلہ بتا دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ گزرے انہوں نے بھی مسئلہ بتا دیا، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گزرے تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مسئلہ پوچھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ ابوہریرہ اپنا مسئلہ تو تم اپنے پاس رکھو، میرے ساتھ آجاؤ تمہیں کچھ کھانے کو مل جائے گا، اتنی جفاکشی کے ساتھ اس دین کے علم کو حاصل کیا تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ ایک خاتون تھی مدینے میں، میں نے ان سے کہا کہ بڑی بی تم مجھ سے کچھ کام کروا لیا کرو اور مجھ کو روٹی دے دیا کرو، کہنے لگیں نہیں بھئی مہنگا ہے، یعنی روٹی پر بھی یہ آدمی مہنگا ہے۔ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ وہی عورت آج میرے نکاح میں ہے۔ دراصل ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی تھی اور یہ دعا کا نتیجہ تھا، ایک روایت میں اس کا ذکر کچھ اس طرح ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا:

”وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَنْ یَّبْسُطَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ ثَوْبَہٗ حَتّٰی اَقْضِیَ مَقَالَتِیْ ھٰذِہٖ ثُمَّ یَجْمَعُہٗ اِلٰی صَدْرِہٖ فَلَا یَنْسٰی مِنْ مَّقَالَتِیْ شَیْئًا اَبَدًا، فَبَسَطْتُ نَمِرَۃً لَیْسَ عَلَیَّ ثَوْبٌ غَیْرُھَا حَتّٰی قَضَی النَّبِیُّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَقَالَتَہٗ ثُمَّ جَمَعْتُھَا اِلٰی صَدْرِیْ فَوَالَّذِیْ بَعَثَہٗ بِالْحَقِّ مَا نَسِیْتُ مِنْ مَّقَالَتِہٖ تِلْکَ اِلٰی یَوْمِیْ ھٰذَا۔“

(بخاری ج:۱ ص:۳۱۶)

ترجمہ: ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آج جو آدمی اپنی چادر بچھائے گا میں اس پر دم کروں گا پھر وہ آدمی اس کو اپنے سینے سے لگا لے گا، تو وہ میری احادیث کو کبھی نہیں بھولے گا، میں نے چادر بچھادی اور میری پشت پر اس چادر کے علاوہ کچھ نہ تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ پڑھا، (اللہ جانے کیا پڑھا ہوگا اور پڑھ کر چادر پر دم کردیا) میں نے چادر سمیٹ کر سینے سے لگالی، وہ دن ہے اور آج کا دن، کبھی کوئی بات مجھے بھولی نہیں۔“

میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ احادیث کو جاننے والا مجھ سے زیادہ کوئی نہیں ہے، مجھ سے زیادہ کوئی شخص احادیث کو نہیں جانتا الا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

ایک ہیں عبداللہ بن عمر، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے اور ایک ہیں عبداللہ بن عمرو، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ (عبداللہ بن عمرو بن العاص) البتہ مجھ سے احادیث زیادہ جانتے ہیں، اس لئے کہ وہ احادیث لکھ لیا کرتے تھے میں لکھا نہیں کرتا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فقاہت:

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اگر کسی مسئلے میں اختلاف ہوجاتا تو حضرات صحابہ، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور وہ ان کے مسئلے کو حل کردیتی تھیں (ابن سعد ج:۴ ص:۱۸۹)۔

قبیصہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عام لوگوں سے زیادہ عالمہ تھیں، مسائل کو جاننے والی تھیں اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا کہ ان کی خدمت میں مسائل کی تحقیق کے لئے حاضر ہوتے تھے (ابن سعد ج:۴ ص:۱۸۹)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور شان نزول:

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بہتر کوئی عالم نہیں دیکھا اور اگر کسی مسئلے میں کسی رائے کی ضرورت ہوتو ان سے بہتر کوئی رائے والا نہیں دیکھا اور قرآن کریم کی جو آیتیں نازل ہوئیں ہیں ان میں ایک ایک آیت کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ معلوم تھا کہ یہ آیت کس سلسلے میں نازل ہوئی ہے اور جب کوئی فریضہ پیش آتا تو وہ اس کو سب سے زیادہ جاننے والی ہوتی تھیں (حیاۃ الصحابۃ ج:۵ ص:۳۸۵)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور علمِ فرائض:

بھئی ہمارے دین کے علوم میں سے ایک مستقل علم فرائض ہے یعنی اگر کوئی شخص فوت ہوجائے تو اس کا مال کس طرح تقسیم کیا جائے گا، اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم جانتے تھے اور علماء میں سے بھی بہت کم آدمی ایسے ہوتے ہیں جو علمِ فرائض کو جانتے ہیں۔

تو حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا علم فرائض کی ماہر تھیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان کسی مسئلے میں وراثت کے مسئلے میں اختلاف ہوتا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رجوع کرتے (ابن سعد ج:۴ ص:۱۸۹)۔

ایک روایت میں ہے:

”عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِيْدٍ قَالَ: كَانَ اَزْوَاجُ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْفَظْنَ مِنْ حَدِيْثِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَثِيْرًا وَّلَا مِثْلًا لِعَائِشَةَ وَاُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، وَكَانَتْ عَائِشَةُ تُفْتِيْ فِيْ عَهْدِ عُمَرَ وَعُثْمَانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا اِلٰى اَنْ مَاتَتْ يَرْحَمُهَا اللهُ، وَكَانَ الْاَكَابِرُ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُمَرُ وَعُثْمَانُ بَعْدَهٗ يُرْسِلَانِ اِلَيْهَا فَيَسْأَلَانِهَا عَنِ السُّنَنِ۔“ (ابن سعد ج:۴ ص:۱۸۹)

ترجمہ: ”حضرت محمود ابن لبید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن دین کے مسائل کو خوب جانتی تھیں اور لوگ ان سے اس معاملے میں استفادہ کرتے تھے، لیکن ازواج مطہرات میں بھی دو ہستیاں ایسی تھیں جو سب سے بڑی عالمہ تھیں، ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسری حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا۔“

حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی عقل و بصیرت:

حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی بات آگئی تو یہ بات بھی سن لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عقل و بصیرت کا بہت بڑا حصہ عطا فرمایا تھا، بڑی ذہین اور دانش مند تھیں، صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ کے ساتھ صلح کی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بہت صدمہ ہوا تھا، کیونکہ وہ صلح بظاہر دب کر ہوئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا احرام کھول دو، چلیں گے واپس، حدیبیہ مکہ مکرمہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے اور تقریباً سوا چار سو میل کا سفر کر چکے ہیں، اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بہت زیادہ صدمہ ہوا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب احرام کھول دو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے لئے آبِ حیات تھا، لیکن صدمہ ایسا تھا کہ گم صم تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا احرام کھول دو، وہ بیٹھے ہیں، اس سفر میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خیمے میں آئے اور شکایت کی کہ میں نے کہا احرام کھول دو، لیکن کوئی میری بات نہیں مانتا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ــ اللہ تعالیٰ پوری اُمّت کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے ــ فرمانے لگیں یا رسول اللہ! صحابہ کرام کو صدمہ ہے اور صدمے کی وجہ سے ان کو کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔

اس لئے آپ ان پر ناراض نہ ہوں اور آپ ایسا کیجئے کہ خیمے سے باہر جائیں اور حجام کو بلائیں اور اس سے کہیں کہ بال اُتار دے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی کیا، باہر تشریف لائے اور حجام کو بلا کر بال اُتار دیئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب احرام اتارتے ہوئے لوگوں نے دیکھا تو ایک دوسرے کے بال اتارنے لگے حتیٰ کہ اتنی تیزی کے ساتھ کہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں گے، یعنی زخمی کر دیں گے تو حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا بہت دانا تھیں، فرماتے ہیں کہ یہ دو بزرگ خواتین حضرت عائشہ اور حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا اکابر صحابہ کی موجودگی میں فتویٰ دیا کرتی تھیں اور خاص طور سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتویٰ دیتی تھیں، یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی، ان کا انتقال ہوگیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آجاتا تھا تو ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور ان سے مسئلہ دریافت کرتے تھے، یہ تو مسائل کا معاملہ تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ادیبانہ فصاحت:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خطبہ سنا ہے، اتنی بلاغت والا خطبہ ہوتا تھا اور اتنا فصیح و بلیغ خطبہ ہوتا تھا اور اتنی دانش مندی کے ساتھ بات کرتی تھیں کہ میں نے ایسا خطیب

نہیں دیکھا جو حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ فصیح و بلیغ اور دانش مندی کا خطبہ دینے والا ہو (حیاۃ الصحابۃ ج:۵ ص:۳۸۵)۔

فقہ، طب اور اشعار میں مہارت:

ان کے بھانجے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ جو ان کے شاگرد بھی ہیں اور ان کے راوی بھی ہیں یعنی سب سے زیادہ روایات نقل کرنے والے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ ہیں، ایک حضرت ''عروہ'' عروہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے تھے، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے بیٹے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے، اور دوسری راویہ ہیں ان کی، حضرت عروہ بنت عبد الرحمن وہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علوم کو نقل کرنے والی ہیں، وہ فرماتی ہیں کہ میں نے کوئی عورت نہیں دیکھی جو علم طب میں، فقہ میں اور عربی اشعار میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر ہو۔

حضرت عروہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ فقہ تو خیر آپ کے گھر کی چیز ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی ہوئی تھی، لیکن ادب و اشعار آپ کو کہاں سے معلوم ہو گئے؟ اور دوسرا علم طب کہاں سے آپ کو حاصل ہو گیا؟ فرمانے لگیں کہ اشعار تو میں نے اپنے والد ماجد سے سیکھے اور وہ عرب کے اشعار سے سب سے زیادہ واقف تھے، عرب کے قبائل سے اور عرب کے اشعار سے سب سے زیادہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ واقف تھے، یہ تو میں نے اپنے والد ماجد سے سیکھے، جہاں تک طب کا تعلق ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بیمار ہوتے تو لوگ آ کے مختلف دوائیاں بتایا کرتے تھے آپ کو اور میں یاد کر لیا کرتی تھی، اس طرح مجھے علم طب حاصل ہو گیا (مسند احمد ج:۶ ص:۶۷)۔

اشعر قبیلے والوں کی مدح

[حدیث:۱۳۱۳] ''عَنْ أَبِي مُوسَى..... إِنَّ الْأَشْعَرِيِّينَ إِذَا أَرْمَلُوا فِي الْغَزْوِ أَوْ قَلَّ طَعَامُ عِيَالِهِمْ بِالْمَدِينَةِ جَمَعُوا مَا كَانَ عِنْدَهُمْ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ ثُمَّ اقْتَسَمُوهُ بَيْنَهُمْ فِي إِنَاءٍ وَاحِدٍ بِالسَّوِيَّةِ فَهُمْ مِنِّي وَأَنَا مِنْهُمْ۔''

(صحیح بخاری ج:۸، ص:۳۸۷، حدیث نمبر:۲۳۰۶، بَابُ الشَّرِكَةِ فِي الطَّعَامِ وَالنَّهْدِ وَالْعُرُوضِ وَكَيْفَ..)

ترجمہ: ''حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اشعری لوگ جب جہاد کے موقع پر محتاج ہو جاتے ہیں یا مدینہ میں ان کے بال بچوں کا کھانا کم ہو جاتا ہے تو ایک کپڑے میں جو ان کے پاس ہوتا ہے جمع کر

لیتے ہیں، پھر ایک برتن سے آپس میں برابر بانٹ لیتے ہیں، پس وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔''

تشریح: اس حدیث میں اشعر قبیلے کی فضیلت ذکر فرمائی ہے، یہ یمن کا ایک قبیلہ تھا، بہت سے صحابہ اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، ان میں سے ایک حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ اشعری بھی تھے، چنانچہ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ اس حدیث کو نقل کر رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اشعری لوگ بڑے اچھے ہیں، جہاد کے موقع پر اگر ان کے توشے ختم ہو جاتے ہیں یا کم پڑ جاتے ہیں تو وہ ایسا کرتے ہیں کہ سارے اپنے جتنے غلے ہیں سب لے آتے ہیں، اب کسی کے پاس زیادہ ہوگا، کسی کے پاس کم ہوگا، سب نے مل کر ایک جگہ جمع کر دیا، اب جتنے ساتھی جمع کرنے والے ہیں وہ ایک ٹوکرا لے لیتے ہیں کوئی پیمانہ لے لیتے ہیں اور سب کو برابر برابر تقسیم کر دیتے ہیں، یہ تو جہاد کی بات تھی، مدینہ میں رہتے ہوئے بھی اگر ان کے اہل وعیال کو تنگی ہوتی تو وہ وہاں بھی یہ کرتے ہیں کہ بھئی اپنے اپنے غلے سارے ایک جگہ جمع کر دو، جمع کرنے کے بعد یہ کرتے ہیں کہ پھر ان کی تقسیم کر دی برابر برابر، فہرست بنالی کہ تمہارے گھر میں کتنے آدمی ہیں، جی اتنے، فرض کرو کہ ۲۰۰ آدمی ہوئے کل، تو اس کے دوسو پیمانے بنا دیئے، تمہارے گھر میں اتنے آدمی ہیں، تمہیں اتنے پیمانے ملیں گے، تمہارے گھر میں اتنے آدمی ہیں تمہیں اتنے پیمانے ملیں گے، یعنی خود کار وہ مساوات قائم کر لیتے ہیں تاکہ سارے برابر ہو جائیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''فَهُمْ مِنِّي وَأَنَا مِنْهُمْ'' وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان پر اپنی رضامندی کا اظہار فرما رہے ہیں کہ وہ میرا طریقہ اپنائے ہوئے ہیں۔ محمدی تفسیر یہ ہے، وہ مساوات جس کا اسلام سبق دیتا ہے، جس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، جس پر اجر وثواب کا وعدہ کرتا ہے اور جس کے ذریعے قلوب میں آپس میں ایک دوسرے سے محبت پیدا ہوتی ہے، یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں بھی محبوب ہو جاتا ہے۔ اور اگر مساوات کا وہ ترجمہ کیا جائے جو آنجہانی کمیونزم کہتا تھا ''آنجہانی'' اس لئے کہتے ہیں وہ بھی ختم ہو گیا، اپنی موت آپ مر گیا، کسی زمانے میں اتنا شور شرابہ اٹھایا تھا کہ گویا ساری دنیا کو کمیونزم کا زکام ہو گیا تھا، جیسا کہ آج زکام ہوا ہے ساری دنیا کو مساوات کا، اچھے خاصوں کو زکام ہوا ہے۔

علامہ اقبال مرحوم کے مکان پر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ٹھہرے ہوئے تھے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا نام سن کر بڑے بڑے لوگ جمع ہو گئے، کہنے لگے: حضرت! بات یہ ہے کہ زمانے کے مقتضیات ہیں، زمانے کے تقاضے ہیں، مسلمان بہت پسماندہ رہ گئے ہیں، اس وقت ضرورت ہے کہ مسلمان سود کے حلال ہونے کا فتویٰ دیں۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تکیہ کلام تھا ''مولوی صاحب!'' اور تھوڑی سی

ناک میں آواز کے ساتھ بولتے تھے، کہنے لگے: ''مولوی صاحب!'' اگر تم لوگوں کو جہنم میں جانا ہے تو سیدھے چلے جاؤ، مولوی کو درمیان میں پل کیوں بناتے ہو؟ کسی کو جہنم میں جانا ہے شوق سے جائے، درمیان میں علماء کو کیوں لاتے ہو؟ مولوی اگر تمہیں سود کے حلال ہونے کا فتویٰ دے دے گا تو وہ حلال تو نہیں ہو جائے گا۔

ایک سو سال سے جنگ لڑ رہے ہیں اور انہوں نے دیکھ لیا کہ مولوی بے چارہ بہتیرا چیختا رہا، لیکن بینک چل رہے ہیں، ایک بھی ایسا اسلامی ملک نہیں جس میں یہودیوں کا ساہوکاری بینکاری نظام نہ ہو، لیکن میں یہاں ٹھہر کر تم سے پوچھتا ہوں: جن لوگوں کے قبضے میں ہماری معاشی پالیسیاں ہیں، انہوں نے تو مولوی کی بات پر کان نہیں دھرا، غیر ملکی قرضے، سودی قرضے، اندرونی قرضے، لینا بھی، دینا بھی، میں پوچھتا ہوں: کتنی ترقی کر گئے ہو تم؟ اس یہودیانہ سودی نظام کو رائج کر کے تم نے کتنی ترقی کر لی؟ معلوم ہوا کہ تم جھوٹ بولتے ہو، یہ جو تم کہتے ہو: ''ملا سود میں حلال ہونے کا فتویٰ نہیں دیتا، یہ ترقی میں رکاوٹ ہے، یہ بریک لگا رہا ہے۔'' میں نے کہا: بریک تو فیل کر دی تم نے مولوی کی، لیکن تم نے کتنی ترقی کر لی؟ اور تم نے دیکھا جتنی ترقی کی ہے وہ نیچے کی طرف ہے، ترقیٔ معکوس! یہی ترقی تھی جس کے گن گائے جاتے تھے؟ ابھی آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے:

فسوف ترى إذا انكشف الغبار أفرس تحت رجلك أم حمار

ترجمہ: ''جب یہ غبار چھٹ جائے گا تو معلوم ہوگا کہ گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر سوار تھے؟''

یہودیوں کا پہلا منصوبہ یہ تھا کہ ان مسلمانوں کو گمراہ کرنے کا ایک آسان راستہ تو یہ ہے کہ اس کو سود پر لگاؤ، اب اگر کوئی اس کی حرمت کا فتویٰ لگاتا ہے تو کسی کو بات سمجھ میں نہیں آتی۔

اسی طرح یہودیوں کا دوسرا منصوبہ ہے جو ذرا اس سے مشکل ہے، وہ یہ کہ مرد و عورت کی مساوات کا نعرہ لگواؤ، اس سے نکالو ان کو گھروں سے اور پھراؤ ان کو بازاروں میں، نعرہ لگاؤ مرد و عورت کی مساوات کا، لیکن مقصود ہے جنسی آوارگی پھیلانا، یہ انسان انسان نہ رہیں، گدھے اور حیوان بن جائیں، جہاں چاہا خواہش پوری کر لی اور انہوں نے کہا کہ اس سے زیادہ مشکل ہے لیکن اصل چیز وہی ہے، وہ یہ کہ مسلمانوں کا قرآن سے بہت تعلق ہے اور وہ ملا کے قبضے میں ہے، ابھی تک قرآن پر ملا کی اجارہ داری ہے، تم یہ تحریک چلاؤ کہ قرآن پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، ہر شخص کو تاویل کرنے کا حق حاصل ہے، ملا کی تاویل کوئی قابل وقعت نہیں اور کہا کہ اس تحریک کو ذرا زور سے چلاؤ، مشکل کام ہے، یہاں آ کر ملا بہت سخت لڑ پڑتا ہے، اب ہمارے یہاں جتنا جدید طبقہ ہے، ''جدید طبقے'' سے میری مراد وہ لوگ ہیں جن کے دماغ میں انگریزیت گھس گئی ہے، وہ کبھی کہتا ہے کہ یہ فرسودہ کتاب ہے، کبھی کہتا ہے کہ اس کے قوانین بدلنے کی ضرورت ہے۔

یہ حنیف رامے جو آج کل گورنر بنا ہوا ہے، اس نے مرزائیوں کے حق میں ایک بیان دیا تھا، بہت مدت ہوگئی، اس کا مضمون ابھی تک میرے پاس ہے اور میں نے اس کا جواب بھی لکھا تھا، وہ بھی روزنامہ ''جنگ'' میں چھپا تھا، میں وہاں خود گیا اور جا کر چھپوایا، پھر مجھے میر شکیل الرحمٰن اپنے ساتھ لے گیا کہ چلو حنیف رامے صاحب سے میں آپ کی ملاقات کرا دوں، آپ خود بات کرلیں، میں نے کہا: بہت اچھا چلو! اس نے ٹیلیفون کیا اور کہا کہ ہمارے بزرگ آئے ہوئے ہیں آپ سے کچھ بات چیت کرنا چاہتے ہیں، اس نے کہا: ''آجاؤ!'' ہمارے لڑکے ساتھ ٹیپ لے گئے تھے تاکہ سوال جواب جو کچھ ہو وہ ٹیپ ہوجائے، اس نے اجازت تو دے دی لیکن کہا کہ: ٹیپ بند کردیں، اس نے کہا: ''میں نے کوئٹہ میں رہ کر تین سال قرآن کا مطالعہ کیا ہے۔'' لہٰذا اب اس سے بڑا کوئی امام نہیں، کیونکہ اس نے کوئٹہ میں رہ کر اکیلے تین سال قرآن کا مطالعہ کرلیا، لہٰذا اب سب سے بڑا امام حنیف رامے ہے، اور اس کی ساری بات کا خلاصہ یہ تھا کہ قرآن پاک اپنی جگہ برحق، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانے کے مطابق اس کی تاویل کی تھی، میں اپنے زمانے کے مطابق اس کی تاویل کروں گا، اس نے مجھے ٹیپ نہیں کرنے دیا۔ میں نے اس پر سوالات کئے، جرح کی اور اس نے یہ بات کہہ دی، ان کی عقل میں یہ بات آتی ہی نہیں کہ قرآنِ کریم کا ایک ہی مطلب لیا جائے اور وہ مطلب قیامت تک جاری رہے۔

ہمارے مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی زمانے میں ''بنیان'' کے معنی بنیان کے ہوتے تھے، لیکن اس زمانے میں ''بنیان'' کے معنی پاجامہ کے ہیں، لفظوں کا مفہوم بھی بدلا کرتا ہے؟ یہ تو کہہ سکتے ہو کہ جو حکم نکلتا ہے اس آیت شریفہ سے زمانے کے تغیر کی وجہ سے شاید اس میں کوئی لچک پیدا ہوجائے، ایسا ہوجاتا ہے، لیکن یہ منطق تو کبھی کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ قانون کی کتابوں میں جو لفظ کسی کے لئے رکھا گیا ہے کل اس کے یہ معنی تھے آج اس کے یہ معنی ہیں اور بیس سال کے بعد یہ ہوں گے لیکن وہ بڑی سنجیدگی سے مجھے کہہ رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانے کے اعتبار سے تعبیر کی تھی، میں اپنے زمانے کے اعتبار سے تعبیر کروں گا۔

تو یہ ان یہودیوں کا تیسرا منصوبہ ہے، انہوں نے کہا کہ یہ ہے بڑا مشکل، ملا نہیں مانے گا اس کو لیکن تم زور سے تحریک چلاؤ کہ قرآن پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، قرآن تو خود کہتا ہے کہ آؤ یہ کتاب ہدایت ہے، پڑھو اس کو، لہٰذا ہر وہ شخص جو ذرا بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کا فرض بنتا ہے کہ قرآن کو خود سمجھے اور جو کچھ اناپ شناپ نکال سکتا ہے اس میں سے نکالے، نعوذ باللہ! ملا کا کیا کام ہے اس میں؟

یہ جناب منصوبے بن رہے ہیں اور تحریروں میں آرہے ہیں، لیکن کسی کو غیرت نہیں آرہی، مرد عورت کی مساوات کا نعرہ، یہ انہوں نے کہا کہ درمیانے درجے کی چیز ہے، مرد اور عورت کو اسلامی معاشرے

میں یکساں سطح پر رکھا جائے۔ تمہاری بے نظیر کو لایا ہی اس لئے گیا ہے اور اس منصوبے میں تصویر بھی دی ہوئی ہے دو عورتوں کی، ایک بینظیر کی، ایک ترکی کی کسی عورت کی، جب یہ منصوبہ بنا تھا اس وقت یہ نہیں بنی تھی بدبخت خالدہ ضیاء، اب تو تین ہوگئی ہیں مسلمانوں کا منہ کالا کرنے کے لئے۔

آج تک امریکہ نے کسی عورت کو صدر کیوں نہیں بنایا؟ پوچھو تو سہی اس سے! مساوات کا جھنڈا اٹھانے والا سب سے بڑا وہ ہے، پچاسواں یا باونواں ان کا صدر چل رہا ہے، ہر چار سال کے بعد صدر بدلتا ہے ان بدبختوں نے آج تک کسی عورت کو صدر کیوں نہیں بنایا؟ پوچھو ان سے جا کے! لیکن ہمیں اُلو کی طرح کہا جاتا ہے مرد عورت کی مساوات۔ مساوات کا مطلب کیا ہے؟ کتوں اور کتیوں کی طرح نکالو ان کو گلیوں میں اور کوئی پابندی نہ ہو اس میں۔

یہ جو قاہرہ میں کانفرنس ہوئی تھی، اس میں اور کیا تھا؟ اس کا ایک حصہ یہ تھا کہ تیرہ اور چودہ سال کے بچوں کو جنسی تعلیم دی جائے، بچے کی تخلیق کی ابتداء جہاں سے ہوتی ہے وہاں سے لے کر بچے کی پیدائش تک کہ یوں یوں ہوتا ہے، بچوں کی پیدائش کی تعلیم دینے چلے ہیں، پہلے کسی نے سیکھا ہی نہیں تھا آج تک یہ فن، دنیا خواہ مخواہ آدم سے لے کر آج تک بنتی چلی آئی ہے، بے حیائی کا سبق دینے کے لئے مسلمانوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے، پہلے کسی نے نہیں سیکھا تھا یہ؟ کسی کو نہیں آیا؟ تو میں نے کہا کہ مساوات کے نعرے تو لگاتے ہیں لیکن یہ سارے مساوات کے نعرے آوارگی پھیلانے کے لئے ہیں۔

بہر حال! اس حدیث میں ہے مساوات محمدی، آج ہے تمہارے کسی محلے کسی برادری میں؟ یہ برادریاں بنی ہوئی ہیں گجراتیوں کی، کاٹھیاواڑیوں کی برادریاں بنی ہوئی ہیں، جب بھی کوئی تنگی ہو تو کہہ دیا جائے جتنے برادری کے لوگ ہیں سارے جمع کردو، ہم برابر تقسیم کردیں، دیکھیں گے کہ کتنے حوصلے والے ہیں؟

تو آنحضرت ﷺ نے اشعر قبیلے کی تعریف فرمائی کہ جب بھی ان پر تنگی آتی ہے تو سارے غلے کو جمع کر کے جتنے آدمی ہیں ان پر تقسیم کردیتے ہیں، کسی کا تھوڑا ہے کسی کا زیادہ ہے، بھئی! جتنا ہے سب لے آؤ، کسی کے پاس دو سیر ہے، کسی کے پاس چار سیر ہے، کسی کے پاس دس سیر ہیں، اور جمع کر کے افراد کو اس میں تقسیم کردیا۔

آیت تخییر

[حدیث: ۱۳۱۴] ''..... جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ ...... فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الشَّهْرَ يَكُونُ تِسْعًا وَعِشْرِينَ۔''

(صحیح مسلم ج:۵، ص:۳۶۲، حدیث نمبر:۱۸۱۵، بَاب الشَّهْرُ يَكُونُ تِسْعًا وَعِشْرِينَ)

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: مہینہ کبھی

انتیس دن کا بھی ہوتا ہے۔''

تشریح: اس حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ مہینہ کبھی انتیس دن کا بھی تو ہوتا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن آنحضرت ﷺ سے خرچ بڑھانے کا مطالبہ کر رہی تھیں، آنحضرت ﷺ ناراض ہو گئے اور ناراض ہو کر آپ نے قسم کھالی کہ ایک مہینے تک تمہارے پاس نہیں آؤں گا، چنانچہ آپ ازواج مطہرات سے الگ ہو گئے اور ایک بالاخانہ تھا وہاں رہنے لگے، جب ایک مہینہ پورا ہوا تو قرآن پاک کی سورۂ احزاب کی آیت نازل ہوئی جو اکیسویں پارے کا آخری رکوع ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴿٢٨﴾ وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٢٩﴾﴾

(الأحزاب)

ترجمہ: ''اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم چاہتی ہو دنیا کو اور اس کی زینت کو، تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر رخصت کر دوں خوبصورتی کے ساتھ، اور اگر تم چاہتی ہو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور آخرت کے گھر کو، تو بے شک اللہ نے تیار کر رکھا ہے تم میں سے نیکی کرنے والیوں کے لئے بڑا اجر۔''

مطلب یہ ہے کہ پھر یہ آخرت میں ملے گا دنیا میں نہیں ملے گا، دنیا میں تمہارا مطالبہ ختم، یہ آیت آیت تخییر کہلاتی ہے، یعنی ازواج مطہرات کو اختیار دینے کی آیت، جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی تو انتیس دن ہو گئے تھے، سب سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے، انہوں نے فوراً کہا: یا رسول اللہ! آپ نے تو ایک مہینے کی قسم کھائی تھی، آج تو انتیس دن ہوئے ہیں، اس موقع پر مسکرا کر فرمایا: مہینہ کبھی انتیس کا بھی تو ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چونکہ اس وقت کم عمر تھیں اور عورتوں میں جذباتیت غالب ہوتی ہے، آپ ﷺ چاہتے تھے یہ یوں نہ کہہ دے کہ ہم سے یہاں یہ مشقتیں برداشت نہیں ہوتیں، کھانے پینے کو بھی کچھ نہ تھا، عورتیں سونخرے کرتی ہیں، اس لئے فرمایا: عائشہ! میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں لیکن جواب دینے میں جلدی نہ کرنا، بلکہ اپنے ماں باپ سے مشورہ کر لینا، بہت ہی اطمینان سے فرمایا کہ جلدی نہ کرنا کیونکہ آنحضرت ﷺ کو اطمینان تھا کہ ماں باپ سے مشورہ کریں گی تو وہ جدائی کا مشورہ نہیں دیں گے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: یا رسول اللہ! آپ فرمائیں کیا کہنا چاہتے ہیں، مشورہ کرنے کی بات ہوگی تو مشورہ بھی کر لیں گے۔

اس پر آپ ﷺ نے دونوں آیتیں پڑھیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تو دنیا اور اس کی زینت کو چاہتی ہو تو آؤ تمہیں کچھ دے کر رخصت کر دوں، اور اگر تم اللہ کو اور اس کے رسول کو اور آخرت کو چاہتی ہو تو

یہاں کچھ نہیں ملے گا، وہاں بہت کچھ تیار کر رکھا ہے تمہارے واسطے، یہاں کچھ نہیں ملے گا، ایک جو کا مطالبہ نہیں ہو تمہارا، فاقے سے مرنا ہے تو یہاں رہو، یہ خلاصہ ہے ان دونوں آیات کا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سن کر جواب دیا: أَفِيكَ يَا رَسُولَ اللهِ! أَسْتَشِيرُ أَبَوَيَّ؟ یارسول اللہ! کیا آپ کے معاملے میں بھی ماں باپ سے مشورہ کرنے کی ضرورت ہے؟ میں آپ کے معاملے میں والدین سے مشورہ کرنے نہیں جاؤں گی، بَلْ أَخْتَارُ اللهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ بلکہ میں اللہ کو، اس کے رسول کو اور آخرت کے گھر کو اختیار کرتی ہوں، اپنا حق ختم، آئندہ کوئی مطالبہ نہیں۔

آنحضرت ﷺ اس جواب سے بہت زیادہ خوش ہوئے۔ اب دوسروں کے پاس بھی جانا تھا، نو تھیں ماشاء اللہ! تو کہنے لگیں: یارسول اللہ! میری ایک درخواست مان لیجئے! وہ یہ کہ کسی دوسری بی بی کے پاس جاکر یہ نہ بتایئے کہ عائشہ نے یہ جواب دیا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ نویں دن باری آتی ہے، ایک آدھ کی چھانٹی ہو جائے تاکہ ایک دن کم ہو جائے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اگر کوئی پوچھے گی تو بتادوں گا، اپنے آپ نہیں بتاؤں گا، اگر کسی نے پوچھا کہ عائشہ نے کیا جواب دیا؟ یہ تو معلوم تھا کہ سب سے پہلے عائشہ کے پاس جائیں گے، کہا: بہت اچھا! جیسے آپ کی مرضی، چنانچہ باقی آٹھوں کے پاس گئے اور سب کا سب سے پہلا سوال تھا کہ عائشہ کا کیا جواب ہے؟ آنحضرت ﷺ سب کو بتاتے کہ اس نے یہ کہا ہے: بَلْ أَخْتَارُ اللهَ وَرَسُولَهُ تو ہر ایک بی بی کہتی کہ جو عائشہ نے کہا وہی میرا جواب: "بَلْ أَخْتَارُ اللهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ" نو کی نو نے یہ جواب دیا اور آئندہ کے لئے مطالبے کی جڑ ختم۔

تو اس موقع پر فرمایا تھا کہ مہینہ کبھی انتیس کا بھی تو ہوتا ہے، ظاہر میں تو یہ فقرہ یونہی سا ہے کہ مہینہ کبھی انتیس کا بھی تو ہوتا ہے، لیکن اس میں کتنی معنویت ہے؟ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آپ نے تو ایک مہینے کی قسم کھائی تھی، آپ انتیسویں دن آگئے ہیں، فرمایا کہ: مہینہ کبھی انتیس کا بھی تو ہوتا ہے، پھر فرمایا کہ: تمہیں انتیس اور تیس کیسے یاد رہے کہ آج تیس نہیں ہوئے انتیس ہوئے؟ کہنے لگیں: ایک ایک دن گن گن کر گزارا ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ: کیسے یاد رہے، ایک ایک دن گن کر گزارا ہے، وہ تو ہم سے پوچھو کہ کیسے گزارا ہے؟

حضرت یوسف علیہ السلام کی فضیلت

[حدیث: ۱۳۱۵] "عَنِ ابْنِ عُمَرَ ...... ، الْكَرِيمُ ابْنُ الْكَرِيمِ ابْنِ الْكَرِيمِ ابْنِ الْكَرِيمِ يُوسُفُ بْنُ يَعْقُوبَ بْنِ إِسْحَاقَ بْنِ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ۔"

(صحیح بخاری ج: ۱۱ ص: ۱۸۳، حدیث نمبر: ۳۱۳۸، بَاب قَوْلِ اللهِ تَعَالَى: لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ)

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد

فرمایا: جو خود کریم ہو اس کا باپ بھی کریم اور اس کا دادا بھی کریم، وہ حضرت یوسف ہیں حضرت یعقوب کے بیٹے، حضرت اسحاق کے پوتے اور حضرت ابراہیم کے پر پوتے (علیہم الصلوٰۃ والسلام)۔"

تشریح: اس حدیث میں حضرت یوسف علیہ السلام کی فضیلت بیان فرمائی ہے کہ پوری انسانیت میں حضرت یوسف علیہ السلام سے بہتر نسب کسی کا نہیں، خود کریم تھے، یعنی نبی تھے، ان کے والد ماجد یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کریم تھے یعنی نبی تھے، ان کے والد ماجد حضرت اسحاق علیہ السلام کریم تھے یعنی نبی تھے، اور ان کے والد ماجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کریم تھے، یعنی نبی تھے، تو خود کریم باپ کریم دادا کریم اور پر دادا کریم، ایسا سلسلہ نسب جس میں چار پشتوں تک مسلسل سلسلہ نبوت چلا ہو پوری دنیا میں حضرت یوسف علیہ السلام کے سوا اور کوئی نہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا کہ: أَيُّ النَّاسِ أَكْرَمُ؟ (طبقات ابن سعد) سب سے زیادہ معزز انسان کون ہے؟ فرمایا: الْكَرِيمُ ابْنُ الْكَرِيمِ ابْنِ الْكَرِيمِ ابْنِ الْكَرِيمِ يُوسُفُ بْنُ يَعْقُوبَ بْنِ إِسْحَاقَ بْنِ إِبْرَاهِيمَ۔ نسب کے لحاظ سے سب سے زیادہ معزز حضرت یوسف علیہ السلام ہیں خود نبی ہیں، باپ نبی ہیں، دادا نبی ہیں، پر دادا نبی ہیں، صحابہؓ نے عرض کیا: ہم یہ نہیں پوچھتے، ہمارا سوال یہ نہیں تھا، فرمایا: فَعَنْ مَعَادِنِ الْعَرَبِ تَسْأَلُونِي؟ تو کیا عرب کے قبائل کے بارے میں مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو؟ انہوں نے فرمایا: جی ہاں! تو ارشاد فرمایا: فَخِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقُهُوا (صحیح البخاری ۱۱/ ۱۶۴، ۳۱۲۳ کنز الاعمال: ۲۷۸۸۰) عرب کے قبائل میں جو زمانۂ جاہلیت میں سب سے زیادہ معزز قبیلہ تھا، وہی اسلام میں سب سے زیادہ معزز قبیلہ ہوگا بشرطیکہ وہ دین کا فہم حاصل کرلے۔

بنو ہاشم کی فضیلت

[حدیث: ۱۳۱۶] "...... أَنَّهُ سَمِعَ وَاثِلَةَ بْنَ الْأَسْقَعِ ......، إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَى كِنَانَةَ مِنْ وُلْدِ إِسْمَعِيلَ وَاصْطَفَى قُرَيْشًا مِنْ كِنَانَةَ وَاصْطَفَى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِي هَاشِمٍ وَاصْطَفَانِي مِنْ بَنِي هَاشِمٍ۔"

(صحیح مسلم ج:۱۱ ص: ۳۸۰، حدیث نمبر: ۴۲۲۱، بَاب فَضْلِ نَسَبِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَسْلِيمِ ....)

ترجمہ: "حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کو اور کنانہ کی اولاد میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو چنا۔"

تشریح: اس حدیث شریف میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے

کنانہ کو اور کنانہ کی اولاد میں سے قریش کو، اور قریش میں سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو چن لیا ہے۔

کنانہ آنحضرت ﷺ کے اجداد میں سے پندرھویں پشت سے ہیں اور ان کے صاحبزادے 'نضر' ان کا لقب قریش ہے، پھر آگے ان کی تمام اولاد قریش کہلائی اور قریش میں سے آنحضرت ﷺ کے پردادا ہاشم یہ سب سے زیادہ معزز تھے، قرآن کریم میں ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ (آل عمران) بے شک اللہ تعالیٰ نے چنا آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم اور آل عمران کو، یہ بنی اسرائیل کی شاخ ہوگی تو تمام انسانوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو چنا اور اولاد آدم میں سب سے زیادہ معزز حضرت نوح علیہ السلام تھے، نوح علیہ السلام کی اولاد میں سب سے زیادہ معزز حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو صاحبزادے تھے اسماعیل اور اسحاق، بڑے اسماعیل اور چھوٹے اسحاق، اللہ تعالیٰ نے کچھ عرصے کے لئے سلسلہ نبوت حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کے لئے رکھا، حضرت اسحاق علیہ السلام کے صاحبزادے تھے حضرت یعقوب علیہ السلام ان کو ''اسرائیل'' کہتے ہیں، ان کی اولاد ''بنی اسرائیل'' کہلائی، سلسلہ نبوت ختم ہوا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر، ان دونوں بھائیوں میں دوسری شاخ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے جن کی اولاد عرب ہے، اور ان کی اولاد میں کنانہ تھے اور ان کے بیٹے نضر تھے وہ قریش کہلاتے ہیں تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سب سے افضل بنو ہاشم تھے اور بنو ہاشم میں سب سے افضل آنحضرت ﷺ، اب یوں کہہ سکتے ہیں کہ پوری کائنات میں سب سے افضل اور اشرف آنحضرت ﷺ ہیں۔

حضرت مولانا محمد یوسف دہلوی، حضرت جی تبلیغی جماعت والے رحمۃ اللہ علیہ میواتیوں سے فرماتے تھے کہ یوں مت سمجھو کہ تمہاری تبلیغ سے دین چمک جائے گا، یوں نہ سمجھنا کہ ہماری محنت سے دین چمک جائے گا، تمہاری محنت سے کچھ دوسرے لوگ متوجہ ہو جائیں گے، کچھ تاجر برادری، کچھ دوسرے لوگ، پھر ان کے متوجہ ہونے سے کچھ علماء متوجہ ہو جائیں گے، پھر ان کے متوجہ ہونے سے عرب متوجہ ہو جائیں گے، پھر ان کے متوجہ ہونے سے قریش متوجہ ہو جائیں گے اور دین قریش کے ذریعے چمکے گا اس لئے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا قبیلہ ہے، اللہ نے دین ان کے پاس بھیجا تھا، دین جب بھی چمکے گا ان کے لگنے سے چمکے گا، تمہارے ذریعے سے نہیں چمکے گا لیکن تمہارا لگنا ذریعہ بن جائے گا قریش کے لگنے کا۔

اس اُمّت کے سب سے بڑے قاری

[حدیث: ۱۳۱۷] ''عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأُبَيٍّ: إِنَّ اللّٰهَ أَمَرَنِي أَنْ أَقْرَأَ عَلَيْكَ {لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ

الْكِتَابِ} قَالَ: وَسَمَّانِي؟ قَالَ: نَعَمْ، فَبَكَى۔"

(صحیح بخاری ج:۱۲ ص:۱۷۴، حدیث نمبر ۳۵۲۵، بَاب مَنَاقِبِ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ)

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُبیؓ بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہیں ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ﴾ پڑھ کر سناؤں، حضرت اُبیؓ نے فرمایا: اور اللہ نے میرا نام لیا تھا؟ ارشاد فرمایا: ہاں! اس پر حضرت اُبیؓ رو پڑے۔"

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ حضرت اُبیؓ بن کعب رضی اللہ عنہ جو سیّد القراء کہلاتے ہیں، اس اُمت کے سب سے بڑے قاری جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "أَقْرَأُهُمْ أُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ" فرمایا ہے، اس اُمت کے سب سے بڑے قاری اُبیؓ بن کعب ہیں، ان سے ایک موقع پر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے فرمایا ہے کہ میں تمہیں سورۂ ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ﴾ پڑھ کر سناؤں، اُبیؓ بن کعب کہنے لگے: اللہ نے کہا ہے کہ مجھے پڑھ کر سنائیں؟ فرمایا: جی ہاں! پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے میرا نام لیا تھا؟ ارشاد فرمایا کہ: جی ہاں! نام لے کر فرمایا کہ اُبیؓ کو ﴿لَمْ يَكُنِ﴾ پڑھ کر سناؤ، پس جب یہ ارشاد فرمایا کہ ہاں اللہ نے نام لے کر فرمایا تھا تو حضرت اُبیؓ بن کعب بے اختیار رو پڑے کہ میری قسمت کہ اللہ نے میرا نام لیا رضی اللہ عنہ۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رونا کئی وجہ سے ہوتا ہے، ایک رونا خشیت کی وجہ سے ہوتا ہے، اللہ کے ڈر کی وجہ سے ہوتا ہے، ایک رونا اللہ کی محبت کی وجہ سے ہوتا ہے، ایک رونا خوف کی وجہ سے ہوتا ہے، بچّہ ڈر جاتا ہے تو رونا شروع کر دیتا ہے، ایک رونا غم کی وجہ سے ہوتا ہے، ایک رونا خوشی کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی کبھی رونا مکر کی وجہ سے ہوتا ہے، جیسا کہ سورۂ یوسف میں ہے: ﴿وَجَآءُوٓا أَبَاهُمْ عِشَآءً يَبْكُونَ﴾ اور آئے یوسف کے بھائی اپنے باپ کے پاس شام کو روتے ہوئے، یہ رونا مکر کا تھا، یعقوب علیہ السلام کو وہ اپنا سچا ہونا بتانا چاہتے ہیں۔ غرضیکہ حضرت اُبیؓ بن کعب رضی اللہ عنہ کا یہ رونا خوشی کی وجہ سے تھا۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی فضیلت

[حدیث: ۱۳۱۸] "...... أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ......، إِنَّ اللهَ قَدْ بَرَّأَهَا مِنْ ذٰلِكَ..... (يَعْنِي أَسْمَاءَ بِنْتَ أَبِي عُمَيْسٍ امْرَأَةَ أَبِي بَكْرٍ)۔"

(صحیح مسلم ج:۱۱ ص:۱۴۸، حدیث نمبر: ۴۰۳۹، بَاب تَحْرِيمِ الْخَلْوَةِ بِالْأَجْنَبِيَّةِ وَالدُّخُولِ عَلَيْهَا)

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے پاک کیا ہے (یہ حدیث حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمائی جو حضرت

ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ہیں۔"

تشریح: اس حدیث میں بھی ایک قصہ آیا ہے، قصہ یہ ہے کہ ابھی پردے کا حکم نہیں آیا تھا، اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا بڑی پاکباز عورت تھیں، یہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ہیں، کچھ لوگ آ کر گھر میں بیٹھ گئے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اس پر غیرت آئی اور بُرا معلوم ہوا، اس موقع پر فرمایا: إِنَّ اللهَ قَدْ بَرَّأَهَا مِنْ ذٰلِكَ اللہ تعالیٰ نے اس عورت کو اس ناپاک قسم کے کاموں سے پاک دامن قرار دیا ہے، اس لئے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

یہ بات بھی عجیب ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی بھی پاک دامنی بھی اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمائی اور ان کی بیوی کی پاک دامنی بھی ذکر فرمائی، دونوں طرف سے اُصولاً و فروعاً۔

"فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے"

[حدیث: ۱۳۱۹] "......لَقِيَهُ الْمِسْوَرُ بْنُ مَخْرَمَةَ فَقَالَ لَهُ..........، إِنَّ فَاطِمَةَ مِنِّي وَأَنَا أَتَخَوَّفُ أَنْ تُفْتَنَ فِي دِينِهَا،........وَإِنِّي لَسْتُ أُحَرِّمُ حَلَالًا وَلَا أُحِلُّ حَرَامًا وَلٰكِنْ وَاللهِ لَاتَجْتَمِعُ بِنْتُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبِنْتُ عَدُوِّ اللهِ أَبَدًا۔"

(صحیح بخاری ج:۱۰، ص:۳۵۱، حدیث نمبر:۲۸۷۹، بَابُ مَا ذُكِرَ مِنْ دِرْعِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ......)

ترجمہ: "حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک فاطمہ میرا ٹکڑا ہے اور بے شک میں اندیشہ کرتا ہوں کہ وہ اپنے دین کے معاملے میں فتنے میں مبتلا ہو جائے اور بے شک میں حرام نہیں کرتا کسی حلال کو اور حلال نہیں کرتا کسی حرام کو لیکن اللہ کی قسم! اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دُشمن کی بیٹی دونوں کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔"

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اپنے دین کے معاملے میں کسی فتنے میں مبتلا نہ ہو جائے، میں کسی حلال کو حرام قرار نہیں دیتا اور نہ کسی حرام کو حلال قرار دیتا ہوں لیکن اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔"

اس کا قصہ یہ ہوا تھا کہ حضرت امیر المؤمنین علی کرّم اللہ وجہہ نے ارادہ کیا تھا ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا، وہ مسلمان ہو گئیں تھیں جیسا کہ ابو جہل کے صاحبزادہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بھی مسلمان ہو گئے تھے، ان کا نام درۃ تھا، درۃ بنت ابی جہل، درۃ کے معنی موتی کے ہیں، عورتوں کو طبعاً دوسرا نکاح ناگوار ہوتا ہے،

تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس ناگواری کا اظہار کیا کہ علی دوسری شادی کرنے جارہے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے اور خطبہ ارشاد فرمایا، اس کے مختلف ٹکڑے مختلف احادیث میں آئے ہیں، فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے، یَرِیبُنِی مَا رَابَهَا اور جو چیز اس کے قلق اور اضطراب کا سبب ہو وہ میرے بھی قلق اور اضطراب کا موجب ہے اور مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اس نکاح کرنے کی وجہ سے فاطمہ اپنے دین کے معاملے میں فتنے میں مبتلا نہ ہو جائے۔

فتنے میں مبتلا ہونا یہ کہ خدانخواستہ اپنے شوہر کی نافرمانی کرے یا یہ کہ وہ سوکن جو آرہی ہے اس کی کوئی بُرائی یا غیبت کرے، بہر حال کوئی ایسا کام کرے جس کی وجہ سے اس کے دین کو نقصان پہنچے اس کا مجھے اندیشہ ہے۔

یہاں اس حدیث میں وہ فقرہ ذکر نہیں کیا وہ دوسری حدیث میں ہے، یہاں اتنا ذکر کیا کہ میں کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال قرار نہیں دیتا، اگر علی کو ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کرنا ہے تو میری بیٹی کو طلاق دیدے، اللہ کی قسم! رسول اللہ کی بیٹی اور عدو اللہ کی بیٹی دونوں ایک گھر میں جمع نہیں ہو سکتیں۔

یہ حدیث عجیب وغریب حقائق ومسائل پر مشتمل ہے، سبحان اللہ! ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ تتمہ اس کا یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا تھا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی اور ناخوشی کا علم ہوا تو ظاہر ہے کہ حضرت علی یہ کام کر ہی نہیں سکتے تھے، کام کرنا تو کجا اس کا وسوسہ بھی نہیں لا سکتے، بعض لوگوں نے جیسے جدید دور کے خارجی ہیں اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مطاعن میں شمار کیا ہے یعنی یہ ان پر طعن کیا ہے لیکن یہ ان کی حماقت اور بے وقوفی ہے۔ میری کتاب ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' کی پہلی جلد میں ایک رسالہ شامل ہے جس کا نام میں نے رکھا تھا: ''حضرت علی اور حضرت عباس کے بارے میں چند اشکالات کا جواب'' وہ پورا رسالہ بہت زیادہ اہمیت کا ہے، حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں ان لوگوں نے جو شبہات اُٹھائے ہیں الحمد للہ اس کا جواب بہت عمدہ آیا ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے میں نے جن لوگوں کی تردید میں قلم اُٹھایا ہے یا ان کے شبہات کا جواب دیا ہے ان میں ایک یہ آدمی تھا جس نے شبہات پیش کئے اور نہایت تیز اور تند، میرا مزاج ذرا گرم ہے، میں نے بھی جواب ترکی بہ ترکی دیا، اس کا پھر خط آیا اس کا پھر جواب دیا، پھر اس کا تیسرا خط آیا کہ اللہ کا شکر ہے میرے اِشکالات دُور ہو گئے اور میں زبانی بھی حاضر ہو کر شکریہ ادا کروں گا، چنانچہ وہ صاحب آئے، غیر مقلد قسم کا آدمی تھا، پڑھا لکھا قسم کا آدمی تھا، لیکن الحمد للہ انہوں نے بہت شکریہ ادا کیا، مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ یہ حق پرست آدمی تھا، شبہات دُور ہونے کے بعد اِقرار کر لیا۔

خیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں کوئی تنقیص نہیں ہے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب اس کی

اطلاع ملی تو توبہ کر لی، اب کبھی وسوسہ بھی نہیں آئے گا، تو یہ تو ان کے انقیاد علی الحق اور اللہ اور اللہ کے رسول کے لئے اپنی خواہش کو مٹا دینے کی علامت ہے اور اس سے ان کے اعلیٰ درجے کی منقبت ثابت ہوتی ہے۔ اور اس حدیث سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت اور منقبت بھی ثابت ہوتی ہے، جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی کہ آپ کو چار سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت تھی، اسی طرح حضرت فاطمہ کی خصوصیت تھی کہ ان کی موجودگی میں ان کے شوہر کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں تھی، ان کے وصال کے بعد جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چھ مہینے بعد ہوا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے متعدد شادیاں کیں اور ایک ایک وقت میں ان کے نکاح میں کئی بیویاں رہیں لیکن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں بس وہی تھیں۔

اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ طبعی اُمور میں بعض باتیں ایسی صادر ہو جانا کاملین سے بھی ہو جاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے وہ چیز قلق میں ڈالتی ہے جو فاطمہ کو قلق میں ڈالتی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اپنے دین کے معاملے میں فتنے میں مبتلا ہو جائے۔ کچھ طبعی اُمور ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی ان میں کسی قدر معذور سمجھا جاتا ہے، جیسے کہ سوکنیں آپس میں لڑتی ہیں یہ تھوڑی سی کمزوری ہے ان کی اور تھوڑی سے معذور بھی ہوتی ہیں، لیکن حدودِ شرعیہ سے تجاوز نہ کریں۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں: بہت دین دار خاتون تھیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا حضرت عائشہ کے بارے میں جب منافقین نے ان پر تہمت لگائی تھی کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ تو یہ موقع تو سوکن کو نظر سے گرانے کا ہوتا ہے، کہنے لگیں: یارسول اللہ! یہ ہوسکتا ہے کہ آپ کا بستر ناپاک ہو جائے یہ ممکن ہے؟ نعوذ باللہ۔ یہ سوکن اپنی سوکن کے بارے میں کہہ رہی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ ان کی دین داری کی بات تھی، باوجود اس کے کہ وہ میری سب سے بڑی رقیب تھیں لیکن انہوں نے کوئی ایسا کلمہ نہیں بولا، یہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا تھیں جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "هِیَ كَانَتْ تُسَامِیْنِیْ مِنْ صَوَاحِبِی" میری تمام سوکنوں میں میرا مقابلہ یہی کرتی تھیں ایک اکیلی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کی تھیں لیکن اس وقت کوئی کلمہ نہیں کہا، تو یہ بہت اُونچی دین داری کی بات ہے کہ آدمی یہاں تک اس کی اصلاح ہو جائے۔

اور یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس کے کہ کائنات میں آپ کی کوئی مثال نہیں ہے لیکن اولاد کی محبت آپ کے قلب میں یہاں تک ہے، تعلق مع اللہ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آدمی ان محبتوں سے فارغ ہو جائے بلکہ یہ معنی ہیں کہ اللہ ان تمام محبتوں پر غالب ہو جائے۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک رسالہ ہے: "انتباہ المؤمنین"، ایک شیعہ نے سوال کیا تھا، حضرت نے اس کا جواب دیا، تیس سال پہلے یہ رسالہ مجھے ملا تھا لیکن گم ہو گیا، جب مجھے ملا تھا تو میرا جی چاہا کہ

اس کا ترجمہ کروں، فارسی رسالہ ہے، تیس سال بعد وہ رسالہ مجھے ملا پھر میں نے اس کا ترجمہ کیا، حضرت کے فارسی متن کے ساتھ میرا وہ رسالہ چھپ چکا ہے، اس میں عجیب وغریب علوم بیان فرمائے ہیں، ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انبیاء اور اولیاء اولاد کی محبت سے فارغ ہوتے ہیں، یہ خیال غلط ہے بلکہ ان میں یہ محبت زیادہ ہوتی ہے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی دلیل یہ بیان فرمائی کہ جس چیز کا مقابلہ ہی نہ ہو وہاں کیا اجر ملے گا؟ ایک طرف اولاد ازواج کی محبت اعلیٰ پیمانے پر ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی محبت ہے لیکن جب مقابلے کا وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی محبت غالب ہوتی ہے باقی سب پس پشت۔ فرماتے ہیں کہ ان کو اتنا ہی اجر زیادہ ملے گا، جتنی محبت زیادہ ہوگی اتنا ہی اجر بھی زیادہ ملے گا۔

اب یہ دیکھو حضرت فاطمہ کی بے چینی یا پریشانی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برداشت نہیں کررہے اور اس کے باوجود فرماتے ہیں کہ میں کسی حلال کو حرام نہیں کہتا کسی حرام کو حلال نہیں کہتا، علی کو حق ہے کہ دوسرا نکاح کرے لیکن اس سے فاطمہ کو رنج پہنچے گا اور اس سے ان کے دین میں خرابی کا مجھے اندیشہ ہے، لہٰذا بہتر ہوگا اگر علی ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو میری بیٹی کو طلاق دیدے کوئی مضائقہ نہیں۔

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ کسی شخص کا اپنی بیٹی کے معاملے میں بے چین ہونا یہ سنت کے خلاف نہیں ہے، اگر اس کی بیٹی کو اس کے گھر میں تکلیف ہو تو حتی الوسع اس کی حمایت وہمدردی کرنا عین سنت نبوی ہے لیکن یہ بات یاد رہے کہ آج کل لوگ بیٹی یا بہن کی حمایت میں ان کا گھر برباد کردیتے ہیں، وہی غالب کے بقول:

دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

نادان کی دوستی کا کردار ادا کرتے ہیں، بطور خاص بچیوں کی مائیں تو اچھی طرح پڑھاتی ہیں، ان بوڑھیوں کی رائے ویسے بھی احمقانہ ہوتی ہے، بچی تمہاری اپنے گھر میں خوش وخرم ہو تمہیں اور کیا چاہئے؟ لیکن یہ اس کو اور پٹیاں پڑھاتی ہیں، اگر کبھی گھر میں کوئی رنج کی بات ہو بھی جائے تو اس کو اطمینان اور تسلی دی جائے تاکہ اس کا گھر آباد رہے، بھئی نئی چیز آتی ہے تو چبھتی ہے آہستہ آہستہ سیٹ ہو جاتی ہے، جب لڑکی پرائے گھر میں گئی ہے تو وہ اس کا اپنا گھر ہے لیکن ہے پرایا ہی، چاہے اپنے عزیز ہی ہوں لیکن اس کو اس گھر میں سیٹ ہونے میں وقت لگے گا، کبھی کشاکشی بھی ہوسکتی ہے، کبھی تھوڑی بہت ناموافقتی بھی ہوسکتی ہے، کبھی نندوں کے ساتھ، کبھی ساس کے ساتھ اختلاف ہوسکتا ہے، تو عقل کی بات یہ ہے کہ اس کو صبر وتحمل سے کام لینے کو کہا جائے کہ بیٹی! سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ، اطمینان سے رہو صبر وتحمل سے کام لو لیکن یہاں گنگا اُلٹی بہتی ہے۔

ایک بزرگ کا ارشاد ہے، وہ فرماتے ہیں: جب تیری بیٹی اور داماد کا اختلاف ہو اور تیری بہن اور بہنوئی کا اختلاف ہو تو کبھی اپنی بیٹی اور بہن کی حمایت نہ کرنا، ورنہ تو ان کے دین کو برباد کردے گا، میں کہتا ہوں دین کو

نہیں دنیا کو بھی برباد کردے گا، بیٹی کی حمایت میں داماد سے لڑتے ہیں، بیٹی کو بھی وہاں بسانا ہے، ماشاء اللہ۔

نکالا چاہتا ہے کام طعنوں سے تو اے غالب
تیرے بے مہر کہنے پر بھلا وہ مہرباں کیوں ہو؟

جس گھر میں تم اپنی بیٹی کو بسانا چاہتے ہو اس سے لڑائی کرتے ہو، عقل کی بات ہے؟ ذرا سا سر نیچا کرلو تواضع اختیار کرلو، وہ بھی تمہارا بچّہ ہے اس کو شرافت متانت سے سمجھاؤ، ان شاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔

تو میں کہتا ہوں کہ بیٹی یا بہن کی حمایت ایک فطری چیز ہے سنّت نبوی ہے لیکن اس کا صحیح طریقہ اختیار کرنا چاہئے، جہاں تمہیں اندازہ ہو کہ ذرا دبانے سے دبے گا اور بات کو سمجھے گا تو ٹھیک ہے، بزرگ لوگ کبھی گھور کر اور کبھی سرزنش سے ایسی بات کر لیتے ہیں، کوئی ایسی بات نہیں لیکن جہاں اندیشہ بگڑنے کا ہو وہاں یہ طریقہ صحیح نہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت

[حدیث: ۱۳۲۰] "عَنِ ابْنِ عُمَرَ.......، إِنَّ لَکَ أَجْرَ رَجُلٍ مِمَّنْ شَهِدَ بَدْرًا وَسَهْمَهُ (قَالَ لِعُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ)۔"

(صحیح بخاری ج: ۱۰، ص: ۳۷۹، حدیث نمبر: ۲۸۹۸، بَاب إِذَا بَعَثَ الْإِمَامُ رَسُولًا فِي حَاجَةٍ أَوْ أَمَرَهُ بِالْمُقَامِ.)

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن عفان سے فرمایا کہ: بے شک تیرے لئے اجر ہے ایک آدمی کا جو جنگ بدر میں شریک ہوا ہو اور اس کا حصہ بھی۔"

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ جنگ بدر کے لئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو آپ کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا جو حضرت عثمان کے نکاح میں تھیں بیمار تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مدینہ میں ان کی تیمارداری کے لئے چھوڑ گئے اور ان سے یہ ارشاد فرمایا: تم مدینہ میں رہو ان کی تیمارداری کرو، تمہیں شرکائے بدر کا اجر بھی ملے گا اور ان کی غنیمت کا حصہ بھی ملے گا، جس دن حضرت اُسامہ بن زید جنگ بدر کی فتح کی خوشخبری لے کر مدینہ طیبہ تشریف لائے اس دن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ان کی تدفین سے فارغ ہو کر ہاتھ جھاڑ رہے تھے۔

یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خصوصیت ہے کہ باوجودیکہ وہ جنگ بدر میں شریک نہیں ہوئے لیکن ان کا شمار بدری صحابہ میں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تمہیں جنگ بدر کی شرکت کا ثواب بھی ملے گا اجر بھی ملے گا اور ساتھ کے ساتھ وہاں سے جو غنیمت اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے اس کا بھی پورا پورا حصہ ملے گا،

چنانچہ ان کو پورا حصہ بھی دیا گیا اور اجر بھی اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے۔

اس اُمّت کا سب سے بڑا امین

[حدیث: ۱۳۲۱] "..... أَنَسِ بْنُ مَالِكٍ...... إِنَّ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَمِينًا وَإِنَّ أَمِينَنَا أَيَّتُهَا الْأُمَّةُ أَبُو عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ۔"

(صحیح بخاری ج:۱۲، ص:۸۵، حدیث نمبر:۳۴۶۱، باب مَنَاقِبِ أَبِي عُبَيْدَةَ بْنِ الْجَرَّاحِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ)

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک ہر اُمّت کا ایک امین ہوتا ہے اور بے شک ہمارا امین یعنی اُمت کا ابوعبیدہ بن جراح ہے۔''

تشریح: اس حدیث میں حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور بزرگی بیان کی گئی ہے، حضرت ابوعبیدہ بن جراح کا شمار عشرہ مبشرہ میں سے ہے یعنی وہ دس صحابی جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیک وقت جنّت کی بشارت عطا فرمائی: ''أَبُو بَكْرٍ فِي الْجَنَّةِ وَعُمَرُ فِي الْجَنَّةِ وَعُثْمَانُ فِي الْجَنَّةِ وَعَلِيٌّ فِي الْجَنَّةِ وَطَلْحَةُ فِي الْجَنَّةِ وَالزُّبَيْرُ فِي الْجَنَّةِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ فِي الْجَنَّةِ وَسَعْدٌ فِي الْجَنَّةِ وَسَعِيدٌ فِي الْجَنَّةِ وَأَبُو عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ فِي الْجَنَّةِ" (ترمذی ۱۳/ ۳۵۹، ۴۱۱۲)۔

اور آخر میں یہ حدیث نقل کرنے والے صحابی حضرت سعید بن زید فرماتے ہیں اگر میں چاہوں تو دسویں کا نام بھی لے سکتا ہوں، کسی نے کہا: لے لیجئے! فرمایا: "سعید بن زید فی الجنة" یہ سعید بن زید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی اور حضرت فاطمہ بن خطاب کے شوہر ہیں۔ تو ان دس صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیک وقت جنّت کی بشارت سنائی، اس لئے ان کو ''عشرہ مبشرہ'' کہا جاتا ہے، اس حدیث میں فرمایا: ہر اُمت کا ایک امین ہوتا ہے اور اس اُمّت کا ہماری اُمّت کا امین ابوعبیدہ بن جراح ہے، اس اُمّت کا سب سے بڑا امین۔

ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک وفد آیا، وہ کہنے لگے: ہماری تعلیم کے لئے اور ہمارے درمیان فیصلے کرنے کے لئے کسی آدمی کو ہمارے ساتھ کر دیں اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ کسی امین آدمی کو بھیج دیجئے، فرمایا: سَأَبْعَثُ مَعَكُمْ رَجُلًا أَمِينًا حَقَّ أَمِينٍ میں تمہارے ساتھ بھیجوں گا امین کو کامل ترین امین کہ اس سے بڑھ کر امین اس اُمّت میں نہیں (مسند احمد بن حنبل ۸/ ۷۰، ۳۷۳۵، ۲، ابن ماجہ ۱/ ۱۵۳، ۱۳۲)۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ملک شام میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مقرر کئے ہوئے سپہ سالار تھے، حضرت ابوبکر کا وصال ہوا اور حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو سب سے پہلا حکم یہ جاری کیا کہ خالد بن ولید کو معزول کیا جاتا ہے اور ان کی جگہ ابوعبیدہ بن جراح کو مقرر کیا جاتا ہے، جو شخص پیغام لے کر آیا وہ حضرت

ابوعبیدہ کے پاس آیا، حضرت ابوعبیدہ نے وہ خط حضرت خالد کو دکھایا امیر المومنین کا، وہ بہت متواضع اور بہت نرم مزاج آدمی تھے، فرمانے لگے: میں تو تمہارے ماتحت کام کر رہا ہوں، امیر المومنین نے یہ حکم بھیج دیا ہے تو میرا خیال ہے کہ میں آپ کو ہی امیر بنائے رکھتا ہوں، میں آپ کے ماتحت ہی ٹھیک ہوں، حضرت خالد بن ولید نے فرمایا: جب امیر المومنین نے آپ کو امیر بنادیا ہے تو اس کے بعد تو کوئی جواز نہیں رہتا، اس لئے آج سے ہمارے امیر آپ ہیں، باقی میری کارکردگی میں ایک سرمو بھی فرق نہیں آئے گا، ایک بال برابر بھی فرق نہیں آئے گا، جتنی قوت اور نشاط کے ساتھ میں امیر ہونے کی حالت میں کام کرتا تھا اسی نشاط اور قوت کے ساتھ میں مامور ہونے کی حالت میں بھی کام کروں گا لیکن چونکہ جنگ جاری ہے اس لئے ابھی آپ مناسب سمجھیں تو اس کا چرچا نہ کیا جائے، اعلان عام نہ کیا جائے تاکہ دشمن کوئی ایسی بات محسوس نہ کرے اور یہ ہماری کسی قسم کی کمزوری کا باعث نہ ہو، یہ معرکہ ختم ہو جائے تو پھر ٹھیک ہے پھر بعد میں اعلان کر دیجئے گا۔

چنانچہ یہی ہوا بھی، اس کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جتنی جنگیں لڑی ہیں وہ ان کی ماتحتی میں لڑی ہیں، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ملک شام میں تشریف لے گئے تو فرمایا: ابوعبیدہ! تم نے مجھے اپنا ہیڈ کوارٹر نہیں دکھایا، کہنے لگے: دیکھ کر کیا کریں گے؟ فرمایا: دکھاؤ تو! کہا: چلئے! آپ حاکم ہیں، تشریف لے گئے، دیکھا کہ ایک چھوٹی سی کٹیا تھی، ایک طرف لوٹا رکھا ہوا تھا، ایک طرف مصلیٰ رکھا ہوا تھا، ایک پیالہ رکھا ہوا تھا جس میں روٹی کے سوکھے ٹکڑے بھگوئے ہوئے تھے، کہا: امیر المومنین! ضیافت حاضر ہے تناول فرمائیں، کہنے لگے: ابوعبیدہ! تو اتنی بڑی ولایت کا حاکم ہے اور تجھ میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا! ان کی حالت کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہیں رو پڑے، یہ مسلمانوں کا سپہ سالار اعظم تھا ابوعبیدہ بن جراح، یونہی نہیں فرمادیا تھا کہ اس اُمت کا سب سے بڑا امین ابوعبیدہ بن جراح ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں طاعون کی بیماری پھیلی، لوگ کثرت سے مر رہے تھے، اس کا نام ''طاعون جارف'' ہے جھاڑو پھیرنے والا طاعون، ایک دن فرمانے لگے کہ: اے اللہ! سارے لوگ مر رہے ہیں، ابوعبیدہ کا ابھی وقت نہیں آیا، ٹھیک ٹھاک تھے، رات کو طاعون کی پھنسی نکلی اگلے دن قبر میں تھے، یہ ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ ہیں۔

شیعوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں ابوبکر ان کے بعد عمر اور ان کے بعد ابوعبیدہ، رضی اللہ عنہم۔ سب سے بدتر آدمی ہیں، یہ حضرت عمر کا نام تو بعد میں آتا ہے ابوعبیدہ کا پہلے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں اس اُمت کا سب سے بڑا امین ابوعبیدہ ہے اور یہ کہتے ہیں کہ سب سے بڑا نعوذ باللہ اب میں کیا کہوں؟ قسمت پھوٹی ہوئی ہو تو آدمی کیا کرسکتا ہے؟

میرا حواری

[حدیث:۱۳۲۲] "عَنْ جَابِرٍ......، إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيًّا وَحَوَارِيَّ الزُّبَيْرُ۔"

(صحیح بخاری ج:۹،ص: ۴۴۳، حدیث نمبر: ۲۶۳۴،بَاب فَضْلِ الطَّلِيعَةِ)

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک ہر نبی کا ایک خاص مددگار ہوتا ہے اور میرا خاص مددگار زبیر ہے۔''

تشریح: اس حدیث شریف میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی منقبت اور فضیلت بیان فرمائی ہے، یہ حضرت زبیر بھی عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، جنگ جمل میں شہید ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کے لڑکے ہیں، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے داماد ہیں، حضرت اسماء بن ابی بکر ان کے گھر میں تھیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی بہن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہسواروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جاں نثاری کے جوہر دکھائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمایا کہ: ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے جیسے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاص خاص ساتھیوں کو ''حواری'' کہا جاتا ہے، ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری جنت میں زبیر ہے اور یہ ارشاد فرمایا تھا جنگ خندق کے موقع پر جبکہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو ایک خاص مہم پر بھیجا گیا تھا اور وہ وہاں سے سرخ رو ہو کر تشریف لائے تھے۔

ان کے دوسرے رفیق حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، ان کا ہاتھ ہی شل تھا، دایاں ہاتھ اُٹھتا نہیں تھا، یہ بھی عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جنگ خندق میں جب تیروں کی بارش ہو رہی تھی تو یہ اس ہاتھ پر اس کو روک رہے تھے اور تیروں کی بارش سے ان کا ہاتھ شل ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا تھا کہ آج کا دن طلحہ کے حصے میں چلا گیا۔

اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کا مقام

[حدیث:۱۳۲۳] "......أَنَّ عَائِشَةَ.....، إِنِّي ذَاكِرٌ لَكِ أَمْرًا فَلَا عَلَيْكِ أَنْ لَا تَسْتَعْجِلِي حَتَّى تَسْتَأْمِرِي أَبَوَيْكِ.......قَالَهُ لَهَا۔"

(صحیح بخاری ج:۱۴،ص:۴۶۷، حدیث نمبر:۴۴۱۲،بَاب قَوْلُهُ {يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ.)

ترجمہ: ''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا: میں تجھ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں سو تجھ کو اس کا جواب دینے میں جلدی مناسب نہیں یہاں تک کہ تو اپنے ماں باپ سے صلاح لے لے۔

تشریح: اس حدیث میں مشہور قصہ ہے جو پہلے بھی گزر چکا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ازواج

مطہرات سے ناراض ہو گئے تھے اور ناراضگی کی وجہ یہ تھی کہ آخری دنوں میں اُمت کے گھروں میں خوش حالی ہو گئی تھی مگر آنحضرت ﷺ کے گھروں کا وہی حال تھا، تو سب نے مل کر مشورہ کیا کہ آنحضرت ﷺ سے نان ونفقہ بڑھانے کا مطالبہ کرنا چاہئے، کسی نے کہا: ''میں فلاں چیز مانگوں گی''، کسی نے کہا: ''میں فلاں چیز مانگوں گی''، آنحضرت ﷺ گھر تشریف لائے تو انہوں نے مطالبات شروع کر دیئے، آنحضرت ﷺ نے کچھ نہیں فرمایا لیکن ناراض ہو کر اتنا فرمایا: اللہ کی قسم! ایک مہینے تک تمہارے پاس نہیں آؤں گا اور بالا خانے میں الگ تشریف لے گئے، ایک مہینہ وہاں گزارہ۔ یہ لمبا قصہ ہے جو بخاری شریف میں مذکور ہے، ایک مہینے بعد اکیسویں پارے کے آخر اور بائیسویں پارے کے شروع کی آیات کا پورا رکوع نازل ہوا اور آنحضرت ﷺ ان آیات شریفہ کو سنانے کے لئے تشریف لائے، ان آیتوں میں فرمایا گیا تھا:

﴿يَآيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا﴾ (الأحزاب)

ترجمہ: ''اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دنیا اور دنیا کی زندگی کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں رخصت کر دیتا ہوں، فارغ کر دیتا ہوں اور خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دیتا ہوں۔''

﴿وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (الأحزاب)

ترجمہ: ''اور اگر تم اللہ کو، اس کے رسول کو اور آخرت کے گھر کو چاہتی ہو تو اللہ تعالیٰ نے تم میں سے نیک کاروں کے لئے بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔''

مطلب یہ کہ پھر دنیا میں تمہارا کوئی استحقاق نہیں، جو دیدے وہ لے لو، نہ دیں تو مطالبہ نہیں کرو، تمہیں آخرت میں ملے گا۔ آگے پورے رکوع میں امہات المومنین سے لمبی بات ہوئی ہے، ان آیات کو لے کر آنحضرت ﷺ نیچے تشریف لائے، کیونکہ حکم تھا کہ اپنی بیویوں سے کہئے، تو سب سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے، اس کا تذکرہ اس حدیث میں ہے، آپ ﷺ کو دیکھتے ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ: حضور! آپ نے تو ایک مہینے کی قسم کھائی تھی آج تو اُنتیس دن ہوئے ہیں، آنحضرت ﷺ نے مسکرا کر فرمایا کہ: مہینہ کبھی اُنتیس کا بھی تو ہوتا ہے اور پھر فرمایا کہ: تمہیں کیسے پتا کہ اُنتیس دن ہوئے ہیں؟ فرمانے لگیں کہ: ایک ایک دن گن کر گزارا ہے۔

اس کے بعد اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اے عائشہ! میں تمہارے سامنے ایک بات رکھنا چاہتا ہوں، اس کے جواب دینے میں جلدی سے کام نہ لینا، جب تک کہ تم اپنے والدین سے مشورہ نہ کرلو

اس کا جواب نہ دینا، میں تم سے سوال کرنا چاہتا ہوں اس کا جواب دینے میں جلد بازی نہ کرنا جب تک کہ والدین سے مشورہ نہ کرو۔ آنحضرت ﷺ کا خیال تھا کہ چونکہ یہ نوعمر ہیں اور نوعمر لڑکیوں کو کھانے پہننے کا شوق ہوتا ہے، تو ایسا نہ ہو کہ یہ سن کر کہ تمہیں یہاں کچھ نہیں ملے گا، تمہارا آئندہ کوئی مطالبہ نہ ہوگا، خدانخواستہ یوں نہ کہہ دیں کہ پھر ہم سے بھی گزارہ نہیں ہوتا اس تنگی میں، ساری دنیا کے لئے سب کچھ ہے ہمارے لئے کچھ نہیں۔

کیا کہا میں نے؟ ساری دنیا اس بارگاہ سے لے کر جاتی ہے اور آج تک لے کر جارہی ہے، کسی کی کوئی حاجت ہو جا کر وہاں عرض کرتا ہے اللہ تعالیٰ پوری کر دیتے ہیں، ساری دنیا کو سب کچھ مل رہا ہے، نہیں مل رہا تو گھر والوں کو نہیں مل رہا، ہم سے یہ نہیں ہوتا، چونکہ ابھی نوعمر ہیں کہیں ایسا نہ کہہ دیں اور یوں خیال فرمایا کہ ان کے والد صدیق اکبر وہ اپنی بچی کو کبھی یہ مشورہ نہیں دیں گے کہ تم قطع تعلق کرلو، آنحضرت ﷺ نے جب یہ بات فرمائی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: فرمادیجئے! اس پر آپ ﷺ نے یہ دو آیتیں اور پورا رکوع پڑھ سنایا، یہ سن کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: أَفِيكَ يَا رَسُولَ اللهِ! أَسْتَشِيرُ أَبَوَيَّ؟ یارسول اللہ! کیا میں آپ کے مقابلے میں اپنے والدین سے مشورہ کرنے جاؤں گی؟ بَلْ أَخْتَارُ اللهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الآخِرَةَ (مسلم ۴/۱۸۷، ۳۷۶۳) بلکہ میں اللہ کو اور اس کے رسول کو اور دار آخرت کو اختیار کرتی ہوں، دنیا کے تمام مطالبات سے دستبردار۔

آنحضرت ﷺ اس جواب سے بہت خوش ہوئے، اب باقی سب کے پاس جانا تھا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: یارسول اللہ! ایک درخواست ہے کہ کسی بیوی کو میرا جواب نہ بتایئے تاکہ کچھ چھانٹی ہو سکے تو اچھا ہے، نو دن کے بعد باری آتی ہے، ایک دو بھی کم ہوگئیں تو سات آٹھ دن بعد باری آجایا کرے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "إِنَّمَا بُعِثْتُ مُيَسِّراً وَلَا بُعِثْتُ مُعَسِّراً" (مسند احمد بن حنبل، کنز العمال، سنن الکبریٰ للبیہقی) مجھے اللہ تعالیٰ نے آسانی کرنے والا بنایا ہے، مشقت میں ڈالنے والا بنا کر نہیں بھیجا، میں اپنے طور پر تو کسی کو نہیں بتاؤں گا لیکن اگر کوئی پوچھے گی کہ عائشہ نے کیا جواب دیا؟ تو اس کو بتادوں گا۔ فرمایا: پھر آپ کی خوشی!

چنانچہ وہاں سے اُٹھ کر ایک ایک بیوی کے پاس گئے اور ان سے تو یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں تھی کہ: "میں تم سے ایک بات ذکر کرنے والا ہوں اس کا جواب دینے میں جلدی نہ کرنا جب تک کہ تم اپنے والدین سے مشورہ نہ کرلو" کیونکہ وہ سب کی سب بڑی عمر کی تھیں، تو ایک ایک کے پاس گئے اور ان کو یہ آیات شریفہ سنائیں، ہر ایک نے پوچھا کہ: عائشہ نے کیا جواب دیا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: اس نے تو یہ جواب دیا ہے؟ بَلْ أَخْتَارُ اللهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الآخِرَةَ فرمانے لگیں کہ: یہی جواب ہمارا بھی ہے، اُمہات المومنین میں سے جس کے پاس بھی گئے اس نے یہی جواب دیا کہ جو جواب عائشہ نے دیا وہی ہمارا بھی ہے،

آئندہ کوئی مطالبہ نہیں۔

یہ آنحضرت ﷺ کی خصوصیت تھی اور آپ کے مرتبے کی عظمت تھی، عام طور پر بیویاں گھروں میں مطالبات کیا کرتی ہیں لیکن آنحضرت ﷺ کو اس سے بھی فارغ کر دیا گیا، کسی کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں، اس کا نان ونفقہ کا کوئی مطالبہ ہی نہیں اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی دیا بھوکا نہیں رکھا، یہ سورۃ احزاب جو تقریباً چھ ہجری میں نازل ہوئی تھی اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ دنیا میں تقریباً چار یا پانچ سال حیات رہے، پھر کبھی کسی نے کوئی شکایت ہی نہیں کی اور پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں وظائف جاری کئے گئے تو اُمہات المومنین کا وظیفہ پانچ پانچ ہزار، یہ بدری صحابہ کا وظیفہ تھا اور اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں صحابہ کرام ہدایا بھیجتے تھے، ایک ایک وقت میں ایک ایک لاکھ کی رقم پیش کی گئی، روایت میں آتا ہے کہ ایک لاکھ کی رقم آپ کی خدمت میں پیش کی گئی اور آپ ان کو تقسیم کرنے بیٹھ گئیں، سارا کپڑا جھاڑ کر اُٹھیں، کچھ بھی نہیں چھوڑا، خادمہ نے کہا: آپ کا روزہ تھا شام کو افطاری کے لئے کچھ بچا لیتیں! فرمایا: پہلے یاد دلاتیں! اب کہنے کا کیا فائدہ؟ اب تو تقسیم کر چکی ہوں، اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پاک دلوں سے دنیا کو نکال دیا تھا، دنیا پھر ان کے پاس بھی آئی لیکن اس طرح آئی کہ ان کے دل پاک تھے، ان کے گھروں میں وہی کیفیت رہی۔

بلاشبہ آنحضرت ﷺ کے اہل خانہ کو اور اُمت کی ماؤں کو ایسا ہی ہونا چاہئے، انہی آیتوں میں اللہ تعالیٰ آگے چل کر فرماتے ہیں: ﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (الأحزاب:۳۲) اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں جیسی نہیں ہو؟ تمہاری شان کہاں عام عورتوں کی شان کہاں؟ کہاں عام عورتیں، کہاں تم نبی کے گھر کی عورتیں؟۔

مزاج شناسی

[حدیث:۱۳۲۴] ”عَنْ عَائِشَةَ... إِنِّي لَأَعْلَمُ إِذَا كُنْتِ عَنِّي رَاضِيَةً وَإِذَا كُنْتِ عَلَيَّ غَضْبَى، قَالَتْ: فَقُلْتُ: مِنْ أَيْنَ تَعْرِفُ ذٰلِكَ؟ فَقَالَ: أَمَّا إِذَا كُنْتِ عَنِّي رَاضِيَةً فَإِنَّكِ تَقُولِينَ: لَا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ، وَإِذَا كُنْتِ عَلَيَّ غَضْبَى قُلْتِ: لَا وَرَبِّ إِبْرَاهِيمَ، قَالَتْ: قُلْتُ: أَجَلْ وَاللهِ يَا رَسُولَ اللهِ! مَا أَهْجُرُ إِلَّا اسْمَكَ۔“

(صحیح بخاری ج:۱۶، ص:۴۵۰، حدیث نمبر:۴۸۲۷، باب غَيْرَةِ النِّسَاءِ وَوَجْدِهِنَّ)

ترجمہ: ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا: بے شک میں جان لیتا ہوں جب تو مجھ سے خوش ہوتی ہے اور جب تو مجھ سے

ناراض ہوتی ہے، میں نے کہا: آپ کیسے جان لیتے ہیں؟ فرمایا: جب تو مجھ سے خوش ہوتی ہے تو یوں کہا کرتی ہے: ''نہیں ربِّ محمد کی قسم!'' اور جب تو ناراض ہوتی ہے تو کہتی ہے: ''نہیں ربِّ ابراہیم کی قسم!'' میں نے کہا: جی ہاں! صحیح فرمارہے ہیں، اللہ کی قسم! میں نہیں چھوڑتی مگر آپ کے نام کو۔''

تشریح: اس حدیث کا مفہوم تو بالکل واضح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: جب تم خوش ہوتی ہو اور ناخوش ہوتی ہو تو میں دونوں حالتوں کا فرق معلوم کرلیتا ہوں، گو تم اپنی زبان سے اور اپنے کسی طرزِ عمل سے اس کا اظہار نہ بھی کرو، عرض کیا: آپ کیسے جان لیتے ہیں؟ ارشاد فرمایا: جب تو خوش ہوتی ہے تو بات کرتے ہوئے یہ کہتی ہے: لَا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ نہیں ایسا نہیں رب محمد کی قسم! اور جب تم ناخوش ہوتی ہو تو کہتی ہو لَا وَرَبِّ إِبْرَاهِيمَ نہیں ایسا نہیں رب ابراہیم کی قسم! اس وقت رب محمد نہیں کہتی بلکہ رب ابراہیم کہتی ہو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! آپ صحیح فرماتے ہیں لیکن بخدا صرف لفظوں میں آپ کا ذکر چھوڑتی ہوں، دل سے نہیں۔

یہاں سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ میاں بیوی کے درمیان کبھی خوشی ناخوشی بھی ہوجاتی ہے اور یہ چیز جائے تعجب نہیں، آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر کوئی صاحبِ کمال اور کوئی صاحب حسن و جمال اور کوئی محبوب نہیں ہوسکتا اور حضرات امہات المومنین سے بڑھ کر کوئی عاشق وشیدا اور کوئی وفادار وفرمانبردار نہیں ہوسکتا لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے طبعی امور درمیان میں آجاتے ہیں۔

میری طالب علمی کا زمانہ تھا، خیر المدارس ملتان میں میں پڑھتا تھا، تو ایک صاحب نے شکایت کی کہ میری بیوی میری فرمانبردار نہیں ہے، میں اس وقت غیر شادی شدہ تھا، میاں بیوی کا مجھے معلوم نہیں تھا، میں نے کہا: تمہاری بیوی تم جیسی انسان ہے، اس کا بھی وجود ہے، ہاتھ پیر آنکھیں، صرف اتنا ہوا کہ ﴿الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ﴾ (النساء:۳۴) کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے اور ان کو گھر کا حاکم بنادیا ہے، عورتوں کو ان کے ماتحت کیا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے بہت ہی عجیب وغریب ارشادات فرمائے ہیں عورت کی فرمابرداری کے بارے میں، یعنی عورت کو مرد کا فرمانبردار ہونا چاہئے، جو حکم دے اس کی تعمیل کرے، صرف اتنی بات پر کہ اللہ تعالیٰ نے تم جیسے انسان پر تم کو حاکم بنایا ہے اور اس کو تمہارا ماتحت کردیا ہے، تم یہ چاہتے ہو کہ ایسی فرمانبرداری کرے کہ زندگی بھر تمہارے خلافِ مزاج کوئی بات ہی پیش نہ آئے اور تم چشم بد دُور بندے ہو اللہ تعالیٰ کے، نہ تم میں اور اللہ میں کوئی مماثلت، نہ تم کو اللہ کے مقابلے میں کوئی قدرت واختیار، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم بھی اللہ تعالیٰ کی ایسی فرمانبرداری کرتے ہو؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ: نہیں! تو گویا تم یہ چاہتے ہو کہ میری بیوی اتنی فرمانبردار ہو اور خود بندہ اپنے خدا کا فرمانبردار نہیں ہوتا،

یہ چاہتے ہو کہ بڑی خدائی تمہاری ہو اور چھوٹی خدائی اللہ تعالیٰ کی ہو، اللہ کے بندے تو اس کی نافرمانی کر لیں لیکن تمہاری خدائی میں نافرمانی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کو میری اس بات سے بڑا نفع ہوا، میں نے اس کو سمجھایا کہ غلطیاں ہو جاتی ہیں، آخر وہ بھی تم جیسی انسان ہے اس میں بھی اللہ نے غصہ رکھا ہے، کبھی ایسا بھی ہوگا کہ تمہاری کسی بات سے اس کو آزردگی ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں جان لیتا ہوں کہ جب تو مجھ سے ناراض ہوتی اور جب تو مجھ سے خوش ہوتی ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ زندگی کے تقلبات ہیں، بیوی کبھی گھر میں ناخوش بھی ہو جاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اُمہات المؤمنین کا یہ کمال ہے کہ اگر بیوی ناخوش ہو تو ناخوشی کا کوئی کلمہ بولے، تیور چڑھائے، منہ بنائے لیکن یہ نہیں کیا، اپنی کسی بات سے بھی ناخوشی کا اظہار نہیں ہونے دیتی تھیں، اتنی نازک مزاجی ان میں بھی ہے، باوجود اس کے کہ کبھی فطری طور پر کوئی ناخوشی کی کوئی بات بھی ہو جاتی ہے لیکن اپنی ناراضگی کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتیں، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم چاہے نہ بتاؤ میں پہچان لیتا ہوں، تم چاہے اظہار نہ کرو مجھے پتا لگ جاتا ہے، تو اس سے اُمہات المؤمنین کا درجہ کمال ثابت ہوتا ہے اور ان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کی رعایت رکھنا بھی ثابت ہوتا ہے۔

تیسری بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فراست کہ **لَا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ** اور **لَا وَرَبِّ إِبْرَاهِيمَ**! سے سمجھ لیتے ہیں کہ اب ناخوش ہے اور اب خوش ہے، جیسے ہم کہتے ہیں کہ نہیں ایسا نہیں، عربوں کا دستور تھا کہ ساتھ "**لَا وَاللهِ**" بھی کہتے ہیں، اب بھی عربوں کو سنیں، ہر بات میں "**لَا وَاللهِ**" گویا کہ یہ ان کا تکیہ کلام ہوتا ہے اور آپ نے سنا ہوگا کہ وہ "أَيْوَا" بھی کہتے ہیں، یہ اصل میں ہے: "أَيْ وَاللهِ!" جی ہاں اللہ کی قسم! وہ انہوں نے اس کا بھی مختصر کر کے "أَيْوَا" بنالیا، یہ تو عربوں کا تکیہ کلام تھا اور ہے، "نَعَمْ" کہتے تھے تو اس کو بھی مؤکد کرتے، "نہیں" کہتے تو اس کو بھی مؤکد کرتے "**لَا وَاللهِ**" لیکن اُمّ المؤمنین اس کے بجائے یہ کہا کرتیں: **لَا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ** تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے پہچان لیتے تھے۔ حضرت اُمّ المؤمنین رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ کی قسم صرف لفظوں میں آپ کا ذکر چھوڑتی ہوں دِل سے نہیں، دِل میں آپ کی محبت بیٹھی ہوئی ہے۔

اور یہاں سے ایک بات اور بھی معلوم ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دو قسم کا تھا، ایک تعلق اُمتی اور نبی کا ہے اور دوسرا تعلق میاں بیوی کا، وہ ایمانی اور عقلی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی ناخوش ہو ہی نہیں سکتی تھیں کیونکہ یہ تو کفر لازم آئے گا، یہ طبعی اُمور میں خوشی اور ناخوشی مراد ہے جس میں انسان معذور قرار دیا گیا ہے اور جن سے حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بھی بچایا نہیں جاتا، جیسا کہ حضرت وحشی رضی اللہ عنہ قاتلِ سیّدنا حمزہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، یہ تو اسلام کا اُصول ہے کہ اسلام لانے کے بعد پہلے کے تمام گناہ ساقط، جب اسلام میں داخل ہوئے تو اللہ نے گناہ تو معاف کر دیا، انہوں نے بیعت کر لی،

حضرت سیّد الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا قتل بھی معاف ہو گیا۔

مجھے اس پر ایک لطیفہ یاد آیا، ابوداؤد شریف میں ایک حدیث ہے کہ ایک صحابی نے دوسرے صحابی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تنقید کی کہ یارسول اللہ! یہ فلانے کا قاتل ہے، جاہلیت میں کسی مسلمان کو شہید کیا ہوگا، یارسول اللہ! اس کو نہ دیجئے۔ تو وہ بھی تیز تھے، کہنے لگے: یارسول اللہ! یہ شخص اس پر اعتراض کر رہا ہے کہ میرے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو جنت میں پہنچادیا اور پھر مجھے اسلام کی توفیق عطا فرما کر مہربانی فرمادی اور مجھے بھی جنت میں پہنچادیا، یہ اللہ کا بندہ اس پر اعتراض کرتا ہے۔

تو حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کے ذریعے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ تو جنت میں پہنچ گئے، سیّد الشہداء بن گئے اور جب وہ سچے پکے مسلمان بن گئے تو اب نہ سزا نہ عتاب لیکن ایک طبعی بات تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بیعت لی اور بیعت لینے کے بعد فرمایا: کیا تم سے یہ نہیں ہوسکتا کہ تم آئندہ میرے سامنے نہ آیا کرو، اس لئے کہ جب تمہیں دیکھتا ہوں چچا یاد آتے ہیں، کوئی عتاب نہیں لیکن یہ ایک طبعی چیز ہے، اب کوئی کہے کہ اس غریب کا گناہ معاف ہو گیا تو اس کو یہ کیوں کہتے ہیں؟ گناہ سب معاف، کوئی انتقام نہیں لیتے نہ دنیا میں نہ آخرت میں، نہ ڈانتے ہیں، نہ برا بھلا کہتے ہیں لیکن طبعی طور پر جو ایک اذیت پہنچتی ہے اس میں آدمی معذور ہے، وہ بھی عاشق صادق تھے، کہا یارسول اللہ! جیسے آپ چاہیں۔ پھر ساری عمر منہ نہیں دکھایا۔

تو میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ بحیثیت نبی کے اُمہات المؤمنین کبھی آپ سے ناراض ہو ہی نہیں سکتی تھیں لیکن بعض طبعی اُمور میں کبھی ایسا ہو جاتا، ایک سوکن کی تعریف کر دی تو قدرتی طور پر ناگوار گزرتی۔

بہرکیف! ان حضرات کے بہت بڑے درجے ہیں، اگر اس کائنات میں اُمہات المؤمنین سے افضل عورتیں ہوتیں تو اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرماتے، ان سے بہتر عورتیں عالمِ امکان میں نہیں تھیں، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر عالمِ امکان میں کوئی ہستی نہیں، اسی طرح ازواج مطہرات سے بڑھ کر عالمِ امکان میں عورتیں نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے بڑھ کر عالمِ امکان میں انسان نہیں انبیائے کرام کے بعد، ورنہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں پیدا نہ کرتے۔

مقامِ انبیاء

[حدیث: ۱۳۲۵] "عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ......، فَأَكُونُ أَوَّلَ مَنْ بُعِثَ فَإِذَا مُوسَى آخِذٌ بِالْعَرْشِ۔"

(صحیح بخاری ج:۲، ص:۷۴۳، حدیث نمبر:۶۸۷۷، باب {وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ} {وَهُوَ رَبُّ.....})

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

بے شک البتہ میں پہلا آدمی ہوں گا جو اپنا سر اُٹھائے گا صور پھونکنے کے بعد تو یکا یک دیکھوں گا کہ موسیٰ عرش سے لپٹے ہوئے کھڑے ہیں۔"

تشریح: اس حدیث میں ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے، ایک مسلمان اور ایک یہودی کا جھگڑا ہو گیا، مسلمان نے کہا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اخْتَارَ مُحَمَّداً فِی الْعَالَمِیْنَ" اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے محمد ﷺ کو تمام جہاں والوں پر چن لیا اور یہودی نے کہا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اخْتَارَ مُوْسٰی عَلَی الْعَالَمِیْنَ" اس اللہ کا شکر جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام جہاں والوں میں سے چن لیا۔

مسلمان کو غصہ آیا اس نے اس کو ایک تھپڑ مار دیا، وہ نبی کریم ﷺ کے پاس شکایت لے کر آیا اور کہا کہ: انہوں نے یہ کہا تھا میں نے ان کو یہ کہہ دیا، انہوں نے میرے طمانچہ مارا، آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس نے ٹھیک ہی تو کہا تھا، اس موقع پر اپنی فضیلت بیان نہیں فرمائی بلکہ آنحضرت ﷺ اس مسلمان پر ناراض ہوئے کہ تم نے اس کو ناحق مارا، پھر فرمایا: "لَا تُخَیِّرُوْا بَیْنَ الْأَنْبِیَاءِ" (سنن ابوداؤد ۱۳/ ۳۹۶، ۴۶۷۰، مشکوٰۃ، مسند احمد بن حنبل ۲۴/ ۱۰۱، ۱۱۵۶۹) تم اپنی رائے سے انبیاء کو ترجیح مت دیا کرو کہ فلانا فلانے سے اُونچا ہے، اس کے بعد یہ حدیث بیان فرمائی، ارشاد فرمایا: جب نفخہ صور پھونکا جائے گا تو تمام روحیں بے ہوش ہو جائیں گی، پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو لوگ ہوش میں آجائیں گے، میں سب سے پہلا شخص ہوں گا جو سر اُٹھاؤں گا لیکن میں دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش الٰہی کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں، اب یہ میں نہیں کہتا کہ آیا وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آگئے یا کوہِ طور پر جو وہ بے ہوش ہوئے تھے اس کے بدلے میں آج اللہ تعالیٰ نے ان کو بے ہوشی سے بچالیا، وہ بے ہوش ہی نہیں ہوئے۔

یہ بات پہلے کافی تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں کہ حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کبھی ایک دوسرے کی تنقیص اور ان پر تنقید نہیں کرتے، پوری نبوت کی تاریخ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت ﷺ کبھی کسی نبی کے منہ سے ایسا کلمہ، ایسا لفظ نہیں سنا گیا جس سے اس کی عزت اس سے کم محسوس ہو اور یہ صرف انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی خصوصیت ہے، ورنہ جتنے انسانی طبقات ہیں ان میں سے ایک کی دوسرے پر تنقید ہوتی رہتی ہے، مولوی مولویوں پر تنقید کرتا ہے اور مشائخ اور بزرگانِ دین بسا اوقات دوسروں پر تنقید کر دیتے ہیں لیکن انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ایسا نہیں کرتے بلکہ دوسرے کی فضیلت بیان فرماتے ہیں۔

ایک شخص نے کوئی ایسا جملہ بولا جس سے آپ ﷺ کی حضرت یونس علیہ السلام پر فضیلت ثابت ہو، فرمایا: "وَمَا یَنْبَغِیْ لِأَحَدٍ أَنْ یَقُوْلَ: أَنَا خَیْرٌ مِنْ یُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ" (صحیح بخاری، مسند احمد بن حنبل ۱/ ۲۵۴، ۲۲۹۴، درمنثور، کنز العمال)۔ تم میں سے کوئی ہرگز یہ بات نہ کہے کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں، یعنی فرمایا کہ: تمہیں یہ کہنے کا بھی حق نہیں کہ ہمارے نبی یونس علیہ السلام سے بہتر ہیں، اپنی رائے سے مت

کہو، کیونکہ تم کہو گے تو دوسرے پر تنقیص کرنے کی نیت سے کہو گے، جب موسیٰ علیہ السلام پر مجھ کو فضیلت دو گے تو موسیٰ علیہ السلام کے متعلق تنقیص کا کوئی لفظ بولو گے اور اس سے حضرِ موسیٰ علیہ السلام کی عظمت بھی معلوم ہوئی اور اس سے آنحضرت ﷺ کا نہایت اعلیٰ درجے کا منصف ہونا بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی خدمت میں مقدمہ لا رہا ہے یہودی جو آپ ﷺ کے بدترین دشمن تھے اور مقدمہ لا رہا ہے آپ کے صحابی کے خلاف لیکن ادنیٰ کلمہ بھی آپ ﷺ کی زبان مبارک سے وہ ایسا نہیں سنا جس میں اس کو ڈانٹا گیا ہو کہ تم نے کیوں جھگڑا کیا؟ یا یہ کہ تم نے ناحق بات کہی، یہ آپ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق تھے۔

مقام سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا

[حدیث:۱۳۲۶] ''عَنْ عَائِشَةَ......، إِنَّهَا كَانَتْ وَكَانَتْ وَكَانَ لِي مِنْهَا وَلَدٌ (تَعْنِي خَدِيجَةَ)۔''

(صحیح بخاری ج:۱۲،ص:۱۸۷،حدیث نمبر:۳۵۳۴،باب تَزْوِيجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَدِيجَةَ.....)

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ ایسی تھیں اور ایسی تھیں اور میری انہی سے اولاد ہوئی یعنی حضرت خدیجہ۔''

تشریح: اس حدیث شریف میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ذکر مبارک ہے، اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے دوسری ازواج مطہرات میں سے کسی بی بی پر رشک نہیں آیا، جس کو غیرت یا حسد بھی کہتے ہیں جو سوکنوں میں ہوتا ہے، ایک سوکن کو دوسری سوکن سے کچھ جلاپا ہوتا ہے، فرماتی ہیں کہ مجھے کبھی کسی دوسری سوکن پر رشک نہیں آیا، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ سب سے زیادہ مجھے چاہتے تھے، البتہ حضرت خدیجہ پر مجھے ضرور رشک آتا تھا، میں نے ان کو دیکھا نہیں لیکن آنحضرت ﷺ ان کا تذکرہ اس کثرت سے فرماتے تھے کہ مجھے بڑا رشک آتا۔

ایک دن میں نے کہا: قریش کی ایک بڑھیا تھی، آپ کیا اس کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں ہمہ وقت؟ یعنی رشک کے طور پر جیسے عورتوں کو ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کا تذکرہ سن کر جل جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے اچھی اچھی بیویاں عطا فرما دیں، فرمایا: ''عَائِشَةُ! إِنَّهَا كَانَتْ وَكَانَتْ'' وہ تھیں جو تھیں اور ان ہی سے میری ساری اولاد ہوئی، یعنی ان کے تذکرے کی دو وجوہات ارشاد فرمائیں، ایک وجہ تو یہ کہ ان کی وہ خوبیاں اور صفات جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائیں، وہ کمیاب ہیں، وہ انہی کے ساتھ خاص تھیں، اسلام لانے والی عورتوں میں سب سے پہلے نمبر پر بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام لانے میں وہ پوری کی پوری اُمت میں سب سے اوّل نمبر پر ہیں تو بے جا نہیں ہوگا، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے جب غار حرا سے واپس آکر ان کے پاس تذکرہ کیا، انہوں

نے اسی وقت پہچان لیا تھا، پھر مکہ کی رئیسہ اور مال دار خاتون تھیں لیکن سارے کا سارا مال رسول اللہ ﷺ پر خرچ کر دیا اور خود فقیر ہوگئیں۔

ایک دن بوسیدہ قسم کے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھیں، جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا کہ: خدیجہ سے کہو اللہ ان کو سلام کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم خوش اور راضی بھی ہو؟ کہنے لگیں: میں سر سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک اپنے ربّ سے راضی ہوں! یہ انہی خاتون کا حوصلہ تھا اور پھر دوسری صفات آنحضرت ﷺ کی جیسی دل داری اور جیسی خدمت انہوں نے کی اس کی کوئی مثال نہیں، پندرہ سال عمر میں بڑی تھیں لیکن ایسی خدمت گاری اور ایسی وفا شعاری کہ سبحان اللہ! اور پورے پچیس سال آنحضرت ﷺ کے ساتھ ان کی رفاقت رہی، پچیس سال کی عمر مبارک میں آنحضرت ﷺ کا ان سے عقد ہوا اور آپ ﷺ کی پچاس سال کی عمر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رخصت ہوئیں اور اس پچیس سال کے عرصے میں آنحضرت ﷺ نے کوئی نکاح نہیں کیا۔

تو غرضیکہ فرمایا: "كَانَتْ وَ كَانَتْ" (صحیح البخاری، مشکوٰۃ) وہ تھیں جو تھیں، ایک وجہ تو یہ اور دوسری وجہ یہ کہ میری ساری اولاد انہی سے ہوئی، سوائے صاحبزادہ گرامی حضرت ابراہیم کے جو کہ مدینہ طیبہ آنے کے بعد حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے ہوئے تھے، باقی سب کی سب اولاد نرینہ بھی اور بچیاں بھی ساری حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوئیں، چار صاحبزادوں کے نام لئے جاتے ہیں، حضرت عبداللہ، قاسم، طیب اور طاہر، اس میں اختلاف بھی ہوا ہے کہ یہ ایک ہی شخصیت کے الگ الگ نام تو نہیں ہیں اور چار صاحبزادیاں تھیں، حضرت زینب، رُقیہ، اُم کلثوم اور حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہن، ان میں سے بعض کی نسل چلی بھی تھی لیکن پھر آگے نہیں چل سکی، اس وقت آنحضرت ﷺ کی ساری کی ساری اولاد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد ہے اور حضرت فاطمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہیں، تو یوں تمام سیدوں کی نانی حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ہیں، اس لئے آنحضرت ﷺ ان کی بہت قدر فرماتے تھے اور بہت بلند الفاظ میں ان کا تذکرہ فرماتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری حدیث میں ہے کہ جب کبھی گھر میں بکری ذبح ہوتی تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں کو ڈھونڈ کر گوشت ان کے گھر پہنچاتے تھے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم) یہ تعلق کی بات ہے، اور یہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کمال ہے کہ آنحضرت ﷺ کی زبان سے اپنی سوکن کا تذکرہ کر رہی ہیں اور بڑے مزے لے لے کر کر رہی ہیں۔

مقام سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا

[حدیث:۱۳۲۷] "أَنَّ عَائِشَةَ..............، إِنَّهَا ابْنَةُ أَبِي بَكْرٍ (قَالَهُ عِنْدَ

انتِصَارِ عَائِشَةَ مِنْ زَيْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ)۔“

(صحیح مسلم ج:۱۲، ص:۱۹۰، حدیث نمبر:۲۷۴۴، بَابٌ فِي فَضْلِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُمَا)

ترجمہ: ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ہاں! یہ ابوبکر کی بیٹی ہے، یہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ارشاد فرمائی تھی جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بدلہ لینے کے لئے حضرت زینب سے گفتگو کی تھی۔“

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا: یہ ابوبکر کی لڑکی ہے، اس کا قصہ صحیح بخاری میں ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلقِ خاطر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جیسا تھا وہ صحابہ کو معلوم تھا، اس لئے عام طور پر ہدیے اس دن بھیجتے تھے جس دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر ہوتے تھے، اب اس میں نہ حضرت کا کوئی قصور، نہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا، امہات المومنین کو غیرت آئی اور ہونی چاہئے تھی، یہ بھی ان کا حق تھا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بھیجا کہ ابا سے کہو کہ لوگوں سے کہیں کہ حضرت عائشہ کے گھر کی تخصیص کیوں کرتے ہو؟ سب کے گھر بھیجا کرو! حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیٹی! جس چیز کو میں پسند کرتا ہو تم بھی پسند کرتی ہو؟ کہا: جی! تو فرمایا: میں اس سے محبت رکھتا ہوں تم بھی اس سے محبت رکھو! یعنی حضرت عائشہ سے، یہ سن کر وہ تو چلی گئیں اور جا کر ان کو جواب دیا، انہوں نے کہا: تم نے آگے کچھ نہیں کہا؟ آگے کوئی بات کرتیں، دوبارہ جاؤ! وہ کہنے لگیں: ہم تو نہیں جائیں گے، کسی اور کو بھیج دو۔

اُمّ المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کی تھیں، آپ کی سگی پھوپھی زاد بہن تھیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میری دوسری ساتھیوں یعنی ازواج مطہرات میں میری ٹکر صرف یہ لیتی تھیں، دوسری کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ میرے مقابلے میں کھڑی ہو، ہاں! یہ مجھ سے ٹکر لیتی تھیں، ان کو بھیجا اور یہ آئیں اور یہ فرمایا: یارسول اللہ! آپ کی بیویاں آپ سے درخواست کرتی ہیں کہ آپ تمام بیویوں میں عدل کریں، لوگوں کو کہیں کہ سب کے یہاں ہدیے بھیجا کریں، اس کے پاس بھیجتے رہتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش، وہ اپنی بات کرتی رہیں، کرتے کرتے حضرت عائشہ کی طرف متوجہ ہوگئیں اور ان کو جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا، حضرت عائشہ خاموش، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھتی رہیں، آپ نے فرمایا کہ: یہ کہہ رہی ہیں آپ بھی کچھ کہئے! بس پھر کیا تھا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقابلہ کون کرے؟ ان کو بھی خوب خوب سنائی، یہاں تک کہ وہ چپ ہوگئیں، جب وہ چپ ہوگئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمادیا: إِنَّهَا ابْنَةُ أَبِي بَكْرٍ یہ ابوبکر کی بیٹی ہے!

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں جب منافقوں نے لغو بات اُڑائی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پوچھا، ان سے یعنی حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے بھی پوچھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میری تمام سوکنوں

میں مجھ سے سب سے زیادہ ٹکر لینے والی یہ تھیں لیکن ان کے دین نے ان کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ میرے بارے میں لب کشائی کریں، ایسے موقع پر تو ان کو بہانہ ہاتھ آجانا چاہئے تھا اور کوئی نہ کوئی بات چلتی کردیتیں، لیکن جب حضور اقدس ﷺ نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور فرمایا: توبہ! توبہ! یارسول اللہ! کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے بستر کو گندہ کریں؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کی بہت تعریف کرتی تھیں کہ تھیں تو میری ٹکر کی اور میری ان سے چلتی بھی خوب رہتی تھی لیکن دین اور تقویٰ ایسا تھا کہ ایک لفظ بھی زبان سے ایسا نہیں نکالتی تھیں جو تہمت یا الزام کے درجے میں آتا ہو۔

اور آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ اُمہات المؤمنین سے فرمایا تھا کہ: ”أَسرَعُكُنَّ لُحُوقاً بِيْ أَطْوَلُكُنَّ يَداً“ (کنز العمال، مجمع الزوائد، مستدرک الحاکم ۱۶/ ۲۳، ۶۸۶۹) تم میں سب سے جلدی آکر مجھ سے وہ ملے گی جس کے ہاتھ سب سے زیادہ لمبے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے لکڑی لے کے ہاتھ ناپنے شروع کئے کہ کس کا ہاتھ لمبا ہے لیکن سب سے پہلے انتقال حضرت زینب کا ہوا، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ: تب ہم سمجھیں کہ آنحضرت ﷺ کی یہ مراد تھی، ان کا ہاتھ لمبا ہے یعنی سخی، ام المساکین کہلاتی تھیں یعنی مسکینوں کی ماں، گھر میں چرخہ کاتتی تھیں اور صرف مساکین کی خدمت کے لئے، کوئی لالچ نہیں، ورنہ ان کو اپنی ضرورت کے لئے کیا چاہئے تھا، صرف مساکین کی خدمت کے لئے پیسہ جمع کرتیں اور ان کی خدمت کرتیں، مساکین کو کھانا کھلاتی تھیں۔

انصار کو نصیحت

[حدیث: ۱۳۲۸] ”عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ......، سَتَكُونُ أَثَرَةٌ وَأُمُورٌ تُنكِرُونَهَا، قَالُوا: يَارَسُولَ اللهِ! فَمَا تَأْمُرُنَا؟ قَالَ: تُؤَدُّونَ الْحَقَّ الَّذِي عَلَيْكُمْ وَتَسْأَلُونَ اللهَ الَّذِي لَكُمْ۔“

(صحیح بخاری ج:۱۱، ص:۴۳۶، حدیث نمبر: ۳۳۳۵، بَابُ عَلَامَاتِ النُّبُوَّةِ فِي الْإِسْلَامِ)

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انصاری صحابہ سے فرمایا: میرے بعد تم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے گی اور ایسے کام ہوں گے جو تم کو بُرے معلوم ہوں گے، عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ہم کو کیا حکم فرماتے ہیں؟ فرمایا: جو حق تمہارے ذمے ہے اس کو ادا کرتے رہنا اور جو حق تمہارا ہے وہ اللہ سے مانگنا۔“

تشریح: اس حدیث میں حضرات انصار کو خطاب ہے، اس کا قصہ یہ ہوا تھا کہ آخری دنوں میں

آنحضرت ﷺ نے سر پر پٹی باندھی ہوئی تھی، مسجد میں تشریف لائے ضعف کی حالت تھی، تو حضرات انصار جو آنحضرت ﷺ کے عاشق جاں نثار اور اصحاب فدا کار تھے، اس کو دیکھ کر برداشت نہ کر سکے اور سارے رونے لگے، آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی: "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ" اے اللہ! انصار کی بخشش فرما، "وَلِأَبْنَاءِ الْأَنْصَارِ" اور انصار کی اولاد کی بھی بخشش فرما، "وَلِأَبْنَاءِ أَبْنَاءِ الْأَنْصَارِ" (صحیح بخاری ۱۶ / ۲۶۳، ۴۹۰۶، صحیح مسلم ۷ / ۱۷۳، ۶۵۷۰، ترمذی، درمنثور، کنز العمال)۔ اور ان کی اولاد کی بھی بخشش فرما، پھر فرمایا: لوگ زیادہ ہوتے جائیں گے، انصار کم ہوتے جائیں گے اور ان انصار سے فرمایا: میرے بعد تم کو یہ حالت پیش آئے گی کہ لوگ دوسروں کو تم پر ترجیح دیں گے اور کچھ ایسی باتیں پیش آئیں گی جو تم کو ناگوار ہیں، شرعاً یا معاشرتی لحاظ سے یا اس لحاظ سے کہ تم کو تمہارا حق نہیں ملا، حضرات انصار نے عرض کیا: یا رسول اللہ! پھر آپ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں؟ فرمایا: جو حق تمہارے ذمے ہے اس کو ادا کرتے رہو، یعنی حاکموں کا جو حق تمہارے ذمے ہے ان کی اطاعت بجالانا، جو کوئی نیک کام کہیں اس کو کرنا اور کسی اچھے کام میں ان کی نافرمانی نہ کرنا، تمہارے ذمے جو حق ہے اس کو ادا کرتے رہو اور جو تمہارا جو حق حاکموں کے ذمے وہ ان سے مانگو ہی نہیں، اللہ سے مانگو، کبھی تمہارا کسی سے جھگڑا ہی نہیں ہوگا، لڑائی تو ساری اس میں ہوتی ہے کہ ایک اپنا حق مانگتا ہے، دوسرا دیتا نہیں، سارا جھگڑا اس پر ہے، اور جب تم دوسروں کا حق جو تمہارے ذمے ہے اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کردو تو اب کسی کا اعتراض تو تم پر نہ رہا، کسی کا جھگڑا تم پر نہ رہا اور تمہارا جو حق لوگوں کے ذمے ہے اس کو مانگو نہیں، اللہ سے مانگو، اللہ ہماری بھی کفایت کرے گا نہیں دیتے نہ سہی، سب جھگڑا مٹ گیا کوئی فساد ہی نہیں رہا۔

اگر میرے ذمے جو حق ہے اس کو ادا کرنے والا بن جاؤں اور میرا حق کسی کے ذمے بنتا ہے اس کو مانگوں نہیں تو کسی کا کیا اختلاف ہے؟ اور اگر اس کا اُلٹ ہو جائے کہ لوگوں کا جو حق میرے ذمے ہے اس کو تو ادا نہ کروں اور میرا جو حق لوگوں کے ذمے بنتا ہے وہ ایک تولے کی جگہ ایک سیر مانگوں، تو پھر فساد ہی فساد ہوگا، تولہ حق بنتا ہے تولہ نہیں مانگتے، یوں خیال بن گیا ہے کہ زیادہ مانگو تو تھوڑا ملے گا، تو آنحضرت ﷺ نے اس حدیث میں حضرات انصار رضی اللہ عنہم کو ایسی نصیحت فرمائی کہ مسلمانوں کے درمیان تشتت اور افتراق پیدا نہ ہو، اگر اس نصیحت پر عمل کرلو تو دنیا کے سارے جھگڑے مٹ جائیں۔

قصہ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ

[حدیث: ۱۳۲۹] "....... قَالَ عَمْرُو بْنُ عَبَسَةَ......، فَقُلْتُ إِنِّي مُتَّبِعُكَ، قَالَ: إِنَّكَ لَا تَسْتَطِيعُ ذٰلِكَ يَوْمَكَ هٰذَا، أَلَا تَرٰى حَالِي وَحَالَ

النَّاسِ وَلٰكِنِ ارْجِعْ إِلٰى أَهْلِكَ فَإِذَا سَمِعْتَ بِي قَدْ ظَهَرْتُ فَأْتِنِي قَالَ فَذَهَبْتُ إِلٰى أَهْلِي۔"

(صحیح مسلم ج:۴،ص:۲۷۸،حدیث نمبر: ۱۳۷۴، بَاب إِسْلَامِ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ)

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک میرا ساتھ دینا تجھ سے اس وقت میں نہ ہو سکے گا، کیا تو میرے اور لوگوں کے حال کو نہیں دیکھ رہا ہے؟ لیکن اس وقت لوٹ جا اپنے لوگوں میں، پھر جب تو میرا حال سنے کہ میں کافروں پر غالب آ گیا ہوں تو اس وقت میرے پاس آ جانا، یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے اس وقت فرمائی جب انہوں نے فرمایا تھا کہ میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔''

تشریح: اس حدیث میں حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے، یہ فرماتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے میں بھی مجھے بت پرستی سے نفرت تھی، میں نے سنا کہ مکہ میں ایک صاحب ہیں جو غیب کی خبریں دیتے ہیں، میں ان کی زیارت کے لئے آیا لیکن کوئی ان کا پتا نہیں بتاتا تھا، بڑی مشکل سے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پہنچا، ان دنوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں تھے اور عام مجمع میں نہیں جاتے تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ فرمایا: میں اللہ کا رسول ہوں! پوچھا: اللہ کا رسول کون ہوتا ہے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے سے اپنے بندوں کے نام پیغام بھیجے ہیں! میں نے کہا: کیا پیغام بھیجے ہیں؟ کہا: آپس میں حسن سلوک کرو، صلہ رحمی کرو، بتوں کی عبادت نہ کرو، مکارم اخلاق یعنی اچھے اخلاق اپناؤ، کہنے لگے: آپ کے ساتھ اس دین پر کون ہیں؟ فرمایا: ''حر وعبد'' ایک آزاد اور ایک غلام، آزاد ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے اور غلام حضرت بلال رضی اللہ عنہ تھے، میں نے کہا کہ: میں بھی آپ کے ساتھ ہونا چاہتا ہوں، مجھے بھی اپنے دین میں شامل کر لیجئے! فرمایا: آج تو اس کی طاقت نہیں رکھتا، تم دیکھتے نہیں کہ میرا اور لوگوں کا کیا حال ہو رہا ہے، یعنی میری مخالفت میں لوگوں کا کیا حال ہے؟ تم ایسا کرو کہ اپنے گھر واپس لوٹ جاؤ، جب تم سنو کہ میں غالب آ گیا ہوں تب آ جانا۔ چنانچہ جب انہوں نے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مستقر بنا لیا ہے اس وقت یہ حاضر خدمت ہوئے اور بڑے اُونچے درجے کے یہ صحابی ہیں، حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ۔

اس اُمّت اور گزشتہ اُمتوں کی مثال

[حدیث: ۱۳۳۰] "عَنِ ابْنِ عُمَرَ......، إِنَّمَا أَجَلُكُمْ فِي أَجَلِ مَنْ خَلَا مِنَ الْأُمَمِ مَا بَيْنَ صَلَاةِ الْعَصْرِ إِلٰى مَغْرِبِ الشَّمْسِ، وَإِنَّمَا مَثَلُكُمْ وَمَثَلُ الْيَهُودِ

وَالنَّصَارٰی کَرَجُلٍ اسْتَعْمَلَ عُمَّالًا فَقَالَ: مَنْ یَعْمَلُ لِي إِلٰی نِصْفِ النَّهَارِ عَلٰی قِيرَاطٍ قِيرَاطٍ، فَعَمِلَتْ الْيَهُودُ إِلٰی نِصْفِ النَّهَارِ عَلٰی قِيرَاطٍ قِيرَاطٍ ثُمَّ قَالَ: مَنْ يَعْمَلُ لِي مِنْ نِصْفِ النَّهَارِ إِلٰی صَلَاةِ الْعَصْرِ عَلٰی قِيرَاطٍ قِيرَاطٍ، فَعَمِلَتِ النَّصَارٰی مِنْ نِصْفِ النَّهَارِ إِلٰی صَلَاةِ الْعَصْرِ عَلٰی قِيرَاطٍ قِيرَاطٍ، ثُمَّ قَالَ: مَنْ يَعْمَلُ لِي مِنْ صَلَاةِ الْعَصْرِ إِلٰی مَغْرِبِ الشَّمْسِ عَلٰی قِيرَاطَيْنِ قِيرَاطَيْنِ، أَلَا فَأَنْتُمُ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ مِنْ صَلَاةِ الْعَصْرِ إِلٰی مَغْرِبِ الشَّمْسِ عَلٰی قِيرَاطَيْنِ قِيرَاطَيْنِ، أَلَا لَكُمُ الْأَجْرُ مَرَّتَيْنِ، فَغَضِبَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارٰی، فَقَالُوا: نَحْنُ أَكْثَرُ عَمَلًا وَأَقَلُّ عَطَاءً، قَالَ اللّٰهُ: هَلْ ظَلَمْتُكُمْ مِنْ حَقِّكُمْ شَيْئًا؟ قَالُوا: لَا، قَالَ: فَإِنَّهُ فَضْلِي أُعْطِيهِ مَنْ شِئْتُ۔"

(صحیح بخاری ج:۱۱ ص:۲۷۵، حدیث نمبر:۳۲۰۰، بَابُ مَا ذُكِرَ عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ)

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہاری مثال گزشتہ قوموں کی میعاد کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے کہ عصر کی نماز سے مغرب تک کا فاصلہ اور تمہاری اور یہود و نصاریٰ کی مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی نے چند لوگوں کو ملازم رکھا، پس اس نے کہا: کون ہے جو میرے لئے کام کرے ظہر کی نماز تک ایک ایک قیراط پر؟ چنانچہ یہود نے ظہر کی نماز تک کام کیا ایک قیراط پر، پھر اس نے کہا: کون ہے جو میرے لئے کام کرے ظہر کی نماز سے عصر کی نماز تک ایک ایک قیراط پر؟ پس عمل کیا نصاریٰ نے ظہر کی نماز سے عصر کی نماز تک ایک ایک قیراط پر، پھر اس نے کہا: کون ہے جو میرے لئے کام کرے عصر کی نماز سے سورج کے غروب ہونے تک دو دو قیراط پر؟ سنو! پس تم وہ لوگ ہو جو کام کر رہے ہو عصر کی نماز سے مغرب تک دو دو قیراط پر اور سنو! تمہارے لئے اجر ہے دُہرا، پس یہود و نصاریٰ غصہ ہوئے، کہنے لگے: ہم نے کام زیادہ کیا اور ہمیں مزدوری کم ملی! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا میں نے تمہارا کوئی حق مارا ہے؟ کہنے لگے: نہیں! فرمایا: پھر یہ میرا فضل ہے، میں جس کو چاہے دوں۔"

تشریح: اس حدیث میں فرمایا: تمہارا وقت دوسری اُمم گزشتہ کے مقابلے میں اتنا ہی ہے جتنا کہ عصر کے بعد مغرب کا وقت ہوتا ہے، یعنی دنیا کی عمر گزر چکی ہے تھوڑی سی باقی ہے، جتنی کہ دن کی عمر عصر سے مغرب تک باقی ہوتی ہے اور پھر فرمایا: تمہاری اور یہود و نصاریٰ کی مثال ایسی ہی ہے کہ ایک شخص نے کہا: کون

ہے جو صبح سے لے کر ظہر کی نماز تک کام کرے؟ اس کو ایک قیراط ملے گا، کچھ لوگوں نے کام کیا، ظہر کی نماز کے بعد پھر اس نے اعلان کیا: کون ہے جو ظہر سے عصر تک کام کرے گا؟ اس کو ایک قیراط ملے گا، کچھ لوگوں نے کام کیا، پھر اس نے تیسرا اعلان کیا: کون عصر سے مغرب تک کام کرے گا؟ اس کو دو دو قیراط ملیں گے، فرمایا: پہلا فریق یہودی تھے، جنہوں نے صبح سے دو پہر تک کام کیا، یعنی بہت دیر تک کام کیا، دوسرا فریق نصرانی یعنی عیسائی تھے جنہوں نے دو پہر سے عصر تک کام کیا، ان کے مقابلے میں کچھ کم، اور ان دونوں مزدوروں کو مزدوری ملی ایک دینار، اور تیسرا فریق تم ہو، تمہیں کام سپرد کیا گیا ہے عصر سے مغرب تک اور مزدوری رکھی گئی ہے دو قیراط، پھر ارشاد فرمایا: یہ دیکھ کر یہود و نصاریٰ ناراض ہوگئے کہ ان سے کام زیادہ لیا گیا اور مزدوری تھوڑی ملی اور ان سے کام تھوڑا لیا گیا اور مزدوری زیادہ دی گئی، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: میں نے جتنی اُجرت تمہارے ساتھ طے کی تھی اس میں کوئی کمی نہیں کی؟ کہنے لگے: نہیں! تو حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا: یہ میرا فضل ہے جس کو چاہوں زیادہ دے دوں۔

پہلی اُمتوں کی مشقت زیادہ تھی لیکن ثواب کم اور اس اُمت کا ثواب زیادہ اور عمر و مشقت تھوڑی اور یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ یہ ہمارے عمل کا بدلہ نہیں بلکہ محض مالک کا احسان ہے۔

بنو مطلب اور بنی ہاشم

[حدیث: ۱۳۳۱] ''عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ.......إِنَّمَا بَنُو الْمُطَّلِبِ وَبَنُو هَاشِمٍ شَيْءٌ وَاحِدٌ.''

(صحیح بخاری ج:۱۰، ص:۳۹۱، حدیث نمبر:۲۹۰۷، بَاب وَمِنَ الدَّلِيلِ عَلَى أَنَّ الْخُمُسَ لِلْإِمَامِ وَأَنَّهُ يُعْطِي...)

ترجمہ: ''حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مطلب کی اولاد اور ہاشم کی اولاد ایک ہی چیز ہیں۔''

تشریح: اس حدیث کا قصہ یہ ہے کہ عبد مناف جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تیسرے دادا ہیں، حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف، ان کے چار صاحبزادے تھے، ہاشم، مطلب، نوفل اور عبد شمس، یہ ہاشم اور مطلب ان کا آپس میں بہت تعلق تھا، حضرت عبد المطلب جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد ہیں، یہ اصل میں مدینہ میں رہتے تھے، اپنے ننھیال میں اور ہاشم کے انتقال کے بعد مطلب جو حضرت عبد المطلب کے چچا تھے اور ہاشم کے بھائی تھے ان کو مکہ لائے تھے، ان کا نام شیبۃ الحمد تھا لیکن کوئی پوچھتا ہاشم سے کہ یہ کون ہے؟ تو کہتے: یہ غلام خرید کر لایا ہوں، اپنے بھتیجے کے متعلق کہتے تھے، تو ان کا لقب ''عبد المطلب'' ہی مشہور ہوگیا، ورنہ نام ان کا شیبۃ الحمد تھا اور یہ سگے بھتیجے تھے مطلب کے۔

توغرضیکہ یہ چار بھائی تھے، مطلب، ہاشم، نوفل اور عبد شمس، عبد شمس کی جو آگے اولاد ہوئی ان کو بنی اُمیہ کہتے ہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اسی خاندان سے تھے اور حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ جو اس حدیث کے راوی ہیں وہ بنو نوفل میں سے ہیں، یہ اپنا قصہ ذکر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اور عثمان نے آپس میں مشورہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنی مطلب کے ساتھ وہ سلوک کرتے ہیں جو ہمارے ساتھ نہیں کرتے، تو اس سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں درخواست کی جائے۔

چنانچہ یہ دونوں صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ عالی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! ہم اپنے بھائیوں بنی ہاشم کی فضیلت کا انکار نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان میں مبعوث فرمایا ہے، باقی تینوں خاندان مطلب، نوفل اور عبد شمس کا خاندان یہ تینوں تو برابر ہیں، آپ کی قرابت کے لحاظ سے تو تینوں برابر ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپ بنو مطلب کے ساتھ زیادہ ترجیحی سلوک کرتے ہیں بہ نسبت بنو نوفل اور بنو عبد شمس کے، سوال معقول تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا اور بڑی متانت سے فرمایا: بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب جاہلیت اور اسلام میں "کَشَيْءٍ وَاحِدٍ" رہے ہیں، فرمایا یہ ایک ہی چیز ہیں، جو حکم بنو ہاشم کا ہے وہی بنو مطلب کا ہے، اس لئے تمہاری یہ بات تو صحیح ہے کہ تینوں کی قرابت برابر ہے لیکن اس پر غور نہیں کیا گیا کہ یہ دونوں خاندان حقیقت میں ایک ہی ہیں، انہوں نے کہا: "اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا" حضور! صحیح فرماتے ہیں، کسی قسم کی کوئی کبیدگی نہیں تھی بس ذرا ایک اشکال سا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے کبیدگی تو پہلے بھی نہیں تھی لیکن اب یہ شبہ بھی جاتا رہا۔

چنانچہ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ خود اس حدیث کو روایت کرتے ہیں: "إِنَّمَا بَنُو الْمُطَّلِبِ وَبَنُو هَاشِمٍ شَيْءٌ وَاحِدٌ" بنو مطلب اور بنو ہاشم تو ایک ہی چیز ہیں، جاہلیت اور اسلام میں ان کی ایک ہی حیثیت ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح بنو ہاشم کے لئے صدقہ زکوٰۃ لینا حرام ہے اسی طرح بنو مطلب کے لئے صدقہ وزکوٰۃ لینا حرام ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنا ہی خاندان سمجھا۔

حضرت خضر علیہ السلام

[حدیث:۱۳۳۲] "عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ....، إِنَّمَا سُمِّيَ الْخَضِرَ أَنَّهُ جَلَسَ عَلَى فَرْوَةٍ بَيْضَاءَ فَإِذَا هِيَ تَهْتَزُّ مِنْ خَلْفِهِ خَضْرَاءَ."

(صحیح بخاری ج:۱۱، ص:۲۰۳، حدیث نمبر:۳۱۵۰، باب حَدِيثِ الْخَضِرِ مَعَ مُوسَى عَلَيْهِمَا السَّلَام)

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: خضر کا نام اسی واسطے تو خضر رکھا گیا کہ وہ بیٹھے تھے ایک صاف سفید زمین پر پس ان

کے بیٹھنے سے نیچے کی زمین سرسبز ہوگئی۔‘‘

تشریح: اس حدیث میں ہے کہ حضرت خضر کا نام ’’خَضِر‘‘ (بفتح الخاء وکسر الضاد) اسی لئے مشہور ہوا کہ وہ ایک زمین پر بیٹھے تھے، تو ان کے نیچے کی زمین سرسبز ہوگئی، ان کا اصل نام ’’ایلیا‘‘ ہے اور ’’خضر‘‘ کا معنی سرسبز کے ہیں تو چونکہ ان کے بیٹھنے سے نیچے کی زمین سرسبز ہوگئی تھی تو اس لئے ان کا لقب ’’خضر‘‘ ہوگیا۔

ان کا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مشہور ہے، پندرہویں پارے کے آخر میں مذکور ہے، اس میں اختلاف ہوا ہے کہ وہ نبی تھے یا نہیں تھے اور اس میں بھی اختلاف ہوا ہے کہ وہ زندہ ہیں یا نہیں؟ محدثین ان کو زندہ تسلیم نہیں کرتے لیکن حضرات صوفیہ تواتر سے ایسے واقعات ذکر کرتے ہیں جن سے ان کا زندہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔

فضیلتِ حضرت زینب بنتِ ابی سلمہ رضی اللہ عنہا

[حدیث:۱۳۳۳] ’’.......فَقَالَتْ لِي زَيْنَبُ بِنْتُ أَبِي سَلَمَةَ......، لَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمُ اللهُ أَعْلَمُ بِأَهْلِ الْبِرِّ مِنْكُمْ..........‘‘

(صحیح مسلم ج:۱۱ص:۸۵، حدیث نمبر:۳۹۹۲، باب استِحبَابِ تَغيِيرِ الِاسْمِ القَبِيحِ إِلَى حَسَنٍ وَتَغيِيرِ اسْمِ)

ترجمہ: ’’حضرت زینب بنتِ ابی سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے آپ کو پاکیزہ مت کہو، اللہ تمہاری نیکی کو بہتر جانتا ہے۔‘‘

تشریح: یہ حدیث حضرت زینب بنتِ ابی سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، حضرت زینب یہ اُمّ المؤمنین حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی ہیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پلی ہیں، ابو سلمہ کی لڑکی ہیں، ابو سلمہ سے دو بچے تھے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی، عمرو بن ابی سلمہ اور زینب بنت ابی سلمہ، اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا جب بیوہ ہوئیں تھیں تو ان کے پاس یہ دو بچّے تھے، جب ان کی عدّت ختم ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نکاح کا پیغام بھیجا، تو فرمانے لگیں: میرے لئے یہ بہت بڑی سعادت کی بات ہے لیکن دو اِشکال ہیں:

ایک یہ کہ میری طبیعت میں غیرت بہت زیادہ ہے اور غیرت کی وجہ سے عورت میں سوکن سے جلاپا بہت ہوتا ہے، ایسا نہ ہو کہ آپ کی پہلے سے اور بھی بیویاں ہیں، ایک میں بھی چلی جاؤں تو مجھے سوکنوں سے ناچاقی ہوجائے اور میں کوئی اِیسا لفظ بول دوں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مبارک کے خلاف ہو، اس طرح میری دنیا اور آخرت تباہ ہوجائے گی، اس سے ڈرتی ہوں۔

دوسری بات یہ کہ میرے پاس بچّے ہیں، میں نہیں چاہتی کہ وہ آپ کو تنگ کریں، گھر آ کر آپ کو

سکون ملنے کے بجائے بچّے شور مچائیں گے، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: پہلی بات (غیرت والی بات) کے لئے تو ہم دُعا کریں گے، یہ مسئلہ ختم ہوجائے گا، اور دوسری بات جہاں تک بچّوں کا تعلق ہے ہم اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں گے کہ کوئی ایسی بات پیش نہیں آئے گی جو ناگواری کا موجب ہو، چنانچہ یونہی ہوا، اس پر فرمانے لگیں: پھر مجھے کیا اِشکال؟

حضرت زینب بنتِ اُمّ سلمہ، ان کا ایک معجزہ ہے، یہ بچّی تھیں اور بچّے گھر میں شرارت کیا ہی کرتے ہیں، آنحضرت ﷺ غسل فرمارہے تھے، عادت مبارک یہ تھی کہ لنگی پہن کر اور پھر پردہ فرماکر غسل فرمایا کرتے تھے، جیسے ہمارے یہاں پکے غسل خانے بنے ہوتے ہیں ایسا رواج اس وقت نہ تھا، ایک کونے میں بیٹھ کر نہالیا کرتے تھے، لنگی پہن کر اور پردہ کرکے غسل فرمایا کرتے تھے، لنگی پہن کر بھی کھلے عام نہیں، حتیٰ کہ گھر میں بھی پردہ کرکے، اب یہ زینب چھوٹی بچّی تھیں جیسا کہ بچّے ستایا کرتے ہیں، شرارت کرنے کے لئے یہ بار بار آتی تھیں اور کپڑا اس طرح ہٹاکر جھانک کر چلی جاتی تھیں اور ہنستی تھیں، ایک دفعہ جب یہ آئیں تو آنحضرت ﷺ نے ان کے منہ پر کلّی کردی ایسے مذاق میں، جیسے بچّوں کے ساتھ مذاق کیا جاتا ہے، اس کا اثر یہ ہوا کہ نوّے سال کی ان کی عمر ہوئی لیکن سولہ سترہ سال کی جوان لڑکی معلوم ہوتی تھیں، نوّے سال کی عمر میں بھی چہرہ ایسا ہی رہا جیسے پندرہ سولہ سال کی نوجوان لڑکی کا ہوتا ہے، ان کا نام برّہ تھا، آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا، برّہ کا معنی ہے پاک، تو فرمایا: اپنے آپ کو اپنے منہ سے پاک نہ کہا کرو، اللہ بہتر جانتا ہے کہ تم میں سے کون پاک ہے؟ اس کا نام زینب رکھو، چنانچہ ان کا نام برّہ سے زینب رکھ دیا۔

اس سے بچّوں کے نام رکھنے کا یہ ادب معلوم ہوا کہ نام ایسا نہ رکھا جائے کہ جس میں کبر ہو، اب لوگ ایسا ہی کرتے ہیں، کوئی تیس مار خان نام رکھتا ہے، کوئی رستم نام رکھتا ہے، کوئی شاہ فہد نام رکھتا ہے، یہ صرف کبر کے لئے ہے کہ ہمارا بچّہ بڑا معلوم ہو، نام ایسا رکھنا چاہئے کہ جس میں کبر نہ پایا جائے، لیکن گھٹیا پن، رذالت اور کمینگی بھی اس میں نہ پائی جائے۔

کل ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ میں نے اپنے بیٹے کا نام رکھا ہے ''جعلان''، ہمارے یہاں ایسے لوگ ہیں کہ کہیں کوئی لفظ دیکھ لیا یا اپنی طرف سے کوئی لفظ بنالیا اور وہ نام رکھ لیتے ہیں اور ہم سے پھر اس کا معنی پوچھتے ہیں، اللہ کے بندو! نام تم رکھتے ہو اور معنی ہم سے پوچھتے ہو، کوئی معنی والا لفظ ہو تو اس کا معنی بتائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک والد نے اپنے بیٹے کی شکایت کی کہ یہ میرا ادب نہیں کرتا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بیٹے کو بلایا کہ تیرا باپ تیرے خلاف شکایت کررہا ہے، بیٹے نے کہا: حضرت! یہ بتایئے کہ کیا اولاد کے ذمے ہی ماں باپ کا حق ہے یا ماں باپ کے ذمے بھی اولاد کا کچھ حق ہے؟ ارشاد فرمایا: ہاں! ماں باپ کے ذمہ بھی اولاد کا حق ہے، ایک حق یہ بھی ہے کہ کسی اچھے خاندان کی خاتون سے نکاح

کرے، آج کل محبت کی شادیاں ہوتی ہیں، لڑکے لڑکیاں کالج میں پڑھتے ہیں وہیں شادیاں کر لیتے ہیں، ماں باپ کو پتا بھی نہیں لگنے دیتے، رنگ و رُوپ دیکھ لیا، یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس خاندان کی ہے؟ بہت سے لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ لڑکی شیعہ ہے میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں، کوئی کہتا ہے کہ آغا خانی ہے، ایک بدبخت نے اپنی کسی محرم کا لکھا، مجھ سے عمر میں چھوٹی ہے، میں اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں، اب خود اندازہ کرلو کہ انسانیت کہاں تک پہنچ گئی ہے؟ انسانیت کا فیتہ ہی گم ہو گیا جس سے پیمائش کریں، کس کو دیکھیں کہ یہ معیاری ہے۔

تو حضرت نے فرمایا: ایک حق تو یہ ہے کہ کسی اچھے خاندان کی شریف لڑکی سے نکاح کرے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ عربوں کی عادت یہ تھی کہ وہ نجابت و شرافت کے تمام اوصاف جو بچے میں پائے جاتے تھے وہ ماں کی طرف منسوب کرتے تھے، یعنی یہ نہیں دیکھا جاتا کہ باپ کتنا اُونچا آدمی ہے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ماں کتنی اُونچی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ باپ کے اخلاق بھی بچے میں آتے ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ زیادہ تر ماں کے اخلاق آتے ہیں، کسی گھٹیا قسم کی عورت سے نکاح کرو گے تو تمہاری اولاد میں بھی اسی قسم کے اخلاق آئیں گے اور اسی بنا پر خواتین کو خود بھی اپنا اخلاق بلند کرنا چاہئے، ان کی نظر بہت اُونچی ہونی چاہئے، گھٹیا اور ادنیٰ باتوں پر لڑنے کے بجائے ان کو اپنا اخلاق بلند کرنا چاہئے، ان کے اثرات ان کی اولاد پر پڑیں گے اور اگر یہ رذالت اور کمینگی کی طرف مائل ہوں گی تو پھر اولاد سے بھی یہی توقع کی جاسکتی ہے کہ اولاد ان اخلاق کا مظاہرہ سب سے پہلے اپنے گھر پر کرے گی، بعد میں باہر، پہلے ماں پر ہی کرتی ہے، ماں پھر ان کو کوستی ہے لیکن کہنے والا کہہ سکتا ہے: ''یہ سب کچھ آپ ہی کا کیا ہوا ہے۔''

تو خاندانی لڑکی سے شادی کرو، جیسی ماں ہوگی ویسے ہی اولاد ہوگی۔ اور دوسرا حق یہ ہے کہ اولاد پیدا ہو تو اس کا اچھا سا نام رکھے اور ایک حق یہ ہے کہ اس کو اخلاق و اعمال کی تعلیم دے اور ایک حق یہ ہے کہ جب جوان ہو جائے تو اس کی اچھی جگہ شادی کرے اور اس کو چلتا کرے، چلو کماؤ اور کھاؤ۔

بادشاہ نے میراثی کو ہاتھی دیا، میراثی نے ڈھول اس کے گلے میں ڈال دیا اور اس کو ہنکا دیا اور کہا: میرا بھی یہی پیشہ ہے تو بھی کما اور کھا۔

اولاد کی شادی کر دو اور اب اس پر اصرار مت کرو کہ وہ ہمارے ساتھ رہیں، کمائیں کھائیں اپنا کام کریں، تمہارے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو خوشی سے رہیں لیکن ان کو مجبور نہ کرو۔

وہ لڑکا کہنے لگا کہ حضرت! ان سے پوچھئے کہ انہوں نے میرے حق ادا کئے ہیں، سب سے اوّل انہوں نے ایک لونڈی سے نکاح کیا جس کے پیٹ سے میں پیدا ہوا ہوں، میری ماں ایک لونڈی ہے، یہ آزاد تھے، کیا ان کو نکاح کرنے کے لئے ایک شریف اور آزاد عورت نہیں ملتی تھی؟ لونڈی کے اخلاق تو لونڈیوں والے

ہی ہوں گے اور وہی اخلاق بچوں میں آئیں گے، جس بچے کی ماں جیسی ہوگی اس میں وہی اخلاق آئیں گے۔

دوسری بات یہ کہ جب میں پیدا ہوا تو والد نے میرا نام ''جعل'' رکھا، جعل گو کے کیڑے کو کہتے ہیں، اس کی جمع 'جعلان' ہے گندی کے کیڑے۔ اور جب گوبر سڑ جاتا ہے اس وقت میں یہ کیڑے پیدا ہوجاتے ہیں۔

اور تیسرا حق اولاد کو آدابِ شرعیہ کی تعلیم دے، ان سے پوچھئے کہ آج تک انہوں نے مجھے ایک بھی ادبِ شرعی کی تعلیم دی؟

تو میں نے کہا کہ ناموں میں یہ بھی نہ ہو کہ ان میں تکبر پایا جائے اور یہ بھی نہ ہو کہ رذالت اور کمینگی پائی جائے، دونوں باتیں غلط، اس لئے بہتر ہے کہ انبیائے کرام کے اسمائے گرامی کے نام رکھے جائیں: أَحَبُّ الْأَسْمَاءِ إِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ عَبْدُ اللهِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ (سنن ترمذی ۱۰/ ۴۶، ۲۷۵۹، سنن نسائی ۱۱/ ۳۱۴، ۳۵۰۹، کنز العمال) اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناموں میں عبداللہ اور عبدالرحمٰن پسند ہیں، اللہ کا بندہ، رحمٰن کا بندہ۔

انصار کی فضیلت

[حدیث: ۱۳۳۴] ''.......سَمِعْتُ الْبَرَاءَ......، الْأَنْصَارُ لَا يُحِبُّهُمْ إِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا يُبْغِضُهُمْ إِلَّا مُنَافِقٌ، فَمَنْ أَحَبَّهُمْ أَحَبَّهُ اللهُ، وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ أَبْغَضَهُ اللهُ۔''

(صحیح بخاری ج: ۱۲، ص: ۱۳۶، حدیث نمبر: ۳۴۹۹، باب حُبِّ الْأَنْصَارِ)

ترجمہ: ''حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات انصار کے بارے میں فرمایا کہ: ان کو دوست نہیں رکھے گا مگر مؤمن اور ان سے بغض نہیں رکھے گا مگر منافق، جو ان سے محبت رکھے گا اللہ تعالیٰ اسے دوست رکھے گا اور جو شخص ان سے بغض رکھے گا اللہ تعالیٰ ان سے عداوت رکھے گا۔''

تشریح: اس حدیث شریف میں حضرات انصار کے بارے میں فرمایا کہ ان سے محبت نہیں رکھے گا مگر مؤمن اور ان سے بغض نہیں رکھے گا مگر منافق، جو شخص کہ ان سے محبت رکھے اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرمائیں گے اور جو شخص کہ ان سے بغض رکھے وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہوگا، اللہ تعالیٰ اس سے دشمنی فرمائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مکہ مکرمہ سے دوسرے مہاجرین جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو وہاں کے پہلے سے رہنے والے حضرات ''انصار'' کہلاتے ہیں، انصار نے مہاجرین کو پناہ دی اور قرآن کریم میں فرمایا ﴿وَيَنْصُرُوْنَ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ (الحشر: ۸) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی، انہوں نے

اسلام کو ٹھکانا دیا یعنی اپنے شہر کو سب سے پہلے دارالاسلام بنایا اور اسلام کی حفاظت کے لئے اپنی جان کی اپنے مال کی اپنے بیوی بچوں کی قربانی دی، اس لئے حضرات انصار کے بہت زیادہ فضائل بیان فرمائے۔

چونکہ یہ حضرات آنحضرت ﷺ کے محبِّ صادق اور عاشق تھے اور چونکہ ان حضرات کی محنتوں اور قربانیوں سے اسلام پھلا اور پھولا، اس لئے جن لوگوں کا تعلق آنحضرت ﷺ سے ہوگا وہ حضرات انصار کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے، اس لئے ارشاد فرمایا: ان حضرات سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے اور ان حضرات سے بغض رکھنا نفاق کی علامت ہے۔ اور یہ بھی فرمایا: جو شخص ان سے محبت رکھے اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت رکھیں گے اور جو شخص ان سے بغض رکھے اللہ تعالیٰ اس سے بغض رکھیں گے۔

حق تعالیٰ شانہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اہل سنّت والجماعت تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت رکھتے ہیں، خصوصاً بھی اور عموماً بھی، جن حضرات کے خاص خاص فضائل ہیں جیسے حضرات خلفائے راشدین، جیسے حضرات عشرہ مبشرہ، حضراتِ اہل بدر، حضراتِ اہل احد، حضراتِ اہل حدیبیہ، امہات المومنین، حضراتِ اہل بیت، حضراتِ مہاجرین وانصار، اہل عرب، ان کی اسلامی تہذیب وتمدن وثقافت، ان کے اخلاق، عاداتِ مبارکہ، اسی طرح آنحضرت ﷺ کے آل واولاد، تو جتنی کسی کی آنحضرت ﷺ کے ساتھ خصوصیت ہے، الحمد للہ اہل سنّت اسی قدر ان سے تعلق ومحبت رکھتے ہیں، کسی شخص کا آنحضرت ﷺ کی صحابیت کے شرف سے مشرف ہوجانا اتنا بڑا شرف ہے کہ اتنا بڑا کوئی شرف نہیں، سوائے نبوت کے، جیسے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سب کے سب اللہ کے نبی اور برگزیدہ بندے ہیں، اللہ تعالیٰ کے پیغامات اپنے اپنے وقت میں اپنی اُمتوں کے پاس لانے والے ہیں، وحیِ الٰہی کا مورد ہیں اور ان حضرات کے سینے انوارِ نبوت کے ساتھ منور ہیں، اس لئے تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ادب واحترام تمام مسلمانوں پر فرض ہے اور کسی ایک نبی کی توہین وتنقیص نعوذ باللہ! گویا تمام انبیاء کی توہین ہے۔

ٹھیک اسی طرح جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے صحابیت کا شرف عطا فرمایا ہے وہ ہمارے لائق احترام اور لائق محبت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چن چن کر اس کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا اور کسی ایک صحابی کی تنقیص وتوہین یہ شرف صحابیت کی توہین ہے، گویا حضور ﷺ کی صحابیت کی بے قدری کی گئی اور حضرات انصار کو اللہ تعالیٰ نے بہت ہی مراتب عطا فرمائے تھے، چونکہ یہ آنحضرت ﷺ کے جاں نثار تھے، اس لئے ان سے محبت رکھنا بلا شبہ ایمان کی علامت ہے، ان سے محبت رکھنے والا اللہ تعالیٰ کا محبوب ہے، اس لئے کہ حضور ﷺ کے محبوبوں سے محبت رکھتا ہے اور ان سے بغض رکھنے والا اللہ تعالیٰ کی نظر میں مبغوض ہے، اس لئے کہ اللہ کے دوستوں اور آنحضرت ﷺ کے پیاروں سے بغض رکھتا ہے۔

اہلِ بیعت الرضوان کی فضیلت

[حدیث: ۱۳۳۵] ”......أَخْبَرَتْنِي أُمُّ مُبَشِّرٍ......، لَا يَدْخُلُ النَّارَ إِنْ شَاءَ اللهُ مِنْ أَصْحَابِ الشَّجَرَةِ أَحَدُ الَّذِينَ بَايَعُوا تَحْتَهَا، قَالَتْ: بَلَى يَا رَسُولَ اللهِ! فَانْتَهَرَهَا، فَقَالَتْ حَفْصَةُ: {وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا}، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَدْ قَالَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: {ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا}۔“

(صحیح مسلم ج:۱۲، ص:۲۹۴، حدیث نمبر:۴۵۵۲، باب مِنْ فَضَائِلِ أَصْحَابِ الشَّجَرَةِ أَهْلِ بَيْعَةِ الرِّضْوَانِ.)

ترجمہ: ”حضرت اُمّ مبشر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں داخل ہوگا دوزخ میں ان شاء اللہ درخت والوں میں سے کوئی شخص جس نے بیعت کی تھی درخت کے نیچے، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ ﴿وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا﴾ (مریم:۷۱) تم میں سے کوئی ایک نہیں ہوگا جو اس میں وارد نہ ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے یہ بھی تو فرمایا ہے کہ: ﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا﴾ (مریم:۷۲) پھر ہم بچالیں گے ان لوگوں جو متقی ہیں اور ہم چھوڑ دیں گے ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے۔“

تشریح: حضرت اُمّ مبشر رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حدیبیہ کے موقع پر جن حضرات نے درخت کے نیچے بیٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ان شاء اللہ ان میں سے کوئی بھی دوزخ میں داخل نہیں ہوگا، وہ سب کے سب جنتی ہیں، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اُمّ المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں، ان کو اشکال ہوا کہ کیوں نہیں داخل ہوں گے؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ (مریم:۷۱) اور نہیں ہے تم میں سے کوئی مگر دوزخ میں ضرور داخل ہوگا اور یہ لازم ہے کہ تیرے رب پر جس کا فیصلہ کیا جا چکا ہے، اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ کوئی بھی داخل ہونے سے نہیں بچے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ڈانٹا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بعد میں یہ بھی تو فرمایا ہے: ﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا﴾ (مریم:۷۲) پھر ہم متقی لوگوں کو بچالیں گے اور ظالموں کو گھٹنوں کے بل گرے ہوئے وہاں چھوڑ دیں گے۔

اس حدیث شریف میں اصحابِ حدیبیہ کی فضیلت ہے، ذی القعدہ سن ۶ ہجری میں عمرے کے ارادے سے مکہ تشریف لے گئے اور کافر مانع آئے، اسی اثناء میں بہت سے واقعات پیش آئے جو احادیث

میں متفرق طور پر آئے ہیں، ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے سفارت کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا تھا، وہاں سے مکہ چھ میل دور ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واپس آنے میں دیر ہوگئی، ادھر مشہور ہوگیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا گیا ہے، اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے جو آپ کے ہم رکاب تھے درخت کے نیچے بیٹھ کر موت اور جہاد کی بیعت لی تھی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں آتا ہے کہ موت کی بیعت نہیں لی تھی، ہم سے یہ بیعت لی تھی کہ "أَنْ لَا نَفِرَّ" (فتح القدیر، طبقات ابن سعد) ہم بھاگیں گے نہیں، تو کسی سے یہ لفظ بولا ہوگا اور کسی سے یہ بولا ہوگا، مختلف لوگ آکر بیعت کرتے تھے، یہ صحابہ جو حدیبیہ میں شریک تھے پندرہ سو کے قریب تھے، بعض روایات میں چودہ سو آتی ہے، بعض میں پندرہ سو آتی ہے، علماء فرماتے ہیں کہ اصل تو چودہ سو تھے باقی حوالی موالی ہوتے ہیں، یعنی ساتھ خدام ہوتے ہیں، یوں پندرہ سو ہوجاتے ہیں۔

اور ان صحابہ کے بارے میں سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿١٨﴾﴾ (الفتح)

ترجمہ: "البتہ تحقیق کہ راضی ہوا اللہ تعالیٰ ایمان والوں سے جب کہ اے نبی! وہ آپ سے بیعت کررہے تھے درخت کے نیچے، پس جان لیا اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ان کے دل میں ہے۔"

صرف ان کے ظاہری عمل سے راضی نہیں ہوا بلکہ ان کے دل کو جان کر ان کے ظاہری عمل سے راضی ہوا اور جس سے اللہ راضی ہوجائے اور اپنی رضامندی کا قرآن میں اعلان کردے ظاہر ہے وہ پکا مؤمن اور جنتی ہے۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الفتح:۲۶) جب کہ کافروں نے اپنے دل میں جاہلیت کی نخوت پیدا کی، الٹی سیدھی شرطیں لگائیں، پس اللہ نے تسکین نازل فرمائی اپنے نبی پر اور مؤمنین پر ﴿وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾ اور ان کو چپکا دیا تقویٰ کی بات پر ﴿وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا﴾ اور وہ اس کے مستحق بھی تھے اور اس کے اہل بھی اور اللہ تعالیٰ کو تو ہر چیز معلوم ہے ﴿وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ اور اسی سورت کے آخر میں

ہے: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (الفتح:۲۹) یہ پوری آیت نازل فرمائی۔

کہنا چاہئے کہ سورۂ فتح حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل ومناقب میں ہے اور انہی کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا کہ: اِن شاء اللہ ان اصحابِ حدیبیہ میں سے جنہوں نے درخت کے نیچے بیٹھ کر بیعت کی تھی ایک بھی جہنم میں داخل نہ ہوگا، مطلب یہ کہ اگر ان سے کوئی غلطیاں بعد میں ہوئیں، آدمی معصوم تو نہیں ہے غلطی پھر بھی ہو جاتی ہے تو وہ معاف ہے، ان پر قلم پھیر دیا گیا ہے، ان سے ایسی کوئی غلطی نہیں ہوگی جو ان کو دوزخ میں لے جائے، اس عمل کی برکت سے سب معاف۔

اور اس قصے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت بھی معلوم ہوئی کہ ان کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے بیعت لی اور دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان پندرہ سو صحابہ سے اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا کہ یہ پندرہ سو صحابی جنتی ہیں۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر یہ اشکال ہوا کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ تم میں سے ہر ایک جہنم پر وارد ہوگا اور تیرے رب نے یہ اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے، یہ آیت واقعی مشکل ہے، ورود کے معنی عام طور پر داخل ہونے کے کئے جاتے ہیں، جب ہم کہتے ہیں کہ "فُلَانٌ وَرَدَ الْقَرْيَةَ" اس کا معنی ہے فلاں آدمی بستی میں داخل ہوا، اللہ پاک فرماتے ہیں کہ تم میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہیں بچے گا جو جہنم پر وارد نہ ہو، یہ تیرے رب کا حتمی فیصلہ ہے، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ڈانٹا کہ تم نے آیت کا مطلب نہیں سمجھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: آگے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی تو فرمایا کہ: ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا.... پھر ہم بچالیں گے متقیوں کو اور ظالموں کو وہیں چھوڑ دیں گے۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس آیت شریفہ میں جس وارد ہونے کا ارشاد فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر ایک جہنم پر وارد ہوگا، اس سے مراد ہے جہنم پر سے گزرنا اور پل صراط رکھا جائے گا جہنم کی پشت پر، یعنی پل صراط جہنم کے اوپر ہوگا اور جہنم کے اوپر سے ہو کر جانا، تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی یہ قسم اور اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ بالکل برحق ہے کہ تم میں سے ہر ایک جہنم پر سے گزرے گا، پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اہل ایمان کو نجات عطا فرمائیں گے اور دوسرے لوگ کٹ کٹ کر نیچے گر جائیں گے، نعوذ باللہ! استغفر اللہ! اس لئے جن حضرات کے بارے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما دیا کہ ایسا آدمی جہنم میں داخل نہیں ہوگا، اس کا یہی مطلب ہے کہ اس کو جہنم میں بھیجا نہیں جائے گا، یہ مطلب نہیں کہ اس کے اوپر سے نہیں گزرے گا، اوپر سے گزرنا تو سب ہی کو معلوم ہے اور جیسا کہ معلوم ہے کہ ہر آدمی اپنی اپنی ایمانی قوت کے مطابق وہاں چلے گا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جہنّم کی پشت پر ایک پل رکھا جائے گا جس کو پل صراط کہتے ہیں اور گزرنے والے اس کے اوپر سے گزریں گے، بعض جس طرح بجلی کوندتی ہے مشرق سے مغرب تک ایک لمحے میں یہ پوری مسافت طے کرلیں گے۔

حافظ فضل اللہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے "المعتمد فی المعتقد" میں لکھا ہے کہ زمین پر سے سیڑھی لگائی جائے گی جو ساتوں آسمانوں کو عبور کرتے ہوئے اوپر جائے گی وہ جنّت ہے، اس سیڑھی پر چڑھنا ہے، اس کا نام پل صراط ہے، یہ نیچے ساری کی ساری زمین جہنّم ہوگی، اس کو جہنّم بنادیا جائے گا۔

یہ جو دریا ہیں یہ پٹرول بن جائیں گے اور اس کے اوپر وہ پل صراط ہے جس کو پار کرکے ان کو اوپر سے جنّت میں جانا ہے کیونکہ جنّت تو ساتوں آسمانوں سے بھی اوپر ہے اور ہمارا حساب وکتاب نیچے زمین پر ہورہا ہے، جب حساب وکتاب سے فارغ ہوجائیں گے تو لوگوں سے کہا جائے گا کہ پل صراط عبور کرو اور نیچے کی زمین کو جہنّم بنادیا جائے گا، اب تم اندازہ کرو کہ کتنی طویل مسافت ہوگی؟

تو کوئی بجلی کی طرح گزریں گے اور کچھ آنکھ جھپکنے کی طرح، ایک دفعہ آنکھ جھپکتا ہے تو آسمانوں سے پار ہوجاتا ہے اور کوئی اور مراتب سرعت سے، حدیث میں چند مثالیں بتادی ہیں، کوئی تیز رو گھوڑے کی طرح ،کوئی تیز رو اونٹ کی طرح، کوئی دوڑنے والے آدمی کی طرح منزل طے کرے گا اور کوئی بے چارے پھنسے ہوئے ہوں گے، آہستہ آہستہ منزل طے کررہے ہوں گے، کتنے سو سال میں طے کریں گے تم ہی اندازہ کرو ،کوئی بچے کی طرح رینگتے ہوئے جائیں گے، چل بھی نہیں سکیں گے۔

جتنا کوئی یہاں پر پل صراط یعنی دین پر برق رفتاری سے چل رہا ہے اور دین پر چلنے سے اس کو کوئی چیز مانع نہیں آتی وہ ان شاء اللہ اسی برق رفتاری سے وہاں اس پل صراط پر چلے گا اور یہاں جیسا کہ احادیث میں آتا ہے دونوں طرف کنڈیاں لگی ہوئی ہوں گی "وَلَهٗ كَلَالِيْبُ كَشَوْكَةِ السَّعْدَانِ" (مسند احمد بن حنبل، کنزالاعمال) سعدان ایک جھاڑی ہوتی ہے، اس کے مُڑے ہوئے کانٹے ہوتے ہیں، جیسا کہ جنگلی بیریوں کے مڑے ہوئے کانٹے ہوتے ہیں، وہ گزرنے والے کو پھانس تو لیتے ہیں پھر چھوڑتے نہیں، بڑی مشکل سے ان سے اپنے آپ کو چھڑایا جاتا ہے، وہاں پل صراط پر شوک السعد ان کی طرح کانٹے لگے ہوں گے اور وہ گزرنے والوں کو پکڑیں گے، یہ وہی ہماری خواہشات کے کانٹے ہیں، اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔ خواہشات کو ترک کردو، اللہ کے راستے پر چلنا ہی چلنا ہے، یہاں چلو گے تو وہاں کا چلنا آسان ہوگا اور اگر یہاں رینگتے ہوئے چلو گے تو وہاں بھی رینگتے ہوئے ہی چلو گے۔

اُمّت کے ساتھ بھلائی

[حدیث:۱۳۳۶] ”عَنْ أَبِي مُوسى.....، إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ إِذَا أَرَادَ رَحْمَةَ أُمَّةٍ مِنْ عِبَادِهِ قَبَضَ نَبِيَّهَا قَبْلَهَا فَجَعَلَهُ لَهَا فَرَطًا وَسَلَفًا بَيْنَ يَدَيْهَا، وَإِذَا أَرَادَ هَلَكَةَ أُمَّةٍ عَذَّبَهَا وَنَبِيُّهَا حَيٌّ فَأَهْلَكَهَا وَهُوَ يَنْظُرُ فَأَقَرَّ عَيْنَهُ بِهَلَكَتِهَا حِينَ كَذَّبُوهُ وَعَصَوْا أَمْرَهُ۔“

(صحیح مسلم ج:۱۱ص:۴۰۷،حدیث نمبر: ۴۲۴۱،باب إِذَا أَرَادَ اللهُ تَعَالَى رَحْمَةَ أُمَّةٍ قَبَضَ نَبِيَّهَا قَبْلَهَا)

ترجمہ: ”حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی اُمّت پر رحمت فرمانا چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے تو اس اُمّت کے نبی کو اس اُمت سے پہلے قبض کر لیتے ہیں، پس اس نبی کو اس اُمت کے لئے پیش رو اور اس اُمّت سے آگے جانے والا بنا دیتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کسی اُمّت کی ہلاکت کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو عذاب دیتے ہیں اس حالت میں کہ نبی زندہ ہوتا ہے، پس اس کو ہلاک کر دیتے ہیں اس حالت میں کہ نبی اس اُمّت کو دیکھ رہا ہوتا ہے، اس کی آنکھوں کو اس اُمّت کی ہلاکت کی وجہ سے ٹھنڈا کر دیتے ہیں جب کہ انہوں نے اس کو جھٹلایا اور اس کے حکم کی سرتابی کی۔“

تشریح: اس حدیث شریف میں فرمایا کہ: جب اللہ تعالیٰ کسی اُمّت کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اُمّت صحیح سالم ہوتی ہے اور نبی کو قبض کر لیتے ہیں، نبی اپنی اُمّت کو صحیح سالم چھوڑ کر جاتے ہیں اور نبی اپنی اُمّت کے لئے پیش رو اور آگے چل کر سامان کرنے والے بن جاتے ہیں، جیسا کہ کوئی قافلہ ہو تو کچھ لوگوں کو پہلے بھیج دیا جاتا ہے تا کہ وہ آگے جا کر ان کا کچھ سامان کریں، خیمے لگانے کی تجویز کریں اور دوسری ضروریات کو دیکھیں، تو اُمّت کے لئے نبی سلف اور فرط بن جاتے ہیں، پیش رو اور آگے جا کر سامان کرنے والا۔

اور جب اللہ تعالیٰ کسی اُمّت کی ہلاکت کا فیصلہ فرماتے ہیں تو نبی کی موجودگی میں اس اُمّت کو تباہ کیا جاتا ہے اور وہ ان کی تباہی کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے اور ان کی تباہی پر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں ،اس لئے کہ انہوں نے اس نبی کو ستایا ہوتا ہے اور اس کی تکذیب کی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے تمام قوموں کے قصے قرآن پاک میں ذکر فرمائے ہیں، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط، قوم شعیب اور اسی طرح دوسری قومیں اور یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّت کو اس لئے ارشاد فرمائی تھی کہ میرا جانا تمہارے لئے رحمت ہے۔

فرمایا تھا کہ: میرا یہاں موجود رہنا یہ بھی تمہارے لئے رحمت ہے اور تم سے رخصت ہو کر چلے جانا یہ بھی تمہارے لئے رحمت ہے، میں چلا جاؤں گا تو آگے جا کر تمہارے لئے سامان کروں گا، الحمد للہ! رسول اللہ ﷺ دنیا سے اس حالت میں تشریف لے کر گئے کہ آپ ﷺ اپنی اُمت سے خوش تھے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے اس طرح پردہ ہٹایا اور دیکھ کر مسکرائے اور پھر پردہ تان دیا، صحابہ فرماتے ہیں کہ: قریب تھا کہ ہم نماز توڑ دیتے آپ کی زیارت کے لئے، بس یہ آخری زیارت تھی، اس کے بعد زیارت نہ ہو سکی، آنحضرت ﷺ کا اس طرح مسکرانا یہ آپ کی خوشنودی اور رضامندی کی علامت تھی کہ تم سے راضی جا رہے ہیں۔